چہارم

قصص القرآن

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی

إنَّ هٰذا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ
بے شبہ یہ بیان حق ہے

قصص القرآن

جلد چہارم

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے واقعات و حالات کا مبصرانہ اور محققانہ بیان

تالیف

مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی





فہرست مضامین قصص القرآن جلد چہارم



دیباچہ طبع ثانی

اللہ رب العزت کا شکر کس زبان سے ادا کیا جائے کہ اُس نے آج قصص القرآن کی چوتھی جلد کے دوسرے ایڈیشن کو شائقین کی خدمت میں پیش کرنے کا موقع عطا فرمایا۔

بلاشبہ یہ مؤلف کی اپنی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے کہ یہ کتاب بحمد اللہ مقبولِ خاص و عام ہوئی بلکہ یہ تو قرآنِ حکیم کا اپنا معجزہ ہے کہ ایک سطر یا ایک لفظ بھی اس کی سچی خدمت سے اگر وابستہ ہو جائے تو وہ لفظ اور وہ سطر بھی مخدوم و مقبول بن جاتی ہے۔

پہلا ایڈیشن جب طبع ہو کر سامنے آیا تو یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ کافی کنج دکاؤ کے باوجود "ختمِ نبوت" کے اہم عنوان سے کتاب خالی ہے —— بار بار غور کیا لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ عنوان کی اہمیت کس طرح نظر انداز ہوگئی۔ یہ کمی ایسی نہ تھی جو قلب کو خلش سے آزاد کر سکتی، اس لیے ایڈیشن کے ختم ہونے کا بے چینی کے ساتھ انتظار رہا، اور اب بحمد اللہ نقشِ ثانی میں اس کی تلافی کر سکا۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

۴۔ ستمبر ۴۷ء کے خونی حادثہ نے ندوۃ المصنفین کو بھی بھڑکتے ہوئے شعلوں کی لپیٹ میں لیے بغیر نہ چھوڑا اور تقریباً پونے دو لاکھ قیمت کے بہترین علمی اسٹاک کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔

اب نہ وہ قرول باغ کی خاموش فضا ہے اور نہ قلب و دماغ کو پہلا سا سکون

نصیب — ایک قرول باغ اور ندوۃ المصنفین کا بہترین آفس ہی کیا سرے سے وہ دلّی ہی نہ رہی، اب تو اِس "مرحوم دلّی" کا ذکر افسانوں ہی میں سُنیئے گا۔ مگر لوگ کہتے ہیں کہ دلّی پھر "دلّی" ہے۔ تیرہ مرتبہ اُجڑ کر بھی نئی بہار کے ساتھ اپنا جوبن دکھا رہی ہے — خدا اس کو نظرِ بد سے بچائے۔

بہرحال اِس نازک اور ناسازگار ماحول کے باوجود قصص القرآن جلد رابع کا دوسرا ایڈیشن طبع ہوکر آپ کو دعوتِ مطالعہ دے رہا ہے۔ اب آپ کا علمی و دینی فرض ہے کہ اس قیمتی ادارہ کو اس قابل بنائیں کہ وہ سابق کی طرح آج بھی علمی، اَدبی اور دینی خدمات انجام دیتا رہے اور دُنیا کی نئی ترقیوں کے ساتھ وہ بھی عروج کی آخری منزل تک پہنچ سکے۔ واللہ غالبٌ علیٰ امرہٖ۔

محمد حفظ الرحمٰن صدیقی کان اللہ لہٗ

۲۱- ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ

طبع سُوم

کتاب کا دوسرا ایڈیشن ختم ہوگیا، لیکن نظرِ ثانی کا موقع نہ مل سکا، اور یہ تیسرا ایڈیشن نظرِ ثانی کے بغیر ہی شائع ہو رہا ہے۔ طبعِ دوم میں ایک اہم باب "ختمِ نبوت" کے اضافہ کے بعد یُوں بھی یہ ایڈیشن نظرِ ثانی کا زیادہ محتاج نہ تھا، پھر بھی انسانی جدوجہد کسی وقت بھی مکمل نہیں کہی جا سکتی —— موقع میسر آیا تو طبع چہارم کے وقت نظرِ ثانی ہو سکے گی۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

۳۱ر اکتوبر ۵۵ء

دیباچہ طبع عکسی

شکر ہے سالہا سال کے انتظار اور کاوش کے بعد قصص القرآن جلد چہارم کا بھی عکسی ایڈیشن تیار ہوگیا ہے اور اس طرح کتاب کی چاروں جلدیں ایک ہی رنگ اور ایک ہی معیار پر آگئی ہیں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ "قصص القرآن" "ندوۃ المصنفین" کی نہایت اہم اور مقبول ترین کتاب ہے اور اپنے مضامین کی افادیت، ندرت اور اثر انگیزی میں اپنا جواب نہیں رکھتی، پُوری کتاب کے کم و بیش اٹھارہ سو صفحات ہیں، ان صفحات میں قرآن کریم

کے بیانات کی روشنی میں انبیائے کرام علیہم السلام کی ایمان افروز زندگی کے واقعات و حالات سادہ اور پُراثر پیرایے میں تحریر کیے گئے ہیں۔

یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ "قصص القرآن" کے درجے کی کوئی کتاب دنیا کی کسی زبان میں نہیں ہے جس میں قصصِ قرآنی اور پیغمبرانِ حق کی تاریخ اتنی تفصیل و تحقیق سے بیان کی گئی ہو۔

قدرتی طور پر جی چاہتا تھا کہ اس لاجواب کتاب کی طباعت بھی اس کی شان اور مرتبے کے مطابق ہوتی، الحمد للہ یہ آرزو پوری ہو گئی اور چاروں جلدیں نفیس کتابت کے زیور سے آراستہ ہو کر آفسٹ پر چھپ گئیں۔

"ندوۃ المصنفین" کے وسائل نہایت ہی محدود ہیں اور اس کے لیے گرانی کی شدت کے اِس دور میں اتنی ضخیم کتاب کی اشاعت جتنی کچھ دشوار ہو سکتی ہے اس کا اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے۔

دعا ہے خواص اور عوام، قدیم تعلیم یافتہ اور جدید طالبانِ علم سب ہی بقدرِ ظرف و ہمت اس سے پورا پورا فیض حاصل کریں۔

ضرورت ہے کہ موعظت و عبرت کے اس دفتر کا ایڈیشن عربی میں بھی شائع ہو اور انگریزی میں بھی، دیکھیے اس کی نوبت کب آتی ہے۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

۲۷ جمادی الآخر ۱۳۹۹ھ

مطابق ۲۴ مئی ۱۹۷۹ء



پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعَالَمِیْنَ نَذِیْرًا۔ والصلوٰۃ والسلام علیٰ محمدن المبعوث کافۃ للناس بشیرا ونذیرا۔

امابعد خدائے تعالیٰ کا احسانِ عظیم ہے کہ آج قصص القرآن کی تالیف اپنی آخری منزل پر پہنچ کر کامیابی کے ساتھ مکمل ہوگئی، میں کیا اور میری لیاقت اور میرا قلم کیا؟ یہ جو کچھ بھی ہوا خدا کے فضل اور قرآنِ حکیم کی برکت کی بدولت ہوا۔ فالحمدُ للّٰہِ علٰی ذٰلک۔

یہ جلد حضرتِ عیسیٰ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) اور خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت ودعوت اور حیٰوۃِ طیبہ اور دیگر مباحثِ متعلقہ پر مشتمل، اور پہلی تین جلدوں کی خصوصیات وامتیازات کی حامل ہے۔

حضرتِ عیسیٰ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے مقدس حالات میں خصوصیت کے ساتھ وہ مباحث لائقِ مراجعت ہیں جو قرآنِ حکیم کے حکیمانہ دلائل وبراہین کی روشنی میں "حیٰوۃِ عیسیٰ علیہ السلام" سے متعلق ہیں یا عہدِ قدیم وعہدِ جدید (توراۃ وانجیل) کے مضامینِ الٰہیات سے تعلق رکھتے ہیں۔

خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی "حیاتِ طیبہ" تو وہ مخدوم شے ہے کہ از سلف تا خلف مسلسل ہر زندہ زبان اس خدمتِ پاک کو اپنا فرض یقین کرتی اور ادائے فرض سے سبکدوشی کا شرف حاصل کرتی رہی ہے۔ خصوصاً عربی زبان کے بعد اُردو زبان میں اس خدمت نے بہترین ذخیرہ پیش کر دیا ہے۔ اور مختصر، متوسط مطوّل ہر نوع کی تالیفات اس سلسلہ میں موجود ہیں اس لیے اس تالیف میں کوشش کی گئی ہے کہ صرف ان ہی واقعات کو سپردِ قلم کیا جائے جن کا قرآنِ حکیم سے براہِ راست تعلق ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر شعبۂ حیات قرآنِ حکیم کی جیتی جاگتی تصویر، اور آپ کا ہر اُسوۂ حسنہ آیاتِ قرآن کی تفسیر ہے۔

قصص القرآن کی تالیف اپنی افادیت اور مقصدِ تالیف کے لحاظ سے کیا درجہ رکھتی ہے۔ اس کا فیصلہ اربابِ ذوق کی نگاہِ بصیرت کے سپرد ہے ——— خدائے تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ وہ اس خدمت کو قبول فرمائے۔ وما توفیقی اِلّا باللہ وھو حسبی ونعم الوکیل۔

خادمِ ملت

محمد حفظ الرحمٰن صدیقی کان اللہ لہٗ

۹ صفر المظفر ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۳ جنوری ۱۹۴۶ء



حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام)

قرآن اور حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) - عمران و حنّہ - مریم علیہا السلام کی ولادت - حنّہ اور ایشاع (الیشبع) - مریم (علیہا السلام) کا زہد و تقویٰ - مقبولیتِ خداوندی - کیا عورت نبی ہو سکتی ہے؟ - نبوت النساء اور ابن حزم - آیت "وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَاۤءِ الْعٰلَمِيْنَ" حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام اور بشاراتِ کتبِ سابقہ - ولادتِ مبارک - بشاراتِ ولادت - حُلیۂ مبارک - بعثت و رسالت - آیاتِ بیّنات لائقِ توجہات اور حقیقتِ معجزات - حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کی تعلیمات کا خلاصہ - حواریِ عیسیٰ (علیہ السلام) - حواریِ عیسیٰ (علیہ السلام) اور قرآن و انجیل کا موازنہ - نزولِ مائدہ - رفع الی السماء یعنی زندہ آسمان پر اُٹھالیا جانا - قادیانی تلبیس اور اُس کا جواب - حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کا رفعِ سماوی اور چند جذباتی باتیں - کادیانی کی ایک کذب بیانی - حیاتِ عیسیٰ (علیہ السلام) - لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ - تفسیر بالرائے کی نمایاں مثال - وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ - مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ - وَرَافِعُكَ اِلَيَّ - حیاتِ عیسیٰ (علیہ السلام) اور احادیثِ صحیحہ - احادیثِ حیات و نزول - حیاتِ مسیحؑ اور اجماعِ امت - حیات و نزولِ مسیحؑ کی حکمت - واقعاتِ نزول صحیح احادیث کی روشنی میں - وفاتِ مسیح (علیہ السلام)

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ۔ نبیِ صادق و متنبیِ کاذب۔ حضرتِ مسیحؑ کی دعوتِ اصلاح۔ بنی اسرائیل کے فرقے۔ اناجیلِ اربعہ۔ قرآن اور انجیل۔ انجیل اور حوارئِ عیسیٰ علیہ السلام۔ حضرتِ مسیحؑ اور موجودہ مسیحیت۔ تثلیث؟ باپ، بیٹا، روح القدس ازمنۂ مظلمہ اور اصلاحِ کلیسہ کی آواز۔ حضرتِ مسیحؑ خدا کے مقرب رسول ہیں۔ حضرتِ مسیح نہ خدا ہیں نہ خدا کے بیٹے۔ لائقِ توجہ بات۔ کفارہ؟

قرآنِ عزیز اور حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام

حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) جلیل القدر اور اولوالعزم پیغمبروں میں سے ہیں، اور جس طرح نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) خاتم الانبیاء و رسل ہیں اُسی طرح عیسیٰ (علیہ السلام) خاتم الانبیاءِ بنی اسرائیل ہیں، اور جمہور کا اِس پر اجماع ہے کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور عیسیٰ (علیہ السلام) کے درمیان کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا، اور درمیان کا یہ زمانہ جس کی مدت تقریباً پانچ سو ستّر سال ہے۔ فترۃ (انقطاعِ وحی) کا زمانہ رہا ہے۔

عیسیٰ (علیہ السلام) کی جلالتِ قدر اور عظمتِ شان کا ایک امتیازی نشان یہ بھی ہے کہ اگر انبیاءِ بنی اسرائیل میں حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کو نبوت و رسالت کا مقامِ امامت حاصل ہے تو عیسیٰ (علیہ السلام) مجددِ انبیاءِ بنی اسرائیل ہیں، اس لیے کہ قانونِ ربانی (تورات) کے بعد بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لیے انجیل (بائبل) سے زیادہ عظیم المرتبہ دوسری کوئی کتاب نازل نہیں ہوئی اور یہ ایک حقیقت ہے کہ انجیل کا نزول قانونِ تورات کی تکمیل ہی کی شکل میں ہوا ہے یعنی نزولِ تورات کے بعد یہود نے جو قسم قسم کی گمراہیاں دینِ حق میں پیدا کرلی تھیں انجیل نے توراۃ کی شارح بن کر بنی اسرائیل کو ان گمراہیوں سے بچنے کی دعوت دی اور اس طرح تکمیلِ تورات کا فرض انجام دیا اور بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰؑ کا فراموش شدہ پیغامِ ہدایت عیسیٰ (علیہ السلام) ہی نے

دوبارہ یاد دلایا اور تازہ بارانِ رحمت کے ذریعہ اس خشک کھیتی کو دوبارہ زندگی بخشی۔
مزید برآں یہ کہ عیسیٰ (علیہ السلام) سرورِ کائنات محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سب سے بڑے منادی اور مبشر ہیں اور ہر دو مقدس پیغمبروں کے درمیان ماضی اور مستقبل دونوں زمانوں میں خاص رابطہ اور علاقہ پایا جاتا ہے۔[1]

قرآنِ عزیز نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مماثلت کے سلسلہ میں جن پاک ہستیوں کے واقعات سے بہت زیادہ بحث کی ہے اُن میں حضرتِ ابراہیم، حضرتِ موسیٰ اور حضرتِ عیسیٰ (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کی مقدس ہستیاں زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔

حضرتِ ابراہیمؑ کی شخصیت قرآن کے "تذکیر بایام اللہ" میں اس لیے زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ جس دینِ قویم اور ملتِ بیضاء کا عروج و کمال محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تقدیس کے ساتھ وابستہ تھا اور جس ملت کی دعوت و تبلیغ کا محور و مرکز ذاتِ اقدسؐ بننے والی تھی وہ ملتِ ابراہیمؑ کے نام سے موسوم ہے "مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ" کیونکہ یہی وہ بڑے پیغمبر ہیں جنھوں نے شرک کے مقابلہ میں سب سے پہلے توحیدِ الٰہی کو حنیفیت کا لقب دیا اور آئندہ ہمیشہ کے لیے خدا کی راہِ مستقیم کے لیے "ملتِ حنیفیہ" کا امتیاز قائم کر دیا یعنی جو خدا کی پرستش کے لیے مظاہرِ کائنات کی پرستش کو وسیلہ بناتا ہے وہ "مشرک" ہے اور جو خالقِ کائنات کی یکتائی کا قائل ہو کر براہِ راست اُسی کی پرستش کرتا ہے وہ "حنیف" ہے۔ پس اس مقدس پیغمبر نے خدا پرستی کے اس حقیقی تصور کو عملی حیثیت میں اس درجہ نمایاں کیا کہ مستقبل میں ادیانِ حق کے لیے اُس کی پیروی حق و صداقت کا معیار بن گئی اور خدائے برتر کی جانب سے قبولیت کا یہ شرف عطا ہوا کہ یہ مقدس پیغمبر کائناتِ رشد و ہدایت کا امامِ اکبر اور مجددِ اعظم قرار پاگیا: "وَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا" اور پیروی کرو ابراہیم کی ملت کی جو سب سے کٹ کر صرف خدا کی جانب جھکنے والا ہے:-

---

[1] تفصیل اپنے موقع پر آئے گی۔

مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا۔ (سورۂ حج پ ۱۷ ع ۱)

یہ ملت ہے تمہارے باپ ابراہیم کی اس نے تمہارا نام "مسلم" رکھا نزولِ قرآن سے قبل اور اس قرآن میں بھی تمہارا نام "مُسلِم" ہے۔

اور موسٰی (علیہ السلام) کی مقدس زندگی کا تذکرہ اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ اُن کی دعوت و تبلیغ کے واقعات یعنی قوم کی جہالت و نافرمانی، دشمنانِ خدا سے نبرد آزمائی پیہم مصائب و آلام پر صبر و استقلال کا دوام و ثبات، اور اسی قسم کے دوسرے کوائف و حالات میں اُن کے اور نبیِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان بہت زیادہ مشابہت و مناسبت پائی جاتی ہے اور اس لیے وہ واقعات و حالات قبول و انکارِ حق اور اُن سے پیدا شدہ نتائج کے سلسلہ میں بصیرت و عبرت کا سامان مہیا کرتے اور نظائر و شواہد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اور عیسٰی (علیہ السلام) کی حیاتِ طیبہ کا مقدس ذکر مسطورۂ بالا خصوصیات و امتیازات کی بناء پر خاص اہمیت رکھتا ہے۔

غرض قرآنِ عزیز نے حضرتِ عیسٰی (علیہ السلام) کے حالات و واقعات کو بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اُن کی حیاتِ طیبہ کے دیباچہ کے طور پر اُن کی والدہ حضرت مریم (علیہا السلام) کے واقعاتِ زندگی کو بھی روشن کیا ہے تاکہ قرآن کا مقصد "تذکیر بایام اللہ" پورا ہو۔

یہ ذکرِ پاک قرآنِ عزیز کی تیرہ سورتوں میں ہوا ہے، ان میں سے کسی جگہ نامِ مبارک عیسٰی (یسوع) سے یاد کیا گیا ہے اور کسی جگہ مسیح اور عبد اللہ کے لقب سے اور کسی مقام پر کنیت "ابن مریم" کے اظہار کے ساتھ۔

نقشۂ ذیل اس حقیقت کا کاشف اور اربابِ مطالعہ کی بصیرت کے لیے ممد و معاون ہے:-

---

[1] مُسلم اور حنیف مفہوم میں متحد ہیں مُسلم خدا کا تابعدار اور حنیف سب سے مُنہ پھیر کر صرف خُدا کا ہو جانے والا۔

شمار	سورۃ	آیات	عیسیٰ	مسیح	عبداللہ	ابن مریم	تعداد آیات
۱	البقرۃ	۸۷-۱۳۶-۱۳۷-۱۳۸-۲۵۳	۳	۰	۰	۲	۵
۲	آل عمران	۴۲-۶۴-۸۴	۵	۱	۰	۱	۲۴
۳	النسآء	۱۵۶-۱۵۹-۱۷۱-۱۷۲	۳	۳	۰	۲	۶
۴	المآئدۃ	۱۷-۴۶-۷۲-۷۵-۷۸-۱۱۰-۱۲۰	۶	۵	۰	۱۰	۱۸
۵	الانعام	۸۵	۱	۰	۰	۰	۱
۶	التوبہ	۲۰-۳۱	۰	۱	۰	۱	۲
۷	مریم	۱۶-۳۵	۱	۱	۱	۶	۱۹
۸	المؤمنون	۵۰	۱	۰	۰	۱	۱
۹	الاحزاب	۷-۸	۱	۰	۰	۱	۲
۱۰	الشوریٰ	۱۳	۱	۰	۰	۰	۱
۱۱	الزخرف	۵۷-۶۳	۱	۰	۰	۱	۲
۱۲	الحدید	۲۷	۱	۰	۰	۱	۱
۱۳	الصف	۶-۱۴	۲	۰	۰	۲	۲

عمران وحنہ حضرتِ زکریا اور حضرتِ یحییٰ (علیہما السلام) کے حالات میں گذر چکا ہے کہ بنی اسرائیل میں عمران ایک عابد و زاہد شخص تھے اور اسی زہد و عبادت کی وجہ سے نماز کی امامت بھی اُن ہی کے سپرد تھی اور اُن کی بیوی حنہ بھی بہت پارسا اور عابدہ تھیں اور اپنی نیکی کی وجہ سے وہ دونوں بنی اسرائیل میں بہت زیادہ محبوب و مقبول تھے [۱]

محمد بن اسحٰق صاحبِ مغازی نے عمران کا نسب نامہ اس طرح بیان کیا ہے:-

عمران بن یاشم بن میشا بن جزقیا بن ابراہیم بن عزریا بن ناوش بن اجز بن یہوا بن نازم بن مقاسط بن ایشا بن ایاز بن رخیم (رخیعام) بن سلیمان بن داؤد (علیہما الصلوٰۃ والسلام)

[۱] تفسیر ابن کثیر جلد ۱ (آل عمران)

اور حافظ ابنِ عساکر نے ان ناموں کے علاوہ دوسرے نام بیان کیے ہیں اور ان دونوں بیانات میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے تاہم اس پر تمام علماءِ انساب کا اتفاق ہے کہ عمران حضرت سلیمان (علیہ السلام) کی اولاد میں سے ہیں اور حنہ بنت فاقوذ بن قبیل بھی داؤد (علیہ السلام) کی نسل سے ہیں[۱]

عمران صاحبِ اولاد نہیں تھے اور اُن کی بیوی حنہ بہت زیادہ متمنی تھیں کہ اُن کے اولاد ہو، وہ اس کے لیے درگاہِ الٰہی میں دست بدعا اور قبولیتِ دعاء کے لیے ہر وقت منتظر رہتی تھیں۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حنہ صحن مکان میں چہل قدمی کر رہی تھیں، دیکھا کہ ایک پرند اپنے بچہ کو بھرا رہا ہے، حنہ کے دل پر یہ دیکھ کر سخت چوٹ لگی اور اولاد کی تمنا نے بہت جوش مارا اور حالتِ اضطراب میں بارگاہِ الٰہی میں دعاء کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے اور عرض کیا: "پروردگار اسی طرح مجھ کو بھی اولاد عطا کر کہ وہ ہماری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بنے" دل سے نکلی ہوئی دعاء نے قبولیت کا جامہ پہنا اور حنہ نے چند روز بعد محسوس کیا کہ وہ حاملہ ہیں۔ حنہ کو اس احساس سے اس درجہ مسرت ہوئی کہ انھوں نے نذر مان لی کہ جو بچہ پیدا ہوگا اس کو ہیکل (مسجدِ اقصیٰ) کی خدمت کے لیے وقف کر دوں گی[۲]

بہرحال اللہ تعالیٰ نے عمران کی بیوی حنہ کی دعاء کو شرفِ قبولیت بخشا اور وہ مسرت و شادمانی کے ساتھ اُمید بر آنے کی گھڑی کا انتظار کرنے لگیں۔

بشر بن اسحٰق کہتے ہیں کہ حنہ ابھی حاملہ ہی تھیں کہ اُن کے شوہر عمران کا انتقال ہوگیا[۳]

مریم علیہا السلام کی ولادت جب مدتِ حمل پوری ہوگئی اور ولادت کا وقت آپہنچا تو حنہ کو

---

[۱] البدایۃ والنہایۃ ج ۲ ص ۵۱ ۔ [۲] بنی اسرائیل کی مذہبی رسوم میں سے یہ رسم بہت مقدس سمجھی جاتی تھی کہ وہ اپنی اولاد کو ہیکل کی خدمت کے لیے وقف کریں۔ البدایۃ والنہایۃ جلد ۲ ۔

[۳] فتح الباری، ج ۶ ص ۳۶۴ ۔

معلوم ہوا کہ اُن کے بطن سے لڑکی پیدا ہوئی ہے، جہاں تک اولاد کا تعلق ہے حنّہ کے لیے یہ لڑکی بھی لڑکے سے کم نہ تھی مگر اُن کو یہ افسوس ضرور ہوا کہ میں نے جو نذر مانی تھی وہ پوری نہیں ہو سکے گی؛ اس لیے کہ لڑکی کس طرح مقدس ہیکل کی خدمت کر سکے گی؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کے افسوس کو یہ کہہ کر بدل دیا کہ ہم نے تیری لڑکی کو ہی قبول کیا اور اس کی وجہ سے تمہارا خاندان بھی معزز اور مُبارک قرار پایا، حنّہ نے لڑکی کا نام مریم رکھا سریانی میں اس کے معنی خادمہ[1] کے ہیں، چونکہ یہ ہیکل کی خدمت کے لیے وقف کر دی گئیں اس لیے یہ نام موزوں سمجھا گیا

قرآنِ عزیز نے اس واقعہ کو معجزانہ اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّ	بیشک اللہ نے آدم اور نوح اور آلِ ابراہیم اور آلِ
اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى	عمران[2] کو (اپنے اپنے زمانہ میں جہان والوں پر بزرگی
الْعٰلَمِيْنَۙ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا	عطا فرمائی (ان میں سے) بعض بعض کی ذریت ہیں)
مِنْۢ بَعْضٍ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌۚ	اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے (وہ وقت یاد کرو)
اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ	جب عمران کی بیوی نے کہا خدایا! میں نے نذر مان لی ہے
اِنِّىْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِىْ بَطْنِىْ	کہ میرے پیٹ میں جو (بچہ) ہے وہ تیری راہ میں آزاد ہے؛
مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّىْ ۚ اِنَّكَ	پس تو اس کو میری جانب سے قبول فرما بیشک تو
اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ فَلَمَّا	سننے والا جاننے والا ہے؛ پھر جب اس نے جنا
وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّىْ	تو کہنے لگی: پروردگار! میرے لڑکی پیدا ہوئی ہے
وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰىؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا	اور اللہ خوب جانتا ہے جو اس نے جنا ہے اور لڑکا
وَضَعَتْؕ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰىۚ	اور لڑکی یکساں نہیں ہیں (یعنی ہیکل کی خدمت لڑکی
وَاِنِّىْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّىْۤ	نہیں کر سکتی لڑکا کر سکتا ہے) اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۳۶۵۔ [2] عمران، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد کا نام بھی ہے اور حضرت مریم علیہا السلام کے والد کا بھی۔ یہاں والدِ مریم علیہا السلام مراد ہیں۔

اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا	اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان الرجیم کے
مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝	کے فتنہ سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔
فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ	پس مریم کو اس کے پروردگار نے بہت اچھی طرح
وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا	قبول فرمایا اور اس کی نشو و نما اچھے طریق پر کی اور
زَكَرِيَّا ۚ (سورہ آلِ عمران پ ۳ ع ۱۳)	زکریا کو اس کا نگران کار بنا دیا۔

حضرتِ مریم (علیہا السلام) جب سنِ شعور کو پہنچیں اور یہ سوال پیدا ہوا کہ مقدس ہیکل کی یہ امانت کس کے سپرد کی جائے تو کاہنوں[1] میں سے ہر ایک نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس مقدس امانت کا کفیل مجھ کو بنایا جائے مگر اس امانت کی نگرانی کا اہل حضرتِ زکریا سے زیادہ کوئی نہ تھا، اس لیے کہ وہ مریم (علیہا السلام) کی خالہ ایشاع (الیشبع) کے شوہر بھی تھے اور مقدس ہیکل کے معزز کاہن اور خدائے برتر کے نبی بھی تھے، اس لیے سب سے پہلے انھوں نے ہی اپنا نام پیش کیا مگر جب سب کاہنوں نے یہی خواہش ظاہر کی اور باہمی کشمکش کا اندیشہ ہونے لگا تو آپس میں طے پایا کہ قرعہ اندازی کے ذریعہ اس کا فیصلہ کر لیا جائے۔ اور بقول روایاتِ بنی اسرائیل تین مرتبہ قرعہ اندازی کی گئی وہ دریا میں اپنے قلم (پورے) ڈالتے مگر قرعہ کی شرط کے مطابق ہر مرتبہ زکریا (علیہ السلام) ہی کا نام نکلتا، کاہنوں نے جب یہ دیکھا کہ اس معاملہ میں زکریا (علیہ السلام) کے ساتھ تائیدِ غیبی ہے تو انھوں نے بخوشی اس فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اس طرح یہ "سعید امانت" حضرتِ زکریا کے سپرد کر دی گئی۔

کہا جاتا ہے کہ مریم (علیہا السلام) کی کفالت کا یہ معاملہ اس لیے پیش آیا کہ وہ یتیم تھیں اور مردوں میں سے کوئی ان کا کفیل نہیں تھا اور بعض کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں قحط کا بہت زور تھا اس لیے کفالت کا سوال پیدا[2] ہوا۔ لیکن یہ دونوں باتیں اگر نہ بھی ہوتیں تب بھی کفالت کا سوال اپنی جگہ پھر بھی باقی رہتا اس لیے کہ مریم (علیہا السلام) اپنی والدہ کی نذر کے مطابق "نذرِ ہیکل"

---

[1] کاہن سے وہ مقدس ہستیاں مراد ہیں جو ہیکل میں مذہبی رسوم ادا کرتی اور خدمتِ ہیکل پر مامور تھیں ۱۲ [2] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۳۶۰

ہو چکی تھیں اور چونکہ لڑکی تھیں اس لیے از بس ضروری تھا کہ وہ کسی مرد نیک کی کفالت میں اس خدمت کو انجام دیتیں

غرض زکریا (علیہ السلام) نے حضرت مریم (علیہا السلام) کے صنفی احترامات کا لحاظ رکھتے ہوئے ہیکل کے قریب ایک حجرہ اُن کے لیے مخصوص کر دیا تاکہ وہ دن میں وہاں رہ کر عبادتِ الٰہی سے بہرہ ور ہوں اور جب رات آتی تو اُن کو اپنے مکان پر ان کی خالہ ایشاع کے پاس لے جاتے اور وہ وہیں شب بسر کرتیں[1]۔

حنہ اور ایشاع | ابن کثیر فرماتے ہیں کہ جمہور کا قول یہ ہے کہ ایشاع (الیشبع) مریم (علیہا السلام) کی ہمشیر تھیں اور حدیثِ معراج میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عیسیٰ اور یحییٰ (علیہما السلام) کے متعلق یہ فرما کر "دھما ابنا خالۃ" جو رشتہ ظاہر فرمایا ہے اس سے بھی جمہور کے قول کی تائید ہوتی ہے۔

لیکن جمہور کا یہ قول قرآنِ عزیز اور تاریخ دونوں کے خلاف ہے اس لیے کہ قرآن نے مریم (علیہا السلام) کی ولادت کے واقعہ کو جس اسلوب کے ساتھ بیان کیا ہے وہ صاف بتا رہا ہے کہ عمران اور حنہ، مریم (علیہ السلام) کی ولادت سے قبل اولاد سے قطعاً محروم تھیں یہی وجہ ہے کہ حنہ نے مریم علیہا السلام کی ولادت پر یہ نہیں کہا "خدایا! میرے تو پہلے بھی ایک لڑکی

---

[1] روح المعانی سورۂ آلِ عمران ـــــ مولانا آزاد ترجمان القرآن میں لکھتے ہیں۔ قرآن میں حضرت مسیح (علیہ السلام) کے ظہور کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ دو جگہ کیا گیا ہے، یہاں اور سورۂ آلِ عمران کی آیات (۳۵-۶۳) میں، یہاں یہ ذکر حضرتِ زکریا کی دعا اور حضرت یحییٰ کی پیدائش کے بیان سے شروع ہوا ہے اور اناجیلِ اربعہ میں سے سینٹ لوقا کی انجیل ٹھیک ٹھیک اسی طرح یہ تذکرہ شروع کرتی ہے لیکن سورۂ آلِ عمران میں یہ تذکرہ اس سے بھی پیشتر کے ایک واقعہ سے شروع ہوتا ہے یعنی حضرتِ مریم کی پیدائش اور ہیکل میں پرورش پانے کے واقعہ سے اور اس بارہ میں چاروں انجیلیں خاموش ہیں لیکن اُنیسویں صدی میں متروک اناجیل کا جو نسخہ ویٹیکان کے کتب خانہ سے برآمد ہوا اس نے حضرتِ مریم کی پیدائش کا یہ مفقود ٹکڑا مہیا کر دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم چوتھی صدی عیسوی کے اوائل تک سرگذشت کا یہ ٹکڑا بھی اسی طرح الہامی یقین کیا جاتا تھا جس طرح بقیہ ٹکڑے یقین کیے جاتے ہیں۔ ج ۲ ص ۴۴۳۔

موجود تھی، اب تو نے دوبارہ بھی لڑکی ہی عطا فرمائی" بلکہ درگاہِ الٰہی میں یہ عرض کیا کہ جس شکل میں میری دعا، تو نے قبول فرمائی ہے اس کو حسبِ وعدہ تیری نذر کیسے کروں؟ نیز توراۃ اور بنی اسرائیل کی تاریخ سے بھی کہیں یہ ثابت نہیں کہ عمران اور حنہ کے مریم (علیہا السلام) کے ماسوا کوئی اور اولاد بھی تھی بلکہ اس کے برعکس تاریخ یہود اور اسرائیلیات کا مشہور قول یہ ہے کہ ایشاع، مریم (علیہا السلام) کی خالہ تھیں۔

دراصل جمہور کی جانب یہ منسوب قول صرف حدیثِ معراج کے مسطورۂ بالا جملہ کے پیشِ نظر ظہور میں آیا ہے حالانکہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ ارشاد (وھما ابنا خالۃ) وہ دونوں خالہ زاد بھائی ہیں، مجازِ متعارف کی شکل میں ہے یعنی آپ نے بطریقِ توسع والدہ کی خالہ کو عیسیٰ کی خالہ فرمایا ہے اور اس قسم کا توسع عام بول چال میں شائع ذائع ہے۔

علاوہ ازیں ابن کثیر (رحمہ اللہ) کا اس کو قولِ جمہور کہنا بھی محلِ نظر ہے اس لیے کہ محمد بن اسحٰق، اسحٰق بن بشر، ابن عساکر، ابن جریر اور ابن حجر (رحمہم اللہ) جیسے جلیل القدر اصحابِ حدیث و سیر کا رجحان اس جانب ہے کہ ایشاع، حنہ کی ہمشیر اور مریم (علیہا السلام) کی خالہ ہیں، حنہ کی بیٹی نہیں ہیں۔

مریم علیہا السلام کا زہد و تقویٰ

مریم (علیہا السلام) شب و روز عبادتِ الٰہی میں رہتیں اور جب خدمتِ ہیکل کے لیے اُن کی نوبت آتی تو اس کو بھی بخوبی انجام دیتی تھیں حتیٰ کہ ان کا زہد و تقویٰ بنی اسرائیل میں ضرب المثل بن گیا اور ان کی زہادت و عبادت کی مثالیں دی جانے لگیں۔

مقبولیتِ خداوندی

زکریا (علیہ السلام) مریم (علیہا السلام) کی ضروری نگہداشت کے سلسلہ میں کبھی کبھی ان کے حجرہ میں تشریف لیجایا کرتے تھے لیکن ان کو یہ بات عجیب نظر آتی کہ جب وہ خلوتکدہ میں داخل ہوتے تو مریم (علیہا السلام) کے پاس اکثر بے موسم کے تازہ پھل موجود پاتے[1] ۔۔۔ آخر

---

[1] یہ تفصیل اگرچہ تفسیری روایات سے ماخوذ ہے اور آیت میں صرف لفظ "رزق" آیا ہے لیکن آیت سے بصراحت ثابت ہوتا ہے کہ مریم کا یہ رزق انسانی داد و دہش کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ بطور کرامت من جانب اللہ تھا۔ (مؤلف)

زکریا (علیہ السلام) سے نہ رہا گیا اور انھوں نے دریافت کیا: مریم تیرے پاس یہ بے موسم پھل کہاں سے آتے ہیں؟ مریم (علیہا السلام) نے فرمایا: "یہ میرے پروردگار کا فضل و کرم ہے، وہ جس کو چاہتا ہے بے گمان رزق پہنچاتا ہے۔" حضرتِ زکریاؑ نے یہ سُنا تو سمجھ گئے کہ خدائے برتر کے یہاں مریمؑ کا خاص مقام اور مرتبہ ہے اور ساتھ ہی بے موسم تازہ پھلوں کے واقعہ نے دل میں یہ تمنا پیدا کر دی کہ جس خدا نے اپنی قدرتِ کاملہ سے یہ پھل بے موسم پیدا کر دیئے، کیا وہ میرے بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود مجھ کو بے موسم پھل (بیٹا) عطا نہ کرے گا! یہ سوچ کر انھوں نے خشوع و خضوع کے ساتھ بارگاہِ ربانی میں دعا کی اور وہاں سے شرفِ قبولیت کا مژدہ عطا ہوا۔

وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۖ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِندَهَا رِزْقًا ۖ قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّىٰ لَكِ هَٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ (سورۂ آلِ عمران پ ۳ ع ۳)	اور اُس (مریم) کی کفالت زکریا نے کی، جب اُس (مریم) کے پاس زکریا داخل ہوتے تو اس کے پاس کھانے کی چیزیں رکھی پاتے۔ زکریا نے کہا: "اے مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آئیں" مریم نے کہا "یہ اللہ کے پاس سے آئی ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے گمان رزق دیتا ہے۔"

مریم (علیہا السلام) اسی طرح ایک عرصہ تک اپنے مقدس مشاغل کے ساتھ پاک زندگی بسر کرتی رہیں اور مقدس ہیکل کا سب سے مقدس مجاور حضرتِ زکریا (علیہ السلام) بھی ان کے زہد و تقویٰ سے بیحد متأثر تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عظمت اور جلالتِ قدر کو اور زیادہ بلند کیا اور فرشتوں کے ذریعہ اُن کو برگزیدۂ بارگاہِ الٰہی ہونے کی یہ بشارت سُنائی:۔

إِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَاكِ عَلَىٰ نِسَاءِ	(اے پیغبر وہ وقت یاد کیجیے) جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو بزرگی دی اور پاک کیا اور دُنیا کی عورتوں پر تجھ کو

الْعٰلَمِيْنَ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ	برگزیدہ کیا، اے مریم! اپنے پروردگار کے سامنے جھک جا اور سجدہ ریز
وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۔	ہو جا اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز ادا کر"
…… وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ	اور تم اس وقت ان کاہنوں کے پاس موجود نہ تھے
اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ	جب وہ اپنے قلموں (پوروں) کو قرعہ اندازی کے لیے)
اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ	ڈال رہے تھے کہ مریم کی کفالت کون کرے اور تم اس وقت
وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ	(بھی) موجود نہ تھے جب وہ اس کفالت کے بارے میں
اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۔ (سورۂ آل عمران پ ۳ ع ۴)	آپس میں جھگڑ رہے تھے۔

حضرت مریم (علیہا السلام) جبکہ نہایت مُرتاض، عابد و زاہد اور تقویٰ و طہارت میں ضرب المثل تھیں اور جبکہ عنقریب ان کو جلیل القدر پیغمبر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی والدۂ ماجدہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہونے والا تھا تو من جانب اللہ ان کی تقدیس و تطہیر کا یہ اعلان بلاشبہ حق بحقدار رسید کا مصداق ہے، تاہم علمی اور تاریخی اعتبار سے بلکہ خود قرآن و احادیث کے مفہوم کے لحاظ سے یہ مسئلہ قابلِ توجہ ہے کہ آیت "وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ" کی مُراد کیا ہے، اور کیا درحقیقت حضرت مریم علیہا السلام کو بغیر کسی استثنار کے کائنات کی تمام عورتوں پر برتری اور فضیلت حاصل ہے؟ اور یہی نہیں بلکہ اس آیتِ فضیلت نے مریمؑ کی ذات سے متعلق علماءِ سلف میں چند اہم مسائل کو زیرِ بحث بنا دیا ہے مثلاً (۱) کیا عورت نبی ہو سکتی ہے؟ (۲) کیا حضرت مریم نبی تھیں؟ (۳) اگر نبی نہیں تھیں تو آیت کے جملہ "وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ" کا مطلب کیا ہے؟

کیا عورت نبی ہو سکتی ہے؟ | محمد بن اسحٰق، شیخ ابو الحسن اشعری، قرطبی، ابن حزم (نور اللہ مرقدہم) اس جانب مائل ہیں کہ عورت نبی ہو سکتی ہے بلکہ ابن حزم تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت حوّا، سارہ، ہاجرہ، ام موسیٰؑ، آسیہ اور مریم (علیہن السلام) یہ سب نبی تھیں، اور محمد بن اسحٰق رح کہتے ہیں کہ اکثر فقہاء اس کے قائل ہیں کہ عورت نبی ہو سکتی ہے اور قرطبی فرماتے ہیں کہ

مریم (علیہا السلام) نبی تھیں۔

ان حضرات کے اقوال کے برعکس خواجہ حسن بصری، امام الحرمین شیخ عبد العزیز اور قاضی عیاض (نور اللہ مرقدہم) کا رجحان اس جانب ہے کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی اور اس لیے مریم علیہا السلام بھی نبی نہیں تھیں۔ قاضی اور ابن کثیر یہ بھی کہتے ہیں کہ جمہور کا مسلک یہی ہے اور امام الحرمین تو اجماع تک کا دعویٰ کرتے ہیں۔ جو علماء یہ فرماتے ہیں کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی وہ اپنی دلیل میں اس آیت کو پیش کرتے ہیں:۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا	اور تم سے پہلے ہم نے نہیں بھیجے مگر مرد کہ وحی
رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ (النحل)	بھیجتے تھے ہم اُن کی طرف۔

اور خصوصیت کے ساتھ حضرتِ مریمؑ کی نبوت کے انکار پر یہ دلیل دیتے ہیں کہ قرآنِ عزیز نے اُن کو "صدیقہ" کہا ہے، سورۂ مائدہ میں ہے:۔

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ	بس ابن مریم تو ایک پیغمبر ہیں جن سے
قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ	پہلے اور بھی پیغمبر گذر چکے اور اُن کی
وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ (مائدہ)	والدہ صدیقہ تھیں۔

اور سورۂ نساء میں قرآنِ عزیز نے منعم علیہم کی جو فہرست دی ہے وہ اس کے لیے نصِ قطعی ہے کہ "صدیقیت" کا درجہ "نبوت" سے کم اور نازل ہے۔

اور جو حضرات عورت کے نبی ہونے کے قائل ہیں وہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ عزیز نے حضرتِ سارہ، اُمِ موسیٰؑ اور حضرتِ مریم (علیہن السلام) کے متعلق جن واقعات کا اظہار کیا ہے ان میں بصراحت موجود ہے کہ ان پر خدا کے فرشتے وحی لے کر نازل ہوئے اور ان کو منجانب اللہ بشارات سے سرفراز فرمایا اور ان تک اپنی معرفت، عبادت کا حکم پہنچایا، چنانچہ

لہ اُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔

حضرتِ سارہ کے لیے سورۂ ہود اور سورۂ الذٰریٰت اور امِ موسیٰ کے لیے سورۂ قصص میں اور مریم علیہا السلام کے لیے آلِ عمران اور سورۂ مریم میں بواسطۂ ملائکہ اور بلاواسطہ خطابِ الٰہی موجود ہے اور ظاہر ہے کہ ان مقامات پر وحی کے لغوی معنی (وجدانی ہدایت یا مخفی اشارہ) کے نہیں ہیں جیسا کہ آیت "وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ" میں شہد کی مکھی کے لیے وحی کا اطلاق کیا گیا ہے۔

اور خصوصیت کے ساتھ حضرتِ مریم (علیہا السلام) کے نبی ہونے کی یہ واضح دلیل ہے کہ سورۂ مریم میں اُن کا ذکر اُسی اسلوب کے ساتھ کیا گیا ہے جس طریقہ پر دیگر انبیاء و رسل کا تذکرہ کیا ہے مثلاً "وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ مُوْسٰی" "وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ اِدْرِیْسَ" "وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ اِسْمٰعِیْلَ" "وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ اِبْرٰهِیْمَ" "وَاذْكُرْ فِی الْكِتٰبِ مَرْیَمَ" یا مثلاً "وَاَرْسَلْنَآ اِلَیْهَا رُوْحَنَا" ہم نے مریم کی جانب اپنے فرشتہ جبرئیل کو بھیجا۔ یا مثلاً "قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ" "میں بلاشبہ تیرے پروردگار کی جانب سے پیغامبر ہوں" نیز آلِ عمران میں مریم علیہا السلام کو ملائکۃ اللہ نے جس طرح خدا کی جانب سے پیغامبر بن کر خطاب کیا ہے وہ بھی اس دعوی کی روشن دلیل ہے۔

اور مریم (علیہا السلام) کے صدیقہ ہونے سے متعلق جو سوال ہے اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر قرآن نے حضرتِ مریم (علیہا السلام) کو صدیقہ کہا ہے تو یہ لقب اُن کی شانِ نبوت کے اسی طرح منافی نہیں ہے جس طرح حضرتِ یوسف (علیہ السلام) کے مسلّم نبی ہونے کے باوجود آیت "یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ" میں اُن کا صدیق ہونا ان کے نبی ہونے کو مانع نہیں ہے بلکہ ذکرِ پاک مقامی خصوصیت کی بنا پر مذکور ہوا ہے۔ کیونکہ جو نبی ہے وہ بہرحال صدیق ضرور ہے البتہ اس کا عکس ضروری نہیں ہے۔

اِن علماءِ اسلام کی ترجمانی جس تفصیل کے ساتھ کتاب الفصل میں مشہور محدث ابن حزم (رحمہ اللہ) نے کی ہے اس تفصیل و قوت کے ساتھ دوسری جگہ نظر سے نہیں گذری اس لیے

۱؎ سورۂ ہود آیت ۷۱-۷۲، والذٰریٰت آیۃ ۲۹-۳۰۔ ۲؎ سورۂ قصص آیۃ ۷۔ ۳؎ آلِ عمران آیۃ ۴۲-۴۳ و ۴۵-۴۷ - و سورۂ مریم آیۃ ۱۶ تا ۲۱۔ ۴؎ سورۂ یوسف۔

سطور ذیل میں اس پورے مضمون کا ترجمہ لائق مطالعہ ہے:۔

نبوۃ النساء اور ابن حزم | یہ فصل ایسے مسئلہ کے متعلق ہے جس پر ہمارے زمانہ میں قرطبہ (اندلس) میں شدید اختلاف بپا ہوا، علماء کی ایک جماعت کہتی ہے کہ عورت نبی نہیں ہو سکتی اور جو ایسا کہتا ہے کہ عورت نبی ہو سکتی ہے وہ ایک نئی بدعت ایجاد کرتا ہے اور دوسری جماعت قائل ہے کہ عورت نبی ہو سکتی ہے اور نبی ہوئی ہیں، اور ان دونوں سے الگ تیسری جماعت کا مسلک توقف ہے اور وہ اثبات ونفی دونوں باتوں میں سکوت کو پسند کرتے ہیں مگر جو حضرات عورت سے متعلق منصبِ نبوّت کا انکار کرتے ہیں اُن کے پاس اس انکار کی کوئی دلیل نظر نہیں آتی البتہ بعض حضرات نے اپنے اختلاف کی بنیاد اس آیت کو بنایا ہے۔ "وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ"

میں کہتا ہوں کہ اس بارہ میں کس کو اختلاف ہے اور کس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عورت کو ہدایتِ خلق کے لیے رسول بنا کر بھیجتا ہے یا اس نے کسی عورت کو "رسول" بنایا ہے، بحث رسالت کے مسئلہ میں نہیں ہے بلکہ نبوّت میں ہے، پس طلبِ حق کے لیے ضروری ہے کہ اوّل یہ غور کیا جائے کہ لغتِ عرب میں لفظِ "نبوت" کے کیا معنی ہیں؟ تو ہم اس لفظ کو "اِنباء" سے ماخوذ پاتے ہیں جس کے معنی "اطلاع دینا" ہیں، پس نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ کسی معاملہ کے ہونے سے قبل بذریعہ وحی اطلاع دے یا کسی بھی بات کے لیے اس کی جانب وحی نازل فرمائے وہ شخص مذہبی اصطلاح میں بلاشبہ "نبی" ہے۔

آپ اس مقام پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وحی کے معنی اس الہام کے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کی سرشت میں ودیعت کر دیا ہے جیسا کہ شہد کی مکھی کے متعلق خدائے برحق کا ارشاد ہے "واوحیٰ رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ" اور نہ وحی کے معنی ظن اور وہم کے لے سکتے ہیں اس لیے کہ ان دونوں کو "علمِ یقین" سمجھنا (جو وحی کا قدرتی نتیجہ ہے) مجنوں کے سوا اور کسی کا کام نہیں ہے اور نہ یہاں وہ معنی مراد ہو سکتے ہیں جو باب کہانت سے تعلق رکھتے ہیں (یعنی

یہ کہ شیاطین، آسمانی باتوں کو سُننے اور چُرانے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے اُن پر شہاب ثاقب کے ذریعہ رجم کیا جاتا ہے اور جس کے متعلق قرآن یہ کہتا ہے: "شَيٰطِيْنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا" کیونکہ یہ باب کہانت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے وقت سے مسدود ہو گیا۔ اور نہ اس جگہ وحی کے معنی نجوم کے تجرباتِ علمیہ سے تعلق رکھتے ہیں جو خود انسانوں کے باہم سیکھنے اور سکھانے سے حاصل ہو جایا کرتے ہیں اور نہ اس کے معنی اُس کے رؤیا (خواب) کے ہو سکتے ہیں جن کے سچ یا جھوٹ ہونے کا کوئی علم نہیں ہے بلکہ ان تمام معانی سے جُدا "وحی بمعنی نبوۃ" یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے قصد اور ارادہ سے ایک شخص کو ایسے امور کی اطلاع دے جن کو وہ پہلے سے نہیں جانتا اور مسطورۂ بالا ذرائع علم سے الگ یہ امور حقیقتِ ثابتہ بن کر اُس شخص پر اس طرح منکشف ہو جائیں گویا آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ اس علم خاص کے ذریعہ اس شخص کو بغیر کسی محنت و کسب کے بداہۃً ایسا صحیح یقین عطا کر دے کہ وہ ان امور کو اس طرح معلوم کر لے جس طرح وہ حواس اور بداہتِ عقل کے ذریعہ حاصل کر لیا کرتا ہے اور اس کو کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اور خدا کی یہ وحی یا تو اس طرح ہوتی ہے کہ فرشتہ آ کر اس شخص کو خدا کا پیغام سُناتا ہے اور یا اس طرح کہ اللہ تعالیٰ براہ راست اس سے خطاب کرتا ہے۔

پس اگر ان حضرات کے نزدیک جو عورت کے نبی ہونے کا انکار کرتے ہیں نبوۃ کے معنی یہ نہیں ہیں، تو وہ ہم کو سمجھائیں کہ آخر نبوت کے معنی ہیں کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کے ماسوا اور کوئی معنی بیان ہی نہیں کر سکتے۔

اور جبکہ نبوت کے معنی وہی ہیں جو ہم نے بیان کیے تو اب قرآن کے ان مقامات کو بغور مطالعہ کیجئے جہاں یہ مذکور ہے کہ اللہ عزوجل نے عورتوں کے پاس فرشتوں کو بھیجا اور فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان عورتوں کو "وحیِ حق" سے مطلع کیا چنانچہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اُمِ اسحٰق (سارہ علیہا السلام) کو اسحٰق (علیہ السلام) کی ولادت کی بشارت

سُنائی، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے " وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ ۝ قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِیْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عَجِيْبٌ ۝ قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ " ان آیات میں فرشتوں نے ام اسحٰق کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اسحٰق اور اُن کے بعد یعقوب (علیہما السلام) کی بشارت سُنائی ہے اور سارہؑ کے تعجب پر یہ کہہ کر دوبارہ خطاب کیا ہے " اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ " تو یہ کیسے ممکن ہے کہ والدۂ اسحٰق (سارہ) علیہا السلام نبی تو نہ ہوں اور اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعہ اس طرح اُن سے خطاب کرے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جبرئیل فرشتہ کو مریم (اُم عیسیٰ علیہما السلام) کے پاس بھیجتا ہے اور ان کو مخاطب کر کے یہ کہتا ہے " قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا " تو یہ "وحی حقیقی" کے ذریعہ نبوت نہیں تو اور کیا ہے اور کیا اس آیت میں صاف طور پر نہیں کہا گیا ہے کہ مریم (علیہا السلام) کے پاس جبرئیل (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کی جانب سے پیغامبر بن کر آئے؟ نیز زکریا (علیہ السلام) جب مریم (علیہا السلام) کے حجرہ میں آتے تو اُن کے پاس اللہ کا غیب سے دیا ہوا رزق پاتے تھے اور انھوں نے اسی رزق کو دیکھ کر بارگاہِ الٰہی میں صاحبِ فضیلت لڑکا پیدا ہونے کی دعا کی تھی، اسی طرح ہم موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کے معاملہ میں دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر وحی نازل فرمائی کہ تم اپنے اس بچہ کو دریا میں ڈال دو اور ساتھ ہی ان کو اطلاع دی کہ میں اس کو تمہاری جانب واپس کروں گا اور اس کو "نبی مرسل" بناؤں گا، پس کون شک کر سکتا ہے کہ یہ "نبوت" کا معاملہ نہیں ہے معمولی عقل و شعور رکھنے والا آدمی بھی بآسانی یہ سمجھ سکتا ہے کہ اگر موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ شرفِ نبوت سے وابستہ نہ ہوتا اور محض خواب کی بناء پر یا دل میں پیدا شدہ وسوسہ کی وجہ سے وہ ایسا کرتیں تو ان کا یہ عمل نہایت ہی مجنونانہ اور متہورانہ ہوتا اور اگر آج ہم میں سے کوئی ایسا کر بیٹھے تو ہمارا یہ عمل یا گناہ قرار پائے گا اور یا ہم کو مجنوں اور پاگل کہا جائے گا

اور علاج کے لیے پاگل خانہ بھیج دیا جائے گا، یہ ایک ایسی صاف اور واضح بات ہے جس میں شک و شبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تب یہ کہنا قطعاً درست ہے کہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کا موسیٰؑ کو دریا میں ڈالدینا اسی طرح وحیِ الٰہی کی بنا پر تھا جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے رؤیا (خواب) میں اپنے بیٹے (اسمٰعیل علیہ السلام) کا ذبح کرنا بذریعہ وحی معلوم کر لیا تھا اس لیے کہ اگر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نبی نہ ہوتے اور ان کے ساتھ وحیِ الٰہی کا سلسلہ وابستہ نہ ہوتا اور پھر وہ یہ عمل محض ایک خواب یا نفس میں پیدا شدہ ظن کی وجہ سے کر گذرتے تو ہر شخص ان کے اس عمل کو یا گناہ سمجھتا یا انتہائی جنون یقین کرتا تو اب بغیر کسی تردد کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ام موسیٰ (علیہا السلام) نبی تھیں۔

علاوہ ازیں حضرت مریم (علیہا السلام) کی نبوت پر ایک یہ دلیل بھی پیش کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ کھٰیٰعص میں اُن کا ذکر انبیاء علیہم السلام کے زمرہ میں کیا ہے اور اس کے بعد ارشاد فرمایا ہے "أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ مِنْ ذُرِّيَّةِ آدَمَ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوحٍ" (یہی ہیں وہ انبیاء آدم کی نسل سے اور ان میں سے جن کو ہم نے نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار کیا جن پر اللہ کا انعام و اکرام ہوا) تو آیت کے اس عموم میں مریم (علیہا السلام) کی تخصیص کر کے ان کو انبیاء کی فہرست میں سے الگ کر لینا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

رہی یہ بات کہ قرآن نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مریم (علیہا السلام) کے لیے یہ کہا ہے "وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ" تو یہ لقب اُن کی نبوت کے لیے اسی طرح مانع نہیں جس طرح حضرت یوسف (علیہ السلام) کے نبی اور رسول ہونے کے لیے یہ آیت مانع نہیں: "يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ" اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ (وباللہ التوفیق)

اب حضرت سارہ، حضرت مریم، حضرت ام موسیٰ (علیہن السلام) کے مسئلۂ نبوت

لہ نبی کا خواب بھی وحی ہوتا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ایک حدیث میں ایسا ہی فرمایا ہے۔

کے ساتھ فرعون کی بیوی (آسیہ) کو بھی شامل کر لیجئے اس لیے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: کمل من الرجال کثیر ولم یکمل من النساء الا مریم بنت عمران وآسیة بنت مزاحم امراءة فرعون (اوکما قال علیہ السلام)[1] یعنی مردوں میں سے تو بہت سے آدمی کامل ہوئے ہیں مگر عورتوں میں سے صرف یہی دو کامل ہوئیں مریم بنت عمران اور آسیہ بنت مزاحم زوجۂ فرعون۔

اور واضح رہے کہ مردوں میں یہ درجۂ کمال بعض رسولوں (علیہم السلام) ہی کو حاصل ہوا ہے اور اگرچہ ان کے علاوہ انبیاء و رسل بھی درجۂ نبوت و رسالت پر مامور ہیں لیکن ان مرسلینِ کاملین کے درجہ سے نازل ہیں، اس لیے حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن عورتوں کو منصبِ نبوت سے سرفراز فرمایا ہے ان میں صرف ان دو عورتوں کو ہی درجۂ کمال تک پہنچنے کی فضیلت حاصل ہے کیونکہ حدیث میں جس درجۂ کمال کا ذکر ہو رہا ہے جو نبی بھی اس درجہ سے نازل ہے وہ کامل نہیں ہے۔

بہرحال اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ اگرچہ بعض عورتیں بہ نصِ قرآن نبی ہیں لیکن ان میں سے ان دو عورتوں کو ہی درجۂ کمال حاصل ہوا۔ درجات کے اس فرق کو خود قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے: "تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ" حقیقت یہ ہے کہ کامل اس کو کہا جاتا ہے جس کی نوع میں سے کوئی دوسرا اس کا ہمسر نہ ہو، پس مردوں میں سے ایسے کامل خدا کے چند ہی رسول ہوئے ہیں جن کی ہمسری دوسرے انبیاء و رسل کو عطا نہیں ہوئی اور بلاشبہ ان ہی کاملین میں سے ہمارے پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ابراہیم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) ہیں جن کے متعلق نصوصِ (قرآن و حدیث) نے ان فضائلِ کمال کا اظہار کیا ہے جو دوسرے انبیاء و رسل کو حاصل نہیں ہیں اسی طرح عورتوں میں سے یہی درجۂ کمال کو

---

[1] بخاری میں الفاظِ حدیث یہ ہیں: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمل من الرجال کثیر ولم یکمل من النساء الا آسیة امراءة فرعون ومریم بنت عمران وان فضل عائشة علی النساء کفضل الثرید علی سائر الطعام۔

پہنچی ہیں جن کا ذکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں کیا ہے۔[1]

ابن حزم (رحمہ اللہ) کے اس طویل مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر وحی کے اُن معانی کو نظر انداز کر کے جن کا اطلاق بلحاظِ عموم لغت جبلت یا نفس میں ظن ووہم کے درجہ کا القاء و الہام پر ہوتا ہے "وہ اصطلاحی معنی لیے ہیں جن کو قرآن نے انبیاء و رُسُل کے لیے مخصوص کیا ہے تو اسکی دو صورتیں ہیں ایک وہ (وحی) جس کا منشاء مخلوقِ خدا کی رشد و ہدایت اور تعلیم اوامر و نواہی سے ہو۔ اور دوسری یہ کہ خدائے تعالیٰ کسی شخص سے براہِ راست یا فرشتہ کے واسطہ سے اس قسم کا خطاب کرے کہ جس سے بشارات دینا، کسی ہونے والے واقعہ کی ہونے سے قبل اطلاع دینا، یا خاص اس کی ذات کے لیے کوئی امر و نہی فرمانا مقصود ہو' اب اگر پہلی صورت ہے تو یہ "نبوۃ مع الرسالۃ" ہے اور بالاتفاق سب کے نزدیک یہ درجہ صرف مردوں کے ساتھ ہی مخصوص ہے جیسا کہ سورۂ النحل کی آیت سے واضح ہے اور اس مسئلہ میں قطعاً دو رائے نہیں ہیں[2]۔

اور اگر وحیِ الٰہی کی دوسری شکل ہے تو ابن حزمؒ اور اُن کے مؤیدین علماء کی رائے میں یہ بھی نبوت ہی کی ایک قسم ہے کیونکہ قرآنِ عزیز نے سورۂ شوریٰ میں انبیاء علیہم السلام پر نزولِ وحی کے جو طریقے بیان کیے ہیں وہ اس وحی پر بھی صادق آتے ہیں۔ سورۂ شوریٰ یہ ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ	اور کسی انسان کے لیے یہ صورت ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے
اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ	(بالمشافہ) گفتگو کرے مگر یا وحی کے ذریعہ یا پسِ پردہ کلام کے ذریعہ
اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ	اور یا اس صورت سے کہ اللہ کسی فرشتہ کو پیغامبر بنا کر بھیجے اور وہ
مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۝	اس کی اجازت سے جس کو کہ وہ چاہے اس بشر کو وحی لا کر سنا دے
(سورۂ شوریٰ پ ۲۵ ع ۵)	بلاشبہ وہ بلند و بالا حکمت والا ہے۔

---

[1] الفصل فی الملل والاہواء والنحل مطبوعہ مصر ۱۳۴۷ھ ج ۵ ص ۱۴-۱۳-۱۲ - یہ بحث فتح الباری ج ۶ ص ۳۴۸ ۳۴۷ و ۳۶۸ مطبوعہ مصر میں بھی قابلِ مراجعت ہے۔

[2] یہاں نبی اور رسولوں کے اس فرق کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جو علمِ کلام کی خاص اصطلاح ہے کیونکہ قرآن کثرت کے ساتھ نبی اور رسول کو مرادف معنی میں استعمال کرتا ہے۔

اور جبکہ قرآن نے وحی کی اس دوسری قسم کا اطلاق بہ نصِ صریح حضرتِ مریمؑ حضرتِ سارہ، حضرتِ اُمِ موسیٰ اور حضرتِ آسیہ (علیہن السلام) پر کیا ہے جیسا کہ سورۂ ہودؑ قصص اور مریم سے ظاہر ہوتا ہے تو ان مقدس عورتوں پر "نبی کا اطلاق" قطعاً صحیح ہے اور اس کو بدعت کہنا سرتاسر غلط ہے۔

ابنِ حزم (رحمہ اللہ) کے مؤید علماء نے اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے اس شبہ کا جواب بھی دیا ہے "کہ قرآن نے جس طرح صاف الفاظ میں مرد انبیاء کو نبی اور رسول کہا ہے اس طرح ان عورتوں میں سے کسی کو نہیں کہا" جواب کا حاصل یہ ہے کہ جبکہ "نبوۃ مع الرسالۃ" جو کہ مردوں کے لیے ہی مخصوص ہے کائناتِ انسانی کی رشد و ہدایت اور تعلیم و تبلیغ نوعِ انسانی سے متعلق ہوتی ہے تو اس کا قدرتی تقاضہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس شخص کو اس شرف سے ممتاز فرمایا ہے اس کے متعلق وہ صاف صاف اعلان کرے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا نبی اور رسول ہے، تاکہ اُمت پر اس کی دعوت و تبلیغ کا قبول کرنا لازم ہو جائے اور خدا کی حجت پوری ہو، اور چونکہ نبوت کی وہ قسم جس کا اطلاق عورتوں پر بھی ہوتا ہے خاص اس ہستی سے وابستہ ہوتی ہے جس کو یہ شرف ملا ہے تو اس کے متعلق صرف یہی اظہار کر دینا کافی ہے کہ جو وحی من اللہ انبیاء و رسل کے لیے ہی مخصوص ہے اُس سے ان چند عورتوں کو بھی مشرف کیا گیا ہے۔

عورتوں کی نبوت کے اثبات و انکار کے علاوہ تیسری رائے ان علماء کی ہے جو اِس مسئلہ میں "سکوت اور توقف" کو ترجیح دیتے ہیں ان میں شیخ تقی الدین سبکی (رحمہ اللہ) نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، فتح الباری میں اُن کا یہ قول مذکور ہے:۔

قال السبکی اختلف فی ھذہ	سبکی فرماتے ہیں "اس مسئلہ میں علماء کی آراء
المسئلۃ ولم یصح عندی فی	مختلف ہیں اور میرے نزدیک اس بارہ میں
ذلک شیء الخ [1]	اِثباتاً یا نفیاً کوئی بات ثابت نہیں ہے۔

[1] فتح الباری ج ۶ کتاب الانبیاء۔

کیا حضرتِ مریمؑ نبی ہیں

اِس تفصیل سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کی نبوت کے انکار پر امام الحرمین کا دعوائے اجماع صحیح نہیں ہے نیز یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ فہرستِ انبیاء میں مسطورۂ بالا دوسری مقدس عورتوں کے مقابلہ میں حضرتِ مریمؑ کی نبوت کے متعلق قرآنی نصوص زیادہ واضح ہیں، یہی وجہ ہے کہ امام شعرانی، ابن حزم اور قرطبی (رحمہم اللہ) کے درمیان حضرتِ مریمؑ کے علاوہ نبیات کی فہرست کے بارہ میں خاصہ اختلاف نظر آتا ہے[1] اور حضرتِ مریمؑ کی نبوت کے متعلق تمام مثبتینِ نبوت کا اتفاق ہے۔

ہم کو ابن کثیر (رحمہ اللہ) کے اس دعویٰ سے بھی اختلاف ہے کہ جمہور، انکار کی جانب ہیں، البتہ اکثریت غالباً سکوت اور توقف کو پسند کرتی ہے۔

آیت "وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ" کا مطلب

جو علماء عورتوں میں نبوت کے قائل ہیں اور حضرتِ مریم (علیہا السلام) کو نبی تسلیم کرتے ہیں، ان کے مسلک کے مطابق تو آیت "وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ" کا مطلب صاف اور واضح ہے وہ یہ کہ حضرتِ مریمؑ کو کائنات کی تمام عورتوں پر فضیلت حاصل ہے، جو عورتیں نبی نہیں ہیں اُن پر اس لیے کہ مریم (علیہا السلام) نبی ہیں اور جو عورتیں نبی ہیں اُن پر اس لیے کہ وہ اُن قرآنی نصوص کے پیشِ نظر جو اُن کے فضائل و کمالات سے تعلق رکھتی ہیں باقی نبیات پر برتری رکھتی ہیں۔

لیکن جو علماء عورتوں کی نبوت کا انکار فرماتے ہیں اور حضرتِ مریمؑ کو "نبیہ" نہیں تسلیم کرتے وہ اس آیت کی مراد میں دو جُدا جُدا خیال رکھتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ آیت کا جُملہ "نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ" عام ہے اور ماضی، حال اور مستقبل کی تمام عورتوں کو شامل ہے۔ اس لیے بلا شبہ حضرتِ مریمؑ کو بغیر کسی استثناء کے کائناتِ انسانی کی تمام عورتوں پر فضیلت و برتری حاصل ہے اور اکثر کا قول یہ ہے کہ آیت کے لفظ "العٰلمین" سے کائنات کی وہ تمام عورتیں مراد ہیں جو حضرتِ مریم (علیہا السلام) کی معاصر تھیں۔ یعنی قرآن عزیز حضرتِ مریم (علیہا السلام) کے زمانہ کا واقعہ نقل کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ بشارت دی کہ وہ اپنے زمانہ کی تمام

[1] فتح الباری ج ۶ ص [illegible]

عورتوں میں برگزیدہ اور صاحبِ کمال ہیں اور ہم نے ان سب میں سے اُن کو چُن لیا ہے اور "العلمین" کا یہ اطلاق وہی حیثیت رکھتا ہے جو حضرتِ موسیٰؑ کی اُمت (بنی اسرائیل) کے لیے اس آیت میں اختیار کی گئی ہے:-

وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (دخان پ ۲۵ ع ۲) اور بلاشبہ ہم نے اپنے علم سے اُن (بنی اسرائیل) کو جہان والوں کے مقابلہ میں پسند کرلیا ہے۔

اور جبکہ باتفاقِ آرا بنی اسرائیل کی فضیلت کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ "العلمین" سے اُن کی معاصر اُمم و اقوام مراد ہیں کہ اُن میں سے اُمتِ موسیٰ علیہ السلام کو فضیلت حاصل ہے تو حضرتِ مریم (علیہا السلام) کی فضیلت کے باب میں بھی یہی معنی مراد لینے چاہئیں۔

حضرتِ مریمؑ کا تقدس اور تقویٰ و طہارت حضرتِ عیسیٰؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر کی والدہ ہونے کا شرف، مرد کے ہاتھ لگائے بغیر معجزہ کے طور پر اُن کے مشکوئے معلّٰی سے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی ولادتِ باسعادت بلاشبہ ایسے امور ہیں جن کی بدولت اُن کو معاصر عورتوں پر فضیلت و برتری حاصل تھی۔

پھر یہ حقیقت بھی فراموش نہیں ہونی چاہئے کہ بابِ فضیلت ایک وسیع باب ہے اور جس طرح کسی شے کی حقیقت بیان کرنے میں بلیغ اور عمدہ طریقِ بیان یہ ہے کہ وہ جامع و مانع ہو یعنی اس کی حقیقت پر اس طرح حاوی ہو کہ تمام دوسری چیزوں سے ممتاز ہو جائے، نہ ایسی کمی رہ جائے کہ اصل حقیقت پوری طرح بیان نہ ہو سکے اور نہ ایسا اضافہ ہو کہ بعض دوسری حقائق بھی اس کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ اسی طرح اس کے برعکس بیانِ فضیلت کے لئے فصاحت و بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو بیانِ حقیقت کی طرح حدود و قیود میں نہ جکڑ دیا جائے کیونکہ اس مقام پر حقیقتِ شے نہیں بلکہ فضیلتِ شے کا اظہار ہو رہا ہے جو اگر اسی طرح کے دوسرے افراد پر بھی صادق آجائے تو بیانِ حقیقت کی طرح اس میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا بلکہ اس موقع پر وسعتِ بیان ہی از بس ضروری ہوتا ہے تاکہ مخاطب کے دل میں اظہارِ فضیلت

سے جو نفسیاتی اثر پیدا کرتا ہے وہ دل نشین اور مؤثر ہو سکے۔

تو ایسی صورت میں "عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ" کے معنی یہ نہیں ہوں گے کہ حضرتِ مریم علیہا السلام کے علاوہ دوسری کوئی مقدس عورت اس شرف کو نہیں پہنچ سکتی یا نہیں پہنچی بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ حضرتِ مریمؑ کو فضائل و کمالات میں بلند سے بلند مرتبہ حاصل ہے "بابِ فضائل" کی یہی وہ حقیقت ہے جس کے فراموش کر دینے پر فضائلِ صحابہ وغیرہ میں اکثر ہم کو لغزش ہو جاتی اور چند مقدس اشخاص سے متعلق فضائل کے مابین تضاد و تناقض نظر آنے لگتا ہے، البتہ ان فضائل کی حدود سے گذر کر جب ہم صاحبِ فضائل افراد کے انفرادی و اجتماعی اعمال کا جائزہ لے کر فرقِ مراتب بیان کرتے ہیں تو وہ ضرور ایک دوسرے کے لئے حدِ فاصل ثابت ہوتے ہیں مثلاً حضراتِ صحابہ و صحابیات کے فضائل کے پیشِ نظر فرقِ مراتب کا صحیح فیصلہ جب ہی ممکن ہو سکتا ہے کہ اُن کے اُن فضائل کے ساتھ ساتھ جو زبانِ وحی ترجمان سے نکلے ہیں ان سے متعلق خصوصی ارشاداتِ قرآنی و حدیثی' اُن کی اسلامی خدمات' اسلام سے متعلق ان کی سرفروشیاں و جاں سپاریاں' نصرتِ حق میں مالی فداکاریاں' اسلام کے نازک ترین لمحات میں ان کے علم و تدبر کی عقدہ کشائیاں اور ان کی علمی جدوجہد کی رفیع سرگرمیاں ان سب کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جائے۔

حضرت عیسٰی (علیہ السلام) اور بشاراتِ کتبِ سابقہ

ادیان و ملل کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دینِ حق اور ملتِ بیضا کی تبلیغ و دعوت کا سلسلہ اگرچہ آدم (علیہ السلام) سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک برابر جاری رہا ہے لیکن اس سلسلہ کو مزید قوت پہنچانے اور سربلند کرنے کے لئے سنۃ اللہ یہ رہی ہے کہ صدیوں بعد ایک ایسے اولوالعزم اور جلیل القدر پیغمبر کو بھیجے جو امتدادِ زمانہ کی وجہ سے پیدا شدہ عام روحانی اضمحلال کو دور کر کے قبولِ حق کے افسردہ رجحانات میں تازگی بخشے اور ضعیف روحانی عواطف کو قوی سے قوی تر بنا دے گویا مذہب کی خوابیدہ دنیا میں حق و صداقت کا صور پھونک کر ایک انقلابِ عظیم

بپا کردے اور مُردہ دلوں میں نئی روح ڈال دے اور اکثر ایسا ہوتا رہا ہے کہ جن اقوام و امم میں اُس عظیم المرتبہ پیغمبر کی بعثت ہونے والی ہوتی ہے صدیوں پہلے ان کے ہادیانِ ملت اور داعیانِ حق (انبیاء علیہم السلام) اس مقدس رسول کی آمد کی بشارات وحیِ الٰہی کے ذریعہ سناتے رہتے ہیں تاکہ اس کی دعوتِ حق کے لئے زمین ہموار رہے اور جب اس نورِ حق کے روشن ہونے کا وقت آجائے تو ان اقوام و امم کے لیے اُس کی آمد غیر متوقع حادثہ نہ بن جائے۔

حضرتِ عیسٰی (علیہ السلام) بھی اُن چند اولوا العزم، جلیل القدر اور مقدس رسولوں میں سے ایک ہیں اور اسی بناء پر انبیاء بنی اسرائیل میں سے متعدد انبیاء علیہم السلام اُن کی آمد سے قبل ان کے حق میں منادی کرتے اور آمد کی بشارت سُناتے نظر آتے ہیں اور ان ہی بشارات کی وجہ سے بنی اسرائیل مدتِ مدید سے منتظر تھے کہ مسیح موعود کا ظہور ہو تو ایک مرتبہ وہ پھر حضرتِ موسٰی (علیہ السلام) کے زمانہ کی طرح اقوامِ عالم میں معزز و ممتاز ہوں گے۔ اور رشد و ہدایت کی خشک کھیتی میں روحِ تازہ پیدا ہوگی۔ اور خدا کے جاہ و جلال سے اُن کے قلوب ایک مرتبہ پھر چمک اُٹھیں گے۔ بائیبل (توراۃ و انجیل) اپنی لفظی و معنوی تحریفات کے باوجود آج بھی اُن چند بشارات کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھتی ہے جو حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کی آمد سے تعلق رکھتی ہیں۔ توراۃ استثناء میں ہے:۔

اور اس موسٰی نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر (ساعیر) سے اُن پر طلوع ہوا، اور فاران کے پہاڑوں سے جلوہ گر ہوا۔ (باب ۳۳۔ آیت ۲۰)

اس بشارت میں سینا سے خدا کی آمد "حضرتِ موسٰی (علیہ السلام) کی نبوت کی جانب اشارہ ہے اور "ساعیر سے طلوع ہونا" نبوتِ عیسٰی (علیہ السلام) مُراد ہے، کیونکہ انکی ولادتِ باسعادت اسی پہاڑ کے ایک مقام "بیت اللحم" میں ہوئی ہے اور یہی وہ مُبارک جگہ ہے جہاں سے نورِ حق طلوع ہوا اور "فاران پر جلوہ گر ہونا" آفتابِ رسالت کی بعثت کا اعلان ہے کیونکہ فاران، حجاز کے مشہور پہاڑی سلسلہ کا نام ہے۔[۱]

[۱] تفصیل اپنے موقعہ پر آئے گی۔

اور حضرت یسعیاہ نبی (علیہ السلام) کے صحیفہ میں ہے:-

"دیکھ میں اپنا پیغمبر تیرے آگے بھیجتا ہوں جو تیری راہ تیار کرے گا، بیابان میں پکارنے والے کی آواز آتی ہے کہ خداوند کی راہ تیار کرو، اس کے راستے سیدھے بناؤ۔"[1]

اس بشارت میں "پیغمبر" سے عیسیٰ (علیہ السلام) مراد ہیں اور بیابان میں پکارنے والے حضرت یحییٰ علیہ السلام ہیں جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے منادی تھے اور ان کی بعثت سے قبل بنی اسرائیل میں اُن کی بعثت و رسالت کا مژدۂ جانفزا سناتے تھے۔

اور متی کی انجیل میں ہے:-

"جب یسوع، ہیرودیس بادشاہ کے زمانہ میں یہودیہ کے بیت لحم میں پیدا ہوا تو دیکھو کئی مجوس پورب سے یروشلم میں یہ کہتے ہوئے آئے کہ یہودیوں کا بادشاہ جو پیدا ہوا ہے وہ کہاں ہے؟ ...... یہ سُن کر ہیرودیس بادشاہ اور اس کے ساتھ یروشلم کے سب لوگ گھبرائے اور اس نے قوم کے سب سردار کاہنوں اور فقیہوں کو جمع کر کے اُن سے پوچھا کہ مسیح کی پیدائش کہاں ہونی چاہیے؟ انھوں نے اس سے کہا کہ یہودیہ کے بیت لحم میں کیونکہ نبی (یسعیاہ علیہ السلام) کی معرفت یوں لکھا گیا ہے، اے بیت لحم یہوداہ کے علاقہ: تو یہوداہ کے حاکموں میں ہرگز سب سے چھوٹا نہیں کیونکہ تجھ میں سے ایک سردار نکلے گا جو میری اُمتِ اسرائیل کی گلہ بانی کرے گا۔"[2]

اور دوسری جگہ ہے:-

اور جب وہ یروشلم کے نزدیک پہنچے اور زیتون کے پہاڑ پر بیت فگے کے پاس آئے تو یسوع نے دو شاگردوں کو یہ کہہ کر بھیجا کہ اپنے سامنے کے گاؤں میں جاؤ وہاں پہنچتے ہی ایک گدھی بندھی ہوئی اور اس کے ساتھ بچہ تمھیں ملے گا انھیں کھول کر میرے پاس لے آؤ اور اگر کوئی تم سے کچھ کہے تو کہنا کہ یہ خداوند کو درکار ہیں وہ فی الفور انھیں بھیجدیگا یہ اس لیے ہوا کہ جو نبی کی معرفت کہا گیا تھا وہ پورا ہو کہ صیہون کی بیٹی سے کہو کہ دیکھ تیرا

[1] باب ۴۰ آیات ۸-۳۔ [2] باب ۲۔ آیات ۶-۱۔

بادشاہ تیرے پاس آتا ہے وہ حلیم ہے اور گدھے پر سوار ہے بلکہ لادو بچہ پر۔[۱]

اور یوحنا کی انجیل میں ہے :۔

اور یوحنا (یحیٰی علیہ السلام) کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کے لیے اس (یحیٰی علیہ السلام) کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں، انھوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے، اس نے کہا میں نہیں ہوں، کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا نہیں، پس انھوں نے اس سے کہا پھر تو ہے کون؟ تاکہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں کہ تو اپنے حق میں کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا میں جیسا کہ یشعیاہ نبی نے کہا ہے بیابان میں پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ سیدھی کرو۔[۲]

اور مرقس اور لوقا کی انجیلوں میں ہے :۔

وہ لوگ منتظر تھے اور سب اپنے اپنے دل میں یوحنا (یحیٰی علیہ السلام کی بابت سوچتے تھے کہ آیا وہ مسیح تھے یا نہیں تو یوحنا (یحیٰی علیہ السلام) نے اُن سب کے جواب میں کہا: میں تو تمھیں بپتسمہ دیتا ہوں مگر جو مجھ سے زور آور ہے وہ آنے والا ہے میں اس کی جوتی کا تسمہ کھولنے کے لایق نہیں، وہ تمھیں روح القدس سے بپتسمہ دے گا۔[۳]

اِن ہر دو بشارات سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہود اپنی مذہبی روایات کی بنا پر جن اولوا العزم پیغمبروں کی بعثت کے منتظر تھے ان میں مسیح علیہ السلام بھی تھے اور حضرت یحیٰی (علیہ السلام) نے اُن کو بتایا کہ وہ نہ ایلیا ہیں نہ وہ نبی اور نہ مسیح (علیہم السلام) بلکہ مسیح علیہ السلام کی بعثت کے منادا اور مُبشر ہیں۔

قرآنِ عزیز نے بھی حضرتِ زکریا اور حضرتِ یحیٰی (علیہما السلام) کے واقعہ کو

---

[۱] باب ۲ - آیات ۶-۱ - [۲] باب ۱ - آیات ۲۳ - ۱۹ - [۳] لوقا باب ۲ - ایات ۱۶ - ۱۵ - [۴] عہد - مرجدید (انجیل) میں یوحنا دو جُداجُدا شخصیتیں ہیں ایک یحیٰی علیہ السلام اور دوسری عیسیٰ علیہ السلام کے حواری اور شاگرد۔

حضرتِ عیسٰی علیہ السلام کی بعثت کی تمہید قرار دیا ہے اور یحیٰی (علیہ السلام) کو حضرتِ عیسٰی (علیہ السلام) کا مُبشر اور منادبتایا ہے۔ آلِ عمران میں ہے:۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ	پس فرشتوں نے اُس (زکریا) کو اس وقت پکارا
يُّصَلِّيْ فِى الْمِحْرَابِ اَنَّ اللّٰهَ	جبکہ وہ حجرہ میں کھڑا ہوا نماز پڑھ رہا تھا بیشک
يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا	اللہ تعالیٰ تجھ کو یحیٰی (فرزند) کی بشارت دیتا ہے، جو
بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ ۔ (پ ۳ ع ۲)	اللہ کے کلمہ (عیسٰی علیہ السلام) کی تصدیق کرے گا۔

ولادتِ مُبارک | عابد و زاہد اور عفت مآب مریم (علیہا السلام) اپنے خلوت کدہ میں مشغولِ عبادت رہتی اور ضروری حاجات کے علاوہ کبھی اس سے باہر نہیں نکلتی تھیں، ایک مرتبہ مسجدِ اقصٰی (ہیکل) کے مشرقی جانب لوگوں کی نگاہوں سے دور کسی ضرورت سے ایک گوشہ میں تنہا بیٹھی تھیں کہ اچانک خدا کا فرشتہ (جبرئیل) انسانی شکل میں ظاہر ہوا۔ حضرتِ مریمؑ نے ایک اجنبی شخص کو اس طرح بے حجاب سامنے دیکھا تو گھبرا گئیں اور فرمانے لگیں "اگر تجھ کو کچھ بھی خدا کا خوف ہے تو میں خدائے رحمان کا واسطہ دے کر تجھ سے پناہ چاہتی ہوں" فرشتے نے کہا: "مریم! خوف نہ کھا، میں انسان نہیں بلکہ خدا کا فرستادہ فرشتہ ہوں اور تجھ کو بیٹے کی بشارت دینے آیا ہوں" حضرتِ مریمؑ نے یہ سُنا تو ازراہِ تعجب فرمانے لگیں: میرے لڑکا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ مجھ کو آج تک کسی بھی شخص نے ہاتھ نہیں لگایا اس لیے کہ نہ تو میں نے نکاح کیا ہے اور نہ میں زانیہ ہوں" فرشتہ نے جواب دیا: میں تو تیرے پروردگار کا قاصد ہوں اُس نے مجھ سے اِسی طرح کہا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ میں اس لیے کروں گا کہ تجھ کو اور تیرے لڑکے کو کائنات کے لیے اپنی قدرتِ کاملہ کے اعجاز کا "نشان" بنا دوں[1] اور لڑکا میری جانب سے "رحمۃ" ثابت ہوگا اور میرا یہ فیصلہ اٹل ہے۔ مریم! اللہ تعالیٰ تجھ کو ایک ایسے لڑکے کی بشارت دیتا ہے جو اس کا "کلمہ" ہوگا اُس کا لقب مسیح[2] اور اُس کا نام

---

[1] یعنی توالد و تناسل کے عام قانون سے جدا قانونِ اعجاز کے مطابق محض حکمِ الٰہی اور ارادۂ باری سے ہی رحمِ مریم میں وجود پذیر ہو جائے گا۔ [2] مسیح بمعنی مُبارک یا سیاح جس کا کوئی گھر نہ ہو۔

عیسیٰ (یسوع) ہوگا اور وہ دنیا اور آخرت دونوں میں باوجاہت اور صاحبِ عظمت رہے گا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقربین میں سے ہوگا' وہ اللہ تعالیٰ کے نشان کے طور پر بحالتِ شیرخوارگی لوگوں سے باتیں کرے گا اور سنِ کہولت (بڑھاپے کا ابتدائی دور) بھی پائے گا تاکہ کائنات کی رشد و ہدایت کی خدمت کی تکمیل کرے اور یہ سب کچھ اس لیے ضرور ہو کر رہے گا کہ اللہ تعالیٰ کا قانونِ قدرت یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کو وجود میں لانا چاہتا ہے تو اس کا محض یہ ارادہ اور حکم کہ "ہوجا" اس شے کو نیست سے ہست کر دیتا ہے لہٰذا یہ یوں ہی ہو کر رہے گا اور اللہ تعالیٰ اس کو اپنی کتاب عطا کرے گا' اس کو حکمت سکھائے گا اور اُس کو بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لیے رسول اور اولوالعزم پیغمبر بنائے گا۔

قرآن عزیز نے ان واقعات کا معجزانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ سورۂ آلِ عمران اور سورۂ مریم میں اس طرح ذکر کیا ہے۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ	(وہ وقت قابل ذکر ہے) جب فرشتوں نے مریم
يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ	سے کہا: اے مریم! اللہ تعالیٰ تجھ کو اپنے کلمہ کی بشارت
عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا	دیتا ہے اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا وہ دنیا
وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ وَ	و آخرت میں صاحب وجاہت اور ہمارے مقربین میں
يُكَلِّمُ النَّاسَ فِى الْمَهْدِ وَكَهْلًا	سے ہوگا اور وہ (ماں کی) گود میں اور کہولت کے
وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى	زمانہ میں لوگوں سے کلام کرے گا اور وہ نکوکاروں میں
يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ ۭ	سے ہوگا۔ مریم نے کہا: میرے لڑکا کیسے ہو سکتا ہے
قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۭ	جبکہ مجھ کو کسی مرد نے ہاتھ تک نہیں لگایا فرشتہ نے کہا
اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ	"اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے اسی طرح پیدا کر دیتا ہے، وہ
كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ	جب کسی شے کے لیے حکم کرتا ہے تو کہہ دیتا ہے "ہوجا"
وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ	اور وہ ہوجاتی ہے" اور اللہ اُس کو کتاب و حکمت اور توراۃ

وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۵

(سورۂ آل عمران پ ۳ ع ۵)

وانجیل کا علم عطا کرے گا اور وہ بنی اسرائیل کی جانب اللہ کا رسول ہوگا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۙ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۫ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ۝ قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۝ قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۝ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ۝ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ۝

(سورۂ مریم پ ۱۶ ع ۲)

اور اے پیغمبر! کتاب میں مریم کا واقعہ ذکر کرو اس وقت کا ذکر جب وہ ایک جگہ پورب کی طرف تھی اپنے گھر کے آدمیوں سے الگ ہوئی پھر اس نے ان لوگوں کی طرف سے پردہ کر لیا، پس ہم نے اس کی طرف اپنا فرشتہ بھیجا اور وہ ایک بھلے چنگے آدمی کے روپ میں نمایاں ہوگیا مریم اسے دیکھ کر گھبرا گئی، وہ بولی اگر تو نیک آدمی ہے تو میں خدائے رحمان کے نام پر تجھ سے پناہ مانگتی ہوں۔ فرشتے نے کہا: میں تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں اور اس لیے نمودار ہوا ہوں کہ تجھے ایک پاک فرزند دے دوں۔ مریم بولی "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے لڑکا ہو حالانکہ کسی مرد نے مجھے چھوا نہیں اور نہ میں بدچلن ہوں؟" فرشتے نے کہا: "ہوگا ایسا ہی" تیرے پروردگار نے فرمایا کہ یہ میرے لیے کچھ مشکل نہیں وہ کہتا ہے یہ اس لیے ہوگا کہ اس (مسیح) کو لوگوں کے لیے ایک نشان بنادوں اور میری رحمت کا اس میں ظہور ہو اور یہ ایسی بات ہے جس کا ہونا طے ہو چکا ہے۔

جبرئیل امین نے مریم (علیہا السلام) کو یہ بشارات سنا کر ان کے گریبان میں پھونک دیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا کلمہ ان تک پہنچ گیا۔ مریم (علیہا السلام) نے کچھ عرصہ کے بعد خود کو حاملہ محسوس کیا تو بہ تقاضائے بشری ان پر ایک اضطرابی کیفیت طاری ہوگئی اور اس

کیفیت نے اُس وقت شدید صورت اختیار کرلی جب انھوں نے دیکھا کہ مدتِ حمل ختم ہو کر ولادت کا وقت قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے، انھوں نے سوچا کہ اگر یہ واقعہ قوم کے اندر رہ کر پیش آیا تو چونکہ وہ حقیقتِ حال سے واقف نہیں ہے اس لیے نہیں معلوم وہ کس کس طرح بدنام اور بہتان طرازیوں کے ذریعہ کس درجہ پریشان کرے اس لیے مناسب یہ ہے کہ لوگوں سے دور کسی جگہ چلے جانا چاہیے، یہ سوچ کر وہ یروشلم (بیت المقدس) سے تقریباً نو میل کوہِ سراۃ (ساعیر) کے ایک ٹیلہ پر چلی گئیں جو اَب بیت اللحم کے نام سے مشہور ہے، یہاں پہنچ کر چند روز بعد دَردِ زِہ شروع ہوا تو تکلیف و اضطراب کی حالت میں کھجور کے ایک درخت کے نیچے تنے کے سہارے بیٹھ گئیں اور پیش آنے والے نازک حالات کا اندازہ کر کے انتہائی قلق اور پریشانی کی حالت میں کہنے لگیں "کاش کہ میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی اور میری ہستی کو لوگ یک قلم فراموش کر چکے ہوتے" تب نخلستان کے نشیب سے خدا کے فرشتہ نے پھر پکارا "مریمؑ! غمگین نہ ہو، تیرے پروردگار نے تیرے تلے نہر[1] جاری کر دی ہے، اور کھجور کا تنہ پکڑ کر اپنی جانب ہلا تو پکے اور تازہ خوشے تجھ پر گرنے لگیں گے پس تو کھا پی اور اپنے بچہ کے نظارہ سے آنکھیں ٹھنڈی کر اور رنج و غم کو بھول جا۔"

حضرتِ مریمؑ (علیہا السلام) پر تنہائی، تکلیف اور نزاکتِ حال سے، جو خوف طاری اور اضطراب پیدا ہو گیا تھا فرشتہ کی تسلی آمیز پکار اور عیسٰیؑ (علیہ السلام) جیسے برگزیدہ بچہ کے نظارہ سے کافور ہو گیا اور وہ عیسٰیؑ (علیہ السلام) کو دیکھ دیکھ کر شاد کام ہونے لگیں۔ تاہم یہ خیال پہلو میں ہر وقت کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا تھا کہ اگرچہ خاندان اور قوم میری عصمت و پاک دامنی سے ناآشنا نہیں ہے پھر بھی اُن کی اِس حیرت کو کس طرح مٹایا جا سکے گا کہ بن باپ کے کس طرح ماں کے پیٹ سے بچہ پیدا ہو سکتا ہے؟

---

[1] سری لغتِ عرب میں نہر کو بھی کہتے ہیں اور بلند ہستی کو بھی، جمہور نے اس جگہ پہلے معنی مراد لیے ہیں' — اور حسن بصری، ربیع بن انس اور ابن اسلم (رحمہم اللہ) سے دوسرے معنی منقول ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے تیرے تلے ایک بلند ہستی پیدا کر دی ہے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۲)

مگر جس خدائے برتر نے اُن کو یہ بزرگی اور برتری بخشی وہ کب ان کو اِس کرب و بے چینی میں مبتلا رہنے دیتا، اس لیے اس نے فرشتہ کے ذریعہ مریم (علیہا السلام) کے پاس پھر یہ پیغام بھیجا کہ جب تو اپنی قوم میں پہنچے اور وہ تجھ سے اس معاملہ کے متعلق سوالات کرے تو خود جواب نہ دینا بلکہ اشارہ سے ان کو بتانا کہ میں روزہ دار ہوں اور اس لیے آج کسی سے بات نہیں کر سکتی تم کو جو کچھ دریافت کرنا ہے اِس بچہ سے دریافت کرلو تب تیرا پروردگار اپنی قدرتِ کاملہ کا نشان ظاہر کرکے اُن کی حیرت کو دُور اور اُن کے قلوب کو مطمئن کردیگا حضرتِ مریم (علیہا السلام) وحی الٰہی کے ان پیغامات پر مطمئن ہو کر بچہ کو گود میں لے بیت المقدس کو روانہ ہوئیں، جب شہر میں پہنچیں اور لوگوں نے اس حالت میں دیکھا تو چہار جانب سے ان کو گھیر لیا اور کہنے لگے "مریم! یہ کیا؟ تو نے تو بہت ہی عجیب بات کر دکھائی اور بھاری تہمت کا کام کرلیا، اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ بُرا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی بدچلن تھی پھر تو یہ کیا کر بیٹھی؟

مریم علیہا السلام نے خدا کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے لڑکے کی جانب اشارہ کر دیا کہ جو کچھ دریافت کرنا ہے اس سے معلوم کرلو میں تو آج روزہ[1] سے ہوں۔ لوگوں نے یہ دیکھ کر انتہائی تعجب کے ساتھ کہا "ہم کس طرح ایسے شیرخوار بچہ سے باتیں کر سکتے ہیں جو ابھی ماں کی گود میں بیٹھنے والا بچہ ہے" مگر بچہ فوراً بول اٹھا "میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ نے (اپنے فیصلۂ تقدیر میں) مجھ کو کتاب (انجیل) دی ہے اور نبی بنایا ہے اور اُس نے مجھ کو مُبارک بنایا خواہ میں کسی حال اور کسی جگہ بھی ہوں، اور اس نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں یہی میرا شعار ہو اور اس نے مجھ کو اپنی ماں کا خدمت گذار بنایا اور خودسر اور نافرمان نہیں بنایا اور اس کی جانب سے مجھ کو سلامتی کا پیغام ہے جس دن کہ میں پیدا ہوا اور جس دن کہ میں مروں گا اور جس دن کہ پھر زندہ اٹھایا جاؤں گا۔" اللہ تعالیٰ نے اِن

---

[1] بنی اسرائیل کے یہاں روزہ میں خاموشی بھی داخلِ عبادت تھی۔

تفصیلات کو سورۂ انبیاء، تحریم اور سورۂ مریم میں ذکر فرمایا ہے :-

وَالَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰیَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ (انبیاء پ ۱۷ ع ۶)

اور اس عورت (مریمؑ) کا معاملہ جس نے اپنی پاکدامنی کو قائم رکھا، پھر ہم نے اس میں اپنی "روح" کو پھونک دیا اور اس کو اور اس کے لڑکے کو جہان والوں کے لیے "نشان" ٹھہرایا ہے۔

وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا (تحریم پ ۲۸)

اور عمران کی بیٹی مریمؑ کہ جس نے اپنی عصمت کو برقرار رکھا پس ہم نے اس میں اپنی روح کو پھونک دیا۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِیًّا ۝ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰی جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا ۝ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِیْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِیًّا ۝ وَهُزِّیْٓ اِلَیْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَیْكِ رُطَبًا جَنِیًّا ۝ فَكُلِیْ وَاشْرَبِیْ وَقَرِّیْ عَیْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَیِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِیْٓ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا ۝ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ۭ

پھر اس ہونے والے فرزند کا حمل ٹھیر گیا وہ (اپنی حالت چھپانے کے لیے) لوگوں سے الگ ہو کر دور چلی گئی پھر اسے دردِ زہ (کا اضطراب) کھجور کے ایک درخت کے نیچے لے گیا (وہ اس کے تنہ کے سہارے بیٹھ گئی) اس نے کہا کاش میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی، میری ہستی کو لوگ یک قلم بھول گئے ہوتے اس وقت (ایک پکارنے والے فرشتے نے) اسے نیچے سے پکارا "غمگین نہ ہو تیرے پروردگار نے تیرے تلے نہر جاری کر دی ہے اور کھجور کے درخت کا تنہ پکڑ کے اپنی طرف ہلا، تازہ اور پکے ہوئے پھلوں کے خوشے تجھ پر گرنے لگیں گے، کھا پی (اور اپنے بچے کے نظارے سے) آنکھیں ٹھنڈی کر، پھر اگر کوئی آدمی نظر آئے (اور پوچھ گچھ کرنے لگے) تو (اشارہ سے) کہہ دے میں نے خدائے رحمان کے حضور روزہ کی منت مان رکھی ہے میں آج کسی آدمی سے بات چیت نہیں کر سکتی" پھر

قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا
فَرِيًّا ۝ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ
اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ
اُمُّكِ بَغِيًّا ۝ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ
قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ
فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝ قَالَ
اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰىنِيَ
الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝
وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا
كُنْتُ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ
وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۝
وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ
جَبَّارًا شَقِيًّا ۝ وَالسَّلٰمُ
عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَ
يَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ
حَيًّا ۝ (سورہ مریم پ ۱۶ ع ۲)

ایسا ہوا کہ وہ لڑکے کو ساتھ لے کر اپنی قوم کے پاس آئی، لڑکا اُس کی گود میں تھا، لوگ (دیکھتے ہی) بول اُٹھے "مریم! تو نے عجیب ہی بات کر دکھائی اور بڑی تہمت کا کام کر گذری، اے ہارون[1] کی بہن! نہ تو تیرا باپ بُرا آدمی تھا نہ تیری ماں بدچلن تھی" (تو یہ کیا کر بیٹھی) اس پر مریمؑ نے لڑکے کی طرف اشارہ کیا (کہ یہ تمہیں بتلا دے گا کہ حقیقت کیا ہے) لوگوں نے کہا: بھلا اس سے ہم کیا بات کریں جو ابھی گود میں بیٹھنے والا شیرخوار بچہ ہے" مگر لڑکا بول اٹھا "میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا، اس نے مجھے بابرکت کیا خواہ میں کسی جگہ ہوں، اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا کہ جب تک زندہ رہوں یہی میرا شعار ہو۔ اس نے مجھے اپنی ماں کا خدمت گذار بنایا، ایسا نہیں کیا کہ خودسر اور نافرمان ہوتا، مجھ پر اس کی طرف سے سلامتی کا پیغام ہے جس دن پیدا ہوا، جس دن مروں گا اور جس دن پھر زندہ اٹھایا جاؤں گا۔"

قوم نے ایک شیرخوار بچہ کی زبان سے جب یہ حکیمانہ کلام سُنا تو حیرت میں رہ گئی اور اس کو یقین ہو گیا کہ مریم (علیہا السلام) کا دامن بلاشبہ ہر قسم کی برائی اور تلویث سے پاک ہے اور اس بچہ کی پیدائش کا معاملہ یقیناً منجانب اللہ ایک "نشان" ہے۔

یہ خبر ایسی نہیں تھی کہ پوشیدہ رہ جاتی، قریب اور بعید سب جگہ اس حیرت زا واقعہ

[1] کہتے ہیں کہ ہارون، مریم علیہا السلام کے خاندان میں ایک عابد و زاہد انسان اور بہت نیک نفس مشہور تھا۔ (تفسیر ابن کثیر)

اور عیسیٰ (علیہ السلام) کی معجزانہ ولادت کے چرچے ہونے لگے اور طبائع انسانی نے اس مقدس ہستی کے متعلق شروع ہی سے مختلف کروٹیں بدلنی شروع کردیں، اصحاب خیر نے اُس کے وجود کو اگر یمن وسعادت کا ماہتاب سمجھا تو اصحاب شر نے اُس کی ہستی کو اپنے لیے فالِ بد جانا اور بغض وحسد کے شعلوں نے اندر ہی اندر اُن کی فطری استعداد کو کھانا شروع کردیا۔

غرض اسی متضاد فضا کے اندر اللہ تعالیٰ اپنی نگرانی میں اس مقدس بچہ کی تربیت اور حفاظت کرتا رہا تاکہ اس کے ہاتھوں بنی اسرائیل کے مُردہ قلوب کو حیاتِ تازہ بخشے اور اُن کی روحانیت کے شجرِ خشک کو ایک مرتبہ پھر بار آور اور مثمر بنائے:۔

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَآوَيْنَاهُمَا إِلَى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ[1] (سورۂ مومنون پ۱۸ ع۲)	اور ہم نے عیسیٰ بن مریم اور اُس کی ماں (مریم) کو (اپنی قدرت کا) نشان بنادیا اور ان دونوں کا ایک بلند مقام (بیت المقدس) پر ٹھکانا بنایا جو سکونت کے قابل اور چشمہ والا ہے۔

بشاراتِ ولادت قرآن عزیز نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بچپن کے حالات میں سے صرف اسی اہم واقعہ کا ذکر کیا ہے باقی بچپن کے دوسرے حالات کو جن کا ذکر قرآن کے مقصدِ تذکیر و موعظت سے خاص تعلق نہیں رکھتا تھا نظر انداز کردیا ہے لیکن اسرائیلیات کے مشہور ناقل

---

[1] عن ابن عباس فی قولہ "وَآوَيْنَاهُمَا إِلَى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ" قال المعین الماء الجاری وھو النھر الذی قال اللہ تعالیٰ "قد جعل ربک تحتک سریا" وکذا قال الضحاک وقتادۃ الی ربوۃ ذات قرار ومعین ھو بیت المقدس فھذا واللہ اعلم ھو الاظھر لانہ المذکور فی الآیۃ الاخریٰ والقرآن یفسر بعضہ بعضا و ھذا اولیٰ ما یفسر بہ ثم الاحادیث الصحیحۃ ثم الآثار۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲۴۶) یعنی حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے آیت "وَآوَيْنَاهُمَا إِلَى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ" کی تفسیر میں منقول ہے کہ "معین" سے نہر جاری مراد ہے اور یہ اسی نہر کا ذکر ہے جس کو آیت "قد جعل ربک تحتک سریا" میں بیان کیا گیا ہے اور ضحاک اور قتادہ (رحمہما اللہ) کا بھی یہی قول ہے کہ "اِلیٰ رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ" سے بیت المقدس کی سرزمین مراد ہے اور یہی قول زیادہ ظاہر ہے اس لیے کہ دوسری آیت میں بیت المقدس (کی نہر) کا ہی ذکر ہے اور قرآن کا ایک حصہ خود ہی دوسرے حصہ کی تفسیر کردیا کرتا ہے اور تفسیر آیات میں پہلی جگہ اسی طریق تفسیر کو حاصل ہے اس کے بعد صحیح احادیث کے ذریعہ تفسیر کا اور اس کے بعد آثار کے ذریعہ تفسیر کا درجہ ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت وہب بن منبہ سے جو واقعات منقول ہیں اور متی کی انجیل میں بھی جن کا ذکر موجود ہے اُن میں سے یہ واقعہ بھی ہے کہ جب حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کی ولادت ہوئی تو اسی شب میں فارس کے بادشاہ نے آسمان پر ایک نیا ستارہ روشن دیکھا، بادشاہ نے درباری نجومیوں سے اس کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ اس ستارہ کا طلوع کسی عظیم الشان ہستی کی پیدائش کی خبر دیتا ہے جو ملکِ شام میں پیدا ہوئی ہے۔ تب بادشاہ نے خوشبوؤں کے عمدہ تحفے دے کر ایک وفد کو ملکِ شام روانہ کیا کہ وہ اس بچہ کی ولادت سے متعلق حالات و واقعات معلوم کریں، وفد جب شام پہنچا تو اُس نے تفتیشِ حال شروع کی اور یہودیوں سے کہا کہ ہم کو اس بچہ کی ولادت کا حال سناؤ جو مستقبلِ قریب میں روحانیت کا بادشاہ ثابت ہوگا۔ یہود نے اہلِ فارس کی زبان سے یہ کلمات سُنے تو اپنے بادشاہ ہیرودیس کو خبر کی، بادشاہ نے وفد کو دربار میں بُلا کر استصواب حال کیا اور اُن کی زبانی واقعہ کو سُن کر بہت گھبرایا اور پھر وفد کو اجازت دی کہ وہ اس بچہ کے متعلق مزید معلومات حاصل کریں۔ پارسیوں کا یہ وفد بیت المقدس پہنچا اور جب حضرتِ یسوع (علیہ السلام) کو دیکھا تو اپنے رسم و رواج کے مطابق اوّل اُن کو سجدۂ تعظیم کیا اور پھر مختلف قسم کی خوشبوئیں اُن پر نثار کیں اور چند روز وہیں قیام کیا، دورانِ قیام میں وفد کے بعض آدمیوں نے خواب میں دیکھا کہ ہیرودیس اِس بچہ کا دشمن ثابت ہوگا اس لیے تم اب اس کے پاس نہ جاؤ اور بیت اللحم سے سیدھے فارس کو چلے جاؤ۔ صبح کو وفد نے فارس کا ارادہ کرتے وقت حضرتِ مریم (علیہا السلام) کو اپنا خواب سُناتے ہوئے کہا کہ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کی نیت خراب ہے اور وہ اس مقدس بچہ کا دشمن ہے اس لیے بہتر یہ ہے کہ تم اس کو ایسی جگہ لے جا کر رکھو جو اُس کی دسترس سے باہر ہو، اِس مشورہ کے بعد حضرتِ مریم (علیہا السلام) یسوع مسیح (علیہ السلام) کو اپنے بعض عزیزوں کے پاس مصر لے گئیں اور وہاں سے ناصرہ چلی گئیں اور جب عیسیٰ علیہ السلام کی عمرِ مبارک تیرہ سال کی ہوئی تو اُن کو ساتھ لے کر دوبارہ بیت المقدس واپس آئیں۔ یہی روایات یہ بھی ظاہر کرتی ہیں کہ

حضرتِ عیسٰی (علیہ السّلام) کے بچپن کے حالاتِ زندگی بھی غیر معمولی تھے اور اُن سے طرح طرح کے کرامات کا صدور ہوتا رہتا تھا۔[1] (واللہ اعلم بحقیقۃ الحال)

حلیۂ مُبارک بخاری حدیثِ معراج میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، میری مُلاقات حضرتِ عیسٰی (علیہ السّلام) سے ہوئی تو میں نے اُن کو میانہ قد سُرخ سپید پایا۔ بدن ایسا صاف شفاف تھا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حمام سے نہا کر آئے ہیں، اور بعض روایات میں ہے کہ آپ کے کاکل کاندھوں تک لٹکے ہوئے تھے، اور بعض احادیث میں ہے کہ رنگ کھُلتا ہوا گندم گوں تھا۔ بخاری کی روایت اور اس روایت میں اداءِ تعبیر کا فرق ہے حُسن میں اگر صباحت کے ساتھ ملاحت کی آمیزش بھی ہوتی ہے تو اس رنگ میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، کسی وقت اگر سُرخی جھلک آئی تو صباحت نمایاں ہو جاتی ہے اور اگر کسی وقت ملاحت غالب آگئی تو چہرہ پر حسن و لطافت کے ساتھ کھلتا ہوا گندم گوں رنگ چمکنے لگتا ہے۔

بعثت و رسالت حضرتِ عیسٰی (علیہ السّلام) سے قبل بنی اسرائیل ہر قسم کی بُرائیوں میں مبتلا تھے اور انفرادی و اجتماعی عیوب و نقائص کا کوئی پہلو ایسا نہیں تھا جو اُن سے بچ رہا ہو، وہ اعتقاد و اعمال دونوں ہی قسم کی گمراہیوں کا مرکز و محور بن گئے تھے حتیٰ کہ اپنی ہی قوم کے ہادیوں اور پیغمبروں کے قتل تک پر جری اور دلیر ہو گئے تھے، یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے متعلق معلوم کر چکے ہو کہ اس نے حضرتِ یحییٰ (علیہ السّلام) کو اپنی محبوبہ کے اشارہ پر کیسے عبرتناک طریقہ پر قتل کرا دیا تھا اور اس نے یہ سفاکانہ اقدام صرف اس لیے کیا کہ وہ حضرتِ یحییٰ کی بڑھتی ہوئی روحانی مقبولیت کو برداشت نہ کر سکا اور اپنی محبوبہ سے ناجائز رشتہ پر اُن کے نہی عن المنکر (برائی سے بچانے کی ترغیب) کی تاب نہ لا سکا اور یہ عبرتناک سانحہ حضرتِ عیسٰی (علیہ السّلام) کی زندگیِ مُبارک ہی میں ان کی بعثت سے قبل پیش آچکا تھا۔

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۲ ص ۷۷، و انجیل متی باب ۲۔

دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا للبستانی) میں یہود سے متعلق جو مقالہ ہے اس کے تاریخی مواد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کی بعثت سے پہلے یہود کے عقائد و اعمال کا یہ حال تھا کہ وہ مشرکانہ رسوم و عقائد کو جزءِ مذہب بنا چکے تھے اور جھوٹ، فریب، بغض و حسد جیسی بداخلاقیوں کو تو عملاً اخلاقِ کریمانہ کی حیثیت دے رکھی تھی اور اسی بناء پر بجائے شرمسار ہونے کے وہ اُن پر فخر کا اظہار کرتے تھے اور ان کے علماء و احبار نے تو دنیا کے لالچ اور حرص میں کتاب اللہ (توراۃ) تک کو تحریف کیے بغیر نہ چھوڑا اور درہم و دینار پر خدا کی آیات کو فروخت کر ڈالا یعنی عوام سے نذر اور بھینٹ حاصل کرنے کی خاطر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے سے بھی دریغ نہیں کیا اور اس طرح قانونِ الٰہی کو مسخ کر ڈالا۔

یہود کی اعتقادی اور عملی زندگی کا مختصر اور مکمل نقشہ ہم کو شعیا (علیہ السلام) کی زبانی خود توراۃ نے اس طرح دکھایا ہے:۔

خداوند فرماتا ہے: یہ اُمت (بنی اسرائیل) زبان سے تو میری عزت کرتی ہے مگر ان کا دل مجھ سے دور ہے اور یہ بے فائدہ میری پرستش کرتے ہیں کیونکہ میرے حکموں کو پیچھے ڈال کر آدمیوں کے حکموں کی تعلیم دیتے ہیں۔

بہرحال ان ہی تاریک حالات میں جب حضرتِ یحییٰ (علیہ السلام) کے قتل کا واقعہ بھی ہو گذرا اور بنی اسرائیل نے خدا کے حکموں کے خلاف بغاوت و سرکشی کی حد کر دی تب وہ وقتِ سعید آ پہنچا کہ جس مبارک بچہ نے حضرتِ مریم کی آغوش میں پیغامِ حق سنا کر بنی اسرائیل کو حیرت میں ڈال دیا تھا، سنِ رشد کو پہنچ کر اس نے یہ اعلان کر کے کہ وہ خدا کا رسول اور پیغمبر ہے اور رشد و ہدایتِ خلق اُس کا فرضِ منصبی ہے قوم میں ہلچل پیدا کر دی، وہ شرفِ رسالت سے مشرف ہو کر اور حق کی آواز بن کر آیا اور اپنی صداقت و حقانیت کے نور سے تمام اسرائیلی دنیا پر چھا گیا، اس مقدس ہستی نے قوم کو للکارا اور احبار کی علمی مجلسوں، راہبوں کے خلوتکدوں

بادشاہ اور امراء کے درباروں اور عوام و خواص کی محفلوں میں حتیٰ کہ کوچہ و برزن اور بازاروں میں شب و روز یہ پیغامِ حق سنایا۔

لوگو! اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اپنا رسول اور پیغمبر بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور تمہاری اصلاح کی خدمت میرے سپرد فرمائی ہے۔ میں اس کی جانب سے پیغامِ ہدایت لے کر آیا ہوں اور تمہارے ہاتھ میں خدا کا جو قانون (توراۃ) ہے اور جس کو تم نے اپنی جہالت اور کج روی سے پس پشت ڈال دیا ہے میں اُس کی تصدیق کرتا ہوں اور اس کی مزید تکمیل کے لیے خدا کی کتاب (انجیل) لے کر آیا ہوں، یہ کتاب حق و باطل کا فیصلہ کرے گی اور آج جھوٹ اور سچ کے درمیان فیصلہ ہو کر رہے گا۔ سُنو اور سمجھو اور اطاعت کے لیے خدا کے حضور جُھک جاؤ کہ یہی دین و دنیا کی فلاح کی راہ ہے۔

اب ان حقائق اور ان کے عواقب و نتائج کو قرآن کی زبانی سُنیے اور "احقاقِ حق و ابطالِ باطل" کے لُطف سے بہرہ مند ہو کر عبرت و موعظت حاصل کیجیے، کیونکہ تذکیر بایام اللہ سے قرآن کا مقصدِ عظیم یہی بصیرت و عبرت ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ	اور بیشک ہم نے موسیٰ کو کتاب (توراۃ) عطا کی اور اس کے
وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ	بعد ہم (تم میں) پیغمبر بھیجتے رہے اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو واضح
وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ	معجزے دے کر بھیجا اور ہم نے اس کو روحِ پاک (جبرئیل) کے
الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ	ذریعہ قوت و تائید عطا کی، کیا جب تمہارے پاس (خدا کا)
الْقُدُسِ ۭ اَفَكُلَّمَا جَاۗءَكُمْ	پیغمبر ایسے احکام لے کر آیا جن پر عمل کرنے کو تمہارا دل نہیں
رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ	چاہتا تو تم نے غرور کو شیوہ (نہیں) بنا لیا؟ پس (پیغمبروں
اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ	کی) ایک جماعت کو جھٹلاتے ہو اور ایک جماعت کو قتل
وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝ وَقَالُوْا	کر دیتے ہو، اور کہتے ہو کہ ہمارے دل (قبولِ حق کے لیے)
قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ	غلاف میں ہیں (یہ نہیں) بلکہ اُن کے کفر کرنے پر خدا نے

بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ٥ (سورۃ البقرہ پ۱ ع۱۱)

ان کو ملعون کر دیا ہے پس بہت تھوڑے سے ہیں جو ایمان لے آتے ہیں۔

وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ عَنكَ إِذْ جِئْتَهُم بِالْبَيِّنَٰتِ فَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ إِنْ هَٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ٥ (المائدہ پ۷ ع۱۵)

اور (اے عیسیٰ) جب ہم نے بنی اسرائیل (کی گرفت و ارادۂ قتل) کو تجھ سے باز رکھا اس وقت جبکہ تو اُن کے پاس کھلے معجزات لے کر آیا تو کہا بنی اسرائیل میں سے منکروں نے، یہ کچھ نہیں ہے مگر کھلا جادو ہے۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَىٰةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُم بِـَٔايَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ٥ إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَٰذَا صِرَٰطٌ مُّسْتَقِيمٌ ٥ فَلَمَّآ أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنصَارِيٓ إِلَى اللَّهِ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ (سورۂ آلِ عمران پ۳ ع۵)

اور میں تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے سامنے ہے اور (اس لیے آیا ہوں) تاکہ تمہارے لیے بعض وہ چیزیں حلال کر دوں جو (تمہاری کجروی کی وجہ سے) تم پر حرام کر دی گئی تھیں اور میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی نشانی لے کر آیا ہوں پس اللہ کا خوف کرو اور میری پیروی کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ میرا اور تمہارا پروردگار ہے پس اُسی کی عبادت کرو یہی سیدھی راہ ہے۔ پس جبکہ عیسیٰ نے اُن سے کفر محسوس کیا تو فرمایا اللہ کے لیے کون میرا مددگار ہے تو شاگردوں نے جواب دیا: ہم ہیں اللہ کے (دین کے) مددگار۔

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلَىٰٓ ءَاثَٰرِهِم بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَءَاتَيْنَٰهُ الْإِنجِيلَ (حدید پ ع)

پھر ان کے بعد (نوح و ابراہیم علیہم السّلام کے بعد) ہم نے اپنے رسول بھیجے اور ان کے بعد عیسیٰ ابن مریم کو رسول بنا کر بھیجا اور اس کو کتاب (انجیل) عطا کی۔

إِذْ قَالَ اللَّهُ يَٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَٰلِدَتِكَ إِذْ أَيَّدتُّكَ بِرُوحِ الْقُدُسِ

(وہ وقت یاد کے لائق ہے) جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہے گا "اے عیسیٰ ابن مریم! میری اس نعمت کو یاد کر جو میری جانب سے تجھ پر اور تیری والدہ پر نازل ہوئی

تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ	جبکہ میں نے روح القدس (جبرئیل) کے ذریعہ تیری
كَهْلًا ۚ وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ	تائید کی کہ تو کلام کرتا تھا آغوشِ مادر میں اور بڑھاپے
وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْإِنْجِيْلَ ۚ	میں اور جبکہ میں نے تجھ کو سکھائی کتاب، حکمت، توراۃ
(سورۃ المائدہ پ ع)	اور انجیل۔
وَإِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ	اور (وہ وقت یاد کرو) جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا:
يٰبَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ	اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا
إِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ	بھیجا ہوا پیغمبر ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی
مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا	جو میرے سامنے ہے اور بشارت سنانے والا ہوں
بِرَسُوْلٍ يَّأْتِيْ مِنْ بَعْدِي	ایک پیغمبر کی جو میرے بعد آئے گا اس کا نام
اسْمُهٗٓ أَحْمَدُ (صف پ ع)	احمد ہے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

آیاتِ بینات قصص القرآن جلد اول معجزات کی بحث میں گذر چکا ہے کہ حق و صداقت کے تسلیم و انقیاد میں انسانی فطرت ہمیشہ سے دو طریقوں سے مانوس رہی ہے: ایک یہ کہ "مدعیِ حق" کی حقانیت و صداقت، دلائل کی قوت اور براہین کی روشنی کے ذریعہ ثابت اور واضح ہو جائے اور دوسرا طریقہ یہ کہ دلائل و براہین کے ساتھ ساتھ منجانب اللہ اس کی صداقت کی تائید میں عام قانونِ قدرت سے جدا بغیر اسباب و وسائل اور تحصیلِ علم و فن کے اس کے ہاتھ پر امورِ عجیبہ کا مظاہرہ اس طرح ہو کہ عوام و خواص اس کے مقابلہ سے عاجز و درماندہ ہو جائیں اور ان کے لیے اسباب و وسائل کے بغیر ان امور کی ایجاد ناممکن ہو، پہلے طریق کے ساتھ یہ دوسرا طریق انسان کے عقل و فکر اور اس کی نفسیاتی کیفیات میں ایسا انقلاب پیدا کر دیتا ہے کہ ان کا وجدان یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ داعیِ حق (نبی و پیغمبر) کا یہ عمل دراصل خود اس کا اپنا فعل نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ خدا کی قوت کام کر رہی ہے اور بلاشبہ یہ اس کے صادق ہونے کی مزید دلیل ہے چنانچہ قرآنِ عزیز میں آیت "وَمَا رَمَيْتَ

اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی لہ میں اسی حقیقت کا اظہار مقصود ہے مگر ان ہر دو طریقوں میں سے ان اصحابِ علم و دانش پر جو قوتِ فہم و ادراک میں بلند مقام رکھتے ہیں پہلا طریقہ زیادہ مؤثر ثابت ہوتا ہے اور وہ دوسرے طریقہ کو پہلے طریقہ کی تائید و تقویت کی حیثیت سے قبول کرتے اور داعیٔ حق (نبی و پیغمبر) کے دعوائے نبوت و رسالت کی صداقت کا مزید عملی ثبوت یقین کرکے اُس پر ایمان لے آتے ہیں اور ان حضرات اربابِ عقل و فکر کے برعکس اربابِ قوت و اقتدار اور ان کی ذہنیت سے متاثر عام انسانی قلوب دوسرے طریقۂ تصدیق سے زیادہ متأثر ہوتے اور نبی و پیغمبر کے معجزانہ افعال کو کائنات کی طاقت و قوت کے دائرہ سے بالاتر ہستی کا ارادہ و قوتِ فعل یقین کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں اور ان اُمور کو خدائی نشان باور کرکے دعوتِ حق و صداقت کے سامنے تسلیم خم کردیتے ہیں۔

قرآنِ عزیز نے اکثر و بیشتر مقامات پر پہلے طریقِ دلیل کو "حجۃ اللہ" "برہان" اور "حکمۃ" سے تعبیر کیا ہے۔ سورۂ انعام میں خدا کی ہستی، اس کی وحدانیت، معاد و آخرت اور دین کے بنیادی عقائد کو دلائل، نظائر اور شواہد کے ذریعہ سمجھانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے:۔

قُلْ فَلِلّٰہِ الْحُجَّۃُ الْبَالِغَۃُ۔ (پ ۸) — (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے، اللہ کیلئے ہی ہے حجتِ کامل (یعنی مکمل اور روشن دلیل)

اور اس سورۃ میں دوسری جگہ حضرتِ ابراہیمؑ کے تذکرہ میں ہے:۔

تِلْکَ حُجَّتُنَا اٰتَیْنٰھَا اِبْرٰھِیْمَ عَلٰی قَوْمِہٖ (پ ۷) — اور یہ ہماری دلیل ہے جو ہم نے ابراہیمؑ کو اس کی قوم کے مقابلہ میں عطا کی۔

اور سورۂ نساء میں ہے:۔

لہ اور اے پیغمبر (بدر کے غزوہ میں) جب تو نے (دشمنوں پر) مٹھی بھر خاک پھینکی تھی تو تو نے وہ مشتِ خاک نہیں پھینکی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی۔ مفصل بحث جلد اول میں گذر چکی ہے

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ	(ہم نے بھیجے) پیغمبر خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے
لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ	تاکہ لوگوں کی جانب سے خدا پر پیغمبر بھیجنے کے بعد کوئی حجت
حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ	(دلیل) باقی نہ رہے (کہ ہمارے پاس دلائل کے ذریعہ راہ مستقیم
(پ ع)	بتانے کوئی نہ آیا تھا اس لیے ہم دینِ حق کی معرفت سے محروم رہے)
...يَآ اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ	.... "اے لوگو! بیشک تمہارے پاس تمہارے
بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (سورۂ نساء پ ع)	پروردگار کی جانب سے برہان (قرآن) آگیا۔

اور سورۂ یوسف میں ہے :۔

لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ	اگر نہ ہوتی یہ بات کہ دیکھ لی تھی اُس (یوسف) نے اپنے
رَبِّهٖ (سورۂ یوسف پ ع)	پروردگار کی دلیل۔

اور سورۂ نحل میں ہے :۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ	اپنے پروردگار کے راستہ کی جانب دعوت و حکمت
بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ	اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور تبادلہ خیالات کرو
وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ	ان (مخالفین) کے ساتھ اچھے طریق گفت گو سے۔

اور سورۂ نساء میں ہے :۔

وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ	اور اللہ تعالٰے نے اتارا تجھ پر کتاب کو اور حکمت کو۔

اسی طرح "حکمت" کا یہ ذکر سورۂ بقرہ آلِ عمران، مائدہ، لقمان، ص، زخرف، احزاب اور قمر میں بہ کثرت موجود ہے اور دوسرے طریقِ دلیل کو اکثر "آیۃ اللہ" اور "آیات اللہ" اور بعض مقامات پر "آیاتِ بینات" اور "بینات" کہا ہے۔

ناقۂ صالح (علیہ السلام) کے متعلق ارشاد ہے :۔

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ	یہ اونٹنی تمہارے لیے (خدا کی جانب سے)
لَكُمْ اٰيَةً (اعراف پ ع)	ایک "نشان" ہے۔

اور حضرت مسیح اور ان کی والدہ مریم (علیہما السلام) کے متعلق ارشاد ہے:۔

وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ (انبیاء پ ۱۷ ع ۶) — اور ہم نے کر دیا مریم اور اس کے لڑکے عیسیٰ (علیہما السلام) کو جہان والوں کے لیے "نشان" (معجزہ)

اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے واقعات میں ارشادِ باری ہے:۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ [1] — اور ہم نے موسیٰ کو نو نشان (معجزات) عطا کیے۔

اور حضرت مسیح (علیہ السلام) کو جو معجزات دیے گئے تھے اُن کے متعلق ارشاد ہے:۔

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ [2] — اور دیے ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو معجزات۔

اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ○ (سورۂ مائدہ پ ۷ ع ۱۵) — اُس وقت جبکہ تو اُن کے پاس کھلے معجزات لے کر آیا تو کہا بنی اسرائیل میں سے منکروں نے یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

ہم نے اس مقام پر اکثر و بیشتر کا لفظ قصداً اختیار کیا ہے کیونکہ قرآنِ عزیز کے اسلوبِ بیان سے واقف اس سے بے خبر نہیں ہے کہ اس نے ان الفاظ کے استعمال میں وسعتِ تعبیر سے کام لیا ہے یعنی جبکہ "معجزہ" بھی ایک خاص قسم کا "بُرہان" ہے اور قرآن اور آیاتِ قرآن جس طرح سرتاسر علم و بُرہان ہیں اُسی طرح "معجزہ" بھی ہیں، اس لیے معجزہ پر بُرہان کا اطلاق اور کتاب اللہ کے جملوں پر آیت اور آیات اللہ کا اطلاق مجاز نہیں بلکہ حقیقت ہے مثلاً حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے دو معجزوں عصاء اور یدِ بیضاء کے متعلق سورۂ قصص میں ہے:

فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ [3] — پس تیرے رب کی جانب سے یہ دو دلیلیں ہیں۔

اور کتاب اللہ اور اس کے جُملوں پر آیت اور آیات کے اطلاقات سے تو قرآن کی کوئی طویل سورۃ ہی خالی ہوگی، تمام قرآن میں جگہ جگہ اس کثرت سے اس کا استعمال ہوا ہے کہ اس کی فہرست مستقل موضوع بن سکتا ہے۔

اس طرح "آیاتِ بینات" کا اگرچہ بکثرت اطلاق کتاب اللہ (قرآن، توراۃ، زبور، انجیل)

[1] سورۂ بنی اسرائیل پ ۱۵ ع ۱۲۔ [2] سورۂ بقرہ پ ع۔ [3] سورۂ قصص۔ پ ۲۰ ع ۴۔

اوران کی آیات پر ہوا ہے مگر مسطورۂ بالا مقامات کی طرح بعض بعض جگہ اس کو "معجزات" کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔

لائق توجہ بات اور حقیقتِ معجزات

نبی اور رسول کی بعثت کا مقصد کائنات کی رشد و ہدایت اور دین و دنیا کی فلاح و خیر کی رہنمائی ہے اور وہ منجانب اللہ وحی کی روشنی میں اِس فرضِ منصبی کو انجام دیتا اور علم و بُرہان اور حجتِ حق کے ذریعہ راہِ صداقت دکھاتا ہے، وہ یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ فطرت اور ماوراءِ فطرت امور میں تصرف و تغیر بھی اُس کا کارِ منصبی ہے بلکہ وہ بار بار یہ اعلان کرتا ہے کہ میں خدا کی جانب سے بشیر و نذیر اور داعی الی اللہ بن کر آیا ہوں، میں انسان ہوں اور خدا کا ایلچی، اس سے زائد اور کچھ نہیں ہوں تو پھر اس کے دعوئے صداقت کے امتحان اور پرکھ کے لیے، اس کی تعلیم، اس کی تربیت اور اس کی شخصیت کا زیرِ بحث آنا یقیناً معقول لیکن اُس سے ماوراءِ فطرت اور خارقِ عادت عجائبات و غرائب کا مطالبہ خلافِ عقل اور بے جوڑ بات معلوم ہوتی ہے اور یوں نظر آتا ہے کہ کسی طبیبِ حاذق کے دعوئے حذاقتِ طب پر اس سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ طلسمی کھٹکے کی ایک عمدہ المساری یا لکڑی کا ایک عجیب قسم کا کھلونا بنا کر دکھائے، طبیب نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ وہ ماہر لوہار یا بڑھئی ہے بلکہ اس کا دعویٰ تو امراضِ جسمانی کے علاج کا ہے، اسی طرح پیغمبرِ خدا کا یہ دعویٰ نہیں ہوتا کہ وہ خدا کی طرح کائنات پر ہر قسم کے تصرف و تغیر کا مالک و قادر ہے بلکہ اس کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ تمام امراضِ روحانی کے لیے طبیب کامل اور حاذق و ماہر ہے۔

پس دعویٰ نبوت اور معجزات (خارقِ عادات امور) کے درمیان کیا تعلق ہے؟ اور کیا اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ "معجزہ" لوازمِ نبوت میں سے نہیں ہے؟

بلاشبہ یہ سوال بہت زیادہ قابلِ توجہ ہے اور اس لیے علمِ کلام میں اس مسئلہ کو کافی اہمیت دی گئی ہے لیکن ہم نے "آیاتِ بیّنات" عنوان کے ماتحت ابتداءِ کلام میں دعوئے نبوت کی صداقت سے متعلق دلائل کی جو تقسیم انسانی طبائع اور ان کے فطری رجحانات کے

پیشِ نظر کی ہے وہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے اور جوہرِ عقل کے تفاوتِ درجات نے بلا شبہ انسانوں کی قوتِ فکریہ کو جداجدا طریقوں کی جانب مائل کر دیا ہے، ان حالات میں جب ایک نبی اور رسول یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ خدا کی جانب سے ایک ایسے منصب پر مامور ہے جو ریاضات و مجاہدات اور نیک عملی کی قوت سے نہیں بلکہ محض خدا کی موہبت اور عطا سے حاصل ہوتا ہے اور یہ "منصبِ نبوت و رسالت" ہے اور اس کا مقصد کائنات کی رشد و ہدایت اور تعلیم حق و صداقت ہے تو بعض انسانی دماغ اور ان کا جوہرِ عقل اس جانب متوجہ ہو جاتا ہے کہ اگر اس ہستی کا یہ دعویٰ صحت پر مبنی ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس کو خدائے برتر کے ساتھ اس درجہ قربت حاصل ہے جو دوسرے انسانوں کے لیے ناممکن ہے پس جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اُس کی صدائے اصلاح اور اس کی تعلیم ہمارے قدیم رسم و رواج یا مذہب و دھرم کے ان عقائد و اعمال کے خلاف ہے جس کو ہم حق سمجھتے آئے ہیں تو ان متضاد اور متخالف تعلیمات کی صداقت و بطالت کے امتحان کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ یہ ہستی کوئی اور ماوراءِ فطرت یا خارقِ عادت امر کر دکھائے تو ہمارے لیے یہ سمجھنا بہت آسان ہو جائے گا کہ بغیر اسباب و وسائل کے اس ہستی کے ہاتھ ایسے امر کا صدور یقیناً اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس کو خدائے برتر کے ساتھ خاص قرب حاصل ہے، تب ہی تو خدائے برحق نے یہ "نشان" دکھا کر اس کی صداقت پر مہر لگا دی' نیز وہ صاحبِ قوت واقتدار انسان جن کے غور و فکر کی قوت ایسے سانچہ میں ڈھل گئی ہے کہ ان پر کوئی امرِ حق اس وقت تک موثر ہی نہیں ہوتا جب تک کہ ان کی متکبرانہ طاقت کو بھی ٹھوکر سے بیدار نہ کیا جائے، وہ بھی اس کے منتظر رہتے ہیں کہ مدعیِ نبوت و رسالت اپنی صداقت کو دلیل و برہان کے ساتھ ساتھ ایک ایسے "کرشمہ" کے ذریعہ ناقابلِ انکار بنا دے کہ جس کا صدور دوسرے انسانوں سے یا تو ممکن ہی نہ ہو اور یا بغیر اسباب و وسائل کے استعمال کیے وجود پذیر نہ ہو سکتا ہو تاکہ یہ باور کیا جا سکے کہ بلا شبہ اس ہستی کی تعلیم و تبلیغ کو خدائے برتر کی تائید حاصل ہے۔

اسی لیے علماء کلام نے دعوئے نبوت اور معجزہ کے درمیان تعلق پر بحث کرتے ہوئے یہ مثال بیان کی ہے کہ ایک شخص جب یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کو بادشاہِ وقت نے اپنا نائب مقرر کر کے بھیجا ہے تو اس مُلک یا صوبے کے باشندے خواستگار ہوتے ہیں کہ مدعیِ نیابت اپنے دعویٰ کی صداقت کے لیے کوئی سند اور علامت پیش کرے چنانچہ مدعیِ نیابت ایک جانب اگر سند دکھاتا ہے تو دوسری جانب ایسی نشانی بھی پیش کرتا ہے جس کے متعلق یہ یقین کیا جا سکے کہ بادشاہ کی عطا کردہ یہ نشانی اس کے عطیہ اور اس منصب کی تصدیق کے علاوہ اور کسی طرح بھی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً بادشاہ کی انگشتری (مہرِ حکومت) یا ایسا خاص عطیہ جو صرف اس منصب پر فائز ہستی کو عطا کیا جاتا ہو۔

تو اگرچہ بظاہر دعوئ نیابت اور انگشتری یا عطیۂ خاص کے درمیان کوئی مطابقت نہیں ہے تاہم اس تعلقِ خاص نے جو شاہی تصدیق سے وابستہ ہے ان دونوں کے درمیان اہم ربط پیدا کر دیا ہے۔

لیکن جبکہ یہ طریقِ تصدیق، معیارِ صداقت و حقانیت میں دوسرے درجہ کی حیثیت رکھتا ہے اور حقیقۃً معیاری حیثیت صرف طریقِ اول "حجۃ و برہانِ حق" کو ہی حاصل ہے، اس لیے معجزہ کے وقوع و صدور کا معاملہ پہلے طریق کے وجود و صدور سے قطعاً جُدا ہے اور وہ یہ کہ ہر ایک مدعیِ نبوت و رسالت کے لیے از بس ضروری ہے کہ وہ اپنے دعویِ حق و صداقت کو حجۃ و بُرہان کی روشنی اور علم و یقین کی قوت کے ذریعہ ثابت کرے اور اپنی تعلیم و تربیت، اور شخصی حیات کے ہر پہلو میں دعویٰ اور دلیل و بُرہان کی مُطابقت کو واضح کرے اور انسانی جوہرِ عقل کے فکر و تدبر کی رہنمائی کا فرض اس طرح انجام دے کہ ہر قسم کے ظن و وہم اور فاسد و کاسد خیالات کے مقابلہ میں یقینِ محکم "روزِ روشن کی طرح نمودار ہو جائے اور اس ادائے فرض کے لیے کسی کی جانب سے نہ مطالبہ شرط ہے اور نہ جستجو لازم بلکہ یہ نبی اور رسول کا براہِ راست وہ فرض ہے جس کے لیے خدائے تعالیٰ نے اس کو منتخب اور مامور کیا ہے، اور اگر ایک لمحہ کے لیے بھی

وہ اس میں کوتاہی کرتا ہے تو گویا اپنے فرض کی پوری عمارت کو اپنے ہاتھ سے برباد کر دیتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ (سورۃ المائدہ پ ۶ ع ۱)

اے پیغمبر! جو تم پر نازل کیا گیا ہے تم اس کو پورا پورا پہنچا دو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو منصب رسالت کو ادا نہ کیا۔

اس کے برعکس معجزہ کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ نبی اور رسول اس کو ضرور ہی دکھائے یا مخالفین کے ہر مطالبہ پر اس کی تعمیل کرے بلکہ "معجزہ" حجت و برہان کی وہ قسم ہے جو اکثر معاندین کے مطالبہ پر وقوع پذیر ہوتا ہے اور اس سے اس کا صدور صرف عالم الغیب کی اپنی "حکمت و مصلحت" پر ہی موقوف رہتا ہے اور وہی خوب جانتا ہے کہ معجزہ کے بارہ میں کس کا سوال جویائے حق کی حیثیت میں ہے اور کس کا تعنّت اور انکارِ مزید کے لیے رُکن، سعید روحوں پر اس کا یہ اثر پڑے گا کہ وہ کہہ اٹھیں گی "آمَنَّا بِرَبِّ هَارُونَ وَمُوسَىٰ" اور کن بدبختوں پر اس طرح اثر انداز ہوگا کہ یوں گویا ہوں گے: "إِنْ هَٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُبِينٌ"

پس قرآنِ عزیز نے اگر ایک جانب بہ نصوصِ قطعیہ یہ ظاہر کیا ہے کہ اُس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو حجۃ و بُرہان کے ساتھ مزید تائید و تقویت کے لیے معجزات عطا کیے ہیں تو دوسری جانب یہ بھی صاف صاف نبی کی زبانی کہلا دیا ہے کہ میں خدا کی جانب سے فقط "نذیر مبین" "بشیر و نذیر" اور "رسول و نبی" ہوں۔ میں نے یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا کہ میں کائناتِ خداوندی کے تصرفات و تغیرات اور ماوراءِ فطرت امور پر قادر ہوں، ہاں خدائے برتر اگر چاہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے اور اس نے ایسا کیا بھی ہے مگر وہ جب ہی کرتا ہے کہ اس کی حکمت و مصلحت اس کی متقاضی ہو۔

چنانچہ حضرتِ داؤد و سلیمان (علیہما السلام) کو منطق الطیر اور تسخیرِ ہوا، طیور و جن کے نشان دیے گئے، حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو "تسعِ آیات بینات"۔ نو کھلے نشان "عطا کیے گئے، جن میں سے دو نشان عصا اور یدِ بیضاء کو قرآن نے بڑے نشان کہا ہے اور

بحرِ قلزم میں غرقِ فرعون اور نجاتِ قومِ موسیٰ کا عجیب و غریب واقعہ مستقل ایک نشانِ عظیم ہے۔ حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) پر دہکتی آگ کے شعلوں کو "بردوسلام" بنا دیا۔ حضرتِ صالح (علیہ السلام) کی قوم کے لیے "ناقۂ صالح" کو نشان بنایا کہ جوں ہی اس کو کسی نے ستایا اُسی وقت خدا کا عذاب قوم کو تباہ و برباد کر جائے گا چنانچہ ٹھیک اُسی طرح پیش آیا۔

حضرتِ ہود اور حضرتِ نوح (علیہما السلام) سے اُن کی قوموں نے عذاب طلب کیا اور کافی سمجھانے کے بعد بھی جب اُن کا اصرار قائم رہا تو ان پیغمبروں نے عذابِ الٰہی کی جو وعیدیں سنائی تھیں وہ ٹھیک اپنے وقت پر پوری ہوئیں حالانکہ ان سب مواقع میں بہ ظاہر اسبابِ نزولِ عذاب اور وقوعِ حوادث و ہلاکت کے کوئی سامان نہیں تھے اور حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو جو مختلف نشان (معجزات) دیے گئے اُن کو بھی قرآن نے صاف صاف بیان کر دیا ہے جو ابھی زیرِ بحث آئیں گے اور آخر میں خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو علمی معجزۂ قرآن عطا کیا جس کی تحدی (مقابلہ کے چیلنج) کا کوئی جواب نہ دے سکا، نیز بدر کے معرکہ میں فرشتوں کا نزول اور ان کے ذریعہ مسلمانوں کی نصرت دیا (؟) ہدی اور "وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی" کے اعلان سے اس مشہور معجزہ کا اظہار فرمایا جس نے بدر کے میدان میں مٹھی بھر خاک کو ایک ہزار دشمنوں کی آنکھوں کا آزار بنا دیا اور شق القمر کا معجزہ عطا فرمایا۔ معاملۂ زیرِ بحث کا یہ ایک پہلو یا ایک رخ ہے اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ ارشاد و تبلیغِ حق کے روشن دلائل و براہین کا کوئی جواب مخالفین سے نہ بن پڑا تو ازراہِ تعنت و سرکشی عجائبات اور خارقِ عادات امور کا مطالبہ کرنے لگے تب اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ ان کا مقصد طلبِ حق اور جستجوئے صداقت نہیں ہے بلکہ یہ جو کہہ رہے ہیں سرکشی، ضد اور تعصب کی راہ سے کہتے ہیں اس لیے اِن کا جواب یہ نہیں ہے کہ خدا کے نشانات کو بھان متی کا تماشہ یا مداری کا کھیل بنا دیا جائے بلکہ اصل جواب یہ ہے کہ ان سے

کہدو میں ان تصرفات کا مدعی نہیں ہوں میں تو نیک و بد اُمور میں تمیز پیدا کرنے، خدا کے بندوں کا خدا کے ساتھ رشتہ ملانے اور نیک و بد کاموں کے انجام کو واضح کرنے کے لیے نذیر مبین اور نبی رسول ہوں۔

وَقَالُوا لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ تَفْجُرَ لَنَا	اور انھوں نے (مشرکوں نے) کہا، ہم اس وقت تک
مِنَ الْأَرْضِ يَنبُوعًا ۞ أَوْ تَكُونَ	ہرگز تیری بات نہیں مانیں گے کہ تو ہمارے لیے زمین سے
لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ	چشمہ اُبال دے یا تیرے واسطے کھجوروں کا اور انگوروں ا
فَتُفَجِّرَ الْأَنْهَارَ خِلَالَهَا تَفْجِيرًا ۞	کا باغ ہو اور تو اس کے درمیان زمین پھاڑ کر نہریں بہادے
أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاءَ كَمَا زَعَمْتَ	یا تو جیسا گمان کرتا ہے ہمارے اوپر آسمان گرادے
عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللَّهِ	یا تو اللہ اور اس کے فرشتوں کو (ہمارے) مقابل
وَالْمَلَائِكَةِ قَبِيلًا ۞ أَوْ يَكُونَ	لاکھڑا کرے یا تیرے واسطے ایک سونے کا (طلائی) مکان
لَكَ بَيْتٌ مِّن زُخْرُفٍ	ہو اور یا تو چڑھ جائے آسمان پر اور ہم تیرے چڑھ جانے کو
أَوْ تَرْقَىٰ فِي السَّمَاءِ وَلَن	بھی ہرگز اس وقت تک نہیں تسلیم کریں گے تاوقتیکہ تو
نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتَّىٰ تُنَزِّلَ	ہمارے پاس (آسمان سے) کتاب لے کر نہ آئے کہ اس کو
عَلَيْنَا كِتَابًا نَّقْرَؤُهُ ۞	ہم پڑھیں (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے پاک
قُلْ سُبْحَانَ رَبِّي هَلْ كُنتُ	ہے میرے پروردگار کے لیے میں اس کے سوا کچھ نہیں
إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا ۞ (اسراء پ ۱۵ ع ۱۰)	کہ انسان ہوں، خدا کا پیغامبر ہوں۔
وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِم بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ	اور اگر کھول دیں ہم اُن پر آسمان کا ایک دروازہ
فَظَلُّوا فِيهِ يَعْرُجُونَ ۞ لَقَالُوا إِنَّمَا	اور یہ اُس پر چڑھنے لگیں تب بھی ضرور یہی کہیں گے
سُكِّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ	کہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مست کردی گئی ہیں
مَّسْحُورُونَ ۞ (الحجر پ ۱۴ ع ۱)	ہماری آنکھیں بلکہ ہم پر جادو کردیا گیا ہے۔
وَإِن يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ	اور اگر یہ ہر قسم کے نشان بھی دیکھ لیں تب بھی

اب ان تفصیلات سے یہ بھی بخوبی روشن ہوگیا کہ علمِ کلام میں جن علمار کی رائے یہ ظاہر کی گئی ہے کہ معجزہ دلیلِ نبوت نہیں ہے اُن کی مراد کیا ہے؟ وہ دراصل دعویٰ نبوت کی صداقت سے متعلق مسطورۂ بالا ہر دو دلائل کے فرق کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جو ہستی نبوت و رسالت کا دعویٰ کرتی ہے اس پر لازم اور ضروری ہے کہ اپنے دعویٰ کی تصدیق کے لیے "حجۃ و بُرہان" پیش کرے اور دلائل کی روشنی میں اپنی حقانیت کو ثابت کرے اور وحیِ الٰہی کی جو تعلیم وہ کائنات کی ہدایت کے لیے پیش کرتی ہے بُرہان و حجت کے ذریعہ اُس کی حقیقت کو واضح کرے، تو گویا اس طرح نبوت و رسالت اور حجۃ و بُرہانِ صداقت میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے اس کے برعکس نبوت کے ساتھ معجزات اور آیات اللہ (نشاناتِ خداوندی) کا تعلق اس طرح کا نہیں ہے بلکہ اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر مخالفین کے مطالبہ پر یا بہ تقاضائے حکمتِ الٰہی نبی اور رسول از خود اپنی صداقت کی تائید میں کوئی نشان (معجزہ) دکھائے تو بلاشبہ وہ اس ہستی کے نبی و رسول ہونے کی ناقابلِ انکار دلیل ہے اور اس کا انکار درحقیقت اس رسول کی صداقت کا انکار ہے کیونکہ اس صورت میں یہ انکار حقیقت اور واقعہ کا انکار ہے اور حقیقت کا انکار حق نہیں بلکہ باطل ہوتا ہے جو نبوت و رسالت کے مقصد کے ساتھ کسی طرح بھی جمع نہیں ہوسکتا۔ البتہ اگر حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہو کہ تعلیمِ حق کی روشنی، وحیِ الٰہی پر دلائل و براہین کاملین اور اصولِ دین پر حجۃ و برہان کا قیام ہوتے ہوئے اب مخالفین کے بار بار طلبِ معجزات و عجائبات کی پرواہ نہ کی جائے اور نبی و رسول، وحیِ الٰہی کی روشنی میں حجت و بُرہان کے ذریعہ تعلیمِ حق جاری رکھے اور مخالفین کے جواب میں صاف صاف کہہ دے کہ میں نے ماورائے فطرت پر قدرت کا کبھی دعویٰ نہیں کیا تو اس صورت میں بندوں پر خدا کی حجت تمام ہوجاتی ہے اور کسی اُمت اور قوم کو یہ حق نہیں رہتا کہ وہ تعلیمِ حق کے دلائل و براہین اور روشن حجت

و بینہ سے اس لیے مُنہ پھیرے اور اس لیے اس کا انکار کردے کہ اُس کی طلب پر اچنبھوں اور عجائبات کا مظاہرہ کیوں نہیں کیا گیا۔

پس قرآنِ عزیز نے جن انبیاء و رُسل کے واقعات و حالات تذکیر بایام اللہ کے سلسلہ میں بیان کرتے ہوئے نصوصِ قطعیہ کے ذریعہ صراحت و وضاحت سے یہ ثابت کیا ہے کہ ہم نے اُن کی صداقت کے نشان کے طور پر نشانات (معجزات) اُن کو عطا اور مخالفین کے سامنے ان کا مظاہرہ کیا تو ہمارا فرض ہے کہ ہم بے چون وچرا اُن کو قبول اور اُن کی تصدیق کریں اور عجائب پرستی کے الزام سے خائف ہو کر عالمِ غیب کی اس تصدیق سے گریز نہ کریں اور نہ رکیک و باطل تاویلات کے پردہ میں اُن کے انکار پر آمادہ ہو جائیں کیونکہ ایسا کرنا اس آیت کا مصداق بن جاتا ہے :-

وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ	اور وہ کہتے ہیں کہ ہم کتاب الٰہی کے بعض پر ایمان
وَّيُرِيدُونَ اَنْ يَّتَّخِذُوا بَيْنَ ذٰلِكَ	لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ چاہتے
سَبِيلًا (سورہ النساء پ ع ۲۱)	ہیں کہ ایمان و کفر کے درمیان ایک راہ بنالیں۔

اور ظاہر ہے کہ یہ مومن و مسلم کی نہیں بلکہ کافر و منکر کی راہ ہے، مومن و مسلم کی راہ تو سیدھی راہ یہ ہے :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا ادْخُلُوا	اے پیروانِ دعوتِ ایمانی ! اسلام میں پوری طرح
فِى السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا	داخل ہو جاؤ (اور اعتقاد و عمل کی ساری باتوں میں مسلم
تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ	بن جاؤ، مسلم ہونے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ زبان
اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ○	سے اسلام کا اقرار کر لو) اور دیکھو شیطانی وسوسوں کی
(سورۃ البقرہ پ ع ۲۵)	پیروی نہ کرو، وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے۔

بہرحال سُنۃ اللہ یہ جاری رہی ہے کہ جب کسی قوم کی ہدایت یا تمام کائناتِ انسانی کی فوز و فلاح کے لیے نبی اور پیغمبر مبعوث ہوتا ہے تو اس کو منجانب اللہ محکم دلائل و براہین اور آیات اللہ (معجزات) دونوں سے نوازا جاتا ہے، وہ ایک جانب وحیِ الٰہی کے ذریعہ

کائنات کے معاش و معاد سے متعلق اوامر و نواہی اور بہترین دستور و نظام پیش کرتا ہے تو دوسری جانب حسب مصلحت خداوندی "خدائی نشانات" کا مظاہرہ کرکے اپنی صداقت اور منجانب اللہ ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ نیز ہر ایک پیغمبر کو اسی قسم کے معجزات و نشانات عطا کیے جاتے ہیں جو اس زمانہ کی علمی ترقیوں یا قومی و ملکی خصوصیتوں کے مناسب حال ہونے کے باوجود معارضہ کرنے والوں کو عاجز و درماندہ کردیں اور کوئی ان کے مقابلہ میں تاب مقاومت نہ لا سکے اور اگر تعصب اور ضد درمیان میں حائل نہ ہوں تو اپنی اکتسابی ترقیوں اور خصوصیتوں کے حقائق سے آگاہ ہونے کی وجہ سے اس اعتراف پر مجبور ہو جائیں کہ یہ جو کچھ سامنے ہے انسانوں کی قدرت سے بالاتر ان کی دسترس سے باہر اور صرف خدائے واحد ہی کی جانب سے ہے۔

مثلاً حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے زمانہ میں علم نجوم (ASTRONOMY) اور علم کیمیا (CHEMISTRY) کا بہت زور تھا اور ساتھ ہی ان کی قوم کواکب و نجوم کے اثرات کو ان کے ذاتی اثرات سمجھتی اور ان کو مؤثر حقیقی یقین کرکے خدائے واحد کی جگہ ان کی پرستش کرتی تھی اور ان کا سب سے بڑا دیوتا شمس (سورج) تھا کیونکہ وہ روشنی اور حرارت دونوں کا حامل تھا اور یہی دونوں چیزیں ان کی نگاہ میں کائنات کی بقاء و فلاح کے لیے اصل الاصول تھیں اور اسی بناء پر کرۂ ارضی میں آگ کو اس کا مظہر مان کر اس کی بھی پرستش کی جاتی تھی، علاوہ ازیں ان کو اشیاء کے خواص و اثرات اور ان کے ردّ عمل پر بھی کافی عبور تھا گویا آج کی علمی تحقیقات کے لحاظ سے وہ کیمیاوی طریقہ عمل سے بھی بڑی حد تک واقف تھے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم (علیہ السلام) کو ان کی قوم کی ہدایت اور خدا پرستی کی تعلیم و تلقین کے لیے ایک جانب ایسے روشن حجت و برہان عطا فرمائے جن کے ذریعہ وہ قوم کے غلط عقائد کے ابطال اور احقاق حق کی خدمت انجام دیں اور مظاہر پرستی کی

وجہ سے حقیقت کے چہرہ پر تاریکی کا جو پردہ پڑ گیا تھا اس کو چاک کر کے رُخِ روشن کو نمایاں کر سکیں "وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ" اور دوسری جانب جب کواکب پرست اور بُت پرست بادشاہ سے لے کر عام افرادِ قوم نے اُن کے دلائل و بُرہان سے لاجواب ہو کر اپنی مادی طاقت کے گھمنڈ پر دہکتی آگ میں جھونک دیا تو اسی خالقِ اکبر نے جس کی دعوت و ارشاد کی خدمت حضرت ابراہیمؑ انجام دے رہے تھے "كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا" کہہ کر اپنی قدرت کا وہ عظیم الشان نشان (معجزہ) عطا کیا جس نے باطل کے پُرہیبت ایوان میں زلزلہ پیدا کر دیا اور تمام قوم اس خدائی مظاہرہ سے عاجز، حیران و پریشان اور ذلیل و خاسر ہو کر رہ گئی۔ "وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ":

اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ میں سحر (MAGIC) مصری علوم و فنون میں بہت زیادہ نمایاں اور امتیازی شان رکھتا تھا اور مصریوں کو فنِ سحر میں کمال حاصل تھا اس لیے حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کو قانونِ ہدایت (توراۃ) کے ساتھ ساتھ "یدِ بیضاء" اور عصا جیسے معجزات دیے گئے اور حضرتِ موسیٰؑ نے ساحرینِ مصر کے مقابلہ میں جب ان کا مظاہرہ کیا تو سحر کے تمام اربابِ کمال اس کو دیکھ کر یک زبان ہو کر پکار اُٹھے کہ بلاشبہ یہ سحر نہیں یہ تو اس سے جدا اور انسانی طاقت سے بالاتر مظاہرہ ہے جو خدائے برحق نے اپنے سچے پیغمبروں کی تائید کے لیے اُن کے ہاتھ پر کرایا ہے کیونکہ ہم سحر کی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں اور یہ کہہ کر انھوں نے فرعون اور قومِ فرعون کے سامنے بے خوفی کے ساتھ اعلان کر دیا کہ وہ آج سے موسیٰؑ اور ہارونؑ کے خدائے واحد ہی کے پرستار ہیں "فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ" مگر فرعون اور امراء دربار اپنی بدبختی سے یہی کہتے رہے "قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ" "فَلَمَّا جَآءَهُمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ":

اسی طرح حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے زمانہ میں علمِ طب (MEDICAL SCIENCE) اور علم الطبیعات (PHYSICS) کا بہت چرچا تھا اور یونان کے اطباء و حکماء (فلاسفر) کی طب و حکمت گرد و پیش کے ممالک و امصار کے اربابِ کمال پر بہت زیادہ اثر انداز تھی اور ملکوں میں صدیوں سے بڑے بڑے طبیب اور فلسفی اپنی حکمت و دانش اور کمالاتِ طب کا مظاہرہ کر رہے تھے مگر خدائے واحد کی توحید اور دینِ حق کی تعلیم سے خواص و عوام یکسر محروم تھے اور خود بنی اسرائیل بھی جو کہ نبیوں کی نسل میں ہونے پر ہمیشہ فخر کرتے رہتے تھے جن گمراہیوں میں مبتلا تھے سطورِ گذشتہ میں اُن پر روشنی پڑ چکی ہے۔

پس اِن حالات میں سنۃ اللہ نے جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو رشد و ہدایت کے لیے منتخب کیا تو ایک جانب ان کو حجۃ و برہان (انجیل) اور حکمت سے نوازا تو دوسری جانب زمانہ کے مخصوص حالات کے مناسب چند ایسے نشان (معجزات) بھی عطا فرمائے جو اُس زمانہ کے اربابِ کمال اور اُن کے پیرووں پر اس طرح اثر انداز ہوں کہ جویائے حق کو اس اعتراف میں کوئی جھجک باقی نہ رہے کہ بلاشبہ یہ اعمال اکتسابی علوم سے جدا محض خدائے تعالیٰ کی جانب سے رسولِ برحق کی تائید میں رونما ہوئے ہیں اور متعصب اور متمرد کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ رہے کہ ان کو "صریح جادو" کہہ کر اپنے بغض و حسد کی آگ کو اور مشتعل کرے۔

عیسیٰ (علیہ السلام) کے ان معجزات میں سے جن کا مظاہرہ انھوں نے قوم کے سامنے کیا قرآنِ عزیز نے "چار معجزات" کا بصراحت ذکر کیا ہے (۱) وہ خدا کے حکم سے مُردہ کو زندہ (۲) اور پیدائشی نابینا کو بینا اور جذامی کو چنگا کر دیا کرتے تھے (۳) وہ مٹی سے پرند بنا کر اس میں پھونک دیتے تھے اور خدا کے حکم سے اس میں روح پڑ جاتی تھی (۴) وہ یہ بھی بتا دیا کرتے تھے کہ کس نے کیا کھایا اور خرچ کیا اور کیا گھر میں ذخیرہ محفوظ رکھا ہے؟

قوموں میں ایسے مسیحا موجود تھے جن کے علاج و معالجے اور اکتسابی تدابیر سے

یا یس مریض شفا پاتے تھے اُن میں ماہر طبیعات ایسے فلسفی بھی کم نہ تھے جو روح و مادہ کے حقائق اور ارضی و سماوی اشیاء کی ماہیات پر بے نظیر نظریات و تجربیات کے مالک سمجھے جاتے تھے اور حقائقِ اشیاء میں اُن کی باریک بینی اور مہارت اربابِ کمال کے لیے باعثِ صد نازش تھی لیکن جب ان کے سامنے عیسٰی (علیہ السلام) نے اسباب و وسائل اختیار کیے بغیر ان اُمور کا مظاہرہ کیا تو ان پر بھی ہدایت و ضلالت کی قدرتی تقسیم کے مطابق یہی اثر پڑا کہ جس شخص کے قلب میں حق کی طلب موجزن تھی اس نے اقرار کیا کہ بلاشبہ اس قسم کا مظاہرہ انسانی دسترس سے باہر اور نبیِ برحق کی تائید و تصدیق کے لیے منجانب اللہ ہے اور جن دلوں میں رعونت حسد اور بغض و عناد تھا ان کے تعصب نے وہی کہنے پر مجبور کیا جو ان کے پیشرو انبیاء و رُسل سے کہتے آئے تھے۔ "اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ"

چوتھے معجزے کے بارے میں بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس کے مظاہرہ کی وجہ یہ پیش آئی کہ مخالفین جب ان کی دعوتِ رشد و ہدایت سے نفور ہو کر ان کو جھٹلاتے اور ان کے پیش کردہ آیاتِ بینات (معجزات) کو سحر اور جادو کہتے تو ساتھ ہی ازرہِ تمسخر یہ بھی کہہ دیا کرتے تھے کہ اگر تم خدائے تعالیٰ کے ایسے مقبول بندے ہو تو بتاؤ آج ہم نے کیا کھایا ہے اور کیا بچا رکھا ہے تب عیسٰی (علیہ السلام) ان کے تمسخر کو سنجیدگی سے بدل دیتے اور وحیِ الٰہی کی نصرت سے ان کے سوال کا جواب دیدیا کرتے تھے۔[1]

مگر قرآنِ حکیم نے اس معجزہ کو جس انداز میں بیان کیا ہے اس کو غور کے ساتھ مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس "نشان" کے مظاہرہ کی وجہ مفسرین کی بیان کردہ توجیہ سے زیادہ دقیق اور وسیع معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ عیسٰی (علیہ السلام) پیغامِ ہدایت و تبلیغِ حق کی خدمت انجام دیتے ہوئے اکثر و بیشتر لوگوں کو دُنیا میں انہماک، دولت و ثروت کے لالچ، اور عیش پسند زندگی کی رغبت سے باز رکھنے پر مختلف اسالیبِ بیان کے ذریعہ توجہ دلایا کرتے تھے تو جس طرح بعض سعید روحیں اس کلمۂ حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتی تھیں

[1] البدایہ والنہایہ ج ۲ ص ۸۲۔

اس کے برعکس شریر النفس انسان اُن کے مواعظِ حسنہ سے قلبی نفرت واعراض کے باوجود امتثالِ امر کرنے والی ہستیوں سے زیادہ ان کو یہ باور کراتیں کہ ہم تو ہمہ وقت آپ کے اس ارشاد کی تعمیل میں سرگرم رہتے ہیں لہٰذا قدرتِ حق نے یہ فیصلہ کیا کہ ان منافقین کی منافقت کی مضرت کو زائل کرنے کے لیے حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کو ایسا "نشان" عطا کیا جائے کہ اس ذریعہ سے حق و باطل منکشف ہو جائے اور حقوق اللہ اور حقوقِ انسانی کے اتلاف پر جو ذخیرہ اندوزی کا سامان کیا جارہا ہے اس کا پردہ چاک کر دیا جائے۔

اِن چہارگانہ خدائی نشان (معجزات) کے علاوہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بغیر باپ کے پیدائش بھی ایک عظیم الشان خدائی نشان" تھا جس کے متعلق ابھی تفصیلات سُن چکے ہو۔

حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کے ہاتھ پر جن معجزات کا ظہور ہوا یا اُن کی ولادت جس معجزانہ طریق پر ہوئی یہود نے ازرہِ حسد اُن کا انکار کیا تو کیا لیکن بعض فطرت پرست مدعیِ اسلام حضرات نے بھی اُن کے انکار کے لیے راہ پیدا کرنے کی ناکام سعی فرمائی ہے' اُن میں سے بعض حضرات وہ ہیں جنھوں نے اس انکار کو ذاتی مفاد کے لیے نہیں بلکہ فطرت پرست اور منکرینِ خدا یورپین علماء جدید سے مرعوبیت کی بناء پر یہ روش اختیار کی ہے تاکہ ان کی مذہبیت پر عجائب پرستی کا الزام عائد نہ ہو سکے، ان میں سر سید اور مولوی چراغ علی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں اور بعض وہ یہود صفت اشخاص ہیں جو اپنی ذاتی غرض اور ناپاک مقصد کی خاطر ازرہِ حسد و بغض حضرتِ مسیحؑ کے ان معجزات کا نہ صرف انکار کرتے ہیں بلکہ تاویلاتِ باطل کے پردہ میں اُن کا مضحکہ اُڑاتے ہیں' ان میں سے متنبیِ کاذب مرزا کادیانی اور مسٹر محمد علی لاہوری خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

کادیانی اور لاہوری نے تو یہ ظلم کیا ہے کہ حضرتِ مسیحؑ کے معجزہ "اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًاۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ" کے متعلق یہ کہدیا کہ مسیحؑ کا یہ عمل ایک تالاب کی مٹی کا رہینِ منت تھا، معجزہ کچھ نہیں تھا، اس تالاب کی مٹی کی یہ

خاصیت تھی کہ جب کسی پرند کی شکل بنائی جاتی اور منہ سے دُم تک سوراخ رکھ دیا جاتا تو ہوا بھر جانے سے اس میں آواز بھی پیدا ہو جاتی تھی اور حرکت بھی گویا العیاذ باللہ! ان بد بختوں کے نزدیک حضرت مسیحؑ کی جانب سے منکروں کے مقابلہ میں یہ معجزانہ صداقت نہیں تھی بلکہ مداری یا شعبدہ باز کا تماشہ تھا۔

اسی طرح احیاءِ موتیٰ (مُردہ کو زندہ کر دینا) کے معجزہ کا بھی انکار کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن عزیز نے یہ فیصلہ سنا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ موت کے بعد کسی کو اس دنیا میں قبل از قیامت زندگی نہیں بخشے گا۔ لیکن لطف یہ ہے کہ اگر پورے قرآن کو از اول تا آخر پڑھ لیا جائے تو کسی ایک آیت میں بھی آپ کو یہ فیصلہ نہیں ملے گا بلکہ اس دعویٰ کے خلاف متعدد مقامات پر اس کا اثبات پائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں موت دینے کے بعد حیاتِ تازہ بخشی ہے مثلاً سورۂ بقرہ کی آیات ذبحِ بقرہ کے واقعہ میں ارشاد ہے:

"فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا كَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى"[1] یا سورۂ بقرہ ہی کی اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے: "فَأَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ"[2] (الآیہ) یا اسی سورۃ میں تیسری جگہ مذکور ہے:

"وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتٰى قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا"[3] چنانچہ ان تمام واقعات میں "احیاءِ موتیٰ" کے صاف اور صریح معانی ثابت ہیں اور جن حضرات نے ان مقامات میں احیاءِ موتیٰ سے مجازی یا کنائی معنیٰ لیے ہیں اُن کو طرح طرح کی تاویلات کی پناہ لینی پڑی ہے مگر اُن کی تاویلات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ احیاءِ موتیٰ کی یہ تاویل اس وجہ سے نہیں کر رہے ہیں

---

[1] حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں بحث گذر چکی ہے۔ ملاحظہ ہو قصص القرآن ج ۲۔ [2] ایضاً۔
[3] قصص القرآن جلد اوّل میں بحث گذر چکی۔

کہ قرآن کے نزدیک اس کا دنیا میں وقوع ممنوع ہے بلکہ وہ کہتے ہیں کہ آیاتِ مسطورۂ بالا کے سیاق وسباق کے پیشِ نظر یہی معنی مناسب حال ہیں۔

غرض یہ دعویٰ کہ قرآن ممنوع قرار دیتا ہے کہ دارِ دنیا میں "احیاء موتی" وقوع پذیر ہو صرف مرزا قادیانی اور مسٹر لاہوری کے دماغ کی اُپج ہے جو قطعاً باطل اور غیر ثابت ہے اور اس کی پشت پر کوئی دلیل نہیں ہے، رہا یہ امر کہ خدا کے عام قانونِ فطرت کے ماتحت ایسا نہیں پیش آتا رہتا سو اگر ایسا ہوتا رہتا تو پھر یہ "معجزہ" ہرگز نہ کہلاتا اور خدائے برتر کا قانونِ خاص جو تصدیقِ انبیاء علیہم السلام کے مقصد سے کبھی کبھی مخالفین کے مقابلہ میں بطور تحدی (چیلنج) کے پیش آتا رہا ہے کوئی خصوصیت نہ رکھتا۔

اسی طرح حضرتِ مسیحؑ کی بن باپ پیدائش کے مسئلہ کا بھی انکار کیا گیا ہے اور قادیانی اور لاہوری نے بھی اس کے خلاف بے دلیل ہرزہ سرائی کی ہے لیکن اس مسئلہ کی موافق و مخالف آراء سے قطع نظر ایک غیر جانبدار منصف جب حضرتِ مسیحؑ کی پیدائش سے متعلق تمام آیاتِ قرآنی کا مطالعہ کرے گا تو اُس پر یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہو جائے گی کہ قرآن حضرتِ مسیحؑ سے متعلق یہود کی تفریط اور نصاریٰ کی افراط دونوں کے خلاف اپنا وہ فرضِ منصبی ادا کرنا چاہتا ہے جس کے لیے قرآن کی دعوتِ حق کا ظہور ہوا ہے، یہود اور نصاریٰ اس بارہ میں دو قطعاً مخالف اور متضاد سمتوں میں چلے گئے ہیں، یہود کہتے ہیں کہ حضرتِ مسیح علیہ السلام مفتری اور کاذب اور شعبدہ باز تھے اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ وہ خدا، خدا کے بیٹے یا ثالثِ ثلٰثہ تھے، ان حالات میں قرآن نے ان اوہام وظنون کے خلاف علم ویقین کی راہ دکھلاتے ہوئے دونوں کے خلاف یہ فیصلہ دیا کہ راہِ حق افراط وتفریط کے درمیان ہے اور صراطِ مستقیم کی یہی سب سے بڑی شناخت ہے۔

وہ کہتا ہے واضح رہے کہ حضرتِ مسیحؑ مفتری اور کاذب نہیں تھے بلکہ خدا کے سچے پیغمبر اور راہِ حق کے داعیِ صادق تھے، انھوں نے دعوتِ حق کی تصدیق کے لیے جو بعض

عجیب باتیں کر دکھائیں وہ معجزاتِ انبیاء کی فہرست میں شامل ہیں نہ کہ ساحروں اور شعبدہ بازوں کی' اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی مگر اس سے یہ کیسے لازم آسکتا ہے کہ وہ خدا یا خدا کے بیٹے ہو گئے، کیا جو شخص پیدائش کا محتاج ہو اور پیدائش میں بھی ماں کے پیٹ کا محتاج اور جو شخص بشری لوازم کھانے پینے کا محتاج ہو وہ عبد اور بشر کے ماسوا خدا، یا معبود ہو سکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔

یہاں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ نصاریٰ نے حضرتِ مسیح علیہ السلام کے متعلق الوہیت کا جو عقیدہ قائم کیا تھا اس کا بہت بڑا سہارا یہی واقعہ تھا جیسا کہ وفدِ نجران اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی باہمی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے۔

تو جبکہ قرآن نے یہود و نصاریٰ کے ان تمام باطل عقائد کی واضح الفاظ میں تردید کر کے جو انھوں نے حضرتِ مسیحؑ کے متعلق قائم کر لیے تھے اپنا فریضۂ اصلاح انجام دیا، یہ کیسے ممکن تھا کہ اگر بن باپ کے پیدائش کا واقعہ باطل اور غیر واقعی تھا اور جو سہارا بن رہا تھا الوہیتِ مسیحؑ کا، اس کے متعلق واضح طور سے قرآن تردید نہ کرتا بلکہ اس کے برعکس وہ جگہ جگہ اس واقعہ کو ٹھیک اس طرح بیان کرتا جاتا جیسا کہ متی کی انجیل میں بیان کیا گیا ہے' اس کا فرض تھا کہ سب سے پہلے اسی پر ضرب کاری لگاتا اور صرف اس قدر کہہ کر کہ حضرتِ مسیحؑ کا باپ فلاں شخص تھا اس ساری عمارت کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکتا جس پر الوہیتِ مسیحؑ کی بنیاد رکھی گئی ہے مگر اس نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ یہ بات کسی طرح بھی مسیحؑ کی الوہیت کی دلیل نہیں بن سکتی، کیوں؟ اس لیے کہ ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ﴾ پس اگر بن باپ کی پیدائش، مسیحؑ کو درجۂ الوہیت دے سکتی ہے تو آدمؑ کو اس سے زیادہ الوہیت کا حق حاصل ہے کہ وہ بن ماں باپ کے پیدا ہوا ہے۔

بہر حال جن تاویل پرستوں نے حضرتِ مسیحؑ کی بن باپ پیدائش سے متعلق آیات کے

جُملوں کو جُدا جُدا کر کے غلط احتمالات پیدا کیے ہیں وہ اِس لیے باطل ہیں کہ جب اِس واقعہ سے متعلق آیات کو یکجا کر کے مُطالعہ کیا جائے تو ایک لمحہ کے لیے بھی آیات کے معانی میں بن باپ پیدایش کے معنی کے ماسوا دوسرے کسی بھی احتمال کی گنجایش باقی نہیں رہتی مگر یہ کہ عربی زبان کے الفاظ کے معین مدلولات و اِطلاقات میں تحریفِ معنوی پر بیجا جسارت کی جائے۔

نیز بقول مولانا ابوالکلام جن اصحاب نے بغیر باپ کے پیدایش سے متعلِق آیات میں تاویلِ باطل کی ہے اُن کی دلیل کا مَدار صرف اِس بات پر ہے کہ حضرتِ مریمؑ کا نکاح اگرچہ یوسف سے ہو چکا تھا مگر رخصتی عمل میں نہیں آئی تھی' ایسی صورت میں میاں بیوی کے درمیان مقاربت گو شریعتِ موسوی کے خلاف نہیں تھی تاہم وقت کے رسم و رواج کے قطعاً خلاف تھی اس لیے حضرتِ مسیحؑ کی پیدایش لوگوں پر گراں گذری' لیکن اوّل تو اِس واقعہ کا ثبوت ہی موجود نہیں سب بے سند بات ہے دوسرے یہودیوں نے حضرتِ مریمؑ پر جو بہتان لگایا تھا' انسائیکلوپیڈیا آف بائبل" میں تصریح ہے کہ اِس بہتان کی نسبت ایک شخص سپنتھرا اٹالی کی جانب کی تھی نہ کہ یوسفِ نجار کی جانب، اسلیے تاویل کی یہ بُنیاد ہی ازسرتاپا غلط اور بے اصل ہے۔[1]

علاوہ ازیں جہاں تک اس مسئلہ کا عقلی پہلو ہے سو عقل بھی اس کے امکان کو ممنوع اور محال قرار نہیں دیتی بلکہ اس کو ممکن الوقوع تسلیم کرتی ہے' کیا سائنس کی موجودہ دُنیا سے آشنا حضرات اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ آج جبکہ سائنس کی جدید تحقیق نے نظریوں سے آگے قدم بڑھا کر مشاہدہ اور تجربہ سے یہ ثابت کر دیا کہ دوسرے حیوانات کی طرح انسان کی خلقت، پیدایش بھی بیضہ سے ہوتی ہے اور اس کو اصطلاح میں خلیۂ تخم کہتے ہیں' یہ خلیہ مرد اور عورت دونوں میں ہوتا ہے اور حمل قرار پا جانے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مرد کے خلیاتِ تخم عورت کے بیضہ میں داخل ہو جاتے ہیں' یہی خلیۂ زندگی اور حیات کا تخم ہے

[1] ترجمان القرآن ج ۲ ۔ ۲ خلیہ کو انگریزی میں (CATL) کہتے ہیں۔

اور قدرتِ حق نے اس کو بہت باریک جثہ عطا فرمایا ہے تو اس تحقیق نے امریکہ اور انگلینڈ کے سائنسدانوں کو اس جانب متوجہ کر دیا ہے کہ کیوں وہ ایک ایسی کوشش نہ کریں کہ بغیر مرد کی مقاربت کے جنسِ رجال کے خلیاتِ تخم کو آلات کے ذریعہ جنسِ اناث کے مبیض میں داخل کرکے "وجودِ انسانی" حاصل کرنے میں کامیاب ہوں۔ سائنس والوں کا یہ تخیل ابھی عملی حیثیت سے کتنا ہی دور ہو لیکن اس سے یہ نتیجہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ عقل یہ ممکن سمجھتی ہے کہ انسانی پیدائش، آنکھوں دیکھے عام طریقِ ولادت کے علاوہ بعض دوسرے طریقوں سے بھی ہو سکتی ہے اور ان کو قانونِ قدرت کے خلاف اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ہم نے قدرت کے تمام قوانین کا احاطہ نہیں کر لیا ہے بلکہ انسان جس قدر علم و دانش کی جانب بڑھتا جاتا ہے اس کے سامنے قدرتِ حق کے قانون کے نئے نئے گوشے کھلتے جاتے ہیں۔

پس اگر یہ صحیح ہے کہ جو بات کل ناممکن نظر آتی تھی آج وہ ممکن کہی جا رہی ہے اور جلد یا بدیر اس کے وقوع پر یقین کیا جا رہا ہے تو نہیں معلوم پھر اُس قانونِ قدرت سے انکار کر دینے کے کیا معنی ہیں جس کا علم اگرچہ ابھی تک ہم کو حاصل نہیں ہے مگر انبیاء و رسل جیسی قدسی صفات ہستیوں پر اس علم کی حقیقت آشکارا ہے تو کیا علمی دلیل کا یہ بھی کوئی پہلو ہے کہ جس بات کا ہم کو علم نہ ہو اور عقل اُس کو ناممکن اور محال نہ ثابت کرتی ہو اُس کا انکار صرف "عدمِ علم" کی وجہ سے کر دیا جائے خصوصاً جب یہ انکار ایک مدعیِ مسیحیت و نبوت کی جانب سے ہو تو اُس کے لیے تو یہی کہا جا سکتا ہے۔

اب ان "آیاتِ بینات" کو قرآنِ حکیم سے سُنیے اور موعظت و عبرت کے حصول کا سروسامان کیجیے کہ ماضی کے اِن واقعات کی تذکیر سے قرآن کا یہی عظیم مقصد ہے۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ	اور خدا سکھاتا ہے اس (عیسیٰ) کو کتاب حکمت تورات
وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ڏ	اور انجیل اور وہ رسول ہے بنی اسرائیل کی جانب
اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ	(وہ کہتا ہے) کہ بیشک میں تمہارے پاس تمہارے

ل۔ اس کا قطر انچ کا ۱/۴۰۰ جز ہے۔

أَنِّيْ أَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِ الْمَوْتٰى بِإِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۚ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۟ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ ۝ إِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۗ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝

(سورۂ آلِ عمران پ ۳ ع ۵)

پروردگار کی جانب سے "نشان" لے کر آیا ہوں وہ یہ کہ میں تمہارے لیے مٹی سے پرند کی شکل بناتا پھر اُس میں پھونک دیتا ہوں اور وہ خدا کے حکم سے زندہ پرند بن جاتا ہے اور پیدائشی اندھے کو سوانکھا کر دیتا اور سپید داغ کے جذام کو اچھا کر دیتا ہوں اور خدا کے حکم سے مُردہ کو زندہ کر دیتا ہوں اور تم کو بتا دیتا ہوں جو تم کھا کر آتے ہو اور جو تم گھر میں ذخیرہ رکھ آتے ہو، سو اگر تم تحقیقی ایمان رکھتے ہو تو بلاشبہ ان اُمور میں (میری صداقت اور منجانب اللہ ہونے کے لیے) "نشان" ہے اور میں تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں جو میرے سامنے ہے اور (اس لیے بھیجا گیا ہوں) تاکہ بعض اُن چیزوں کو جو تم پر حرام کی گئی ہیں تمہارے لیے حلال کر دوں تمہارے لیے پروردگار کی کے پاس سے "نشان" لایا ہوں، پس تم اللہ سے ڈرو، اور (اُس کے دیے ہوئے احکام میں) میری اطاعت کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے، سو اُسکی عبادت کرو، یہی سیدھی راہ ہے۔

وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِإِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِيْ

اور (اے عیسیٰ ابن مریم! تو میری اس نعمت کو یاد کر) جبکہ تو میرے حکم سے گارے سے پرند کی شکل بنا دیتا اور پھر اس میں پھونک دیتا تھا اور وہ میرے حکم سے زندہ پرند بن جاتا تھا اور جبکہ تو میرے حکم سے پیدائشی اندھے کو سوانکھا اور سپید داغ کے کوڑھ کو اچھا کر دیتا تھا اور جبکہ

وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰی	تو میرے حکم سے مُردہ کو زندہ کر کے قبر سے
بِاِذْنِیْ۔ (سورۂ مائدہ پ ع)	نکالتا تھا۔
فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ	پھر جب وہ (عیسٰی علیہ السلام) اُن کے پاس کھُلے
قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ۔	نشان لے کر آیا تو انھوں نے (بنی اسرائیل نے)
(سورۂ الصف پ ع)	کہا "یہ تو کھُلا ہوا جادو ہے"۔

انبیاء (علیہم السلام) نے جب کبھی بھی قوموں کے سامنے آیات اللہ کا مظاہرہ کیا ہے تو منکروں نے ہمیشہ اُن کے متعلق ایک بات ضرور کہی ہے "یہ تو کھلا ہوا جادو ہے"۔ پس کیا ایک جویائے حق اور غیر متعصب انسان کے لیے یہ جواب اِس جانب رہنمائی نہیں کرتا کہ انبیاء علیہم السلام کے اس قسم کے مظاہرے ضرور عام قوانینِ قدرت سے جُدا ایسے علم کے ذریعہ ظہور پذیر ہوتے تھے جو صرف ان قدسی صفات ہستیوں کے لیے ہی مخصوص رہا ہے اور اِن کے علاوہ انسانی دُنیا اس کے فہمِ حقیقت سے بہرہ مند نہیں ہوئی تب ہی اُن لوگوں کے پاس جو از رہِ عناد و ضد انکار پر تُلے ہوئے تھے، اس کے انکار کے لیے اِس سے بہتر دوسری تعبیر نہیں تھی کہ وہ ان امور کو "سحر و جادو" کہہ دیں۔ لہٰذا ان اُمور کو سحر و جادو کہنا بھی ان کے "معجزہ" اور "نشانِ خداوندی" ہونے کی زبردست دلیل ہے۔

حضرتِ عیسٰی (علیہ السلام) اور اُن کی تعلیمات کا خُلاصہ

بہرحال حضرتِ عیسٰی (علیہ السلام)، بنی اسرائیل کو حجۃ و بُرہان اور آیات اللہ کے ذریعہ دینِ حق کی تعلیم دیتے رہتے اور ان کے بھُولے ہوئے سبق کو یاد دلا کر مُردہ قلوب میں حیاتِ تازہ بخشتے رہتے تھے۔

خدا اور خدا کی توحید پر ایمان، انبیاء و رسل (علیہم السلام) کی تصدیق، آخرت (معاد) پر ایمان، ملائکۃ اللہ پر ایمان، قضاء و قدر پر ایمان، خدا کے رسولوں اور کتابوں پر ایمان، اخلاقِ حسنہ کے اختیار، اعمالِ سیئہ سے پرہیز و اجتناب، عبادتِ الٰہی سے رغبت، دُنیا میں انہماک سے نفرت اور خدا کے کنبہ (مخلوقِ خدا) سے محبت و مودت یہی وہ تعلیم د

تلقین تھی جو اُن کی زندگی کا مشغلہ اور فرضِ منصبی بنا ہوا تھا وہ بنی اسرائیل کو توراۃ، انجیل، اور حکیمانہ پند و نصائح کے ذریعہ ان امُور کی جانب دعوت دیتے مگر بدبخت یہود اپنی فطرتِ کج صدیوں کی مسلسل سرکشی اور تعلیمِ الٰہی سے بغاوت کی بدولت اس درجہ تشدد ہو گئے تھے اور انبیاء و رسل کے قتل نے اُن کے قلوب کو حق و صداقت کے قبول میں اس درجہ سخت بنا دیا تھا کہ ایک مختصر سی جماعت کے علاوہ ان کی جماعت کی بڑی اکثریت نے ان کی مخالفت اور ان کے ساتھ حسد و بغض کو اپنا شعار اور اپنی جماعتی زندگی کا معیار بنا لیا اور اس لیے انبیاء کی سنّتِ راشدہ کے مُطابق رشد و ہدایت کے حلقہ بگوشوں میں دُنیوی جاہ و جلال کے لحاظ سے کمزور و ناتواں اور زیر دست پیشہ ور طبقہ کی اکثریت نظر آتی تھی ضعفاء کا یہ طبقہ اگر اخلاص و دیانت کے ساتھ حق کی آواز پر لبیک کہتا تو بنی اسرائیل کا وہ سرکش و مغرور حلقہ ان پر اور خدا کے پیغمبر پر پھبتیاں کستا، توہین و تذلیل کا مظاہرہ کرتا اور اپنی عملی جد و جہد کا بڑا حصہ معاندت و مخالفت میں صرف کرتا رہتا تھا:

وَلَمَّا جَآءَ عِيسٰى بِالْبَيِّنٰتِ	اور جب عیسیٰ ظاہر دلائل لے کر آئے تو کہا: بلاشبہ
قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ	میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں اور اس لیے
وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ	آیا ہوں تاکہ ان بعض باتوں کو واضح کر دوں جن کے
تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ	متعلق تم آپس میں جھگڑ رہے ہو، پس اللہ سے ڈرو اور
وَاَطِيْعُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّيْ	میری اطاعت کرو، بیشک اللہ تعالیٰ ہی میرا اور
وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ	تمہارا پروردگار ہے سو اس کی پرستش کرو یہی سیدھی
مُّسْتَقِيْمٌ ۝ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ	راہ ہے" پھر وہ آپس میں گروہ بندی کرنے لگے سو
مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا	ان لوگوں کے دردناک عذاب کے ذریعہ ہلاکت اور
مِنْ عَذَابِ يَوْمٍ اَلِيْمٍ (زخرف پ ۲۵)	خرابی ہے۔
وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ	اور (وہ وقت یاد کرو) جب عیسیٰ ابن مریم نے کہا

يٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ ؎۱

اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا پیغمبر ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں توراۃ کی جو میرے سامنے ہے اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئیگا نام اُس کا احمد ہے، پس جب عیسیٰ علیہ السلام آیا اُن کے پاس معجزات لے کر تو وہ (بنی اسرائیل) کہنے لگے یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ ۝

(سورۂ آلِ عمران پ ۳ ع ۱۴)

پھر جب عیسیٰ نے اُن (بنی اسرائیل) سے کفر محسوس کیا تو کہا "اللہ کی جانب میرا کون مددگار ہے؟" حواریوں نے جواب دیا: ہم ہیں اللہ کے (دین کے) مددگار۔ ہم اللہ پر ایمان لے آئے اور تم گواہ رہنا کہ ہم مُسلمان ہیں، اے ہمارے پروردگار جو تو نے اُتارا ہے ہم اس پر ایمان لے آئے اور ہم نے رسول کی پیروی اختیار کر لی پس تو ہم کو (دینِ حق کی) گواہی دینے والوں میں سے لکھ لے۔

حواریِ عیسیٰ علیہ السلام | مگر عیسیٰ (علیہ السلام) معاندین ومخالفین کی دراندازیوں اور سرتاسر شرانگیزیوں کے باوجود اپنے فرضِ منصبی "دعوۃ الی الحق" میں سرگرمِ عمل رہتے اور شب وروز بنی اسرائیل کی آبادیوں اور بستیوں میں پیغامِ حق سُناتے اور روشن دلائل اور واضح آیات اللہ کے ذریعہ لوگوں کو قبولِ حق وصداقت پر آمادہ کرتے رہتے تھے اور خدا اور حکمِ خدا سے سرکش اور باغی انسانوں کی اس بھیڑ میں ایسی سعید رُوحیں بھی نکل آتی تھیں جو عیسیٰ (علیہ السلام) کی دعوتِ حق پر لبیک کہتی اور سچائی کے ساتھ دینِ حق کو قبول کر لیتی تھیں، ان ہی پاک بندوں میں وہ مقدس ہستیاں بھی تھیں جو حضرتِ عیسیٰؑ کے شرفِ صحبت سے فیضیاب ہو کر

؎۱ سورہ الصف پ ۲۸ ع ۱۔

نہ صرف ایمان ہی لے آئی تھیں بلکہ دینِ حق کی سربلندی اور کامیابی کے لیے انھوں نے جان و مال کی بازی لگا کر خدمتِ دین کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا اور اکثر و بیشتر حضرت مسیحؑ کے ساتھ رہ کر تبلیغ و دعوت کو سرانجام دیتی تھیں، اسی خصوصیت کی وجہ سے وہ "حواری" (رفیق) اور "انصار اللہ" (اللہ کے دین کے مددگار) کے مقدس القاب سے معزز و ممتاز کی گئیں چنانچہ ان بزرگ ہستیوں نے پیغمبرِ خدا کی حیاتِ پاک کو اپنا اُسوہ بنایا اور سخت سے سخت اور نازک سے نازک حالات میں بھی اُن کا ساتھ نہیں چھوڑا اور ہر طرح معاون و مددگار ثابت ہوئیں:

وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّٖنَ	اور (اے عیسٰی وہ وقت یاد کرو) جبکہ میں نے حواریوں
اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ قَالُوْٓا	کی جانب (تیری معرفت) یہ وحی کی کہ مجھ پر اور میرے
اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا	پیغمبر پر ایمان لاؤ تو انھوں نے جواب دیا "ہم ایمان
مُسْلِمُوْنَ o (سورۂ مائدہ پ ۷ ع ۶)	لائے اور اے خدا! تو گواہ رہنا کہ ہم بلاشبہ مسلمان ہیں۔
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ	اے ایمان والو! تم اللہ کے (دین کے) مددگار ہو جاؤ
اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ	جیسا کہ عیسٰی ابن مریمؑ نے جب حواریوں سے کہا:
لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ	"اللہ کے راستہ میں کون میرا مددگار ہے" — تو
قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ	حواریوں نے جواب دیا "ہم ہیں اللہ (کی راہ)
فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ	کے مددگار پس بنی اسرائیل کی ایک جماعت
وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ	ایمان لائی اور ایک گروہ نے کفر اختیار کیا سو ہم نے
اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا	مومنوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں تائید کی
ظٰهِرِيْنَ o (الصف پ ۲۸ ع ۱۰)	پس وہ (مومن) غالب رہے۔

گذشتہ سطور میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ عیسٰی (علیہ السلام) کے یہ حواری بیشتر غریب اور مزدور طبقہ میں سے تھے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت و تبلیغ کے ساتھ "سنۃ اللہ" یہی جاری رہی ہے کہ ان کی صدائے حق پر لبیک کہنے اور دینِ حق پر جان سپاری کا مظاہرہ

کرنے کے لیے اوّل غریب اور کمزور طبقہ ہی آگے بڑھتا ہے اور زبردست ہی فداکاری کا ثبوت دیتے ہیں اور وقت کی صاحبِ اقتدار اور زبردست ہستیاں اپنے غرور اور گھمنڈ کے ساتھ مقابلہ اور معارضہ کے لیے سامنے آتی اور معاندانہ سرگرمیوں کے ساتھ اعلاء کلمۃ اللہ کی راہ میں سنگِ گراں بن جاتی ہیں لیکن جب خدائے تعالیٰ کا قانونِ پاداشِ عمل اپنا کام کرتا ہے تو نتیجہ میں فلاح و کامرانی ان کمزور فدایانِ حق ہی کا حصہ ہو جاتا ہے اور متکبر و مغرور ہستیاں یا ہلاکت کے قعرِ ذلت میں جا گرتی ہیں اور یا مقہور و مغلوب ہو کر سرنگوں ہو جانے کے ماسوا کوئی چارۂ کار نہیں دیکھتیں۔

حواریٔ عیسیٰ علیہ السلام اور قرآن و انجیل کا موازنہ

قرآنِ عزیز نے عیسیٰ (علیہ السلام) کے حواریوں کی منقبت بیان کی ہے، سورۂ آلِ عمران کی آیات تمہارے سامنے ہیں، حضرتِ مسیح (علیہ السلام) جب دینِ حق کی نصرت و یاری کے لیے پکارتے ہیں تو سب سے پہلے جنھوں نے "نحن انصار اللہ" کا نعرہ بلند کیا وہ یہی پاک ہستیاں تھیں، سورۂ صف میں اللہ ربّ العٰلمین نے جب مسلمانوں کو مخاطب کر کے "کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ" کی ترغیب دی تو تذکیر بایام اللہ کے پیشِ نظر ان ہی مقدس ہستیوں کا ذکر کیا اور ان ہی کی مثال اور نظیر دے کر نصرتِ حق کے لیے برانگیختہ کیا اور سورۂ مائدہ میں اُن کے قبولِ ایمان اور دعوتِ حق کے سامنے انقیاد و تسلیم کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بھی اُن کے خلوص، حق طلبی اور حق کوشی کی زندہ جاوید تصویر ہے۔ یہ سب کچھ تو اس وقت کا حال ہے جب تک حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) ان کے درمیان موجود ہیں لیکن آپ کے "رفع الی السماء" کے بعد بھی ان کی پُر استقامت اور دینِ قویم کی فداکارانہ خدمت کے متعلق سورۂ صف کی آیت فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ" میں کافی اشارہ موجود ہے اور شاہ عبدالقادر (نوراللہ مرقدہٗ) نے اسی بنا پر آیتِ زیرِ بحث کی تفسیر کرتے ہوئے تاریخی شہادت کا اِس طرح ذکر فرمایا ہے:

حضرتِ عیسیٰؑ کے بعد ان کے یاروں (حواریوں) نے بڑی محنتیں کی ہیں تب ان کا دین

نشر ہوا، ہمارے حضرت کے پیچھے بھی حنفیوں نے اس سے زیادہ کیا۔
مگر اس کے برعکس بائبل (انجیل) بعض مقامات میں اگر ان کی منقبت اور مدح سرائی میں رطب اللسان ہے تو دوسری جانب ان کو بزدل اور منافق ثابت کرتی ہے۔ انجیل یوحنا میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے مشہور و معتمد علیہ حواری یہودا کے متعلق اس وقت کا حال جب حضرت یسوع (علیہ السلام) کو یہودی گرفتار کرنا چاہتے ہیں' اس طرح مذکور ہے:

یہ باتیں کہہ کر یسوع اپنے دل میں گھبرایا اور یہ گواہی دی کہ میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ تم میں سے ایک شخص مجھے پکڑوا دیگا۔ شاگرد شبہ کرکے کہ وہ کس کی نسبت کہتا ہے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے .... ایک شخص جس سے یسوع محبت کرتا تھا..... اس نے یسوع کی چھاتی کا سہارا لے کر کہا اے خداوند وہ کون ہے؟ یسوع نے جواب دیا کہ جسے میں نوالہ ڈبو کر دیدوں گا وہی ہے' پھر اس نے نوالہ ڈبو دیا اور لے کر شمعون اسکریوتی کے بیٹے یہوداہ کو دیدیا اور اس نوالہ کے بعد شیطان اس میں سما گیا۔[1]

اور انجیل متی میں اُس شمعون پطرس حواری کے متعلق جو "بقول اناجیل ساری عمر حضرت یسوع کا پیارا اور معتمد علیہ رہا" یہ مسطور ہے :۔

شمعون پطرس نے اس سے کہا' اے خداوند تو کہاں جاتا ہے' یسوع نے جواب دیا کہ جہاں میں جاتا ہوں اب تو میرے پیچھے نہیں آسکتا مگر بعد میں میرے پیچھے آئیگا پطرس نے اس سے کہا اے خداوند میں اب تیرے پیچھے کیوں نہیں آسکتا' میں تو تیرے لیے اپنی جان دوں گا' یسوع نے جواب دیا، کیا تو میرے لیے اپنی جان دے گا؟ میں تجھ سے سچ سچ کہتا ہوں کہ مرغ بانگ نہ دے گا جب تک کہ تو تین بار میرا انکار نہ کرے گا۔[2]

اور اسی متی کی انجیل میں تمام شاگردوں (حواریوں) کی بزدلی اور حضرت یسوع کو بے یار و مددگار چھوڑ کر فرار ہو جانے کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

"اس پر سارے شاگرد اُسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔"[3]

[1] باب ۱۳ آیات ۲۷-۲۱۔ [2] متی باب ۲۷ آیت ۴۶۔ [3] باب ۲۶ آیت ۵۶

اِن حوالجات سے تین ایسی باتیں ثابت ہوتی ہیں جن کو کسی طرح بھی عقل و نقل تسلیم کرنے کو تیار نہیں، اوّل یہ کہ جو شاگرد اور حواری حضرتِ یسوعؑ کے زیادہ قریب، ان کے معتمد علیہ اور ان کی نگاہوں میں محبوب تھے وہ نتیجہ میں نہ صرف بزدل بلکہ "منافق" نکلے مگر عقل و نقل کا فیصلہ یہ ہے کہ اگرچہ ہر ایک پیغمبر اور مصلح کی جماعت میں ایک چھوٹا سا گروہ منافقین کا عموماً ہوتا ہے جو اپنی دُنیوی اغراض کی خاطر بہ کراہتِ قلب ظاہرداری کے طور پر شریکِ جماعت ہونا مفید سمجھتا ہے مگر ایک مصلح اور پیغمبر کے درمیان ہمیشہ سے یہ فرق رہا ہے کہ مصلح خواہ اپنی جماعت کے منافقین سے پوری طرح آگاہ نہ ہو سکے لیکن نبی اور پیغمبر کو "وحی الٰہی" کے ذریعہ شروع ہی سے مخلص اور منافق کی اطلاع دیدی جاتی ہے تاکہ ایک منکر و کافر سے زیادہ جس گروہ سے جماعتِ حق اور اس کی دعوت و اصلاح کو ضرر پہنچ سکتا ہے، نبی اُس کے حالات سے غافل نہ رہے۔ پس اسی پر کوئی منافق کسی وقت اور کسی حالت میں بھی نبی اور پیغمبر کا محبوب، معتمد علیہ اور مقرب نہیں ہو سکتا، البتہ یہ ایک جدا امر ہے کہ نبی، دینِ حق کی مصلح کی وجہ سے اس کے ساتھ اعراض اور درگذر کا طریقِ عمل مناسب سمجھے جیسا کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے ایک صحابی کے اس سوال پر کہ جب آپ منافقین کے حالاتِ منافقت سے آگاہ ہیں تو اُن کا مقابلہ کر کے کیوں اُن کو کیفرِ کردار تک نہیں پہنچا دیتے تاکہ جماعتِ مسلمین کو اُن کی منافقت سے نجات ملے" یہ جواب دیا: "اس لیے کہ ان کے قبولِ ایمان کی ظاہرداری کے بعد ہمارے سخت گیر طریقہ کے متعلق غیر مسلموں کو یہ دھوکا نہ ہو کہ وہ کہہ اٹھیں "محمدؐ، اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کرنے سے نہیں چوکتے۔"

دوسری بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ یہوداہ کے اندر شیطان نے اس وقت حلول کیا جب حضرتِ یسوعؑ نے اپنے ہاتھ سے اس کو نوالہ ڈبو کر دیا، مگر یہ بات بھی اس لیے عقل و نقل کے خلاف ہے کہ بزرگوں اور مقدس انسانوں کے ہاتھوں سے جو کچھ ہوتا ہے اس کا اثر برکت، طہارت اور تقدیس تو ہوا کرتا ہے لیکن شیطان کا حلول اور بدی کا نفوذ نہیں

ہوا کرتا، بیشک یہ درست ہے کہ جب حق کا ترازو قائم ہوتا ہے تو اس سے کھرا اور کھوٹا دونوں کی حقیقت کا انکشاف ہوجایا کرتا ہے لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ اس پیمانہ کے مَس کرنے سے کسی کھرے میں کھوٹ پیدا ہوجائے اور انجیل کے اس بیان میں صورتِ حال پہلی نہیں بلکہ دوسری ہے۔

تیسری بات یہ کہ حضرتِ یسوعؑ کے تمام اُن حواریوں میں سے جن کی مدح و ستایش میں جگہ جگہ بائبل رطب اللسان ہے" ایک، دو، یا دس پانچ نہیں سب کے سب نہایت بزدلی اور غداری کے ساتھ اس وقت حضرتِ مسیحؑ سے کنارہ کش ہوگئے، جب دینِ حق کی حمایت و نصرت کے لیے سب سے زیادہ اُن کی ضرورت تھی اور جب کہ پیغمبرِ خدا (علیہ الصلوٰۃ والسلام) دشمنوں کے نرغہ میں پھنسے ہوئے تھے۔

مگر انجیل کی اس شہادت کے خلاف سورۂ آلِ عمران میں قرآنِ عزیز نے یہ شہادت دی ہے کہ اس نازک وقت میں جب حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے حواریوں کو دینِ حق کی نصرت و یاری کے لیے پکارا تو سب نے اولوالعزمی اور فداکارانہ جذبہ کے ساتھ یہ جواب دیا: "نحن انصار اللہ" اور پھر حضرتِ مسیحؑ کے سامنے اپنی استقامتِ دین اور اپنے مخلصانہ ایمان کے متعلق شہادت دے کر نصرت کا پورا پورا یقین دلایا اور پھر سورۂ صف میں قرآنِ عزیز نے یہ بھی ظاہر کیا کہ ان حواریوں نے حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) سے جو کچھ کہا تھا ان کی موجودگی میں اور ان کے بعد سچی وفاداری کے ساتھ نباہا اور بلاشبہ مومنینِ صادقین ثابت ہوئے اور اس لیے اللہ تعالیٰ نے بھی اُن کی مدد فرمائی اور ان کو دشمنانِ حق کے مقابلہ میں کامیاب کیا۔

انجیل اور قرآن کے اِس موازنہ کو دیکھ کر ایک انصاف پسند یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس معاملہ میں "حق" قرآن کے ساتھ ہے اور علماءِ نصاریٰ نے انجیل میں تحریف کرکے اِس قِسم کے گھڑے ہوئے واقعات کا اضافہ اِس لیے کیا ہے تاکہ صدیوں بعد کے خود ساختہ

عقیدہ عقیدۂ صلیب مسیح سے متعلق یہ داستان صحیح ترتیب پر قائم ہو سکے کہ جب مسیح (علیہ السلام) کو صلیب پر لٹکایا گیا تو انھوں نے یہ کہتے کہتے جان دیدی ایلی ایلی لما سبقتنی "اے خدا اے خدا! تو نے مجھے کیوں یکہ و تنہا چھوڑ دیا" اور کسی ایک شخص نے بھی مسیح کا ساتھ نہ دیا — بہر حال حواریوں سے متعلق بائبل کی یہ تصریحات محرّف اور خود ساختہ داستان سرائی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔

نزولِ مائدہ | مخلص اور فداکار حواریوں کی جماعت اگرچہ صادق الایمان اور راسخ الاعتقاد تھی مگر علمی و مجلسی تکلفاتِ گفت و شنید کے لحاظ سے سادہ لوح اور ضروریاتِ زندگی کے سروسامان کے اعتبار سے غربا اور ضعفاء کی جماعت تھی اس لیے انھوں نے ازراہِ سادگی و سادہ دلی حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) سے یہ درخواست کی کہ جس خدائے برتر میں یہ لامحدود طاقت ہے کہ اس کا ایک نمونہ آپ کی ذاتِ اقدس اور وہ نشان (معجزات) ہیں خدائے تعالیٰ نے جن کو آپ کی تصدیقِ نبوّت و رسالت کے لیے آپ کے ہاتھ پر ظاہر فرمایا اُس خدا میں یہ طاقت بھی ضرور ہوگی کہ وہ ہمارے لیے غیب سے ایک دسترخوان نازل کر دیا کرے تاکہ ہم روزی کمانے کی فکر سے آزاد ہو کر باطمینانِ قلب یادِ خدا اور دینِ حق کی دعوت و تبلیغ میں مصروف رہا کریں۔ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) نے یہ سُن کر اُن کو نصیحت فرمائی کہ اگرچہ خدا کی طاقت بے غایت اور بے نہایت ہے لیکن کسی سچّے بندہ کے لیے یہ زیبا نہیں کہ وہ اس طرح خدا کو آزمائے، پس خدا سے ڈرو اور ایسے خیالات سے بچو، یہ سُن کر حواریوں نے جواب دیا "ہم اور خدا کو آزمائیں، حاشا ہمارا تو یہ مقصد نہیں، ہمارا تو یہ مطلب ہے کہ رزق کی جدوجہد سے دل کو مطمئن کر کے خدا کے اِس عطیہ کو زندگی کا سہارا بنا لیں اور آپ کی تصدیق میں ہم کو حق الیقین کا اعتقادِ راسخ حاصل ہو جائے اور ہم اس کی خدائی پر کائناتِ انسانی کے لیے شاہدِ عدل بن جائیں۔"

حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) نے جب اُن کا بڑھتا ہوا اِصرار دیکھا تو بارگاہِ الٰہی میں دعا،

کی "اے خدا! تو ان کے سوال کو پورا کر اور آسمان سے ایسا مائدہ (دسترخوانِ نعمت) نازل فرما کہ وہ ہمارے لیے تیرے غضب کا مظہر ثابت نہ ہو بلکہ ہمارے اوّل و آخر سب کے لیے خوشی کی یادگار (عید) بن جائے اور تیرا "نشان" کہلائے اور اس ذریعہ سے ہم کو اپنے غیبی رزق سے شادکام کرے کیونکہ تو ہی بہتر رزق رساں ہے" اس دعاء کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی: عیسیٰ تمہاری دعاء قبول ہے، میں اس کو ضرور نازل کروں گا لیکن یہ واضح رہے کہ اس کھلی نشانی نازل ہونے کے بعد اگر ان میں سے کسی نے بھی خدا کے حکم کی خلاف ورزی کی تو پھر ان کو عذاب بھی ایسا ہولناک دوں گا جو کائنات کے کسی انسان کو نہیں دیا جائے گا۔ قرآنِ عزیز نے نزولِ مائدہ کے واقعہ کا اس معجزانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ ذکر کیا ہے :-

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ	اور (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ حواریوں نے کہا تھا "اے
مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ	عیسیٰ بن مریم! کیا تمہارا پروردگار ایسا کر سکتا ہے کہ آسمان سے
اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ	ہم پر ایک خوان اُتار دے؟" (یعنی ہماری غذا کیلئے آسمان سے
السَّمَآءِ ۭ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ	غیبی سامان کردے) عیسیٰ نے کہا خدا سے ڈرو (اور ایسی
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ قَالُوْا نُرِيْدُ	فرمائشیں نہ کرو) اگر تم ایمان رکھتے ہو، انھوں نے کہا (مقصود
اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُنَا	اس سے قدرتِ الٰہی کا امتحان نہیں ہے بلکہ) ہم چاہتے ہیں
وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَ	(ہمیں غذا میسر آئے تو) اس میں سے کھائیں اور ہمارے دل آرام
نَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝	پائیں اور ہم جان لیں کہ تو نے ہمیں سچ بتایا تھا اور اس پر ہم گواہ
قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ	ہو جائیں۔ اس پر عیسیٰ بن مریم نے دعا کی "اے اللہ! اے ہمارے
رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ	پروردگار! ہم پر آسمان سے ایک خوان بھیج دے کہ اُس کا آنا
السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا	ہمارے لئے اور ہمارے اگلوں اور پچھلوں سب کے لیے عید
وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا	قرار پائے اور تیری طرف سے (فضل و کرم کی) ایک نشانی ہو۔

وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ قَالَ	ہمیں روزی دے تو سب سے بہتر روزی دینے والا
اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ فَمَنْ	ہے" اللہ نے فرمایا "میں تمہارے لیے خوان بھیجوں گا،
يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ	لیکن جو شخص اس کے بعد بھی (راہِ حق سے) انکار کریگا تو
عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ	میں اسے (پاداش عمل میں) عذاب دوں گا، ایسا عذاب کہ تمام
الْعٰلَمِيْنَ ۝ (سورۂ مائدہ پ ۷ ع ۱۵)	دنیا میں کسی آدمی کو بھی ویسا عذاب نہیں دیا جائے گا۔

یہ مائدہ نازل ہوا یا نہیں؟ قرآنِ عزیز نے اِس کے متعلق کوئی تفصیل نہیں بیان کی اور نہ کسی مرفوع حدیث میں اس کا کوئی تذکرہ پایا جاتا ہے، البتہ آثارِ صحابہ و تابعین (رضی اللہ عنہم) میں ضرور تفصیلات مذکور ہیں :-

مجاہد اور حسن بصری (رحمہم اللہ) فرماتے ہیں کہ مائدہ کا نزول نہیں ہوا اس لیے کہ خدائے تعالیٰ نے اس کے نزول کو جس شرط کے ساتھ مشروط کر دیا طلب کرنے والوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ انسان ضعیف البنیان اور کمزوریوں کا مجسمہ ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی لغزش یا معمولی خلاف ورزی کی بدولت اس دردناک عذاب کے سزاوار ٹھیریں اپنے سوال کو واپس لے لیا، علاوہ ازیں اگر مائدہ کا نزول ہُوا ہوتا تو وہ ایسا نشانِ الٰہی (معجزہ) تھا کہ نصاریٰ اس پر جس قدر بھی فخر کرتے وہ کم تھا اور ان کے یہاں اس کی جس قدر بھی شہرت ہوتی وہ بے جا نہیں ہوتی تاہم ان کے یہاں اس نزولِ مائدہ کا اس طرح کوئی تذکرہ نہیں پایا جاتا [1]

اور حضرتِ عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) اور حضرتِ عمار بن یاسر (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ یہ واقعہ پیش آیا اور مائدہ کا نزول ہوا، جمہور کا رجحان اسی جانب ہے، البتہ اس کے نزول کی تفصیلات میں مختلف اقوال پائے جاتے ہیں مثلاً صرف ایک دن نازل ہوا یا چالیس روز تک نازل ہوتا رہا؟ اور پھر اُترنا بند ہو گیا تو کیوں؟ اور صرف یہی ہوا

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۱۱۷ مگر یوحنا کی انجیل باب ۶ میں تو یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ یہ واقعہ عید فصح کے موقع پر پیش آیا۔

کہ نازل نہ ہوا، یا جن لوگوں کی خلاف ورزی کی وجہ سے بند ہوا ان پر سخت قسم کا عذاب بھی آپہنچا؟ جو نقول یہ کہتی ہیں کہ مائدہ کا نزول صرف ایک دن نہیں بلکہ چالیس دن تک برابر جاری رہا، وہ بند ہو جانے کا سبب یہ بیان کرتی ہیں کہ نزولِ مائدہ پر حکم یہ ہوا کہ اس کو فقیر، مسکین اور مریض ہی کھائیں تونگر اور بھلے چنگے نہ کھائیں مگر چند روز تعمیل کے بعد لوگوں نے آہستہ آہستہ اس کی خلاف ورزی شروع کر دی' یا یہ حکم ملا تھا کہ اس کو کھائیں سب مگر اگلے روز کے لیے ذخیرہ نہ کریں مگر کچھ عرصہ کے بعد اس کی خلاف ورزی ہونے لگی اور نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف مائدہ کا نزول ہی بند ہو گیا بلکہ خلاف ورزی کرنیوالے خنزیر اور بندر کی شکل میں مسخ کر دیے گئے۔[1]

بہر حال اِن آثار میں جو قدرِ مشترک ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کی دعاء قبول فرمالی تو مشیتِ باری کا یہ حکم ہوا کہ مائدہ طیار ہو چنانچہ لوگوں کی آنکھوں دیکھتے خدا کے فرشتہ فضاءِ آسمانی سے اس کو لے کر اُترے، اِدھر فرشتے آہستہ آہستہ اس کو لیے ہوئے اتر رہے تھے اور اُدھر حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ درگاہِ الٰہی میں دست بدعا تھے کہ مائدہ آپہنچا اور حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) نے اوّل دو رکعت نمازِ شکر ادا کی اور پھر مائدہ (خوان) کو کھولا تو اس میں تلی ہوئی مچھلیاں اور تر و تازہ پھل اور روٹیاں موجود پائیں اور خوان کھولتے ہی ایسی نفیس خوشبو نکلی کہ اس کی مہک نے سب کو مست کر دیا، حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ کھائیں مگر لوگوں نے اصرار کیا کہ ابتداء آپ کریں' آپ نے ارشاد فرمایا، یہ میرے لیے نہیں ہے' تمہاری طلب پر نازل ہوا ہے، یہ سُن کر سب گھبرائے کہ نہ معلوم اس کا نتیجہ کیا ہو کہ خدا کا رسول تو نہ کھائے اور ہم کھائیں، آپ نے یہ دیکھ کر ارشاد فرمایا "اچھا فقراء' مساکین' معذورین اور مریضوں کو بلاؤ، یہ اُن کا حق ہے، تب ہزار ہا بندگانِ خدا نے شکم سیر ہو کر کھایا مگر مائدہ کی مقدار میں کوئی فرق

[1] نزولِ مائدہ کا سوال اگرچہ کیا تھا حواریوں نے مگر کیا تھا سب کی جانب سے اس لیے یہ واضح رہے کہ جن نقول میں خلاف ورزی اور اس سے متعلق عذاب کا ذکر ہے ان کا اشارہ حواریوں میں سے کسی کی جانب مطلق نہیں ہے کیونکہ یہ بات نصوصِ قرآنی کے خلاف ہے۔

نہیں آیا۔[1]

اس مسئلہ میں حضرت شاہ عبدالقادر (نوراللہ مرقدہٗ) مجاہد اور حسن بصری (رحمہم اللہ) کے ہم نوا معلوم ہوتے ہیں اور نزولِ مائدہ سے متعلق ان دونوں جماعتوں سے الگ ایک اور لطیف بات ارشاد فرماتے ہیں۔ موضح القرآن میں ہے:۔

(ھل یستطیع) "ہو سکے" یہ معنی کہ ہمارے واسطے تمہاری دعا سے اس قدر خرقِ عادت کرے یا نہ کرے فرمایا (اتقوا اللہ) "ڈرو اللہ سے" یعنی بندہ کو چاہئے کہ اللہ کو نہ آزمائے کہ میرا کہا مانتا ہے یا نہیں اگرچہ خداوند (آقا و مالک) بہتیری مہربانی کرے "وَنَكُونَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ" یعنی برکت کی امید پر مانگتے ہیں اور (تاکہ) معجزہ ہمیشہ مشہور رہے۔ آزمانے کو نہیں کہتے ہیں۔ وہ خوان اترا یکشنبہ کو وہ نصاریٰ کی عید ہے جیسے ہم کو روز جمعہ۔ بعضے کہتے ہیں۔ وہ خوان اترا چالیس روز تک اور پھر بعض نے ناشکری کی یعنی حکم ہوا تھا کہ فقرا اور مریض کھاویں نہ محظوظ (تو انگر) اور چنگے پھر قریب اسی آدمی سور اور بندر ہو گئے (مگر) یہ عذاب پہلے یہود میں ہوا تھا پیچھے کسی کو نہیں ہوا۔[2]

اور بعضے کہتے ہیں (مائدہ) نہ اترا، تہدید سن کر مانگنے والے ڈر گئے نہ مانگا لیکن پیغمبر کی دعا عبث نہیں اور اس کلام (قرآن) میں نقل کرنا بے حکمت نہیں، شاید اس دعا کا اثر یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی امت (نصاریٰ) میں آسودگی مال سے ہمیشہ رہی اور جو کوئی ان میں ناشکری کرے تو شاید آخرت میں سب سے زیادہ عذاب پاوے۔ اس میں مسلمان کو عبرت ہے کہ اپنا مدعا خرقِ عادت کی راہ سے نہ چاہے پھر اس کی شکر گذاری بہت مشکل ہے، اسبابِ ظاہری پر قناعت کرے تو بہتر ہے۔ اس قصہ میں بھی ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کے آگے حمایت پیش نہیں جاتی۔[3]

---

[1] یہ واقعات بڑی تفصیل کے ساتھ تمام کتب تفسیر میں موجود ہیں۔

[2] شاہ صاحب کا مسلک یہ ہے کہ واقعہ مسخ صحیح نہیں ہے۔ [3] موضح القرآن سورۂ مائدہ۔

اس سلسلہ میں حضرت عمار بن یاسر (رضی اللہ عنہ) نے موعظت و بصیرت سے متعلق بہت خوب بات ارشاد فرمائی ہے:-

"عیسیٰ (علیہ السلام) سے ان کی قوم نے نزولِ مائدہ کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے جواب ملا "تمہاری درخواست اس شرط کے ساتھ منظور کی جاتی ہے کہ نہ اس میں خیانت کرنا نہ اُس کو چھپائے رکھنا اور نہ اس کو ذخیرہ کرنا ورنہ یہ بند کر دیا جائے گا اور تم کو ایسا عبرت ناک عذاب دوں گا جو کسی کو نہ دیا جائے گا"

اے معشر عرب! تم اپنی حالت پر غور کرو کہ اونٹوں اور بکریوں کی دُم پکڑ کر جنگلوں میں چراتے پھرتے تھے، پھر خدائے تعالیٰ نے اپنی رحمت سے تمہارے درمیان ہی سے ایک برگزیدہ رسول مبعوث فرمایا جس کے حسب و نسب سے تم اچھی طرح واقف ہو، اس نے تم کو یہ خبر دی کہ عنقریب تم عجم پر غالب آجاؤ گے اور اس پر چھا جاؤ گے۔ اور اس نے تم کو سختی کے ساتھ منع فرمایا کہ مال و دولت کی فراوانی دیکھ کر ہرگز تم چاندی اور سونے کے خزانے جمع نہ کرنا مگر قسم بخدا کہ زیادہ لیل و نہار نہ گذریں گے کہ تم ضرور سونے چاندی کے خزانے جمع کرو گے اور اس طرح خدائے برتر کے دردناک عذاب کے مستحق بنو گے۔[1]

رفع الی السماء یعنی زندہ آسمان پر اٹھایا جانا

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) نے نہ شادی کی اور نہ بود و ماند کے لیے گھر بنایا وہ شہر شہر اور گاؤں گاؤں خدا کا پیغام سناتے اور دینِ حق کی دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیتے اور جہاں بھی رات آپہنچتی وہیں کسی سروسامانِ راحت کے بغیر شب بسر کر دیتے تھے اور چونکہ ان کی ذاتِ اقدس سے مخلوقِ خدا جسمانی و روحانی دونوں طرح کی شفا اور تسکین پاتی تھی اس لیے جس جانب بھی ان کا گذر ہو جاتا خلقت کا انبوہ حسن عقیدت کے ساتھ جمع ہو جاتا اور والہانہ محبت کے ساتھ ان پر نثار ہو جانے کو تیار رہتا تھا۔

یہود کو اس دعوتِ حق کے ساتھ جو بغض و عناد تھا اس نے اس بڑھتی ہوئی مقبولیت کو انتہائی حسد اور سخت خطرہ کی نگاہ سے دیکھا اور جب ان کے مسخ شدہ قلوب کسی طرح اس کو

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۲ سورۂ مائدہ۔

برداشت نہ کر سکے تو اُن کے سرداروں، فقیہوں، فریسیوں اور صدوقیوں نے ذاتِ اقدس کے خلاف سازش شروع کی اور طے یہ پایا کہ اس ہستی کے خلاف کامیابی حاصل کرنے کی بجز اس کے کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ بادشاہِ وقت کو مشتعل کر کے اس کو دار پر چڑھا دیا جائے

گذشتہ چند صدیوں سے یہود کے ناگفتہ بہ حالات کی بدولت اس زمانہ میں یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کی حکومت اپنے باپ دادا کے علاقہ میں سے بمشکل ایک چوتھائی پر قائم تھی اور وہ بھی برائے نام اور اصل حکومت و اقتدار، وقت کے بُت پرست شاہنشاہ قیصرِ روم کو حاصل تھا اور اس کی نیابت میں پلاطیس یہودیہ کے اکثر علاقہ کا گورنر یا بادشاہ تھا۔

یہود اگرچہ اس بُت پرست بادشاہ کے اقتدار کو اپنی بدبختی سمجھ کر اس سے متنفر تھے مگر حضرت مسیح (علیہ السلام) کے خلاف قلوب میں مشتعل حسد کی آگ نے اور صدیوں کی غلامی سے پیدا شدہ پست ذہنیت نے ایسا اندھا کر دیا کہ انجام اور نتیجہ کی فکر سے بے پرواہ ہو کر پلاطیس کے دربار میں جا پہنچے اور عرض کیا: "عالی جاہ! یہ شخص نہ صرف ہمارے لیے بلکہ حکومت کے لیے بھی خطرہ بنتا جا رہا ہے اگر فوراً ہی اس کا استیصال نہ کر دیا گیا تو نہ ہمارا دین ہی صحیح حالت میں باقی رہ سکے گا اور اندیشہ ہے کہ کہیں آپ کے ہاتھ سے حکومت کا اقتدار بھی نہ چلا جائے اس لیے کہ اس شخص نے عجیب و غریب شعبدے دکھا کر خلقت کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور ہر وقت اس گھات میں لگا ہے کہ عوام کی اس طاقت کے بل پر قیصر اور آپ کو شکست دیکر خود بنی اسرائیل کا بادشاہ بن جائے۔ اس شخص نے لوگوں کو صرف دُنیوی راہ سے ہی گمراہ نہیں کیا بلکہ اس نے ہمارے دین تک کو بھی بدل ڈالا اور لوگوں کو بددین بنانے میں منہمک ہے۔ پس اس فتنہ کا انسداد از بس ضروری ہے تاکہ بڑھتا ہوا یہ فتنہ ابتدائی منزل ہی میں کچل ڈالا جائے"۔

غرض کافی گفت و شنید کے بعد پیلاطیس نے ان کو اجازت دیدی کہ وہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کو گرفتار کر لیں اور شاہی دربار میں مجرم کی حیثیت سے پیش کریں، بنی اسرائیل کے سردار، فقیہ اور کاہن یہ فرمان حاصل کر کے بیحد مسرور ہوئے اور فخر و مباہات کے ساتھ

ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے کہ آخر ہماری سازش کارگر ہوئی اور ہماری تدبیر کا تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھ گیا اور کہنے لگے کہ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ خاص موقع کا منتظر رہا جائے اور کسی خلوت اور تنہائی کے موقع پر اس طرح اس کو گرفتار کیا جائے کہ عوام میں ہیجان نہ ہونے پائے۔ انجیل یوحنا میں اس واقعہ سے متعلق یہ کہا گیا ہے :-

پس سردار کاہنوں اور فریسیوں نے صدر عدالت کے لوگوں کو جمع کر کے کہا ہم کرتے کیا ہیں؟ یہ آدمی تو بہت معجزے دکھاتا ہے اگر ہم اسے یونہی چھوڑ دیں تو سب اس پر ایمان لے آئیں گے اور رومی آکر ہماری جگہ اور قوم دونوں پر قبضہ کرلیں گے اور ان میں سے کائفا نام ایک شخص نے جو اس سال سردار کاہن تھا ان سے کہا تم نہیں جانتے اور نہ سوچتے ہو کہ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ ایک آدمی اُمت کے واسطے مرے نہ کہ ساری قوم ہلاک ہو[1]

یہ اس مشورہ کا تذکرہ ہے جو بادشاہ کے پاس جانے سے قبل آپس میں ہوا اور یہ خطرہ ظاہر کیا گیا کہ اگر اس ہستی کو یونہی چھوڑ دیا گیا تو بادشاہِ وقت (قیصر) کہیں سلطنت کے لیے خطرہ سمجھ کر رہی سہی برائے نام حکومت یہود کا بھی خاتمہ نہ کر دے۔

اور مرقس کی انجیل میں ہے :-

دو دن کے بعد فصح اور عید الفطر ہونے والی تھی اور سردار کاہن اور فقیہ موقع ڈھونڈھ رہے تھے کہ اسے کیونکر فریب سے پکڑ کر قتل کریں کیونکہ کہتے تھے کہ عید کو کہیں ایسا نہ ہو کہ بلوہ ہو جائے[2]۔

دوسری جانب حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے حواریوں کے مکالمہ کو سورۂ آلِ عمران اور سورۂ صف کے حوالہ سے نقل کیا جا چکا ہے کہ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) نے جب یہود کے کفر و انکار اور معاندانہ ریشہ دوانیوں کو محسوس کیا تو ایک جگہ اپنے حواریوں کو جمع کیا اور ان سے فرمایا کہ بنی اسرائیل کے سرداروں اور کاہنوں کی معاندانہ سرگرمیاں تم سے پوشیدہ نہیں ہیں، اب وقت کی نزاکت اور کڑی آزمائش و امتحان کی گھڑی کی قربت تقاضا کرتی ہے کہ میں تم سے

[1] باب ۱۱ آیات ۴۷ تا ۵۰ ، [illegible] ۱۴ آیات ۱-۲ ۔

سوال کروں کہ تم میں کون وہ افراد ہیں جو اس کفر و انکار کے سیلاب کے سامنے سینہ سپر ہو کر خدا کے دین کے ناصر و مددگار بنیں گے۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا یہ ارشادِ مبارک سن کر سب نے بڑے جوش و خروش اور صداقتِ ایمانی کے ساتھ جواب دیا "ہم ہیں اللہ کے مددگار خدائے واحد کے پرستار، آپ گواہ رہیں کہ ہم مسلم وفا شعار ہیں" اور درگاہِ باری میں اپنی اس اطاعت کوشی پر استقامت کے لیے یوں دست بدعا ہیں "اے پروردگار! ہم تیری اتاری ہوئی کتاب پر ایمان لے آئے اور صدق دل کے ساتھ تیرے پیغمبر کے پیرو ہیں، خدایا! تو ہم کو صداقت و حقانیت کے فداکاروں کی فہرست میں لکھ لے۔"

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے فریضۂ دعوت و تبلیغ کے خلاف یہود بنی اسرائیل کی مخالفانہ سرگرمیوں سے متعلق حالات کا یہ حصہ تو اکثر و بیشتر ایسا ہے کہ قرآن اور انجیل کے درمیان اصولاً اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن اس کے مابعد کے پورے حصۂ بیان میں دونوں کی قطعاً جُدا جُدا راہیں ہیں اور ان کے درمیان اس درجہ تضاد ہے کہ کسی طرح بھی ایک کو دوسری راہ کے قریب نہیں لایا جا سکتا۔ البتہ اس جگہ پہنچ کر یہود اور نصاریٰ دونوں کا باہمی اتحاد ہو جاتا ہے اور دونوں کے بیانات واقعہ سے متعلق ایک ہی عقیدہ پیش کرتے ہیں، فرق ہے تو یہ کہ یہود اس واقعہ کو اپنا کارنامہ اور اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے ہیں اور نصاریٰ اس کو یہود بنی اسرائیل کی ایک قابلِ لعنت جدوجہد یقین کرتے ہیں۔

یہود اور نصاریٰ دونوں کا مشترک بیان یہ ہے کہ یہود کے سرداروں اور کاہنوں کو یہ اطلاع ملی کہ اس وقت یسوع (علیہ السلام) لوگوں کی بھیڑ سے الگ اپنے شاگردوں کے ساتھ ایک بند مکان میں موجود ہیں، یہ موقع بہترین ہے، اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیجیے، فوراً ہی یہ لوگ موقع پر پہنچ گئے اور چاروں طرف سے مکان کا محاصرہ کر کے یسوع (علیہ السلام) کو گرفتار کر لیا اور توہین و تذلیل کرتے ہوئے پیلاطیس کے دربار میں لے گئے تاکہ وہ انکو سُولی پر لٹکائے اور اگرچہ پیلاطیس نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو بے قصور سمجھ کر چھوڑ دینا چاہا مگر

بنی اسرائیل کے اشتعال پر مجبوراً سپاہیوں کے حوالہ کردیا۔ سپاہیوں نے ان کو کانٹوں کا تاج پہنایا، مُنہ پر تھوکا، کوڑے لگائے اور ہر طرح کی توہین و تذلیل کرنے کے بعد مجرموں کی طرح سولی پر لٹکا دیا اور دونوں ہاتھوں میں میخیں ٹھونک دیں سینہ کو برچھی کی انی سے چھید دیا اور اس کس مپرسی کی حالت میں انھوں نے یہ کہتے ہوئے جان دیدی "ایلی ایلی لما سبقتنی" انجیل متی میں اس واقعہ کی تفصیلات کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

سردار کاہن نے اُس سے کہا: میں تجھے زندہ خدا کی قسم دیتا ہوں کہ اگر تو خدا کا بیٹا مسیح ہے تو ہم سے کہدے۔ یسوع نے اس سے کہا: تو نے خود کہہ دیا بلکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس کے بعد تم ابنِ آدم کو قادرِ مطلق کی داہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں پر آتا دیکھو گے اس پر سردار کاہن نے یہ کہہ کر اپنے کپڑے پھاڑے کہ اس نے کفر بکا ہے اب ہمیں گواہوں کی کیا حاجت رہی، دیکھو تم نے ابھی یہ کفر سُنا ہے تمہاری کیا رائے ہے، انھوں نے جواب میں کہا وہ قتل کے لائق ہے اس پر انھوں نے اس کے مُنہ پر تھوکا اور اس کے مکّے مارے اور بعض نے طمانچے مار کے کہا اے مسیح ہمیں نبوت سے بتا کس نے تجھے مارا...... جب صبح ہوئی تو سب سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں نے یسوع کے خلاف مشورہ کیا کہ اُسے مار ڈالیں اور اسے باندھ کر لے گئے اور پیلاطیس حاکم کے حوالہ کیا...... اور حاکم کا دستور تھا کہ عید پر لوگوں (بنی اسرائیل) کی خاطر ایک قیدی جسے وہ چاہتے تھے چھوڑ دیتا تھا اس وقت برابا نام ان کا ایک مشہور قیدی تھا پس جب وہ اکٹھے ہوئے تو پیلاطیس نے ان سے کہا تم کسے چاہتے ہو کہ میں تمہاری خاطر چھوڑ دوں؟ برابا کو یا یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے؟...... وہ بولے برابا کو پیلاطیس نے ان سے کہا پھر یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے کیا کروں، سب نے کہا اس کو صلیب دی جائے اس نے کہا کیوں؟ اس نے کیا برائی کی ہے؟ مگر وہ اور بھی چلّا چلّا کر بولے کہ اس کو صلیب دی جائے، جب پیلاطیس نے دیکھا کہ کچھ بن نہیں پڑتا الٹا بلوہ ہوتا جاتا ہے

تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا "میں اس راست باز کے خون سے بری ہوں تم جانو" سب لوگوں نے جواب دیکر کہا "کہ اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر" اس پر اس نے برابا کو ان کی خاطر چھوڑ دیا اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالے کیا تاکہ صلیب دی جائے۔ اس پر حاکم کے سپاہیوں نے یسوع کو قلعہ میں لیجا کر ساری پلٹن اس کے گرد جمع کی اور اس کے کپڑے اتار کر اسے قرمزی چوغہ پہنایا اور کانٹوں کا تاج بنا کر اس کے سر پر رکھا اور ایک سرکنڈا اس کے داہنے ہاتھ میں دیا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک اُسے ٹھٹھوں میں اُڑانے لگے کہ اے یہودیوں کے بادشاہ آداب۔ اور اس پر تھوکا اور وہی سرکنڈا لے کر اس کے سر پر مارنے لگے اور جب اس کا ٹھٹھا کر چکے تو چوغے کو اس پر سے اتار کر پھر اس کے کپڑے اُسے پہنائے اور صلیب دینے کو لے گئے۔ اس وقت اس کے ساتھ دو ڈاکو صلیب پر چڑھائے گئے ایک داہنے اور ایک بائیں اور راہ چلنے والے سر ہلا ہلا کر اس کو لعن طعن کرتے اور کہتے تھے اے مقدس کے ڈھانے والے اور تین دن میں بنانے والے اپنے تئیں بچا اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو صلیب پر سے اُتر آ، اسی طرح سردار کاہن بھی فقیہوں اور بزرگوں کے ساتھ مل کے ٹھٹھے کے ساتھ کہتے تھے اس نے اوروں کو بچایا اپنے تئیں نہیں بچا سکتا... اور دوپہر سے لے کر تیسرے پہر تک تمام ملک میں اندھیرا چھایا رہا اور تیسرے پہر کے قریب یسوع نے بڑی آواز سے چلا کر کہا: "ایلی ایلی لما سبقتنی" (اے میرے خدا! اے میرے خدا! تو نے مجھ کو کیوں چھوڑ دیا) جو وہاں کھڑے تھے اُن میں سے بعض نے سُن کر کہا "یہ ایلیا کو پکارتا ہے..... یسوع پھر بڑی آواز سے چلایا اور جان دیدی[1]"

تفصیلات میں کم و بیش فرق کے ساتھ یہی مفروضہ داستان باقی تینوں انجیلوں میں بھی مذکور ہے۔ چاروں انجیلوں کی اس متفقہ مگر مفروضہ داستان کو مطالعہ کرنے کے بعد طبیعت پر قدرتی اثر یہ پڑتا ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی موت انتہائی بیکسی اور بے بسی

[1] باب ۲۶ آیات ۵۷ تا ۷۵۔

کی حالت میں دردناک طریقہ سے ہوئی اور اگرچہ خدا کے پاک اور مقدس بندوں کے لیے یہ کوئی اچنبھی بات نہ تھی بلکہ مقربین بارگاہِ صمدی کے لیے اس قسم کی کڑی آزمائشوں کا مظاہرہ اکثر ہوتا رہا ہے لیکن اس واقعہ کا یہ پہلو اس کے مفروضہ اور گھڑے ہوئے ہونے پر روزِ روشن کی طرح شاہد ہے کہ حضرت یسوع نے ایک اولوالعزم پیغمبر بلکہ مردِ صالح کی طرح اس واقعہ کو صبر و رضاءِ الٰہی کے ساتھ انگیز نہیں کیا بلکہ ایک انتہائی مایوس انسان کی طرح خدا سے شکوہ کرتے کرتے جان دیدی "ایلی ایلی، لما سبقتنی" کہتے ہوئے جان دے دینا مایوسی اور شکوہ کی وہ صورتِ حال ہے جو کسی طرح بھی حضرت مسیح (علیہ السلام) کے شایانِ شان نہیں کہی جا سکتی، پھر اس واقعہ کا یہ پہلو بھی کم حیرت زا نہیں ہے کہ بقول انجیل کے یسوع مسیح نے اس حادثہ سے قبل تین مرتبہ خدائے تعالیٰ سے یہ درخواست کی "اے میرے باپ اگر ہو سکے تو یہ (موت کا) پیالہ مجھ سے ٹل جائے" اور جب یہ درخواست کسی طرح قبول نہ ہوئی تو مایوس ہو کر کہنا پڑا "اگر یہ میرے پیے بغیر نہیں ٹل سکتا تو تیری مرضی پوری ہو"

باعثِ حیرت یہ بات ہے کہ جبکہ عقیدۂ "کفارہ" کے مطابق حضرت مسیح کا یہ معاملہ خدا اور اس کے بیٹے (العیاذ باللہ) کے درمیان طے شدہ تھا تو پھر اس درخواست کے کیا معنی اور اگر لوازمِ بشریت کی بناء پر تھا تو خدا کی مرضی معلوم ہو جانے اور اس پر تناعت کر لینے کے بعد پھر یہ بے صبر اور مایوس انسانوں کی طرح جان دینے کا کیا سبب؟

یہود کی گھڑی ہوئی اس داستان کو چونکہ نصاریٰ نے قبول کر لیا تو یہود از رہِ فخر و غرور اس پر بیحد مسرور ہیں اور کہتے ہیں کہ مسیح ناصری اگر "مسیح موعود" ہوتا تو خدائے تعالیٰ اس بے بسی اور بے کسی کے ساتھ اس کو ہمارے ہاتھ میں نہ دیتا کہ وہ مرتے وقت تک خدا سے شکوہ کرتا رہا کہ اس کو بچائے مگر خدا نے اس کی کوئی مدد نہ کی حالانکہ ہمارے باپ دادا اس وقت بھی کافی اشتعال دیتے رہے کہ اگر تو حقیقۃً خدا کا بیٹا اور "مسیح موعود" ہے تو کیوں تجھ کو خدا نے ہمارے ہاتھوں اس ذلت سے نہ بچا لیا۔

واقعہ یہ ہے کہ نصاریٰ کے پاس جبکہ اس چبھتے ہوئے الزام کا کوئی جواب نہیں تھا اور واقعہ کی ان تفصیلات کو مان لینے کے بعد "عقیدۂ کفارہ" کی کوئی قیمت باقی نہیں رہ جاتی تھی تب انھوں نے واقعہ کی ان تفصیلات کے بعد ایک پارۂ بیان کا اور اضافہ کیا۔

یوحنا کی انجیل میں ہے :۔

لیکن جب انھوں نے یسوع کے پاس آکر دیکھا کہ وہ مرچکا ہے تو اس کی ٹانگیں نہ توڑدیں مگر ان میں سے ایک سپاہی نے بھالے سے اس کی پسلی چھیدی اور فی الفور اُس سے خون اور پانی بہ نکلا ...... ان باتوں کے بعد ارمتیہ کے رہنے والے یوسف نے جو یسوع کا شاگرد تھا یہودیوں کے خوف سے خفیہ طور پر پیلاطیس سے اجازت چاہی کہ یسوع کی لاش لیجائے، پیلاطیس نے اجازت دیدی پس وہ آکر اس کی لاش لے گیا اور نیکدیمس بھی آیا جو پہلے یسوع کے پاس رات کو گیا تھا اور پچاس سیر کے قریب مر اور عود ملا ہوا لایا۔ پس انھوں نے یسوع کی لاش لے کر اُسے سوتی کپڑے میں خوشبودار چیزوں کے ساتھ کفنایا جس طرح کہ یہودیوں میں دفن کرنے کا دستور ہے اور جس جگہ اُسے صلیب دی گئی وہاں ایک باغ تھا اور اس باغ میں ایک نئی قبر تھی جس میں کبھی کوئی نہ رکھا گیا تھا پس انھوں نے یہودیوں کی تیاری کے دن کے باعث یسوع کو وہیں رکھ دیا۔ ہفتہ کے پہلے دن مریم مگدلینی ایسے تڑکے کہ ابھی اندھیرا ہی تھا قبر پر آئی اور پتھر کو قبر سے ہٹا ہوا دیکھا پس وہ شمعون پطرس اور اس کے دوسرے شاگرد کے پاس جسے یسوع عزیز رکھتا تھا دوڑی ہوئی گئی اور ان سے کہا کہ خداوند کو قبر سے نکال لے گئے اور ہمیں معلوم نہیں کہ اسے کہاں رکھ دیا ..... لیکن مریم باہر قبر کے پاس کھڑی روتی رہی اور جب روتے روتے قبر کی طرف جھک کے اندر نظر کی تو دو فرشتوں کو سپید پوشاک پہنے ہوئے ایک کو سرہانے اور دوسرے کو پائینتی بیٹھے دیکھا جہاں یسوع کی لاش پڑی تھی انھوں نے اس سے کہا اے عورت تو کیوں روتی ہے؟ اس نے ان سے کہا اس لیے کہ

میرے خداوند کو اٹھا لے گئے اور معلوم نہیں کہ اسے کہاں رکھا یہ کہہ کر وہ پیچھے پھری اور یسوع کو کھڑے دیکھا اور نہ پہچانا کہ یہ یسوع ہے۔ یسوع نے اس سے کہا مریم! وہ پھر کر اس سے عبرانی زبان میں بولی "ربونی" یعنی اے استاد! یسوع نے اس سے کہا مجھے نہ چھو کیونکہ میں اب تک باپ کے پاس اوپر نہیں گیا لیکن میرے بھائیوں کے پاس جا کر ان سے کہو کہ میں اپنے باپ اور تمہارے باپ کے اور اپنے خدا اور تمہارے خدا کے پاس اوپر جاتا ہوں، مریم مگدلینی نے آکر شاگردوں کو خبر دی کہ میں نے خداوند کو دیکھا اور اس نے مجھ سے یہ باتیں کہیں۔ پھر اُسی دن جو ہفتہ کا پہلا دن تھا شام کے وقت جب وہاں کے دروازے جہاں شاگرد تھے یہودیوں کے ڈر سے بند تھے یسوع آکر بیچ میں کھڑا ہوا اور ان سے کہا کہ تمہاری سلامتی ہو اور یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ اور پسلی انہیں دکھائی، پس شاگرد خداوند کو دیکھ کر خوش ہوئے یسوع نے پھر اُن سے کہا کہ تمہاری سلامتی ہو جس طرح باپ نے مجھے بھیجا ہے اسی طرح میں بھی تمہیں بھیجتا ہوں اور یہ کہہ کر انکو پھونکا اور ان سے کہا "روح القدس" لو[۱]

ہر ایک شخص معمولی غور و فکر کے بعد بہ سہولت سمجھ سکتا ہے کہ یہ پارۂ بیان پہلے حصۂ بیان کے ساتھ غیر مربوط اور قطعاً بے جوڑ ہے بلکہ یہ اندازہ لگانا ہی مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ دونوں تفصیلات ایک ہی شخص سے وابستہ ہیں کیونکہ پہلا پارۂ بیان ایک ایسی شخصیت کا مرقع ہے جو بے بس و بیکس مایوس اور خدا سے شاکی نظر آتی ہے اور دوسرا حصۂ بیان ایسی ہستی کا رُخِ روشن پیش کرتی ہے جو خدائی صفات سے متصف، ذاتِ باری کی مقرب اور پیش آمدہ واقعات سے مطمئن و مسرور ہے بلکہ ان کے وقوع کی متمنی اور ان کو اپنے ادائے فرض کا اہم جزو سمجھتی ہے۔

ببیں تفاوتِ رَہ از کجاست تا بکجا

بہر حال حقیقت چونکہ دوسری تھی اور ایک عرصۂ دراز کے بعد "عقیدۂ کفارہ" کی بدعت نے

[۱] انجیل یوحنا باب ۱۹ آیت ۳۴-۳۳ و آیت ۴۲-۳۸ و باب ۲۰ آیات ۱ تا ۲۲۔

نصاریٰ کو اس کے خلاف اس گڑھے ہوئے افسانہ کی تصنیف پر مجبور کر دیا اس لیے قرآن عزیز نے حضرتِ مریم اور حضرتِ عیسیٰ (علیہما السلام) سے متعلق دوسرے گوشوں کی طرح اس گوشہ سے بھی جہالت و تاریکی کا پردہ ہٹا کر حقیقتِ حال کے رُخِ روشن کو جلوہ آرا کرنا ضروری سمجھا اور اس نے اپنا وہ فرض انجام دیا جس کو مذاہبِ عالم کی تاریخ میں قرآن کی دعوتِ تجدید و اصلاح کہا جاتا ہے۔

اس نے بتایا کہ جس زمانہ میں بنی اسرائیل، پیغمبرِ حق اور رسولِ خدا (عیسیٰ بن مریمؑ) کے خلاف خفیہ تدبیروں اور سازشوں میں مصروف اور ان پر نازاں تھے اسی زمانہ میں خدائے برتر کے قانونِ قضاء و قدر نے یہ فیصلہ نافذ کر دیا کہ کوئی طاقت اور مخالف قوت عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) پر قابو نہیں پا سکتی اور ہماری محکم تدبیر اس کو دشمنوں کے ہر مکر سے محفوظ رکھے گی اور نتیجہ یہ نکلا کہ جب بنی اسرائیل نے اُن پر نرغہ کیا تو اُن کو پیغمبرِ خدا پر کسی طرح دسترس حاصل نہ ہو سکی اور ان کو بحفاظت تمام اٹھا لیا گیا اور جب بنی اسرائیل مکان میں گھسے تو صورتِ حال اُن پر مشتبہ ہو گئی اور وہ ذلت اور رسوائی کے ساتھ اپنے مقصد میں ناکام رہے اور اس طرح خدا نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا جو عیسیٰ بن مریمؑ کی حفاظت کے لیے کیا گیا تھا۔

تفصیل اِس اجمال کی یہ ہے کہ جب عیسیٰ (علیہ السلام) نے یہ محسوس فرمایا کہ اب بنی اسرائیل کے کفر و انکار کی سرگرمیاں اس درجہ بڑھ گئی ہیں کہ وہ میری توہین و تذلیل بلکہ قتل کے لیے سرگرمِ سازش ہیں تو انھوں نے خاص طور سے ایک مکان میں اپنے حواریوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے صورتِ حال کا نقشہ پیش فرما کر ارشاد فرمایا: امتحان کی گھڑی سر پر ہے، کڑی آزمائش کا وقت ہے، حق کو مٹانے کی سازشیں پورے شباب پر ہیں اب میں تمہارے درمیان زیادہ نہیں رہوں گا اس لیے میرے بعد دینِ حق پر استقامت، اس کی نشر و اشاعت اور یاری و نصرت کا معاملہ صرف تمہارے ساتھ وابستہ ہو جانے والا ہے،'

اِس لیے مجھے بتاؤ کہ خدا کی راہ میں سچا مددگار کون کون ہے۔ حواریوں نے یہ کلامِ حق سُن کر کہا: ہم سب ہی خدا کے دین کے مددگار ہیں، ہم سچے دل سے خدا پر ایمان لائے ہیں اور اپنی صداقتِ ایمانی کا آپ ہی کو گواہ بناتے ہیں اور یہ کہنے کے بعد انسانی کمزوریوں کے پیشِ نظر اپنے دعویٰ پر ہی بات ختم نہیں کر دی بلکہ درگاہِ الٰہی میں دست بدعا ہو گئے کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں تو اس پر ہم کو استقامت عطا فرما اور ہم کو اپنے دین کے مددگاروں کی فہرست میں لکھ لے۔

اِس جانب سے مطمئن ہو کر اب حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) اپنے فریضۂ دعوت و ارشاد کے ساتھ ساتھ منتظر رہے کہ دیکھیے معاندین کی سرگرمیاں کیا رُخ اختیار کرتی ہیں اور خدائے برحق کا فیصلہ کیا صادر ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں قرآنِ عزیز کے ذریعہ یہود و نصاریٰ کے ظنون و اوہامِ فاسدہ کے خلاف علم و یقین کی روشنی بخشتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ جس وقت معاندین اپنی خفیہ تدبیروں میں سرگرمِ عمل تھے اسی وقت ہم نے بھی اپنی قدرتِ کاملہ کی مخفی تدبیر کے ذریعہ یہ فیصلہ کر لیا کہ عیسیٰ بن مریم کے متعلق معاندینِ حق کی تدبیر کا کوئی گوشہ بھی کامیاب نہیں ہونے دیا جائے گا اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی پوشیدہ تدابیر کے مقابلہ میں کسی کی پیش نہیں جا سکے گی اس لیے کہ اُس کی تدبیر سے بہتر کوئی تدبیر ہو ہی نہیں سکتی۔

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ	اور انھوں نے (یہود نے عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف)
وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ	خفیہ تدبیر کی اور اللہ نے (یہود کے مکر کے خلاف) خفیہ
(آلِ عمران پ۳ ع۱۳)	تدبیر کی اور اللہ سب سے بہتر خفیہ تدبیر کا مالک ہے۔

لغتِ عرب میں "مکر" کے معنی خفیہ تدبیر (اور دھوکا کرنے) کے ہیں اور علمِ معانی کے قاعدہ "مشاکلہ" کے مطابق جب کوئی شخص کسی کے جواب یا دفاع (Defence) میں خفیہ تدبیر کرتا ہے تو وہ اخلاق ... مذہب کی نگاہ میں کتنی ہی عمدہ تدبیر کیوں نہ ہو اس کو بھی

"مکر" ہی سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ ہر ایک زبان کے محاورہ میں بولا جاتا ہے "برائی کا بدلہ برائی ہے" حالانکہ ہر شخص یہ یقین رکھتا ہے کہ برائی کرنے والے کے جواب میں اسی قدر مقابلہ کا جواب دینا اخلاق اور مذہب دونوں کی نگاہ میں "برائی" نہیں ہے تاہم تعبیر میں دونوں کو ہم شکل ظاہر کر دیا جاتا ہے اور اسی کو "مشاکلہ" کہتے ہیں اور یہ فصاحت و بلاغت کا اہم جزء سمجھا جاتا ہے۔

غرض خفیہ تدبیر دونوں جانب سے تھی، ایک جانب بُرے بندوں کی بُری تدبیر اور دوسری جانب خدائے برتر کی بہترین تدبیر، نیز ایک جانب قادرِ مطلق کی تدبیرِ کامل تھی جس میں نقص و خامی کا امکان نہیں اور دوسری جانب دھوکے اور فریب کی خام کاریاں تھیں جو تارِ عنکبوت ہو کر رہ گئیں۔

آخر وہ وقت آپہونچا کہ بنی اسرائیل کے سرداروں، کاہنوں، اور فقیہوں نے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کا ایک بند مکان میں محاصرہ کر لیا، ذاتِ اقدس اور حواری مکان کے اندر بند ہیں اور دشمن چاروں طرف سے محاصرہ کیے ہوئے ہیں لہٰذا اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ کیا صورت ہو کہ جس سے دشمن ناکام رہے اور حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کو کسی طرح کا بھی گزند نہ پہنچا سکے تا کہ خدائے قادر کا وعدۂ حفاظت اور دعویٰ تدبیرِ خیر پورا ہو تو اس کے متعلق قرآن نے بتایا کہ بیشک خدا کا وعدہ پورا ہوا اور اُس کی تدبیرِ محکم نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو دشمنوں کے ہاتھوں سے ہر طرح محفوظ رکھا اور صورت یہ پیش آئی کہ اِس نازک گھڑی میں حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کو وحی الٰہی نے یہ بشارت سُنائی: عیسیٰ! خوف نہ کر تیری مدت پوری کی جائے گی (یعنی تم کو دشمن قتل نہیں کر سکیں گے اور نہ تم اس وقت موت سے دوچار ہو گے) اور ہو گا یہ کہ میں تجھ کو اپنی جانب (ملاءِ اعلیٰ کی جانب) اٹھالوں گا اور اِن کافروں سے ہر طرح تجھ کو پاک رکھوں گا (یعنی یہ تجھ پر کسی قسم کا قابو نہ پا سکیں گے) اور تیرے پیرووں کو اِن کافروں پر ہمیشہ غالب رکھوں گا (یعنی بنی اسرائیل کے مقابلہ میں

قیامت تک عیسائی اور مسلمان غالب رہیں گے اور ان کو کبھی ان دونوں پر حاکمانہ اقتدار نصیب نہیں ہوگا، پھر انجام کار میری جانب (موت کے بعد) لوٹ آنا ہے پس میں ان باتوں پر فیصلۂ حق دوں گا جن کے متعلق تم آپس میں اختلاف کر رہے ہو:-

إِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى إِنِّيْ
مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ
مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ
اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا إِلٰى
يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ
فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ
تَخْتَلِفُوْنَ ؕ (آل عمران پ ع)

(وہ وقت ذکر کے لائق ہے) جب اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ
سے کہا اے عیسیٰ! بے شبہ میں تیری مدت کو پوری کردوںگا
اور تجھ کو اپنی جانب اٹھا لینے والا ہوں اور تجھ کو کافروں
(بنی اسرائیل) سے پاک رکھنے والا ہوں اور جو تیری پیروی
کریں گے ان کو تیرے منکروں پر قیامت تک کے لیے غالب
رکھنے والا ہوں، پھر میری جانب ہی لوٹنا ہے، پھر میں اُن
باتوں کا فیصلہ کروں گا جن کے بارے میں (آج) تم جھگڑ رہے ہو۔

وَإِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ
عَنْكَ إِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ
فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ
إِنْ هٰذَآ إِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ؕ
(مائدہ پ ع)

(قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کو اپنے احسانات شمار
کراتے ہوئے فرمائے گا) اور وہ وقت یاد کرو جب میں نے بنی اسرائیل
کو تجھ سے روک دیا (یعنی وہ کسی طرح تجھ پر قابو نہ پا سکے) جبکہ تو
ان کے پاس معجزات لے کر آیا اور ان میں سے کافروں نے
کہہ دیا: "یہ تو جادو کے ماسوا اور کچھ نہیں ہے۔"

تو اب جبکہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو یہ اطمینان دلا دیا گیا کہ اس سخت محاصرہ کے باوجود دشمن تم کو قتل نہ کر سکیں گے اور تم کو غیبی ہاتھ ملاءِ اعلیٰ کی جانب اُٹھا لے گا اور اس طرح دشمنانِ دین کے ناپاک ہاتھوں سے آپ ہر طرح محفوظ کر دیے جائیں گے تو اس جگہ پہنچکر ایک دوسرا سوال پیدا ہوا کہ یہ کس طرح ہوا اور واقعہ نے کیا صورت اختیار کر لی؟ کیونکہ یہود و نصاریٰ تو کہتے ہیں کہ مسیح کو سولی پر بھی لٹکایا اور مار بھی ڈالا تب قرآن نے بتایا کہ مسیح بن مریم (علیہما السلام) کے قتل و صلیب کی پوری داستان سرتاسر غلط اور جھوٹ ہے بلکہ

اصل معاملہ یہ ہے کہ جب مسیح کو بقید حیات ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا گیا اور اس کے بعد دشمن مکان کے اندر گھس پڑے تو اُن پر صورتِ حال مشتبہ کر دی گئی اور وہ کسی طرح نہ جان سکے کہ آخر اِس مکان میں سے مسیح (علیہ السلام) کہاں چلا گیا :-

وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ	اور (یہود ملعون قرار دیے گئے) اپنے اس قول پر کہ ہم نے
عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ	مسیح عیسیٰ بن مریم پیغمبرِ خدا کو قتل کر دیا حالانکہ انھوں نے نہ اسکو
وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ	قتل کیا اور نہ سُولی پر چڑھایا بلکہ (خدا کی خفیہ تدبیر کی بدولت)
شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ	اصل معاملہ ان پر مشتبہ ہو کر رہ گیا اور جو لوگ اس کے قتل
اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ	کے بارہ میں جھگڑ رہے ہیں بلاشبہ وہ اس (عیسیٰؑ) کی
مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ	جانب سے شک میں پڑے ہوئے ہیں ان کے پاس حقیقت
اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ	حال کے بارہ میں ظن (اٹکل) کی پیروی کے سوا علم کی
يَقِيْنًا ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ	روشنی نہیں ہے اور انھوں نے عیسیٰؑ کو یقیناً قتل نہیں کیا
وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝	بلکہ ان کو اللہ نے اپنی جانب (ملاءِ اعلیٰ کی جانب) اٹھا لیا
(نساء پ ۶ ع ۲۲)	اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

قرآن عزیز کا یہ وہ بیان ہے جو یہود و نصاریٰ کے اختراعی فسانہ کے خلاف اس نے حضرت مسیح بن مریم (علیہما السلام) کے متعلق دیا ہے اب دونوں بیانات آپ کے سامنے ہیں، اور عدل و انصاف کا ترازو آپ کے ہاتھ میں۔ پہلے حضرت مسیح (علیہ السلام) کی شخصیت اور ان کے دعوت و ارشاد کے مشن کو تاریخی حقائق کی روشنی میں معلوم کیجیے اور اس کے بعد ایک مرتبہ پھر اُن تفصیلی واقعات پر نظر ڈالیے جو ایک اولوالعزم پیغمبر، مقرب بارگاہِ الٰہی اور نصاریٰ کے عقیدۂ باطل کے مُطابق خدا کے بیٹے کو خدا کے فیصلہ کے سامنے مایوس، مضطرب، بے یار و مددگار اور خدا سے شاکی ظاہر کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس تضادِ بیان پر بھی غور فرمائیے کہ ایک جانب عقیدۂ کفارہ کی بنیاد صرف اس پر قائم ہے کہ حضرت مسیح خدا کا بیٹا بن کر آیا ہی

اِس غرض سے تھا کہ مصلوب ہو کر دنیا کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے اور دوسری جانب صلیب اور قتلِ مسیح کی داستان اِس اساس پر گھڑی کی گئی ہے کہ جب وہ وقتِ موعود آ پہنچتا ہے تو خدا کا یہ فرضی بیٹا اپنی حقیقت اور دنیا میں وجود پذیری کو یکسر فراموش کر کے "ایلی ایلی لما سبقتنی" کا حسرتناک جملہ زبان سے کہتا اور مرضیِ الٰہی پر اپنی ناخوشی کا اظہار کرتا ہوا نظر آیا ہے کیا کسی شخص کو یہ سوال کرنے کا حق نہیں ہے کہ اگر نصاریٰ کے بیان کردہ واقعات کے دونوں حصے صحیح اور درست ہیں تو اِن دونوں کے باہم یہ تضاد کیسا اور اس عدم مطابقت کے کیا معنی؟

پس اگر ایک حقیقت بیں اور دُور رس نگاہ ان تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اور واقعات و حالات کی ان تمام کڑیوں کو باہم جوڑ کر اس مسئلہ کا مُطالعہ کرے تو وہ تصدیقِ حق کے پیشِ نظر بلا تامل یہ فیصلہ کرے گی کہ بائبل کی یہ داستان تضاد کی حامل اور گڑھی ہوئی داستان ہے اور قرآن نے اس سلسلہ میں جو فیصلہ دیا ہے وہی حق اور مبنی بر صداقت ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کے بعد سے سینٹ پال سے قبل تک نصاریٰ "یہود" کی اس خرافی داستان سے قطعاً بے تعلق تھے لیکن جب سینٹ پال (پولوس رسول) نے تثلیث اور کفارہ پر جدید عیسائیت کی بنیاد رکھی تو کفارہ کے عقیدہ کی استواری کیلئے یہود کی اس خرافی داستان کو بھی مذہب کا جزء بنا لیا گیا۔

لیکن واقعہ سے متعلق حد درجہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ جب کہ چودہ صدیوں سے قرآنِ حکیم نے عیسیٰ (علیہ السلام) کی عظمت و جلالتِ قدر کا اعلان کرتے ہوئے اُن کے "رفع الی السماء" کی حقیقت کو یہود و نصاریٰ کی خرافی داستان کے خلاف علم و یقین کی روشنی میں نمایاں اور یہود و نصاریٰ کو دلائل و براہین کے ذریعہ لاجواب اور سرنگوں کر دیا تھا تو اس کے مقابلہ میں آج ایک مُدعیِ اسلام' دعوئے نبوت و مسیحیت کے شوق یا ہندوستان پر مسلط عیسائی حکومت کی خود غرضانہ خوشامد میں یہود و نصاریٰ کے اسی عقیدہ کو دوبارہ زندہ کرنا اور اس پر اپنے "باطل عقیدۂ نبوت" کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے اور پنجاب (قادیان) کا یہ متنبی قرآنِ عزیز کی

تصریحات سے بے نیاز ہوکر نہایت جسارت کے ساتھ اُن تمام واقعات کی تصدیق کرتا ہے جو اس سلسلہ میں یہود و نصاریٰ نے اپنے اپنے باطل مزعومہ عقائد کی تکمیل کے لیے اختراع کیے ہیں، وہ کہتا ہے کہ بلاشبہ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کو یہود نے اسیر کیا، اُن کا ٹھٹھا اُڑایا، ان کے مُنہ پر تھوکا، اُن کے طمانچے بھی لگائے، ان کو کانٹوں کا تاج بھی پہنایا اور ان کے علاوہ ہر قسم کی توہین و تذلیل کا سلوک کرنے کے بعد اُن کو صلیب پر بھی چڑھایا اور اپنے زعم میں اُن کو قتل بھی کر ڈالا البتہ یہود و نصاریٰ کی حرف بحرف تصدیق کے بعد بغیر کسی قرآنی نص، حدیثی روایت اور تاریخی شہادت کے اپنی جانب سے یہ اضافہ کرتا ہے کہ جب شاگردوں کے مطالبہ پر نعش ان کے حوالہ کر دی گئی اور وہ تجہیز و تکفین کے لیے آمادہ ہوئے تو دیکھا کہ جسم میں جان باقی ہے تب انھوں نے خفیہ طور پر ایک خاص مرہم کے ذریعہ اُن کے زخموں کا علاج کیا اور جب وہ چنگے ہو گئے تو پوشیدہ رہ کر کشمیر کو چلے گئے اور وہاں بھی حیات کے آخری لمحوں تک خود کو چھپائے رکھا اور گمنامی میں وہیں انتقال پا گئے، گویا یوں کہیے کہ یہود و نصاریٰ کی مفروضہ داستان میں حضرتِ مسیح (علیہ السلام) سے متعلق توہین و تذلیل کے جس قدر بھی پہلو تھے وہ سب تو متنبیِ کاذب نے قبول کر لیے باقی اُن کی عظمتِ شان اور جلالتِ مرتبہ سے متعلق پہلو کو داستان سے خارج کر کے اس کے ساتھ ایک ایسا فرضی حصہ جوڑ دیا جس سے ایک جانب نیچر پرستوں کو اپنی جانب مائل کرنے کا سامان مہیا ہو سکے اور دوسری جانب عیسیٰ (علیہ السلام) کی باقی زندگیِ مُبارک کو گُمنامی کے ساتھ وابستہ کر کے توہین و تذلیل کا ایک گوشہ جو تشنۂ سامان رہ گیا تھا اس کی تکمیل ہو جائے (اِنّا للّٰہ و اِنّا الیہ راجعون)

متنبیِ پنجاب کو یہ سب کچھ کرنے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ اس کی جانب ابھی اشارہ کیا جا چکا ہے اور اس کی تفصیل کے لیے پروفیسر برنی کی کتاب "قادیانی مذہب" لائقِ مطالعہ ہے یا خود متنبیِ کاذب کی تصنیفی ہفوات اس حقیقت کو عُریاں کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

ہمارے پیشِ نظر تو یہ مسئلہ ہے کہ متنبیِ پنجاب نے کس طرح قرآن حکیم کی نصوصِ قطعیہ کے

خلاف یہود و نصاریٰ کے عقیدۂ "توہین" "تصلیب" اور قتل عیسیٰ علیہ السلام کی تائید پر بے جا جسارت کا اقدام کیا اور جس حد تک اختلاف کیا اس میں بھی دعویٰ قرآنی کے خلاف ان کی حیاتِ طیبہ کو نامراد و ناکام اور گمنام ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی۔

آپ ابھی سن چکے ہیں کہ قرآن عزیز نے بنی اسرائیل کے مقابلہ میں خدائے تعالیٰ کی نجات سے دعویٰ حفاظت و برتری کو کس قوتِ بیان کے ساتھ نمایاں کیا ہے "وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ" "اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" اور پھر کس زور کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دعوائے حفاظت کو اس شان کے ساتھ پورا کیا کہ دشمن کسی حیثیت سے بھی مسیح بن مریم (علیہما السلام) پر قابو نہ پا سکے اور ہاتھ تک نہ لگا سکے۔ "وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ" "وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ"

تو اب قابلِ غور ہے یہ بات کہ ہم دنیا میں روز و شب یہ مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ اگر کسی صاحبِ قوت و اقتدار ہستی کے عزیز دوست یا مصاحب کے خلاف ان کا دشمن درپے آزار یا قتل کے درپے ہوتا ہے اور یہ سمجھ کر کہ ہم صاحبِ اقتدار ہستی کی اعانت کے بغیر دشمن کے مقابلہ میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتے وہ صاحبِ اقتدار کی جانب رجوع کرتے ہیں اور یہ ہستی انکو پوری طرح اطمینان دلاتی ہے کہ دشمن ان کو کسی طرح نقصان نہیں پہنچا سکتا بلکہ اُن تک اس کی دسترس ہی نہیں ہونے دی جائے گی تو ہر ایک اہلِ عقل اس کلا ہی مطلب لیتا ہے کہ اب کسی بھی حالت میں اُن کو دشمن کا خطرہ باقی نہیں رہا مگر یہ کہ صاحبِ اقتدار ہستی اپنے وعدہ کا ایفاء نہ کرے اور جھوٹا ثابت ہو اور یا دشمن کی طاقت اتنی زیادہ ہو کہ وہ خود بھی اس حمایت و نصرت میں مغلوب و مقہور ہو کر رہ جائے۔

پس جب انسانی دنیا میں یہ اطلاع موصول ہو کہ صاحبِ اقتدار ہستی کے عزیز دوست یا مصاحب کو اس کے دشمن نے گرفتار کر لیا، مارا پیٹا، منہ پر تھوکا اور ہر طرح ذلیل و

رسوا کرکے اپنے گمان میں مار بھی ڈالا اور مُردہ سمجھ کر نعش اس کے عزیزوں کے سپرد کردی مگر حسب اتفاق نبض دیکھنے سے معلوم ہوا کہ کہیں جان اٹکی رہ گئی ہے لہٰذا علاج معالجہ کیا گیا اور وہ رو بصحت ہو گیا تو دنیاءِ انسانی اس صاحبِ اقتدار ہستی کے متعلق کیا رائے قائم کریگی جس نے اس مظلوم کی حمایت و نصرت کا وعدہ کیا تھا؟ یہ کہ اس نے اپنا وعدہ پورا کیا یا نہیں کیا؟ ظاہر ہے کہ نہیں کیا خواہ قصداً نہیں کیا یا اس لیے کہ وہ مجبور رہا۔

پس اگر دنیاءِ انسانی کے معاملات میں صورتِ حال یہ ہے کہ معلوم نہیں کہ متنبی پنجاب کے عقل و دماغ نے قادرِ مطلق خدا کے متعلق کس ذہنیت کے ماتحت یہ فیصلہ کیا کہ خدا نے عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) کو ہر قسم کی حفاظت و صیانت کے وعدہ کے باوجود دشمن کے ہاتھوں وہ سب کچھ ہونے دیا جس کو یہود و نصاریٰ کی اندھی تقلید میں متنبی پنجاب نے تسلیم کرلیا البتہ اشک شوئی کے لیے صرف اس قدر اضافہ کر دیا کہ اگرچہ یہود نے صلیب و قتل کے بعد سمجھ لیا تھا کہ روح قفسِ عنصری سے نکل چکی ہے مگر حقیقتہً ایسا نہیں ہوا تھا بلکہ رمق جان ابھی غیر محسوس طور پر باقی تھی اس لیے اسی طرح ان کی جان بچ گئی جس طرح موجودہ زمانہ میں اب سے چند سال قبل جیلوں میں پھانسی دینے کا جو طریقہ رائج تھا اس کی وجہ سے کبھی پھانسی پانے کے بعد رمقِ جان باقی رہ جاتی تھی اور نعش کی سپردگی کے بعد علاج معالجہ سے وہ اچھا ہو جاتا تھا۔

بہرحال ہم تو اس ذاتِ واحد قادرِ مطلق خدا پر ایمان رکھتے ہیں جس نے جب کبھی بھی اپنے خاص بندوں (نبیوں اور رسولوں) سے اس قسم کا وعدۂ حفاظت و صیانت کیا ہے تو پھر اس کو پُورا بھی ایسی شان سے کیا ہے جو قادرِ مطلق ہستی کے لیے شایاں اور لائق ہے۔

حضرتِ صالح (علیہ السلام) اور ان کی قوم کے منکرینِ حق کا معاملہ سورہ نمل میں جس معجزانہ شان کے ساتھ بیان ہوا ہے اس پر غور فرمایئے۔ ارشادِ باری ہے:۔

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ — اور شہر میں نو شخص تھے جو (بہت) مُفسد تھے اور کوئی کام

يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا	صلاح کاری کا نہیں کرتے تھے، انھوں نے آپس میں کہا
يُصْلِحُوْنَ ۝ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ	"باہم قسمیں کھاؤ کہ ہم ضرور صالحؑ اور اس کے گھر والوں پر
لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ	شبخون ماریں گے اور پھر اس کے وارثوں سے کہہ دیں گے
لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ	کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے وقت موقع پر موجود ہی
وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ وَمَكَرُوْا	نہیں تھے اور قسم بخدا ہم ضرور سچے ہیں" اور انھوں نے
مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ	(صالحؑ کے خلاف) خفیہ سازش کی اور ہم نے بھی (انکی
لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فَانْظُرْ كَيْفَ	سازش کے خلاف) خفیہ تدبیر کی اور وہ ہماری مخفی تدبیر
كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ اَنَّا	کو نہیں سمجھتے تھے پس (اے محمدؐ!) دیکھو! کہ ان کی خفیہ
دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝	سازشی تدبیر کا کیا حشر ہوا؟ یہ کہ ہم نے ان کو (مفسدوں کو)
فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا	اور ان کی سرکش قوم کو سب کو ہلاک کر دیا (نگاہ اٹھاکر)
ظَلَمُوْا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ	دیکھو یہ (قریب ہی) ہیں ان کے گھروں کے کھنڈر ویران
لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ وَ	ہیں ان کے ظلم کی وجہ سے، بیشک اس واقعہ میں نشانی
اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا	ہے سمجھ والوں کے لیے اور ہم نے نجات دی ایمان والوں
يَتَّقُوْنَ ۝ (نمل پ ۱۹ ع ۴)	کو جو کہ پرہیزگار تھے۔

اور پھر مطالعہ کیجیے اُس عظیم الشان واقعہ کا جو ہجرتِ خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) سے تعلق رکھتا ہے اور سورۂ انفال میں دشمنانِ حق کی ذلت و رسوائی کا ابدی اعلان ہے۔

ان دونوں واقعات میں حق و باطل کے معرکوں، دشمنوں کی خفیہ سازشوں اور انبیاء علیہم السلام کی حفاظت کے لیے وعدۂ الٰہی اور اس کے بے غل و غش پورا ہونے کا جو نقشہ قرآن عزیز نے پیش کیا ہے، تاریخی نگاہ سے ان پر غور فرمائیے اور فیصلہ کیجیے کہ جس خدا نے صالح (علیہ السلام) اور خاتم الانبیاء محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ اپنے وعدۂ حفاظت کو اِس شانِ رفیع کے ساتھ پورا کیا ہو۔ کیا متنبیِ پنجاب کے عقیدہ کے مطابق اسی شانِ معجزانہ

کے ساتھ وہ عیسیٰ (علیہ السلام) کے حق میں پورا ہوا؟ نہیں ہرگز نہیں، حالانکہ آیات قرآنی شاہد ہیں کہ ان دونوں واقعات کے مقابلہ میں عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) سے کیے گئے وعدے زیادہ واضح تفصیلات رکھتے ہیں اور ان میں صاف کہا گیا ہے کہ خدا کے بہترین مخفی فیصلہ کے مطابق حضرت مسیح (علیہ السلام) کے دشمن اُن کو ہاتھ تک نہ لگا سکیں گے، تب ہی تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اپنے جن احسانات و انعامات کو شمار کرائے گا ان میں سے ایک بڑا انعام و احسان یہ بھی ہوگا:۔

وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ اور جبکہ ہم نے بنی اسرائیل کو تجھ سے روک دیا تھا

متنبی پنجاب کو اگر اپنی نبوت اور مسیحیت کے افترا اور ڈھونگ کو مضبوط کرنے کیلیے حضرت مسیح کے زندہ آسمان پر اُٹھائے جانے کے خلاف اس درجہ ناگواری تھی جیسا کہ متنبی کاذب کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے تب بھی یہود و نصاریٰ کی اس اندھی تقلید کے لیے مقابلہ میں جو نصوص قرآنی کے خلاف "کفر بواح" تک پہنچاتی اور حضرت مسیح کی شانِ رفیع کے حق میں باعثِ توہین و تذلیل اور وعدۂ الٰہی کی تکذیب کرتی ہے" کیا یہ کافی نہیں تھا کہ تاویلِ باطل[1] کے پردہ میں اتنا ہی کہہ دیا جاتا کہ وہ اگرچہ بقیدِ حیات آسمان پر نہیں اُٹھائے گئے مگر اللہ تعالیٰ نے بند مکان سے کسی طریق پر اُن کو دشمنوں کے نرغے سے نکال کر محفوظ کر دیا اور دشمن کسی طرح ان کو نہ پا سکے، لیکن وائے برحالِ متنبی قادیان کہ خدا کے سچے پیغمبر حضرت عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) کے ساتھ بغض و عناد نے " خسر الدنیا والآخرہ " کا مصداق بنا کر ہی چھوڑا۔

قادیانی تلبیس اور اس کا جواب	حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے اِس معرکۃ الآراء مسئلہ میں جو اُن کی عظمت اور جلالت کا زبردست نشان ہے" سورۂ آلِ عمران کی آیات کا باہمی ربط اور

[1] تاویلِ باطل اس لیے کہ حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق دیگر نصوصِ قرآنی، حدیثی اور اجماعِ امت کے پیشِ نظر اس مقام پر یہ تاویل بلاشبہ باطل ہے مگر اس سے کم از کم حضرت مسیح (علیہ السلام) کی توہین اور وعدۂ الٰہی کی تکذیب کا پہلو نہیں نکلتا۔

ترتیبِ ذکری خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہے کہ متنبّی کاذب نے اس میں بھی "تلبیس الحق بالباطل" کا ثبوت دے کر ناواقف کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

قرآن عزیز، سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیحؑ کے دشمنوں کے نرغے میں گھر جانے سے متعلق جس تسلی اور وعدہ کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فطری شکل وصورت یہ پیش آئی کہ جب دشمنانِ دین نے حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کا ایک بند مکان میں محاصرہ کر لیا تو ایک اولوالعزم پیغمبر اور خدائے برحق کے درمیان تقرب کا جو رشتہ قائم ہے اس کے پیشِ نظر قدرتی طور پر حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اب کیا پیش آنے والا ہے، راہِ حق میں جاں سپاری یا قدرتِ الٰہی کا کوئی اور کرشمہ؟ اور اگر دشمنوں سے تحفظ کے لیے کوئی کرشمہ پیش آنے والا ہے تو اس کی کیا شکل ہوگی کیونکہ بظاہر کوئی سامان نظر نہیں آتا، اور اگر تحفظ ہوا بھی تو کیا کچھ مصائب وآلام اٹھانے کے بعد تحفظِ جان ہوگا یا دشمن کسی بھی صورت میں قابو نہ پا سکیں گے؟ تب اللہ تعالیٰ نے حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کو مخاطب کرتے ہوئے حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے قلب میں فطری طور پر پیدا ہونے والے سوالات کا ترتیب وار اس طرح جواب دیا: "عیسیٰ! میری یہ ذمہ داری ہے کہ میں تیری مقررہ مدتِ حیات پوری کروں گا یعنی مطمئن رہو کہ تجھ کو دشمن قتل نہ کرپائیں گے" (اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ) "درصورت یہ ہوگی کہ اس وقت میں تجھ کو اپنی جانب یعنی ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لوں گا" (وَرَافِعُكَ اِلَیَّ) اور یہ بھی اس طرح نہیں کہ پہلے سب کچھ مصائب ہو گذریں گے اور پھر ہم تجھ کو آخر میں علاج معالجہ کرا کرا اٹھائیں گے، نہیں بلکہ یوں ہوگا کہ تو دشمن کے ناپاک ہاتھوں سے ہر طرح محفوظ رہے گا اور کوئی دشمن تجھ کو ہاتھ تک نہ لگا سکے گا (وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا) یہ تو تمہارے فطری سوالات کا جواب ہوا لیکن اس سے بھی زیادہ ہم یہ کریں گے کہ جو تیرے پیرو ہیں (خواہ غلط کار ہوں جیسا کہ نصاریٰ اور خواہ صحیح العقیدہ ہوں جیسا کہ مسلمان) ان کو قیامت تک یہود پر غالب رکھیں گے اور تا قیامِ قیامت کبھی ان کو حاکمانہ اقتدار نصیب نہیں ہوگا، باقی رہا تمام

معاملات کا فیصلہ ہو اُس کے لیے (قیامت کا) دن مقرر ہے اس روز سب اختلافات ختم ہو جائیں گے اور حق و باطل کا دو ٹوک فیصلہ کر دیا جائے گا۔

زیرِ بحث آیات کی یہ تفسیر جس طرح سلفِ صالحین اور اجماعِ امت کے مطابق ہے اسی طرح اس میں آیات میں کیے گئے متعدد وعدوں کی ترتیب میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اور مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی مگر مرزائے قادیانی نے اپنی "مسندِ مسیحیت و نبوت" کو قائم کرنے کے لیے قرآن، احادیثِ صحیحہ اور اجماعِ اُمت کے خلاف جبکہ یہ دعوٰی کیا کہ حضرتِ عیسٰی (علیہ السلام) کی موت ہو چکی تو اس سلسلہ کی آیات میں تحریفِ معنوی کی ناکام سعی کو بھی ضروری سمجھا اور دعوٰی کیا کہ اگر مسیح (علیہ السلام) کی موت کے وقوع کو رفع الی السماء اور تطہیر اور تفوق المطیعین علی الکافرین سے قبل تسلیم نہ کیا جائے گا تو ترتیبِ ذکری میں فرق آجائے گا اور مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم ماننا پڑے گا اور یہ قرآنِ عزیز کی شانِ بلاغت کے خلاف ہے لہٰذا یہ ماننا چاہیے کہ "اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ" کے وعدہ کا وقوع ہو چکا اور عیسٰی (علیہ السلام) پر موت آچکی۔

مرزائے قادیانی کی یہ "تلبیس" اگرچہ ان حضرات سے تو پوشیدہ نہیں رہ سکتی جو عربیت اور قرآن کے اسلوبِ بیان کا ذوق رکھتے ہیں لیکن عوام کو مغالطہ میں ڈال سکتی ہے اس لیے اس عنوان کے شروع ہی میں آیات کی تفسیر کو اِس طرح بیان کر دیا گیا کہ مرزا کی جانب سے جو تلبیس کی گئی ہے وہ خود بخود زائل ہو جائے تاہم مزید تشریح کے لیے یہ اور اضافہ ہے کہ ترتیبِ ذکری کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کلام میں اگر چند باتیں ترتیب وار ذکر کی گئی ہیں تو اُن کا وقوع بھی اس طرح ہونا چاہیے کہ اس کلام میں ذکر کردہ ترتیب بگڑنے نہ پائے اور مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کرنا نہ پڑے اور یہ جب ضروری ہے کہ کلام کی فصاحت و بلاغت کا تقاضہ ہی یہ ہو کہ ترتیبِ ذکری میں فرق نہ آنے پائے ورنہ تو بعض مقامات پر تقدیم و تاخیر کو بھی فصاحت کی جان سمجھا جاتا ہے اور یہ علمِ معانی کا مشہور مسئلہ ہے۔

پس قرآن کی ان آیات میں جمہور اہلِ اسلام کی تفسیر کے مطابق ترتیب ذکری بحالہ قایم ہے اس لیے کہ خدا کی جانب سے پہلا وعدہ یہ ہے کہ میں تمہاری مقررہ مدت پوری کروں گا "اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ" یعنی تمہاری موت اِن دشمنوں کے ہاتھ سے نہیں ہوگی بلکہ تم اپنی طبعی موت سے مروگے مگر اس پہلے وعدہ کو پورا کرنے کے لیے متعدد صورتیں ہوسکتی تھیں یہ کہ دشمنوں پر باہر سے اچانک حملہ ہو جائے اور وہ فرار ہو جائیں یا سب وہیں کھیت رہیں اور حضرت مسیح (علیہ السلام) ان کی زد سے بچ جائیں یا یہ کہ قوم عاد و ثمود کی طرح زمین یا آسمان سے قدرتی عذاب آکر ان سب کو ہلاک کر دے، یا یہ کہ حضرت مسیح کسی ترکیب سے ان کے نرغہ میں سے محفوظ نکل جائیں اور ان کی دسترس سے باہر ہو جائیں یا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے کرشمۂ قدرت سے عیسیٰ (علیہ السلام) کو مکان بند رہتے ہوئے ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھالے وغیرہ وغیرہ۔ تو قرآن نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو خبر دی کہ پہلے وعدہ کا ایفاء مسطورہ بالا آخری شکل یعنی "وَرَافِعُکَ اِلَیَّ" کی شکل میں ہوگا اور ہوگا بھی ایسی قدرتِ کاملہ کے ہاتھوں کہ اس محاصرہ کے باوجود دشمن اپنے ناپاک ہاتھ تجھ کو نہیں لگا سکیں گے اور میں اُن کافروں کے ہاتھ سے تجھ کو پاک رکھوں گا "وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا"۔ اور ان باتوں کے علاوہ یہ بھی ہوگا کہ میں تیرے پیروؤں کو تیرے منکروں پر قیامت تک غالب رکھوں گا۔ بہرحال بعد کے یہ تینوں وعدے بالترتیب جب ہی عمل میں آئیں گے کہ پہلے وعدۂ اوّل وقوع پذیر ہو جائے یعنی تیری موت ان کے ہاتھوں نہ ہو بلکہ اپنی مقررہ مدت پر پہنچ کر طبعی موت آئے۔ ان آیات میں پہلے وعدہ کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ میں اوّل تجھ کو ماروں گا اور پھر بالترتیب یہ سب امور انجام دوں گا، کیونکہ یہ قول صرف جاہل ہی کہہ سکتا ہے لیکن جس کو گفتگو کا معمولی بھی سلیقہ ہے وہ ہرگز ایسا کہنے کی جرأت نہیں کرے گا کیونکہ ترتیب ذکری کے لیے یہ تو ہونا چاہیے کہ ان امور کے وقوع میں ایسی صورت نہ پیدا ہو جائے کہ ترتیب میں فرق لاکر تقدیم و تاخیر کا عمل جراحی کرنا پڑے لیکن اگر کوئی شے زمانہ کا امتداد اور طوالت چاہتی ہے

اور اس کا آخری حصۂ وقوع ان تمام امور کے بعد پیش آتا ہے جو اس کے بعد مذکور تھے مگر ترتیبِ ذکری میں مطلق کوئی فرق نہیں آتا تو ایسی شکل میں اس وقوع کے متأخر ہو جانے سے کسی عالم کے نزدیک بھی کلام کی فصاحت و بلاغت میں نقص واقع نہیں ہوتا اور نہ اس قسم کے وقوعِ ترتیبی کا ترتیبِ ذکری کے ساتھ کوئی تعلق ہوتا ہے۔

پس مسئلۂ زیرِ بحث میں حضرتِ عیسٰی علیہ السلام کی طبعی موت کا وقوع کبھی بھی ہو اس کا ترتیبِ ذکری سے مطلق کوئی علاقہ نہیں ہے، یہاں تو "اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ" کہہ کر یہ بتایا گیا ہے کہ دیے گئے متعدد وعدوں میں پہل اور اولیت اس وعدہ کو حاصل ہے کہ تمہاری موت کا سبب یہ یہود بنی اسرائیل نہیں ہوں گے بلکہ جب بھی یہ مقررہ مدت پوری ہو گی اس طریق پر ہو گی جو عام طور سے میری جانب منسوب کی جاتی ہے (یعنی طبعی موت) اور یہ وعدہ بہر حال باقی تین وعدوں سے پہلے ہی رہا تب ہی تو یہ تینوں وعدے وقوع میں آسکے، اور اگر کہیں دشمن حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کی موت کا سبب بن گئے ہوتے تو پھر "رفع" اور "تطہیر" کے لیے کوئی صورت ہی نہ رہ جاتی اور مرزا کادیانی کی طرح باطل اور رکیک تاویلات کی آڑ لینی پڑتی اور آیاتِ زیرِ بحث کی "روح" فنا ہو کر رہ جاتی۔ اور یہ اس لیے کہ اگر "رفع" سے رفعِ روحانی اور "تطہیر" سے روحانی پاکی مُراد لیے جائیں تو یہ قطعاً بے محل اور بے موقع ہو گا کیونکہ قرآن کے ارشاد کے مطابق یہ وعدے حضرتِ عیسٰی (علیہ السلام) کو دیے جا رہے ہیں تو حضرتِ عیسٰی (علیہ السلام) کو یہ بتانا کہ تمہارے متعلق یہود کا یہ اعتقاد کہ "تم کاذب اور ملعون ہو" غلط ہے اور تم مطمئن رہو کہ میں تمہارا رفعِ روحانی کرنے والا ہوں قطعاً عبث تھا کیونکہ حضرتِ عیسٰی (علیہ السلام) پیغمبرِ خدا ہیں اور جانتے ہیں کہ یہود کا افترا کیا حقیقت رکھتا ہے، نیز یہود کو حضرتِ مسیح کے رفعِ روحانی کا پتہ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ معاملہ عالمِ غیب سے متعلق ہے تو خدائے برتر کا یہ ارشاد نہ حضرتِ مسیح کی برمحل تسلی کا باعث ہو سکتا تھا اور نہ یہود کے لیے سود مند اور یہی حال دوسرے وعدۂ تطہیر کا ہے بلکہ جب بقولِ کادیانی

یہود کے ہاتھوں حضرتِ مسیحؑ صلیب پر چڑھا دیے گئے تو نعش پا لینے کے بعد شاگردوں کا مرہم عیسیٰ لگا کر چنگا کر لینے اور پھر منجانب اللہ جن کی ہدایت و ارشاد کے لیے مامور کیے گئے تھے ان سے جان بچا کر بھاگ جانے اور زندگی بھر گمنامی میں زندگی بسر کرتے رہنے کے بعد "رَافِعُكَ إِلَيَّ" اور "مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا" کہہ دینے سے نہ یہود کے عقیدۂ متعلق مسیحؑ کی ہی تردید ہوگی اور نہ ایک غیر جانبدار انسان ہی یہ سمجھ سکے گا کہ ایسے موقع پر جبکہ عیسیٰ (علیہ السلام) دشمنوں کے نرغے میں ہیں اور جبکہ اُن کو یہ یقین ہے کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور موت کے بعد رفعِ روحانی اور تطہیر لازم شے ہے" ان تسلیوں اور وعدوں کا کیا فائدہ ہے خصوصاً جبکہ ان کے ساتھ دشمن نے وہ سب کچھ کر لیا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔

البتہ جمہور اہلِ حق کی تفسیر کے مطابق آیاتِ قرآنی کی روح اپنی معجزانہ بلاغت کے ساتھ پوری طرح ناطق ہے کہ یہ وعدے حضرتِ مسیحؑ سے جس طرح کیے گئے وہ برمحل اور فطری اضطراب کے لیے بلاشبہ باعثِ تسکین ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت کا ذات کے یہود و نصاریٰ کے دراشتی عقائدِ باطلہ کی تردید کے لیے کافی اور مدلل۔

جمہور اہلِ حق کی یہ تفسیر "توفی" کے معنی "مقررہ مدت پوری کرنا" اختیار کر کے کی گئی ہے جس کا حاصل (توفی بمعنی موت) نکلتا ہے لیکن توفی کے یہ حقیقی معنی نہیں ہیں بلکہ بطور کنایہ کے مستعمل ہوتے ہیں کیونکہ لغتِ عرب میں اس کا مادہ (میٹر) وفیٰ، یفی، وفاءٌ ہے جس کے معنی "پورا کرنے" کے آتے ہیں اور اس کو جب بابِ تفعّل میں لے جا کر "توفی" بناتے ہیں تو اس کے معنی "کسی شے کو پورا پورا لے لینا" یا "کسی شے کو سالم قبضہ میں کر لینا" آتے ہیں (توفی أخذه وافیا تامًا یقال توفیت من فلان مالی علیه) اور چونکہ موت میں بھی اسلامی عقیدہ کے مطابق روح کو پورا لے لیا جاتا ہے اس لیے کنایہ کے طور پر کہ جس میں حقیقی معنی بحالہ محفوظ رہا کرتے ہیں "توفی بمعنی موت" مستعمل ہوتا ہے اور کہتے ہیں "توفاه اللہ ای اماته" لیکن

اگر موقع پر دوسرے دلائل ایسے موجود ہوں جن کے پیشِ نظر توفّی کے حقیقی معنی لیے جا سکتے ہوں یا حقیقی کے ماسوا دوسرے معنی بن ہی نہ سکتے ہوں تو اس مقام پر خواہ فاعل "اللہ تعالیٰ" اور مفعول "ذی روح انسان" ہی کیوں نہ ہو وہاں حقیقی معنی "پورا لے لینا" ہی مراد ہوں گے مثلاً آیت "اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِہَا"[1] "اللہ پورا لے لیتا ہے جانوں کو اُن کی موت کے وقت اور اُن جانوں کو جن کو ابھی موت نہیں آئی ہے پورا لے لیتا ہے نیند میں" "وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ" کے لیے بھی لفظ "توفّی" بولا گیا یعنی ایک جانب یہ صراحت کی جا رہی ہے کہ یہ وہ جانیں (نفوس) ہیں جن کو موت نہیں آئی اور دوسری جانب یہ بھی بصراحت کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نیند کی حالت میں ان کے ساتھ "توفّی" کا معاملہ کرتا ہے تو یہاں اللہ تعالیٰ فاعل ہے "متوفّی" اور نفس انسانی مفعول ہے "متوفّٰی" مگر پھر بھی کسی صورت سے "توفّی بمعنی موت" صحیح نہیں ہیں ورنہ تو قرآن کا جملہ "وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ" العیاذ باللہ مہمل ہو کر رہ جائے گا' یا مثلاً "وَھُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰکُمْ بِالَّیْلِ وَیَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّہَارِ" (اور وہی (اللہ) ہے جو پورا لے لیتا یا قبضہ میں کر لیتا ہے تم کو رات میں اور جانتا ہے جو تم کماتے ہو دن میں[2]) میں بھی کسی طرح توفّی بمعنی موت نہیں بن سکتے حالانکہ توفّی کا فاعل اللہ اور مفعول انسانی نفوس ہیں' یا مثلاً آیت "حَتّٰی اِذَا جَآءَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْہُ رُسُلُنَا"[3] یہاں تک کہ جب آتی ہے تم میں سے ایک کسی کو موت، قبض کر لیتے ہیں یا پورا لے لیتے ہیں اس کو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) میں ذکر موت ہی کا ہو رہا ہے لیکن پھر بھی "تَوَفَّتْہُ" میں توفّی کے معنی موت کے نہیں بن سکتے ورنہ بے فائدہ تکرار لازم آئے گا' یعنی "اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ" میں جب لفظ "موت" کا ذکر آ چکا تو اب "تَوَفَّتْہُ" میں بھی اگر توفّی کے معنی موت ہی کے لیے جائیں تو ترجمہ یہ ہوگا' یہاں تک کہ جب آتی ہے تم میں سے ایک کسی کو موت' موت لے آتے ہیں ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں دوبارہ لفظِ موت کا ذکر بے فائدہ ہے اور کلام فصیح و بلیغ اور معجز تو کیا روزمرہ کے محاورہ

[1] سورۂ زمر۔ [2] سورۂ انعام۔ [3] انعام۔

اور عام بول چال کے لحاظ سے بھی پست اور لاطائل ہو جاتا ہے البتہ اگر توفی کے حقیقی معنی کسی شے پر قبضہ کرنا یا اس کو پورا لے لینا مراد لیے جائیں تو قرآن عزیز کا مقصد ٹھیک ادا ہوگا اور کلام بھی اپنے حد اعجاز پر قائم رہے گا۔

اب ہر ایک عاقل غور کر سکتا ہے کہ یہ دعویٰ کرنا کہ توفّی کے حقیقی معنی موت کے ہیں۔ خصوصاً جبکہ فاعل خدا ہو اور مفعول ذی روح کہاں تک صحیح اور درست ہے۔

بہرحال اس موقع پر "موت" اور "توفی" دونوں کا ساتھ ساتھ بیان ہونا اور دونوں کا ایک ہی معمول ہونا اور پھر دونوں کے معنی میں فرق و تفاوت اس بات کے لیے واضح دلیل ہے کہ یہ دونوں مرادف الفاظ نہیں ہیں اور جس طرح لیث و اسد (بمعنی شیر) ابل و جمل (بمعنی اونٹ) نون و حوت (بمعنی مچھلی) وغیرہ اسماء کا اور جمع، شملٌ، کسبٌ (بمعنی جمع ہونا) اور لبثٌ مکثٌ (بمعنی ٹھہرنا) اور عطشٌ، ظمأٌ (پیاس) اور جوعٌ، سغبٌ (بمعنی بھوک) مصادر کا حال ہے، موت اور توفّی کے درمیان وہ معاملہ نہیں ہے بلکہ ان کے حقیقی معانی میں نمایاں فرق ہے۔ اور مثلاً آیت فَاَمْسِکُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ پس روکے رکھو اُن (عورتوں) کو گھروں میں یہاں تک کہ لے لے ان کو موت" میں موت کو فعل اور توفّی کا فاعل قرار دیا گیا ہے اور ہر ایک زبان کی نحو (گرامر) کا یہ مسئلہ ہے کہ فاعل اور فعل ایک نہیں ہوتے کیونکہ فعل، فاعل سے صادر ہوتا ہے، عین ذاتِ فاعل نہیں ہوا کرتا تو اس سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ توفّی کے حقیقی معنی "موت" کے ہرگز ہرگز نہیں ہیں ورنہ اس کا اطلاق جائز نہیں ہو سکتا۔

ان تین مقامات کے علاوہ سورۂ بقرہ کی آیت :

ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ پھر پورا دیا جائے گا ہر ایک نفس کو جو کچھ اس نے کمایا ہے۔

اور سورۂ نحل کی آیت :

وَتُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ اور پورا دیا جائے گا ہر نفس کو جو کچھ اس نے کمایا ہے۔

میں بھی توفی کا فاعل اللہ تعالیٰ اور مفعول نفس انسانی ہے تاہم یہاں توفی بمعنی موت نہیں بن سکتے اور یہ بہت واضح اور صاف بات ہے۔

غرض ان آیات میں باوجود اس امر کے کہ "توفی" کا فاعل اللہ تعالیٰ اور اس کا مفعول "انسان یا نفس انسانی" ہے پھر بھی باجماعِ اہلِ لغت و تفسیر "موت کے معنی" نہیں ہو سکتے خواہ اس لیے کہ دلیل اور قرینہ اس معنی کے خلاف ہے اور یا اس لیے کہ اس مقام پر توفی کے حقیقی معنی (پورا لے لینا یا قبض کر لینا) کے ماسوا "موت کے معنی" کسی طرح بن ہی نہیں سکتے۔

تو مرزائے قادیانی کا یہ دعویٰ کہ "توفی" اور "موت" مرادف الفاظ ہیں یا یہ کہ توفی کا فاعل اگر اللہ تعالیٰ اور مفعول انسان یا نفسِ انسانی ہو تو اس جگہ صرف "موت" ہی کے معنی ہونگے، دونوں دعوے باطل اور نصوصِ قرآنی کے قطعاً خلاف ہیں۔ فَهَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ :

توفی اور موت یقیناً مرادف الفاظ نہیں ہیں اور توفی کے حقیقی معنی "موت" نہیں بلکہ "پورا لے لینا یا قبض کر لینا" ہیں۔ قرآن عزیز سے اس کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ پورے قرآن میں کسی ایک جگہ بھی موت کا فاعل اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو قرار نہیں دیا گیا مگر اس کے برعکس توفی کا فاعل متعدد مقامات پر ملائکہ (فرشتوں) کو ٹھیرایا ہے مثلاً سورۂ نساء میں ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ بیشک وہ لوگ جن کو فرشتوں نے قبض کر لیا یا پورا پورا لے لیا، اور سورۂ انعام میں ہے: "تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا" قبض کر لیا یا پورا لے لیا اس کو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتوں) نے اور سورۂ سجدہ میں ہے: "قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ" (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجیے قبض کرے گا تم کو موت کا فرشتہ) اور سورۂ انفال میں ہے: "وَلَوْ تَرٰٓى إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ اور کاش کہ تو دیکھے جس وقت کہ قبض کرتے ہیں فرشتے اُن لوگوں (کی روحوں) کو جنھوں نے کفر کیا ہے۔

اِن تمام مقامات پر اگرچہ توفی "کنایۃً" بمعنی موت استعمال ہوا ہے لیکن پھر بھی چوں کہ

اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی بجائے ملائکہ اور ملک الموت کی جانب ہو رہی تھی اس لیے لفظِ "توفی" کا اطلاق کیا گیا اور لفظِ "موت" استعمال نہیں کیا گیا اور یہ صرف اس لیے کہ موت تو اللہ کا فعل ہے اور موت کے وقت انسان کا یعنی روحِ انسانی کا قبض کرنا اور اس کا پورا پورا لے لینا یہ فرشتوں کا عمل ہے، تو جن مقامات میں یہ بتانا مقصود ہے کہ جب خدا کسی کی اجل پوری کر دیتا اور موت کا حکم صادر فرماتا ہے تو اس کی صورتِ عمل کیا پیش آتی ہے ان مقامات میں موت کا اطلاق ہرگز موزوں نہیں تھا بلکہ "توفی" کا لفظ ہی اس حقیقت کو ادا کر سکتا تھا۔

موت اور توفی کے درمیان قرآنی اطلاقات کے پیشِ نظر ایک بہت بڑا فرق یہ بھی ہے کہ قرآنِ عزیز نے جگہ جگہ "موت" اور "حیات" کو تو مقابل ٹھیرایا ہے لیکن "توفی" کو کسی ایک مقام پر بھی "حیات" کا مقابل قرار نہیں دیا۔ مثلاً سورۂ ملک میں ہے: "هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ ــــ خدا ہی وہ ذات ہے جس نے پیدا کیا موت کو اور زندگی کو" اور سورۂ فرقان میں ہے "وَلَا یَمْلِکُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَیٰوةً ۔ اور وہ نہیں مالک ہیں موت کے اور نہ حیات کے۔"

اور اسی طرح ان دونوں کے مشتقات کو مقابل ٹھیرایا ہے مثلاً "کَیْفَ تُحْیِی الْمَوْتٰی"[1] "یُحْیِی الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا"[2] "فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا"[3] "وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ"[4] "وَهُوَ یُحْیِی الْمَوْتٰی"[5] (وغیر ذلک کثیرا) البتہ توفی کے حقیقی معنی میں چونکہ یہ وسعت موجود ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے موت کی جو حقیقت ہے بطریقِ کنایہ اس پر بھی حسبِ موقع اس کا اطلاق ہو سکتا ہے تو یہ استعمال اور اطلاق بھی جائز ٹھیرا اور اس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔

"توفی" کے معنی کی اس مفصل تشریح و توضیح کا حاصل یہ ہوا کہ لغتِ عرب اور قرآنی اطلاقات دونوں اس کے شاہد ہیں کہ توفی اور موت دونوں کے حقیقی معنی میں بھی اور دونوں کے اطلاقات میں بھی واضح فرق ہے اور دونوں مرادف الفاظ نہیں ہیں خواہ توفی کا فاعل اللہ تعالیٰ اور مفعول "انسان اور روحِ انسانی" ہی کیوں نہ ہو۔ مگر اسلامی نقطۂ نظر سے چونکہ موت ایک ایسی حقیقت کا نام ہے جس پر بطریقِ "توسع" اور "کنایہ" توفی کا اطلاق کیا جا سکتا ہے پس جب

[1] بقرہ ۔ [2] روم ۔ [3] بقرہ ۔ [4] [illegible] ۔ [5] شوریٰ

مقام پر قرینہ اور محلِ استعمال کا تقاضہ یہ ہوگا کہ وہاں توفّی بول کر کنایۃً موت کے معنی لیے جانے چاہئیں تو اس جگہ "موت" کے معنی مراد ہوں گے لیکن اس کے برعکس اگر دلیل، قرینہ اور محلِ استعمال حقیقی معنی کا متقاضی ہے تو اس جگہ وہی معنی مراد ہوں گے اور ان ہی کو مقدم سمجھا جائے گا خواہ کنائی معنی وہاں قطعاً نہ بن سکتے ہوں اور خواہ بن سکتے ہوں مگر محلِ استعمال اور دوسرے دلائل اس کو مرجوح یا ممنوع قرار دیتے ہوں۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو بہ نظرِ غائر مطالعہ کرنے کے بعد لغت کے مشہور امام ابو البقا نے یہ تصریح کی ہے کہ عوام میں توفّی کے معنی اگرچہ "موت" کے سمجھے جاتے ہیں مگر خواص کے نزدیک اس کے معنی "پورا لے لینا" اور "قبض کرنا" ہیں فرماتے ہیں: التوفی الاماتۃ وقبض الروح وعلیہ استعمال العامۃ والاستیفاء واخذ الحق وعلیہ استعمال البلغاء۔

الحاصل، سورۂ مائدہ کی آیت "اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ" میں اگر حقیقی معنی مراد ہوں جیسا کہ جلیل القدر علماء تفسیر ولغت نے اختیار کیے ہیں۔ تب بھی مرزائے قادیانی کے علی الرغم آیاتِ زیرِ بحث کا یہ مطلب ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو یہ تسلی دی گئی "اے عیسیٰ! میں تجھ کو پورا پورا لے لینے والا ہوں یا تجھ کو قبض کرنے والا ہوں اور صورت یہ ہوگی کہ میں تجھ کو اپنی جانب (ملاءِ اعلیٰ کی جانب) اُٹھا لینے والا ہوں اور تجھ کو دشمنوں کے ناپاک ہاتھوں سے پاک رکھنے والا ہوں الخ" یعنی جب شروع میں یہ بتایا کہ تجھ کو قبض کر لیا جائے گا یا پورا لے لیا جائے گا تو قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ قبض کرنے اور پورا لے لینے کی مختلف شکلیں ہیں مثلاً ایک یہ کہ موت آجائے اور رُوح کو قبض کر لیا جائے اور پورا لے لیا جائے اور دوسری یہ کہ زندہ ملاءِ اعلیٰ کی جانب (اپنی جانب) اُٹھا لیا جائے تو یہاں کونسی صورت پیش آئے گی پس اس کو صاف اور واضح کرنے کے لیے کہا گیا کہ دوسری شکل اختیار کی جائے گی تاکہ دشمنوں کی سازشوں کے مقابلہ میں معجزانہ تدبیر کے ذریعہ وعدۂ الٰہی "وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ" پورا ہو اور "وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ" کا عظیم الشان مظاہرہ ہو جائے اور "توفّی" اور

"رفع" ہوجانے پر نتیجہ یہ نکلے کہ ذاتِ اقدس کافروں کے ہاتھ سے ہر طرح محفوظ ہوجائے اور
اس طرح وعدۂ ربانی "وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا" بغیر کسی تاویل کے صحیح ہوجائے، اور
"تاویلِ باطل کے ذریعہ شک اور تردّد یا حقیقتِ حال سے انکار صرف ان ہی قلوب کا حصّہ
رہ جائے جو قرآن سے علم حاصل کرنے کی بجائے اوّل اپنے ذاتی اوہام و ظنون کو راہنما بناتے
اور پھر قرآن کے منطوق و مفہوم کے خلاف اس کے مُنہ میں اپنی زبان رکھ دینا چاہتے ہیں اور
اس سے وہ کہلانا چاہتے ہیں جو وہ خود کہنا نہیں چاہتا مگر وہ قرآنِ عزیز کی اس صفت سے
غافل رہتے ہیں" لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ
اس قرآن کے آگے سے اور نہ اُس کے پیچھے سے (کسی جانب سے بھی) باطل نہیں پھٹک سکتا،
یہ اُتارا ہوا ہے ایسی ہستی کی جانب سے جو حکمت والی، خوبیوں والی ہے"۔

متنبّی پنجاب کو جب قرآنِ عزیز کی ان نصوص سے متعلق تحریفِ معنوی میں ناکامی ہوئی
اور خسران کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا تو مجبور ہوکر اور قرآنِ عزیز کے اطلاقات، احادیثِ صحیحہ کی
اطلاعات اور اجماعِ اُمت کے فیصلہ کو پسِ پُشت ڈال کر "فلسفہ" کی آغوش میں پناہ لینے کا
کا ارادہ کیا اور اپنی تصانیف میں یہ ہرزہ سرائی کی کہ اگر حضرتِ مسیحؑ آسمان پر زندہ اُٹھا لیے
گئے تو یہ عقل کے خلاف ہے اس لیے کہ کوئی مادی جسم ملاءِ اعلیٰ تک پرواز نہیں کرسکتا اور
کر بھی جاتا تو اتنی طویل مدت کیسے زندہ ہے اور وہاں کھانے، پینے اور رفعِ حاجت کرنے
کی صورت کیسے عمل میں آسکتی ہے؟

قدرتِ الٰہی کے معجزانہ افعال کو خلافِ عقل کہہ کر بات اگر ختم ہوسکتی تو شاید قادیانی کی
یہ فلسفیانہ موشگافی درخورِ اعتنا سمجھی جاسکتی۔ لیکن آج فلسفۂ جدید بہ شکلِ سائنس ترقی کرکے
جس حد تک پہنچ چکا ہے وہاں نظریات (THIORIS) نہیں بلکہ مشاہدات اور عملیات
(PRACTICLES) اس بات کو ثابت کر رہے ہیں کہ فضاء کے موانعات کو اگر آہستہ آہستہ
ہٹا دیا جائے یا اُن کو ضبط (CANTROL) میں لے آیا جائے تو مادی جسم کے لیے غیر معلوم

بلندی تک پہنچنا ممکن العمل ہو جائے گا اور اس کے لیے جو جد و جہد کر رہے ہیں وہ ممکن العمل سمجھ کر ہی کر رہے ہیں اور سائنٹفک (SCINTIFIC) طریقہ پر کر رہے ہیں پس اگر آج کا انسان میلوں اوپر ہوائی جہاز کے ذریعہ جا سکتا ہے اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ ہزاروں میل سے مادی انسان کے ساتھ باتیں کرتے وقت اس کے جسم کی تصویر لے سکتا ہے اور ہوا اور آفتاب کی لہروں اور شعاعوں پر کنٹرول کر کے ہزاروں میل تک اپنی آواز کو بذریعہ ریڈیو نشر کر سکتا ہے اور ہزاروں برس کے گذرے ہوئے واقعات کو فضا میں نظم کر کے آج اِس طرح سُنا سکتا ہے گویا وہ سب کچھ اِس وقت ہو رہا ہے تو اس انسان کے خالق بلکہ خالقِ کائنات کے متعلق ازرہِ تفلسف یہ کہنا کہ وہ مادی جسم کو ملاءِ اعلیٰ تک کیسے لے جا سکتا ہے، اپنی غباوت پر مہر کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔

اور اگر ادویات اور غذاؤں اور حفظانِ صحت کے مختلف طریقوں سے عمرِ طبعی کو دوگنا اور تین گنا کیا جا سکتا اور کیا جا رہا ہے نیز اگر مختلف غذاؤں کے اثرات و نتائج میں یہ فرق ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے کہ کسی سے فُضلہ زیادہ بنے اور کسی سے بہت کم بنے اور کسی سے قطعاً نہ بنے بلکہ وہ خالص خون کی شکل میں تحلیل ہو جائے اور اگر انسان اپنی ریاضتوں اور مجاہدوں کے ذریعہ روحانی قوت کو بڑھا کر آج اس دُنیا میں دنوں، ہفتوں بلکہ مہینوں بغیر خورد و نوش زندہ رہ سکتا ہے تو مجبور انسانوں کی ان کامیاب کوششوں کو صحیح سمجھنے کے باوجود خالقِ ارض و سماوات کی جانب حضرت مسیحؑ کی رفعتِ آسمانی پر مسطورۂ بالا شکوک پیش کرنا یا ان کے پیشِ نظر ان کے بجسدِ عنصری ملاءِ اعلیٰ تک پہنچنے اور وہاں زندہ رہنے کا انکار کرنا اگر جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص علمی حقائق سے ناآشنا اور علومِ قرآن سے محروم ہے وہ "خلافِ عقل" اور "ماوراءِ عقل" اِن دونوں باتوں کے درمیان فرق کرنے سے عاجز ہے اور اس لیے ہمیشہ ماوراءِ عقل کو خلافِ عقل کہہ کر پیش کرتا رہتا ہے۔

دراصل انسان کی فکری گمراہیوں کا سرچشمہ صرف دو ہی باتیں ہیں ایک یہ کہ انسان "عقل" سے اس درجہ بے بہرہ ہوجائے کہ ہر ایک بات بے سمجھے بوجھے مان لے اور اندھوں کی طرح ہر ایک راہ پر چلنے لگے، دوسری بات یہ کہ جو حقیقت بھی عقل سے بالاتر نظر آئے اس کو فوراً جھٹلادے اور یہ یقین کرلے کہ جس شے کو اس کی سمجھ یا چند انسانوں کی سمجھ ادراک نہیں کرسکتی وہ شے حقیقۃً وجود نہیں رکھتی اور تکذیب کے لائق ہے حالانکہ بہت سی باتیں وہ ہیں جو ایک دور کے تمام عقلاء کے نزدیک ماوراءِ عقل سمجھی جاتی ہیں اس لیے کہ ان کی عقلیں ان باتوں کا ادراک کرنے سے عاجز رہیں مگر وہی باتیں علمی ترقی کے دوسرے دور میں جاکر نہ صرف ممکن الوقوع قرار پاتی بلکہ مشاہدہ اور تجربہ میں آجاتی ہیں پس اگر ہر ایک وہ شے جو کسی ایک انسان یا جماعت یا اس کے دور کے تمام اہلِ عقل کے نزدیک ماوراءِ عقل تھی "خلافِ عقل" کہلانے کی مستحق تھی تو وہ دوسرے دور میں کیوں عقل کیلیے ممکن ہوئی بلکہ مشاہدہ میں آگئی۔

قرآنِ عزیز نے گمراہی کی اس پہلی حالت کو (جہل، ظن، خرص، اٰکل) سے تعبیر کیا ہے اور دوسری حالت کو "الحاد" کہا ہے اور یہ دونوں حالتیں "علم وعرفان" سے محرومی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

خلافِ عقل اور ماوراءِ عقل کے درمیان یہ فرق ہے کہ خلافِ عقل بات وہ ہوسکتی ہے جس کے نہ ہوسکنے کے متعلق علم ویقین کی روشنی میں مثبت دلائل وبراہین موجود ہوں اور عقل، دلیل وبرہان اور علم یقین سے یہ ثابت کرتی ہو کہ ایسا ہونا ناممکن اور محالِ ذاتی ہے اور ماوراءِ عقل اس بات کو کہتے ہیں کہ بعض باتوں کے متعلق عقل ہی کا یہ فیصلہ ہے کہ چونکہ انسانی عقل کا ادراک ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتا اور حقیقت اسی حد پر ختم نہیں ہوجاتی لہٰذا ہر وہ بات جو عقل کے احاطہ میں نہ آسکتی ہو مگر اس کے انکار پر علم ویقین کے ذریعہ برہان ودلیل بھی دی جاسکتی ہوں تو ایسی بات کو خلافِ عقل نہیں بلکہ ماوراءِ عقل کہیں گے۔

خلافِ عقل اور ماوراءِ عقل کے درمیان امتیاز ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ جن چیزوں کو کل کی دنیا میں عام طور پر خلافِ عقل کہا جاتا رہا ان کو اہلِ دانش وبینش نے خلافِ عقل نہ سمجھتے ہوئے موجود

دور میں ممکن بلکہ موجود کر دکھایا اور کل ہی عقل کی ترقی آج کی بہت سی ماوراءِ عقل باتوں کو احاطۂ عقل میں لا سکے گی اور نہ معلوم یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔

پس جو شخص حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے بجسدِ عنصری رفع الی السماء کا اس لیے منکر ہے کہ عقل فلسفہ اس کا انکار کرتا ہے تو اس کا یہ دعویٰ "برہان و دلیل اور علم و یقین کی جگہ محض ظن، اٹکل کے ماتحت ہے" اور ایسے حضرات کے لیے پھر عالم غیب کی تمام ماوراءِ عقل باتوں، مثلاً وحی، فرشتہ، جنت، جہنم، حشر، معاد، معجزہ وغیرہ تمام باتوں کو خلافِ عقل کہہ کر جھٹلا دینا چاہیے قرآن عزیز نے ان ہی جیسے منکرینِ حق کے متعلق صاف صاف مکذبین کا لقب تجویز کر دیا ہے۔

بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ	نہیں یہ بات نہیں ہے (جیسا کفار کہتے ہیں) اصل حقیقت یہ ہے
وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ كَذَٰلِكَ	کہ جس بات پر یہ اپنے علم سے احاطہ نہ کر سکے اور جس بات کا نتیجہ
كَذَّبَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ	ابھی پیش نہیں آیا اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہو گئے ٹھیک
فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ	اسی طرح انھوں نے بھی جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گذر چکے
الظَّالِمِينَ (یونس پ ۱۱ ع ۴)	ہیں تو دیکھو ظلم کرنے کا کیسا کچھ انجام ہو چکا ہے۔

آیت میں كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ کہہ کر جس حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے "یعنی انسان کی عقل جس بات کا ادراک نہ کر سکے اس کو دلیل و برہان اور علم یقین کے بغیر ہی جھٹلا دینا اور صرف اس بنا پر انکار کر دینا کہ یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے" اس کی ایک نظیر مرزا غلام احمد قادیانی کا وہ انکار ہے جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے "رفع الی السماء" سے متعلق ہے اور اس کے خلیفہ مسٹر لاہوری کی موشگافیاں بھی اسی بے دلیل انکار و جحود کا شعبہ ہیں۔

اس حربہ کو بھی بیکار و بے سود سمجھ کر متنبی پنجاب نے پھر رخ بدلا اور یہ دعویٰ کیا کہ اس موقع کے علاوہ قرآن کے کسی مقام سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ "رفع" سے "رفعِ روحانی" کے ماسوا کوئی معنی لیے گئے ہیں یعنی مادی شے کی جانب رفع کی نسبت کی گئی ہو لہٰذا اس مقام پر بھی رفع روحانی کے علاوہ معنی لینا قرآن کے اطلاق و استعمال کے خلاف ہے۔

مگر متنبّی کاذب کا یہ دعویٰ اوّل تو بنیاداً ہی غلط ہے کیونکہ اگر کسی لفظ کے محلِ استعمال سے یا قرآن ہی کی دوسری نصوص سے ایک معنی متعین ہیں تب یہ سوال پیدا کرنا کہ "یہی استعمال دوسرے کسی مقام پر جب تک ثابت نہیں ہوگا قابلِ تسلیم نہیں" حد درجہ کی نادانی ہے تا وقتیکہ دلیل سے یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ لغتِ عرب میں اس لفظ کا اس معنی میں استعمال جائز ہی نہیں اور اگر اتمامِ حجت کے طور پر اس قسم کے لچر سوال یا دعوے کو قابلِ جواب، یا لائقِ ردّ سمجھا ہی جائے تو سورۂ والنازعٰت کی یہ آیت کافی و وافی ہے:۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰهَا ○ رَفَعَ سَمْكَهَا (النازعٰت پ ۳۰ ع ۲)

(اے افرادِ نسلِ انسانی) خلقت اور پیدائش کے لحاظ سے کیا تم زیادہ بھاری اور بوجھل ہو یا آسمان جس کو خدا نے بنایا اور اس کے بوجھل جسم کو بلند کیا۔

اور ایک آسمان پر ہی کیا موقوف ہے یہ ہم سے لاکھوں اور کروڑوں میل دور فضا میں سورج، چاند اور ستاروں کو خدائے برتر نے جو بلندی اور رفعت عطا کی ہے کیا یہ سب کے سب مادی اجسام نہیں ہیں؟ اور اگر ہیں اور یقیناً ہیں تو جس خالقِ ارض و سماوات نے ان مادی اجسام کا رفعِ آسمانی کیا ہے وہ اگر ایک انسانی مخلوق کا رفعِ آسمانی کر دے تو اس کو قرآن کے اطلاق و استعمال کے خلاف کہنا غباوت اور جہالت نہیں تو اور کیا ہے البتہ ثبوت درکار ہے تو اس کے لیے قرآنِ عزیز کی نصوص، صحیح احادیث اور اجماعِ اُمت سے زیادہ موثّق ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟

حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کا رفعِ سماوی اور چند جذباتی باتیں

مرزائے قادیانی نے اگرچہ اس مسئلہ میں جمہور کے خلاف یہود و نصاریٰ کی پیروی میں تحریفِ مطالب کی کافی سعیِ ناکام کی ہے اور مسٹر لاہوری نے بھی تفسیرِ قرآن میں تحریفِ معنوی کے ذریعہ اپنے مقتدا کی مدد کی تاہم دل کا چور اُن کو مطمئن نہیں کر سکا اور اس لیے انھوں نے دلائل و براہین کی جگہ جذبات کو دلیلِ راہ بنایا اور کبھی تو یہ کہا کہ جو لوگ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کو آسمان پر زندہ تسلیم کرتے ہیں وہ ان کو خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر فضیلت دیتے ہیں کہ آپ زمین پر ہوں اور

حضرت عیسیٰؑ آسمان پر، یہ تو سخت توہین کی بات ہے۔

لیکن علمی حلقوں میں اِس لچر اور لوچ جذبہ کی کیا قدر و قیمت ہو سکتی ہے جبکہ ہر ایک مذہبی انسان اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہے کہ اگرچہ فرشتے ہمیشہ بقیدِ حیات ملاءِ اعلیٰ میں موجود اور سکونت پذیر ہیں تاہم اُن سب کے مقابلہ میں بلکہ اُن کی جلیل القدر ہستیوں مثلاً جبرئیل و میکائیل کے مقابلہ میں بھی ایک مفضول سے مفضول نبی کا رتبہ بہت بلند اور عالی ہے حالانکہ وہ نبی زمین پر مقیم رہا ہے اور جبرئیلؑ کا قیام ملاءِ اعلیٰ کے بھی بلند تر مقام پر رہتا ہے چہ جائیکہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبۂ جلیل کہ جس کی عظمت ــــــ

"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" میں مضمر ہے، علاوہ ازیں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے شبِ معراج میں "قاب قوسین او ادنیٰ" کا جو تقرب پایا ہے وہ نہ کسی مَلک اور فرشتہ کو حاصل ہوا اور نہ کسی نبی اور رسول کو، اس لیے حضرت مسیحؑ کا رفعِ آسمانی اُس "رفعت" کو پہنچ ہی نہیں سکتا جو اسریٰ میں آپ کو حاصل ہوئی۔ بہرحال فاضل و مفضول کے درمیان فرقِ مراتب کے لیے تنہا ملاءِ اعلیٰ کا قیام معیارِ فضیلت نہیں ہے خصوصاً اُس "افضل ہستی" کے مقابلہ میں جس کی فضیلت کا معیار خود اس کا وجود باجود ہو اور جس کی ذاتِ قدسی صفات خود ہی منبعِ فضائل اور مرجعِ کمالات ہو ایسی ہستی سے تو "مقام" عزت و مرتبہ پاتا ہے نہ کہ وہ ذاتِ گرامی۔

حسنِ یوسف، دمِ عیسیٰ، یدِ بیضا داری ۔۔۔ آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

اور کبھی یہ کہا کہ جو شخص عیسیٰ (علیہ السّلام) کو زندہ تسلیم کرتا ہے وہ "العیاذ باللہ" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس لیے توہین کرتا ہے کہ وہ بقیدِ حیات نہیں رہے اور اس طرح حضرت عیسیٰؑ کو پھر ذاتِ اقدس پر برتری حاصل ہو گئی۔

یہ قول پہلے سے بھی زیادہ بے کیف اور بے معنی ہے بلکہ سرتاسر غلط بنیاد پر قائم، اس لیے کہ کون اہلِ عقل اور ذی ہوش کہہ سکتا ہے کہ "زندگی" بھی فاضل و مفضول کے درمیان معیارِ فضیلت ہے، اِس لیے کہ زندگی کی قیمت ذاتی کمالات و فضائل سے ہے نہ اس لیے کہ وہ

زندگی ہے پھر "معیارِ فضیلت" کی اس بحث سے قطعِ نظر اس موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مسئلہ فضیلت کو درمیان لانا اس لیے بھی قطعاً بے محل ہے کہ جبکہ قرآن عزیز کی نصوص نے تمام کائنات پر آپؐ کی برتری کو ثابت کر دیا اور آپؐ کی سیرت نے زندہ شہادت بن کر ان نصوص کی تصدیق کر دی تو کسی بھی انسان کی "زندگی" یا "رفعِ آسمانی" یا اور کوئی "وجہِ فضیلت" اس کے مقابلہ میں نہیں لائی جا سکتی، اور ہر ایک حالت و صورت میں "فضلِ کلّی" اُسی جامع کمالات ہستی کو حاصل رہے گا۔

وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ کی تفسیر

اس مسئلہ کو ختم کرنے سے پہلے اب ایک بات باقی رہ جاتی ہے کہ سورۂ نساء کی مسطورہ بالا آیت میں "وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ" کی کیا تفسیر ہے یعنی وہ کیا اشتباہ تھا جو یہودیوں پر طاری کر دیا گیا تو قرآن عزیز اس کا جواب اس مقام پر بھی اور آلِ عمران میں بھی ایک ہی دیتا ہے اور وہ "رفع الی السماء" ہے، آلِ عمران میں اس کو وعدہ کی شکل میں ظاہر کیا "وَرَافِعُكَ اِلَیَّ" اور نساء میں ایفاءِ وعدہ کی صورت میں یعنی "بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ" جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ محاصرہ کے وقت جب مُنکرینِ حق گرفتاری کے لیے اندر گھسے تو وہاں عیسٰی (علیہ السلام) کو نہ پایا، یہ دیکھا تو سخت حیران ہوئے اور کسی طرح اندازہ نہ لگا سکے کہ صورتِ حال کیا پیش آئی اور اس طرح "وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ" کا مصداق بنکر رہ گئے اس کے بعد قرآن کہتا ہے "اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا" تو یہ اشتباہ کے بعد جو صورتِ حال پیش آئی اُس کا نقشہ بیان کیا گیا ہے اور اس سے دو باتیں بصراحت ظاہر ہوتی ہیں: ایک یہ کہ یہود اِس سلسلہ میں اِس طرح شک میں پڑ گئے تھے کہ گمان اور اٹکل کے ماسوا ان کے پاس علم و یقین کی کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی اور دوسری بات یہ کہ انھوں نے کسی کو قتل کر کے یہ مشہور کیا کہ انھوں نے "مسیح علیہ السلام" کو قتل کر دیا اور یا پھر آیت زمانۂ نبوتِ محمدی کے یہود کا حال بیان کر رہی ہے۔

پس قرآنِ عزیز کے اُن واضح اعلانات کے بعد جو حضرتِ مسیحؑ کی حفاظت و صیانت کے سلسلہ میں کیے گئے ہیں اور جن کو تفصیل کے ساتھ سطورِ بالا میں بیان کر دیا گیا ہے' ان دونوں باتوں کی جزئی تفصیلات کا تعلق آثارِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) اور تاریخی روایات پر رہ جاتا ہے اور اس سلسلہ میں صرف ان ہی روایات و آثار کو قابلِ تسلیم سمجھا جائے گا جو اپنی صحتِ روایت کے ساتھ ساتھ ان بنیادی تصریحات سے نہ ٹکراتی ہوں جن کا ذکر متعدد مقامات پر قرآنِ عزیز نے بصراحت کر دیا ہے اور "القراٰن یفسر بعضہ بعضاً" قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی خود ہی تفسیر کر دیتا ہے" کے اصول پر جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کو دشمن ہاتھ تک نہ لگا سکے اور وہ محفوظ ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لیے گئے اور جیسا کہ "یومِ عیسیٰ" کی بحث میں ابھی نصوصِ قرآنی سے ثابت ہوگا کہ وہ وقوعِ قیامت کے لیے "نشان" ہیں۔ اور اس لیے دوبارہ کائناتِ ارضی میں واپس آکر اور مفوضہ خدمت انجام دے کر پھر موت سے دوچار ہوں گے۔

شخصِ مقتول و مصلوب سے متعلق آثار و تاریخ کی جو ملی جلی روایات ہیں اُن کا حاصل یہ ہے کہ "سبت کی شب" میں حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) بیت المقدس کے ایک بند مکان میں اپنے حواریوں کے ساتھ موجود تھے کہ بنی اسرائیل کی سازش سے دمشق کے بت پرست بادشاہ نے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری کے لیے ایک دستہ بھیجا' اس نے آکر محاصرہ کر لیا۔ اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا۔ جب سپاہی اندر داخل ہوئے تو انھوں نے حواریوں میں ایک ہی شخص کو حضرتِ عیسیٰؑ کے ہم شبیہ پایا۔ اور اس کو گرفتار کر کے لے گئے اور پھر اس کے ساتھ وہ سب کچھ ہوا جس کا ذکر گذشتہ سطور میں ہو چکا ہے۔ ان ہی روایات میں بعض اس کا نام یودس بن کریا یوطا بیان کرتے ہیں اور بعض جرجیس اور دوسرے داؤد بن لوزا کہتے ہیں۔

پھر ان روایات میں سے بعض میں ہے کہ یہ شخصِ مقتول اپنی خلقت ہی میں حضرتِ مسیحؑ

کا مشابہ اور اُن کا نقشِ ثانی تھا۔ اسرائیلیاتِ انجیلی میں ہے کہ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے حواریوں میں سے یہودا اسخر لوطی حضرتِ عیسیٰؑ کا شبیہ تھا اور بعض روایات میں ہے کہ جب یہ نازک گھڑی آپہنچی تو حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) نے حواریوں کو دعوت و تبلیغ حق سے متعلق تلقین و ہدایات کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی مجھ کو مطلع کر دیا ہے کہ میں ایک مُدت تک کے لیے ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا جاؤں گا اور یہ واقعہ مخالفین اور متبعین دونوں کے لیے سخت آزمائش و امتحان میں جانے والا ہے لہٰذا تم میں سے جو شخص اس پر آمادہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو میرا شبیہ بنا دے اور وہ خدا کی راہ میں جامِ شہادت پیئے اس کو جنت کی بشارت ہے، تب ایک حواری نے پہل کی اور خود کو اس کے لیے پیش کیا اور منجانب اللہ وہ حضرتؑ کا ہم شکل ہو گیا اور سپاہیوں نے اس کو گرفتار کر لیا۔[1]

یہ تفصیلات نہ قرآن میں مذکور ہیں اور نہ احادیثِ مرفوعہ میں اس لیے وہ صحیح ہوں یا غلط نفسِ مسئلہ اپنی جگہ اٹل ہے اور قرآن کی آیات میں منصوص، اس لیے اصحابِ ذوق کو اختیار ہے کہ وہ صرف قرآن کے اس اجمال پر ہی قناعت کریں کہ حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کا رفع الی السماء اور ہر طرح دشمنوں سے تحفظ نیز یہود پر معاملہ کا مشتبہ ہو کر کسی دوسرے کو قتل کرنا یہود و نصاریٰ کے پاس اس سلسلہ میں علم و یقین سے محروم ہو کر ظن و تخمین اور شک و شبہ میں مبتلا ہو جانا اور قرآن کا حقیقتِ واقعہ کو علم و یقین کی روشنی میں ظاہر کر دینا یہ سب حقائق ثابت ہیں "وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ" اور "اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ" (الآیہ) کی تفسیر میں ان روایات کی تفصیلات کو بھی قبول کریں اور یہ سمجھ کر تسلیم کریں کہ زیرِ بحث آیات کی تفسیر ان تفصیلات پر موقوف نہیں ہے بلکہ یہ امر زائد ہے جو آیات کی تفسیر صحیح کے لیے مؤید ہے۔

حیاتِ عیسیٰ علیہ السلام سورۂ آلِ عمران، مائدہ اور نساء کی زیرِ بحث آیات سے یہ ثابت ہو چکا کہ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے متعلق حکمتِ الٰہی کا یہ فیصلہ اکواں کو بقیدِ حیات ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا جائے اور وہ دشمنوں اور کافروں سے محفوظ اٹھا لیے گئے۔

[1] واقعات کی یہ تفصیلات تاریخ ابن کثیر جلد ۲ اور کتبِ تفسیر میں منقول ہیں ۱۲۔

لیکن قرآن نے اس مسئلہ میں صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حسب موقع اُن کی حیات امروز پر نصوصِ قطعیہ کے ذریعہ متعدد جگہ روشنی ڈالی ہے اور ان مقامات میں اس جانب بھی اشارات کیے ہیں کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی حیاتِ طویل اور رفع الی السماء میں کیا حکمت مستور تھی تاکہ اہلِ حق کے قلوب تازگیِ ایمان سے شگفتہ ہوجائیں اور باطل کوش اپنی کورباطنی پر شرمائیں۔

لیؤمنن بہ قبل موتہ	وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا (نساء پ ۶ ع ۳)	اور کوئی اہلِ کتاب میں سے باقی نہ رہے گا مگر یہ کہ وہ ضرور ایمان لائے گا عیسیٰ پر اُس (عیسیٰ) کی موت سے پہلے اور وہ (عیسیٰ) قیامت کے دن ان پر (اہلِ کتاب پر) گواہ بنے گا۔

اس آیت سے قبل آیات میں وہی مسطورۂ بالا واقعہ مذکور ہے کہ عیسیٰ علیہ السّلام کو نہ صلیب پر چڑھایا گیا اور نہ قتل کیا گیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب اٹھالیا یہ یہود و نصاریٰ کے اس عقیدہ کی تردید ہے جو انھوں نے اپنے باطل زعم اور اٹکل سے قائم کرلیا تھا، ان سے کہا جارہا ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کے متعلق صلیب پر چڑھائے جانے اور قتل کیے جانے کا دعویٰ قابلِ لعنت ہے کیونکہ بہتان اور لعنت توام ہیں، اس کے بعد اس آیت میں امرِ اوّل کی تصدیق میں اس جانب توجہ دلائی جارہی ہے کہ آج اگر اس ملعون عقیدہ پر فخر کررہے ہو تو وہ وقت بھی آنے والا ہے جب عیسیٰ بن مریم (علیہما السّلام) خدائے برتر کی حکمت و مصلحت کو پورا کرنے کے لیے کائناتِ ارضی پر واپس تشریف لائیں گے اور اس عینی مشاہدہ کے وقت اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) میں سے ہر ایک موجود ہستی کو قرآن کے فیصلہ کے مطابق عیسیٰ (علیہ السّلام) پر ایمان لے آنے کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہے گا۔ اور پھر جب وہ اپنی مدتِ حیات ختم کرکے موت کی آغوش سے دوچار ہوجائیں گے تو قیامت کے دن اپنی اُمت (اہلِ کتاب) پر اُسی طرح گواہ ہوں گے جس طرح تمام انبیاء و مرسلین

اپنی اپنی اُمتوں پر شاہد بنیں گے۔

یہ حقیقت کچھ مخفی نہیں ہے کہ عیسٰی (علیہ السلام) کے متعلق اگرچہ یہود و نصاریٰ دونوں واقعۂ صلیب و قتل پر متفق ہیں لیکن اس سلسلہ میں دونوں کے عقائد کی بُنیاد قطعاً متضاد اصول پر قائم ہے، یہود، حضرت مسیح (علیہ السلام) کو مفتری اور کاذب بکتے اور دجّال سمجھتے ہیں اور اس لیے فخر کرتے ہیں کہ انھوں نے یسوع مسیح کو صلیب پر بھی چڑھایا اور پھر اس حالت میں مار بھی ڈالا۔ اس کے برعکس نصاریٰ کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا کا پہلا انسان آدم (علیہ السلام) گنہگار تھا اور ساری دنیا گنہگار تھی اس لیے خدا کی صفتِ رحمت نے ارادہ کیا کہ دُنیا کو گناہوں سے نجات دلائے اس لیے اُس کی صفتِ "رحمت" نے ابنیت (بیٹا ہونا) کی شکل اختیار کی اور اس کو دنیا میں بھیجا تاکہ وہ یہود کے ہاتھوں سولی پر چڑھے اور مارا جائے اور اس طرح ساری کائناتِ ماضی و مستقبل کے گناہوں کا "کفارہ" بن کر دُنیا کی نجات کا باعث بنے۔

سورۂ نساء کی آیات میں قرآنِ عزیز نے صاف صاف کہہ دیا کہ حضرت مسیح کے قتل کے دعوی کی بُنیاد کسی بھی عقیدہ پر مبنی ہو لائقِ لعنت اور باعثِ ذلت و خسران ہے۔ خدا کے سچے پیغبر کو مفتری سمجھ کر یہ عقیدہ رکھنا بھی لعنت کا موجب اور خدا کے بندے اور مریمؑ کے بطن سے پیدا انسان کو خدا کا بیٹا بنا کر اور "کفارہ" کا باطل عقیدہ تراش کر مسیحؑ (علیہ السلام) کو مصلوب و مقتول تسلیم کرنا بھی گمراہی اور علم و حقیقت کے خلاف اٹکل کا تیر ہے اور اس سلسلہ میں صحیح اور مبنی بر حقیقت فیصلہ وہی ہے جو قرآن نے کیا ہے اور جس کی بنیاد "علم و یقین اور وحیِ الٰہی" پر قائم ہے۔

پس آج جبکہ تمہارے سامنے اس اختلاف کے فیصلہ کے لیے جو شک و ظن کی شکستہ بنیادوں پر قائم تھا علم و یقین کی روشنی آ چکی ہے پھر بھی تم اپنے ظنونِ کاسدہ اور اوہامِ فاسدہ پر اصرار کر رہے ہو اور حضرت مسیحؑ سے متعلق باطل عقیدہ کو ترک کرنے کے لیے تیار

لہ دجّال دجل سے ماخوذ ہے جس کے معنی "فریب" ہیں۔

نہیں ہوتے ہو تو قرآن کا ایک دوسرا فیصلہ اور وحی الٰہی کا یہ اعلان بھی سن لو کہ تمہاری نسل پر وہ وقت بھی آنے والا ہے جب قرآن کے اس صحیح فیصلہ اور اعلانِ حق کے مطابق حضرتِ مسیح ملاءِ اعلیٰ سے کائناتِ ارضی کو واپس ہوں گے اور ان کی یہ آمد ایسی مشاہد ہو گی کہ یہود و نصاریٰ میں سے ایک فرد بھی ایسا نہ رہے گا جو بادلِ خواستہ یا بادلِ ناخواستہ اُس ذاتِ گرامی پر یہ ایمان نہ لے آئے کہ بلاشبہ وہ خدا کے سچے رسول ہیں؛ خدا کے بیٹے نہیں برگزیدہ انسان ہیں مصلوب و مقتول نہیں ہوئے تھے بقیدِ حیات ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں: "وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ"۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ سورۂ آلِ عمران اور سورۂ مائدہ کی طرح اس جگہ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے لیے لفظ "توفی" نہیں بولا گیا بلکہ بصراحت لفظ "موت" استعمال کیا گیا ہے، یہ کیوں؟ صرف اس لیے کہ ان دونوں مقامات پر جس حقیقت کا اظہار مقصود ہے اُس کے لیے "توفی" ہی مناسب ہے جیسا کہ سورۂ آلِ عمران سے متعلق آیات کی تشریح و تفسیر میں گذر چکا اور سورۂ مائدہ سے متعلق آیت کی تفسیر میں عنقریب بیان ہو گا اور اس جگہ چونکہ براہِ راست "موت" ہی کا تذکرہ مطلوب ہے اور اس حالت کا ذکر ہے جس کے بعد حضرتِ مسیح (علیہ السلام) بھی "كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ" کا مصداق بننے والے ہیں اس لیے یہاں "موت" کو بصراحت لانا ہی ازبس ضروری تھا اور یہ مزید برہان ہے اس دعویٰ کے لیے کہ آلِ عمران اور مائدہ میں لفظ "موت" کی جگہ "توفی" کا اطلاق بلاشبہ خاص مقصد رکھتا ہے ورنہ جس طرح ان دونوں مقامات پر توفی کا اطلاق کیا گیا تھا اسی طرح یہاں بھی کیا جاتا یا جس طرح اس جگہ لفظ "موت" کا اطلاق کیا گیا ہے اسی طرح ان دونوں مقامات پر بھی لفظِ موت ہی کا استعمال ہونا چاہیے تھا مگر قرآنِ عزیز کے ان دقیق اسالیبِ بیان کے فرق کا فہم طالبینِ حق کا ہی حصہ ہے نہ کہ مرزائے قادیانی اور مسٹر لاہوری جیسے اصحابِ زیغ کا جو اپنی خاص اغراضِ ذاتی کے پیشِ نظر پہلے ایک نظریہ

ایجاد کر لیتے ہیں اور بعد ازاں اس سلسلہ کی تمام آیاتِ قرآنی کو اسی کے سانچہ میں ڈھال کر اس کا نام "تفسیرِ قرآن" رکھتے ہیں۔

بہرحال جمہور کے نزدیک آیت زیرِ عنوان کی تفسیر یہی ہے جو سپردِ قلم کی جا چکی، مشہور محدث، جلیل القدر مفسر اور اسلامی مؤرخ، عماد الدین بن کثیر (رحمہ اللہ) اس تفسیر کو حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) اور حسن بصری (رحمہ اللہ) سے بسندِ صحیح نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:۔

قتادہ، عبدالرحمٰن اور بہت سے مفسروں کا یہی قول ہے اور یہی قولِ حق ہے جیسا کہ عنقریب ہم دلیلِ قاطع سے اس کو ثابت کریں گے۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)[1]

اور سرتاجِ محدثین ابن حجر عسقلانی (رحمہ اللہ) بھی اسی کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"اسی تفسیر پر حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) نے یقین کیا ہے اور ابن عباسؓ کی اس تفسیر کو ابن جریر نے بروایت سعید بن جبیر اور ابو رجاء نے بھی حسنؓ سے بسندِ صحیح روایت کیا ہے کہ ابن عباس (رضی اللہ عنہما) نے فرمایا "قبل موتہ" یعنی قبلِ موتِ عیسیٰ (علیہ السلام) قسم بخدا بیشک وشبہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) بقیدِ حیات ہیں اور جب وہ آسمان سے اتریں گے تو سب اہلِ کتاب اُن پر ایمان لے آئیں گے اور ابن جریر (رحمہ اللہ) نے اسی تفسیر کو اکثر اہلِ علم سے نقل کیا ہے اور ابن جریرؒ وغیرہ نے اسی تفسیر کو ترجیح دی ہے"[2]

مگر اس صحیح تفسیر کے علاوہ کتبِ تفسیر میں احتمالِ عقلی کے طور پر دو قول اور بھی منقول ہیں مگر وہ دونوں بلحاظِ سند ضعیف اور ناقابلِ اعتماد اور بلحاظِ سیاق و سباق (یعنی آیت زیرِ بحث سے قبل اور بعد کی آیات کے لحاظ سے) غلط اور ناقابلِ التفات ہیں یعنی ایسے احتمالاتِ عقلی ہیں جو نقل اور آیات کے باہمی نظم و ترتیب کے خلاف ہیں۔

اِن ہر دو معنی میں سے ایک معنی یہ ہیں کہ "موتہ" میں جو ضمیر ہے اس کو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی بجائے اہلِ کتاب کی جانب لوٹایا جائے اور آیت کا ترجمہ یوں کیا جائے

---

[1] ابن کثیر جلد اول۔ [2] فتح الباری شرح بخاری ج ۶ ص ۳۰۴۔

"اور اہلِ کتاب میں سے کوئی فرد ایسا نہیں ہے جو اپنی موت سے پہلے عیسیٰؑ پر ایمان لے آتا ہو" یعنی اگرچہ یہود و نصاریٰ اپنی زندگی میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے متعلق قرآن کے بتائے ہوئے عقیدے پر ایمان نہیں لاتے اور اپنے اپنے عقیدہ پر قائم رہتے ہیں لیکن جب ان کو "موت" آدباتی ہے تو وہ اس آخری حالت میں "جو نزع کا وقت کہلاتا ہے" صحیح عقیدہ کے مطابق ایمان لے آتے ہیں اور اہلِ کتاب کے ہر ایک فرد پر بلا استثنار یہی حالت گذرتی ہے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ "اہلِ کتاب کا ہر ایک فرد اپنی موت سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آتا ہے" یعنی جب وہ عالمِ دنیا سے منقطع ہو کر عالمِ غیب سے وابستہ ہو رہا ہوتا ہے اس وقت اس پر اصل حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بیشک خدا کے سچے پیغمبر تھے۔

پس اس بات سے قطع نظر کہ یہ دونوں تفسیریں نقلِ روایت کے اعتبار سے ناقابلِ اعتماد اور غیر صحیح اور آیات کے سیاق و سباق کے خلاف ہیں عقلی نقطۂ نظر سے بھی غلط ہیں اس لیے کہ اگر آیت کے معنی یہ ہیں جو سطورِ بالا میں نقل کیے گئے تب یہ آیت اپنے مقصدِ بیان کے خلاف بے معنیٰ اور بے نتیجہ ہو جاتی ہے (العیاذ باللہ) کیونکہ قرآنِ عزیز دوسرے مقامات پر صاف کہہ چکا ہے کہ جب انسان عالمِ دنیا سے کٹ کر عالمِ غیب سے وابستہ ہو جاتا ہے اور نزع کی یہ کیفیت اس پر طاری ہو جاتی ہے کہ جو معاملات اس ساعت سے قبل تک اس کے لیے غیب کے معاملات تھے وہ مشاہدہ میں آنے شروع ہو جاتے ہیں تو اس وقت اس کے اعمال و کردار کا صحیفہ لپیٹ دیا جاتا ہے اور اب تبدیلیِ اعتقاد کا کوئی نتیجہ اور ثمرہ نہیں ملتا یعنی اس وقت کا نہ اقرار و اعتراف معتبر اور نہ انکار مستند :-

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ	پس جب آئے ان کے پاس پیغمبر واضح دلائل لیکر تو اُس چیز
بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ	سے خوش ہوئے جو ان کے پاس علم سے تھی اور گھیر لیا ان کو اُس چیز
الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ	نے جس کی وہ مذاق بناتے تھے پس جب انھوں نے ہمارا عذاب

يَسْتَهْزِءُوْنَ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا	دیکھا تو انھوں نے کہا ہم خدائے واحد پر ایمان لے آئے
قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا	اور جن چیزوں کو ہم اس کا شریک بناتے تھے اس سے
بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ۝ فَلَمْ يَكُ	منکر ہوئے، پس نہیں نافع ہوا اُن کا یہ) ایمان جب
يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا	انھوں نے ہمارے عذاب کا مشاہدہ کر لیا، یہ اللہ کی سنت
سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ	ہے جو اُس کے بندوں میں ہمیشہ جاری رہی اور اس
عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ	موقع پر کافروں نے زیان پایا۔
وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ	لیکن اُن لوگوں کی توبہ توبہ نہیں ہے جو (ساری عمر تو)
يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا	بُرائیاں کرتے رہے لیکن جب ان میں سے کسی کے آگے
حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ	موت آکھڑی ہوئی تو کہنے لگا اب میں توبہ کرتا ہوں،
اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ	(ظاہر ہے کہ ایسی توبہ سچی توبہ نہیں ہوئی) اسی طرح اُن
يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ	لوگوں کی توبہ بھی توبہ نہیں ہے جو دنیا سے کفر کی حالت
اَعْتَدْنَا لَھُمْ عَذَابًا اَلِـيْمًا ۝	میں جاتے ہیں، ان تمام لوگوں کے لیے ہم نے دردناک
(سورۂ نساء پ ۴ ع ۳)	عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تو ایسی صورت میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا معنی رکھتا ہے؟ انسان جب اس حالت پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے سامنے سے غیب کے پردے ہٹ جاتے ہیں اور برزخ، ملائکۃ اللہ، عذاب یا راحت، جنت و جہنم، غرض دینِ حق کی تعلیم کردہ غیب کی ساری حقیقتیں اس پر منکشف ہو جاتی ہیں اور اس میں یہود و نصاریٰ کی ہی خصوصیت کیا ہے، یہ حالت تو ہر ایک ابنِ آدم پر گذرنے والی ہے، نیز جب اس قسم کا ایمان قبول ہی نہیں ہے تو اس کا ذکر اسی اسلوب کے ساتھ ہونا چاہیے تھا جو غرقِ فرعون کے وقت فرعون کے ایمانی اعتراف و اقرار کے لیے اختیار کیا گیا اور جس میں اس وقت کی ایمانی پکار کی بے وقعتی ظاہر کی گئی ہے نہ کہ ایسے اسلوبِ بیان کے ساتھ

ل سورۃ المؤمن پ ۲۴ ع ۹۔

گویا مستقبل میں ہونے والے کسی ایسے عظیم الشان واقعہ کی خبر دی جارہی ہے جو مخاطبین (یہود و نصاریٰ) کے عقائد و عزائم کے خلاف حضرت عیسٰی (علیہ السلام) سے متعلق قرآن کی تصدیق اور اس کے اٹل فیصلہ کی زندہ شہادت بن کر پیش آنے والا ہے ورنہ تو ایک عیسائی اور یہودی پنجۂ موت میں آجانے کے وقت جانِ عزیز سپرد کردینے سے پہلے حضرتِ عیسٰیؑ پر ایمان لایا تب کیا اور نہ لایا تب کیا اس کی یہ تصدیق کائناتِ انسانی کے علم و ادراک سے باہر صرف اس کے اور خدا کے درمیان تعلق رکھتی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسی بات کا ایسے موقع پر تذکرہ کرنا قطعاً بے محل ہے جہاں ایک قوم کو اس کے ایک خاص عقیدہ پر ملزم و مجرم بنانے کے لیے فیصلۂ حق کی تائید کے لیے ماضی اور مستقبل میں کائناتِ ارضی پر پیش آنے والے واقعات کو پیش کیا جارہا ہے جیسا کہ آیت کے سیاق و سباق سے واضح ہورہا ہے علاوہ ازیں ان احتمالات کی یہاں اس لیے بھی گنجائش نہیں ہے کہ غرغرہ کے وقت حضرتِ عیسٰیؑ یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اس قسم کا ایمان تو ہر اُس اہلِ کتاب سے متعلق ہے جو اس آیت کے نزول سے کچھ دن قبل یا صدیوں قبل گذر چکے اور مر کھپ چکے ہیں لہٰذا اگر آیت میں یہ مضمون بیان کرنا مقصود تھا تو اس کے لیے مؤکد مستقبل کی یہ تعبیر لیومنن" فصاحت و بلاغتِ کلام کے بالکل خلاف ہے اس کیلیے تو ایسی تعبیر کی ضرورت تھی جو ... ال اور استقبال تینوں زمانوں پر حاوی ہوتی تاکہ قرآن کا مفہوم اپنے توسع کے لحا ... پوری طرح ادا ہوتا۔

نیز دوسرے معنی تو اس لیے بھی قطعاً غلط اور بے محل ہیں کہ اس آیت سے قبل اور بعد کی آیات میں یعنی سیاق و سباق میں خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہی نہیں ہے کیوں کہ شروع آیات میں صرف حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کا ذکر ہورہا ہے اور اس آیت کے آخر میں یہ ارشاد ہوا ہے: "وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا" اور واضح ہے یہ بات کہ اس جگہ شاہد سے حضرتِ عیسٰی (علیہ السلام) مراد ہیں اور عَلَيْهِمْ کی ضمیر سے ان کی اُمت تو پھر نبیِ اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیے بغیر درمیان کی کسی ضمیر کا مرجع ذاتِ اقدس کو قرار دینا نہ صرف یہ کہ فصاحت و بلاغت کے منافی ہے بلکہ قاعدۂ عربیت کے قطعاً خلاف اور انتشارِ ضمائر کا موجب ہے۔

غرض بے غل و غش صحیح معنی وہی ہیں جو جمہور نے اختیار کیے ہیں اور یہ دونوں خود ساختہ احتمالات آیت کی تفسیر تو کیا صحیح احتمال کہلانے کے بھی مستحق نہیں ہیں[1]۔

حیوٰۃ و نزولِ عیسیٰ علیہ السلام اور احادیثِ صحیحہ

قرآن عزیز نے جس معجزانہ اختصار کے ساتھ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے رفعِ سماوی، حیاتِ امروز اور علامتِ قیامت بن کر نزول من السماء کے متعلق تصریحات کی ہیں صحیح ذخیرۂ احادیث نبوی میں ان آیات ہی کی تفصیلات بیان کرکے ان حقائق کو روشن کیا گیا ہے۔ چنانچہ امام حدیث بخاری اور مسلم نے صحیحین (صحیح بخاری، صحیح مسلم) میں حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے یہ روایت متعدد طریقہائے سند سے نقل کی ہے:۔

قال رسول اللہ صلی اللہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اُس ذات کی قسم جس کے
علیہ وسلم والذی نفسی بیدہٖ	قبضہ میں میری جان ہے ضرور وہ وقت آنے والا ہے کہ تم میں عیسیٰ
لیوشکن ان ینزل فیکم ابن	بن مریم حاکم و عادل بن کر اُتریں گے، وہ صلیب کو توڑیں گے اور خنزیر کو
مریم حکمًا عدلًا فیکسر الصلیب	قتل کریں گے (یعنی موجودہ عیسائیت کو مٹائیں گے) اور جزیہ اُٹھا دیں گے
ویقتل الخنزیر ویضع الجزیۃ	(یعنی نشانِ الٰہی کے مشاہدہ کے بعد اسلام کے سوا کچھ بھی قبول نہیں ہوگا
ویفیض المال حتی لا یقبلہ	اور اسلامی احکام میں بارشادِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جزیہ کا حکم اسی وقت

---

[1] اس مقام کے علاوہ سورۂ زخرف کی آیت مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اور سورۂ آلِ عمران کی ابتداء سے بیاسی آیات تک جو وفد نجران سے تعلق رکھتی ہیں یہ سب مقامات دلالۃ النص یا اشارۃ النص کی شکل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کے لیے دلیل و برہان ہیں اور اگرچہ ان کی تفصیلات اور وجوہِ استشہاد میرے پاس مدوّن و مرتب ہیں تاہم کتاب کی طوالت کے خوف سے اس جگہ ان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے بوقتِ فرصت انشاء اللہ مستقل مضمون کی صورت میں ہدیۂ ناظرین ہوگا، اور یا پھر حجۃ الاسلام علامہ محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہٗ کی کتاب "عقیدۃ الاسلام فی حیوٰۃ عیسیٰ علیہ السلام" اس مقصد کے لیے قابلِ مراجعت ہے۔

احد وحتی تکون السجدة الواحدة	تک کے لیے ہے) اور مال کی اس درجہ کثرت ہوگی کہ کوئی اس کو قبول
خیرا لہ من الدنیا وما فیہا	کرنے والا نہیں ملے گا اور خدا کے سامنے ایک سجدہ دنیا وما فیہا سے
ثم قال ابوھریرة اقرؤا ان	زیادہ قیمت رکھے گا (یعنی مالی کثرت کی وجہ سے خیرات و صدقات کے
شئتم (وَاِنْ مِّنْ اَھْلِ	مقابلہ میں عبادتِ نافلہ کی اہمیت بڑھ جائے گی) پھر ابوہریرہؓ نے فرمایا اگر
الْکِتٰبِ اِلَّا لَیُؤْمِنَنَّ بِہٖ قَبْلَ	تم (قرآن سے اس کا استشہاد) چاہو تو یہ آیت پڑھو (وان من
مَوْتِہٖ وَیَوْمَ الْقِیٰمَةِ یَکُوْنُ	اھل الکتاب - الآیہ) اور کوئی اہلِ کتاب میں سے نہ ہوگا مگر (یہ کہ)
عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا)	موت سے پہلے اس پر (عیسٰیؑ پر) ضرور ایمان لے آئیگا اور وہ (عیسٰیؑ)
(کتاب الانبیاء)	قیامت کے دن اُن پر گواہ ہوگا۔

(۲) بخاری اور مسلم میں بسندِ نافع مولی ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ حضرتِ ابوہریرہؓ سے یہ روایت بھی منقول ہے:-

قال رسول اللہ صلی اللہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس وقت تمہارا کیا حال ہوگا جب
علیہ وسلم کیف انتم اذا نزل ابن	تم میں ابن مریم اتریں گے اور اس حالت میں اتریں گے کہ تم ہی میں سے
مریم فیکم وامامکم منکم	ایک شخص تمہاری امامت کر رہا ہوگا۔

- اِن دونوں روایات کے علاوہ حضرتِ ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے متعدد طریقہائے سند سے اور روایات بھی صحیحین: مسند احمد اور سنن[2] میں درج ہیں جو یہی مفہوم و معنی ادا کرتی ہیں، اُن میں سے ایک زیادہ مفصل ہے اور مسئلۂ زیرِ بحث کے بعض دوسرے پہلوؤں کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ مسندِ احمد میں ہے:-

(۳) ان النبی صلی اللہ علیہ	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تمام انبیاء اصولِ دین میں علاتی
وسلم قال الانبیاء اخوة	بھائیوں کی طرح ہیں، دین سب کا ایک اور فروعِ دین مختلف اور
لعلات امھاتھم شتّٰی ودینھم	میں دوسرے انبیاء کے مقابلہ میں عیسٰیؑ بن مریم سے زیادہ قریب ہوں
واحد وانا اولی الناس بعیسی	اس لیے کہ ان کے اور میرے درمیان کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا اور

[1] کتاب الانبیاء۔ [2] ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ۔

بن مریم لانہ لم یکن نبی بینی وبینہ وانہ نازل فاذا رأیتموہ فاعرفوہ رجل مربوع الی الحمرة والبیاض علیہ ثوبان ممصران کان رأسہ یقطر ان لم یصبہ بلل، فیدق الصلیب ویقتل الخنزیر ویضع الجزیة ویدعو الناس الی الاسلام ویہلک اللّٰہ فی زمانہ الملل کلہا الا الاسلام ویہلک اللّٰہ فی زمانہ المسیح الدجال ثم تقع الامانة علی الارض حتی ترتع الاسود مع الابل والنمار مع البقر والذئاب مع الغنم ویلعب الصبیان بالحیات لا تضرہم فیمکث اربعین سنة ثم یتوفی ویصلی علیہ المسلمون"

بلا شبہ وہ کائناتِ ارضی پر اتریں گے پس جب تم اُن کو دیکھو تو اس حلیہ سے پہچان لینا، میانہ قد، سرخ و سپید رنگ ہوگا ان کے جسم پر دو سُرخی مائل رنگ کی چادریں ہوں گی ایسا معلوم ہوگا گویا فی الحال غسل کرکے آرہے ہیں اور سر سے پانی کے قطرے موتی کی طرح ٹپک پڑنے والے ہیں۔ وہ صلیب کو توڑیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے (موجودہ عیسائیت کا خاتمہ کردیں گے) اور جزیہ اُٹھا دیں گے اور لوگوں کو "اسلام" کی دعوت دیں گے اور اللّٰہ تعالیٰ ان کے زمانہ میں تمام ادیان و ملل کو مٹا دے گا اور صرف ایک ہی دین "دینِ اسلام" باقی رہ جائے گا اور اللّٰہ تعالیٰ ان ہی کے زمانہ میں مسیح دجّال کو ہلاک کرے گا پھر کائنات میں "امانت" (امرِ خیر) جگہ کرلے گی حتیٰ کہ شیر اونٹوں کے ساتھ، چیتے گائے بیلوں کے ساتھ، بھیڑیے بکریوں کے ساتھ چرتے نظر آئیں گے اور بچے سانپوں کے ساتھ کھیلیں گے، اور اُن کو کوئی گزند نہیں پہنچے گا، پس عیسیٰ چالیس سال اس زمین پر زندہ رہیں گے پھر وفات پا جائیں گے اور مسلمان اُن کے جنازہ کی نماز ادا کریں گے۔

اور صحیح مسلم میں حضرتِ ابو ہریرہؓ سے ایک طویل حدیث روایت کی گئی ہے اس میں خروجِ دجّال کا ذکر کرتے ہوئے نبی اکرم صلی اللّٰہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ مبارک مذکور ہے۔

(۴) فاذا جاؤا الشام خرج فبیناہم یعدون للقتال یسوون الصفوف اذ اقیمت الصلوٰة فینزل عیسیٰ بن مریم الخ

پس جب مسلمان ملک شام پہنچیں گے تو دجّال کا خروج ہوگا ابھی مسلمان اس کے مقابلہ میں جنگ کی تیاریاں کر رہے ہوں گے، صفیں درست کرتے ہونگے کہ نماز کے لیے اقامت ہونے لگے گی۔ اس درمیان میں عیسیٰ بن مریم کا نزول ہوگا اور وہ مسلمانوں کی امامت کا فرض انجام دیں گے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت نواس بن سمعان (رضی اللہ عنہ) سے ایک طویل روایت منقول ہے جس میں یہ مذکور ہے:۔

اذ بعث اللہ المسیح	(ابھی دجال ایک مسلمان پر اپنے شیطانی کرشموں کی آزمائش کر رہا ہوگا)
بن مریم (علیہ السلام)	کہ اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم کو بھیج دے گا وہ جب کائنات ارضی پر
فینزل عند المنارۃ البیضاء	اتریں گے تو مسجد دمشق کے شرقی جانب کے سپید منارہ پر اتریں گے
شرقی دمشق بین مھرذتین	اور ان کے بدن پر (سرخی مائل) گہری زرد رنگ کی دو چادریں
واضعا کفیہ علی اجنحۃ	ہوں گی (یعنی ایک بدن کے اوپر کے حصہ پر اور دوسری زیرین
ملکین اذا طأطأ	حصۂ بدن پر لپٹی ہوگی) اور دو فرشتوں کے بازوؤں پر سہارا لیے
رأسہ قطر واذا رفعہ	ہوں گے۔ جب سر جھکائیں گے تو سر سے پانی ٹپک پڑنے لگے گا
تحدر منہ جمان	اور جب سر اٹھائیں گے تو پانی کے قطرے موتیوں کی طرح چمکیں گے
کاللؤلؤ الخ۔	(یعنی غسل کیے آرہے ہوں گے)

اور مختلف طریقہائے سند سے امام احمد نے مسند میں اور ترمذی (رحمہ اللہ) نے سنن میں حضرت مجمع بن جاریہ (رضی اللہ عنہ) سے بسند صحیح یہ روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:۔

یقتل ابن مریم الدجال بباب لُدٍّ[1] ابن مریم، دجال کو باب لد پر قتل کریں گے۔

امام ترمذی اس روایت کو نقل کر کے فرماتے ہیں "ھٰذا حدیث صحیح" اور اس کے بعد ان حضرات صحابہؓ کی فہرست شمار کراتے ہیں جن سے نزول عیسیٰ بن مریم اور ان کے ہاتھوں قتل دجال سے متعلق روایات کتب حدیث میں منقول ہیں فرماتے ہیں:۔

اور اس باب میں حضرت عمران بن حصین، نافع بن عیینہ، ابو برزہ اسلمی، حذیفہ بن اسید، ابو ہریرہ، کیسان، عثمان بن العاص، جابر بن عبد اللہ، ابو امامہ باہلی، ابن مسعود، عبد اللہ بن عمرو بن العاص، سمرۃ بن جندب، نواس بن سمعان، عمرو بن عوف، حذیفہ بن الیمان

[1] شہر دمشق کی شہر پناہ کا ایک دروازہ ہے۔

(رضی اللہ عنہم) سے بھی روایات منقول ہیں[1]

اور امام احمدؒ نے مسند میں، امام مسلمؒ نے صحیح میں اور اصحابِ سنن نے سنن میں، بروایت حضرت حذیفہ بن الاسیدی، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے:۔

قال اشرف علینا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم من غرفۃ ونحن نتذکر الساعۃ فقال، لا تقوم الساعۃ حتی تروا عشر آیات، طلوع الشمس من مغربھا والدخان والدابۃ، وخروج یاجوج وماجوج ونزول عیسی بن مریم والدجال وثلثۃ خسوف خسف بالمشرق وخسف بالمغرب وخسف بجزیرۃ العرب ونار تخرج من قعر عدن تسوق وتحشر الناس تبیت معھم حیث باتوا وتقیل معھم حیث قالوا[2]	حضرت حذیفہ فرماتے ہیں ہم (صحابہ) ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے قیامت کے متعلق بات چیت کر رہے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بالاخانہ سے جھانکا اور ارشاد فرمایا قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک تم دس نشان نہ دیکھ لوگے۔ آفتاب کا مغرب سے طلوع، دخان (دھواں) دابۃ الارض، خروجِ یاجوج وماجوج، عیسٰیؑ بن مریم کا نزول دجّال کا خروج، تین مقامات میں خسوف کا پیش آنا۔ (زمین میں دھنس جانا) مشرق میں مغرب میں اور جزیرۃ العرب میں، آگ کا قعرِ عدن سے نکلنا جو لوگوں کو سمیٹ لے جائے گی اور جب رات کو لوگ آرام کریں گے تو وہ بھی ٹھہر جائے گی اور جب دوپہر کو قیلولہ کریں گے تب بھی وہ ٹھیری رہے گی:۔

اور محدث ابن ابی حاتمؒ نے اور جلیل القدر محدث ومفسر ابن جریر طبریؒ نے بروایتِ حسن بصری (رحمہ اللہ) بسندِ صحیح حیات ونزولِ عیسٰی بن مریمؑ سے متعلق ایک روایت نقل کی ہے اس میں ہے:۔

---

[1] ترمذی باب نزولِ عیسٰی بن مریمؑ۔ [2] اس حدیث میں جن علامات کا ذکر ہے وہ سب تشریح طلب ہیں گریہاں ان کی تشریحات بے محل ہیں اس لیے نظر انداز کر دی گئیں، عام تشریحات کتب تفسیر وحدیث میں اور شاہ رفیع الدین دہلوی نور اللہ مرقدہٗ کے رسالہ علاماتِ قیامت میں قابلِ مطالعہ ہیں۔

قال رسول اللّٰہ صلے اللّٰہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے فرمایا: عیسیٰ
للیھود ان عیسیٰ لم یمت وانہ	(علیہ السلام) مرے نہیں اور بلاشبہ وہ قیامت سے
راجعٌ الیکم قبل یوم القیٰمۃ	پہلے تمہاری جانب لوٹ کر آئیں گے۔

اسی طرح ابن ابی حاتم اور ابن جریر (رحمہما اللہ) نے سورۂ نساء کی آیات متعلقہ وفدِ نجران کی تفسیر کرتے ہوئے اصولِ حدیث کے نقطۂ نظر سے بسندِ حسن ایک طویل روایت ربیع بن انس سے نقل کی ہے اس میں بھی بصراحت یہ مذکور ہے:

فقال لھم النبی صلی اللّٰہ علیہ	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد سے فرمایا: کیا تم
وسلم الستم تعلمون ان ربنا	نہیں جانتے کہ بلاشبہ ہمارا پروردگار زندہ ہے جس
حیٌّ لا یموت وان عیسیٰ یأتی	کے لیے موت نہیں ہے اور بلاشبہ عیسیٰ السلام کو
علیہ الفناء [1]	فنا (موت) سے دوچار ہونا ہوگا۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس جگہ لفظ "یأتی" فرمایا ہے جو مستقبل کے لیے بولا جاتا ہے لفظ "اتی" نہیں فرمایا جو ماضی کے لیے مخصوص ہے۔

اور بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں اور محدث علی متقی گجراتی نے کنز العمال میں باسنادِ حسن وصحیح اس سلسلہ میں جو روایات نقل فرمائی ہیں ان میں نزولِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے ذکر کے ساتھ "من السماء" کا لفظ صراحت سے موجود ہے۔ [2]

یہ اور اسی قسم کا کثیر ذخیرۂ حدیث ہے جو حیات و نزولِ عیسیٰ بن مریم پیغمبرِ بنی اسرائیل (علیہ الصلوٰۃ والسلام) سے متعلق کتبِ حدیث و تفسیر میں منقول ہے اور جو قوتِ سند کے لحاظ سے صحیح اور حسن سے کم رتبہ نہیں رکھتا اور باعتبارِ شہرت و تواتر روایات جن کا یہ حال ہے کہ حسبِ تصریح امام ترمذی، حافظِ حدیث عماد الدین بن کثیر، حافظِ حدیث ابن حجر عسقلانی اور دیگر ائمۂ حدیث سولہ جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کو روایت کیا ہے جن میں سے

---

[1] تفسیر ابن جریر ج ۵۔ [2] کتاب الاسماء والصفات صفحہ ۳۰۱ وکنز العمال ج ۷، ص ۲۶۸۔

بعض صحابہ کا یہ دعویٰ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تصریحات سیکڑوں صحابہؓ کے مجمع میں خطبہ دے کر فرمائیں اور یہ صحابۂ کرامؓ بغیر کسی انکار و اجنبیت کے ان روایات کو خلفاءِ راشدین (رضی اللہ عنہم) کے دورِ خلافت میں علیٰ رؤس الاشہاد سناتے تھے چنانچہ ان جلیل القدر صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے جن ہزارہا شاگردوں نے سُنا ان میں سے یہ عظیم المرتبہ ہستیاں قابلِ ذکر ہیں جن میں ہر فرد روایتِ حدیث میں ضبط و حفظ، ثقاہت و علمی تبحر کے پیشِ نظر امامت و قیادت کا درجہ رکھتا ہے مثلاً سعید بن المسیب، نافع مولیٰ ابو قتادہ، حنظلہ بن علی الاسلمی، عبدالرحمٰن بن آدم، ابو سلمہ، ابو عمرہ، عطار بن بشار، ابو سہیل، موثر بن غفارہ، یحییٰ بن ابی عمرو، جبیر بن نفیر، عروہ بن مسعود ثقفی، عبداللہ بن زید انصاری، ابو زرعہ، یعقوب بن عامر، ابو نصرہ ابو الطفیل (رحمہم اللہ)

پھر ان علماء کبار اور محدثینِ اعلام سے جن بے شمار تلامذہ نے سُنا ان میں سے راویانِ حدیث کے طبقہ میں جن کو حدیث اور علومِ قرآن کا رتبۂ بلند حاصل ہے اور جو اپنے وقت کے "امام الحدیث" اور "امیر المومنین فی الحدیث" تسلیم کیے گئے ہیں، بعض کے اسماءِ گرامی یہ ہیں:- ابن شہاب زہری، سفیان بن عیینہ، لیث، ابن ابی ذئب، اوزاعی، قتادہ، عبدالرحمٰن بن ابی عمرہ، سہیل، جبلہ بن سحیم، علی بن زید، ابو رافع، عبدالرحمٰن بن جبیر، نعمان بن سالم، معمر، عبداللہ بن عبید اللہ (رحمہم اللہ)

غرض ان روایات و احادیثِ صحیحہ کا صحابہ، تابعین، تبعِ تابعین یعنی خیر القرون کے طبقات میں اس درجہ شیوع ہو چکا تھا اور وہ بغیر کسی انکار کے اس درجہ لائقِ قبول ہو چکی تھیں کہ ائمۂ حدیث کے نزدیک حضرتِ مسیح علیہ السلام کی حیات و نزول سے متعلق ان احادیث کو مفہوم و معنی کے لحاظ سے درجۂ "تواتر" حاصل تھا اور اسی لیے وہ بے جھجک اس مسئلہ کو احادیثِ متواترہ سے ثابت اور مسلّم کہتے تھے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ روایتِ حدیث کے تمام طبقات و درجات میں ان روایات کو "تلقی بالقبول" کا یہ درجہ حاصل رہا ہے کہ ہر دور میں اس کے رواۃ میں

"ائمہ حدیث" اور روایت حدیث کے "مدار" نظر آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان مرفوع وموقوف برصحابہ (رضی اللہ عنہم) احادیث اور روایات کے ناقلین میں امام احمد، امام بخاری، امام مسلم، ابوداؤد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ جیسے اصحاب صحیح وسنن ائمہ حدیث کے اسماء گرامی شامل ہیں اور وہ باتفاق ان روایات کی صحت وحسن کے قائل ہیں چنانچہ یہ اور اسی قسم کی احادیث صحیحہ کا ذکر کرتے ہوئے مشہور محدث ومفسر ابن کثیر اپنی تفسیر میں اول یہ عنوان قائم کرتے ہیں:

ذکر الاحادیث الواردۃ فی نزول عیسیٰ	ان احادیث کا ذکر جو حضرت عیسیٰ بن مریم
بن مریم علیہما الصلوٰۃ والسلام	(علیہما السلام) کے آسمان سے
الی الارض من السماء فی اٰخر الزمان	زمین پر اترنے کے بارے میں نازل
قبل یوم القیٰمۃ [1]	ہوئی ہیں۔

اور اس کے بعد سلسلہ کی احادیث کو نقل کرنے کے بعد آخر میں یہ تحریر فرماتے ہیں:

فھذہ احادیث متواترۃ عن رسول اللہ	پس یہ ہیں وہ احادیث جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
صلی اللہ علیہ وسلم من روایۃ ابی ھریرۃ	سے تواتر کے درجہ تک منقول ہوئی ہیں اور نقل رواۃ
وابن مسعود وعثمان بن العاص وابی امامۃ	(آپ کے صحابہ) ابوہریرہ، ابن مسعود، عثمان بن
والنواس بن سمعان وعبداللہ بن	العاص، ابو امامہ، نواس بن سمعان، عبداللہ بن عمرو
عمرو بن العاص ومجمع بن حارثۃ	بن العاص، مجمع بن حارثہ، ابی شریحہ، حذیفہ
وابی شریحۃ وحذیفۃ بن اسید	بن اسید (رضی اللہ عنہم) سے ثابت ہے اور ان
رضی اللہ عنھم وفیھا دلالۃ علی	روایات میں عیسیٰ بن مریم کے طریقۂ نزول اور
صفۃ نزولہ ومکانہ الخ [1]	مکانِ نزول سے متعلق بھی رہنمائی موجود ہے۔

اور حافظ حدیث ابن حجر عسقلانی (نور اللہ مرقدہٗ) علامہ ابوالحسین آبری (رحمہ اللہ) سے نزول عیسیٰ (علیہ السلام) سے متعلق احادیث کے تواتر کو فتح الباری میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کرتے ہیں:

[1] تفسیر ابن کثیر جلد اول ص ۵۸۲ و ۵۸۸۔

قال ابو الحسن الخسعی الابری	ابو الحسن خسعی ابری سے منقول ہے کہ احادیثِ رسول اس
بان المهدی من هذه الامة وان	بارہ میں تواتر کو پہنچ چکی ہیں کہ مہدی اسی امت میں سے
عیسی یصلی خلفه الخ	ہوں گے اور عیسٰی علیہ السّلام اُن کے پیچھے نماز پڑھیں گے

اور تلخیص الحبیر کتاب الطلاق کے ضمن میں یہ تحریر فرماتے ہیں:-

ولما رفع عیسی فاتفق اصحاب	لیکن رفعِ عیسٰی (علیہ السّلام) کا معاملہ تو تمام علماءِ حدیث وتفسیر
الاخبار والتفسیر علی انه ببدنه	کا اس پر اجماع ہے کہ وہ اپنے جسدِ عنصری کے ساتھ ہنوز
حیا الخ	زندہ ہیں (اور وہی قربِ قیامت نازل ہوں گے)

اور محدثِ عصر محققِ وقت علامہ سید محمد انور شاہ "عقیدۃ الاسلام" میں اس تواتر کی تائید میں یہ تحریر فرماتے ہیں:-

وللمحدث العلامة الشوکانی	اور محدث علامہ شوکانی نے ایک رسالہ تصنیف کیا ہے
رسالة سماها التوضیح فی تواتر	جس کا نام یہ رکھا ہے "التوضیح فی التواتر ما جاء فی المنتظر
ما جاء فی المنتظر والدجال والمسیح ذکر	والدجال والمسیح" اس رسالہ میں انھوں نے انتیس[۲۹] احادیث
فیها تسعة وعشرین حدیثا فی نزوله	حضرت عیسٰی (علیہ السّلام) کے نزول سے متعلق نقل کی ہیں جو
علیه السلام ما بین صحیح وحسن و	اصولِ حدیث کے لحاظ سے صحیح، حسن، صالح، ضعیف درجات کو
صالح وهذا وازید منه مرفوع واما	شامل ہیں اور مرفوع احادیث اس تعداد سے بھی زیادہ موجود
الآثار فتفوت الاحصاء الخ[۱]	ہیں اور آثارِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) تو بیشمار ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ حضرتِ عیسٰی علیہ السلام کے رفعِ سماوی اور حیات، و نزول من السماء پر اُمّتِ محمدیہ (علیہا الصلوٰۃ والسلام) کا اجماع منعقد ہو چکا ہے چنانچہ علمِ عقائد و کلام کی مشہور و مستند کتاب عقیدۂ سفارینی میں اُمّت کے اس اجماع کی تصریح موجود ہے:-

---

[۱] صفحہ ۴ حضرتِ استاذ کا یہ رسالہ اپنے موضوع میں بے نظیر تصنیف ہے، عربی زبان میں تحریر ہے اور علماء و طلبہ دونوں کے لیے لائقِ مطالعہ ہے۔ مُصنّفِ قصص القرآن اس سلسلہ کے اکثر مباحث میں اسی رسالہ کا خوشہ چین ہے۔

ومنها أي من علامات الساعة العظمى العلامة الثالثة ان ينزل من السماء سيد (المسيح) عيسى بن مريم (عليه السلام) ونزوله ثابت بالكتاب والسنة واجماع الامة واما الاجماع فقد اجمعت الامة على نزوله ولم يخالف فيه احد من اهل الشريعة وانما انكر ذلك الفلاسفة والملاحدة مما لا يعتد بخلافه۔ [1]

اور علاماتِ قیامت میں سے تیسری علامت یہ ہے کہ حضرت مسیح (عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) آسمان سے اتریں گے اور اُن کا آسمان سے اُترنا کتاب (قرآن) سُنت (حدیث) اور اجماعِ اُمت سے قطعاً ثابت ہے (قرآن وحدیث سے نزول ثابت کرنے کے بعد فرماتے ہیں) جہاں تک اجماعِ اُمت کا تعلق ہے تو اس میں ذرا شبہ نہیں کہ حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان سے نازل ہونے پر اُمت کا اجماع ہے اور اس بارہ میں پیروانِ شریعتِ اسلامی میں سے کسی ایک کا بھی خلاف موجود نہیں البتہ فلسفیوں اور ملحدوں نے نزولِ عیسیٰ کا انکار کیا ہے اور اسلام میں اُن کا اِنکار قطعاً بے وقعت ہے۔

حیات و نزولِ مسیحؑ کی حکمت

گذشتہ سطور میں حیات و نزولِ مسیح (علیہ السلام) کو دلائل و براہین کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے جو ایک منصف اور طالبِ حق کو علمِ یقین عطا کرتے ہیں اب مزید طمانیتِ قلب کے لیے ان چند حکمتوں کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جن کو علماءِ حق نے اس سلسلہ میں بیان فرمایا ہے لیکن اس کے مطالعہ سے قبل یہ حقیقت بہرحال پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور اس کی مشیت کی مصلحتوں کا احاطہ عقلِ انسانی کے لیے ناممکن ہے اور مخلوق، خالقِ کائنات کے اسرار و حِکَم پر عبور بھی کیسے کر سکتی ہے؟ تاہم

---

[1] صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے تین زمانوں کو "خیر القرون" کہا جاتا ہے چونکہ نبی معصوم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان تینوں کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے "خیر القرون قرنی، ثم الذین یلونهم، ثم الذین یلونهم" سب سے بہتر میرا زمانہ ہے پھر اُن لوگوں کا جو اس زمانہ سے قریب ہیں اور پھر اُن کا جو اس دوسرے زمانہ سے متصل ہیں اور اُس کے بعد فرمایا "پھر جھوٹ کی کثرت ہو جائے گی یعنی ان ہر سہ ادوار کے بعد اکثریت کے اندر دینی انحطاط پیدا ہو جائے گا اور اسلامی خصوصیاتِ اخلاق مٹ جائے گی۔

علماءِ اُمت، فراستِ مومن اور علمِ حق کی راہ سے دین اور احکامِ دین کے اسرار و مصالح پر قلم فرسائی کرتے اور اپنی محدود دسترس کے مطابق اس موضوع پر علمی حقائق کا اظہار کرتے آئے ہیں اسلامی دور کی علمی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ دورِ اوّل میں علم الاسرار کی امامت کا شرف عمر بن الخطاب، علی بن ابی طالب اور صدیقہ عائشہ (رضی اللہ عنہم) کو حاصل تھا اور اس کے بعد اگرچہ ہر ایک صدی میں دو چار علماءِ ربانی اس کے ماہر و محقق رہے ہیں لیکن خصوصیت کے ساتھ خلیفۂ اموی عمر بن عبدالعزیزؒ، امام ابوحنیفہؒ، علامہ عزالدین بن عبدالسلام مصری، حافظ ابن تیمیہ، امام غزالی، رومی، سید مرتضیٰ زبیدی اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو اس علم سے خاص مناسبت تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں اُن کو فطری ملکہ عطا فرمایا تھا۔

بہرحال حکمت کی حیثیت لطائف و نکات کی ہوتی ہے اور اس کو دلیل و حجت کا مرتبہ نہیں دیا جا سکتا اس لیے زیرِ بحث مسئلہ میں بھی "حکمت و مصلحت" کا ذکر اسی نقطۂ نظر سے سمجھنا چاہیے۔ واللہ اعلم بالصواب ولکل شئ عندہٗ فصل الخطاب۔

(۱) یہود بنی اسرائیل اپنی مذہبی کتابوں کی پیشینگوئیوں اور بشارتوں میں یہ پڑھ چکے تھے کہ ان کو دو شخصیتوں "مسیحِ ہدایت" اور "مسیحِ ضلالت" سے سابقہ پڑے گا اس لیے وہ منتظر تھے کہ موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد "مسیحِ ہدایت" کا ظہور کب ہوتا ہے لیکن شومیٔ قسمت کہ جب مسیحِ ہدایت کا ظہور ہوا تو انھوں نے بغض و حسد کی راہ سے اس کو "مسیحِ ضلالت" کہہ کر رد کر دیا اور صرف یہی نہیں بلکہ آمادۂ قتل ہو گئے اور چونکہ قتلِ انبیاء ان کا دستور رہا تھا اس لیے وہ اس پر ہر وقت جری رہتے تھے، پس جبکہ وہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح ان کے قتل کے بھی قائل ہو گئے تو یہ تعجب خیز بات نہ ہوئی کہ جب مسیحِ ضلالت (دجّال) کا خروج ہو تو یہود اس کو مسیحِ ہدایت کہہ کر قومی حیثیت سے اس کے پیرو ہو جائیں کیونکہ مذہبی تسلیم کے پیشِ نظر ان پر مسیحِ ہدایت کا اتباع ضروری تھا اور جب وہ مسیحِ ہدایت کو مسیحِ ضلالت کہہ کر قتل کر چکے تو اب مسیحِ ضلالت کو ہی اس کے دعوے کے مطابق مسیحِ ہدایت تسلیم کرنے پر

آمادہ ہو جائیں گے مگر مشیتِ الٰہی فیصلہ کر چکی تھی کہ مسیح ضلالت کی گمراہی کا فتنہ چونکہ عظیم الشان ہوگا اور وہ اوّل خدائی کا دعویٰ کرے گا اور اس کے بعد مسیح ہدایت بنے گا اس لیے اس کا خروج قیامت کے قریب ہی ہونا چاہیے جو دورِ فتن یعنی فتنوں کی آماجگاہ ہوگا اس لیے حکمتِ الٰہی کا یہ بھی منشاء ہوا کہ "مسیح ہدایت" کو یہود کے فتنہ سے اس طرح بچایا جائے کہ وہ اس کو ہاتھ بھی نہ لگا سکیں اور جب وہ وقت آپہنچے کہ مسیح ضلالت اپنی گمراہی کا علم بلند کرے تو مسیح ہدایت ملاءِ اعلیٰ سے کائناتِ ارضی پر اُترے اور یہود بنی اسرائیل جو کہ بہ تعدادِ کثیر مسیح ضلالت کے پیرو ہو رہے ہوں گے اپنی آنکھوں سے حق و باطل کا مشاہدہ کر لیں اور جب مسیح ہدایت کے مقدس ہاتھوں سے مسیح ضلالت کا خاتمہ ہو جائے تو جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا" حق الیقین بن کر اُن کی نگاہوں کے سامنے آجائے اور اس طرح قبولِ حق کے ماسوا ان کے لیے دوسرا چارہ کار باقی ہی نہ رہے اور یا پھر وہ بھی مسیح ضلالت کے ساتھ "فی النار" کر دیے جائیں۔

نیز یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ ادیان و ملل کی تاریخ میں صرف یہود ہی ایک ایسی جماعت ہے جس نے اپنے انبیاء (علیہم السلام) کو بھی قتل کرنے سے ہاتھ نہیں روکا لیکن حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد یہود نے جن انبیاء کے خونِ ناحق سے ہاتھ رنگے تھے وہ صرف "نبی" ہی تھے جو "علماء اُمتی کانبیاء بنی اسرائیل" کا مصداق تھے مگر کوئی صاحبِ شریعت رسول اُن کے اس قتلِ ناحق کا مظلوم نہیں بنا تھا اس لیے یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے ایک جلیل القدر رسول (عیسیٰ بن مریمؑ) کو قتل کرنے کا نہ صرف ارادہ کیا بلکہ دنیوی اسباب کے لحاظ سے مکمل تیاری کر لی تھی تب مشیتِ حق نے یہ فیصلہ کیا کہ مسیح ہدایت کو اس طرح بچایا جائے کہ خود یہود کو بھی محسوس ہو جائے کہ وہ مسیح بن مریمؑ پر دسترس نہ پا سکے، لہٰذا فیصلۂ مشیت بروئے کار آیا اور حضرتِ مسیحؑ کو ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا گیا اور تمام دنیوی اسباب ہیچ ہو کر رہ گئے، لیکن اس احساس کے باوجود چونکہ حقیقتِ حال تک نہ پہنچ سکے اور ظن و

گمان ہی کے قعر میں پڑے رہے گو اپنی بات رکھنے کے لیے مشہور ہی کرتے رہے کہ ہم نے مسیح بن مریمؑ کو قتل کر دیا۔ ادھر متبعین مسیحِ ہدایت (نصاریٰ) کی بدبختی دیکھیے کہ کچھ عرصہ کے بعد پولوس رسول نے ان میں عقیدۂ تثلیث و کفارہ کی بدعت پیدا کر کے یہود کے گھڑے ہوئے افسانۂ صلیب کو بھی داخلِ عقیدہ کر دیا، اور اب یہود و نصاریٰ دونوں جماعتیں اس گمراہی میں مبتلا ہو گئیں کہ عیسیٰ بن مریمؑ صلیب پر چڑھا کر قتل کر دیے گئے۔ تب قرآن عزیز نے نازل ہو کر حق و باطل کے درمیان فیصلہ سنایا اور حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کے متعلق دونوں جماعتوں نے جو جدا الگ رُخ اختیار کیے تھے اور پھر ایک مسئلہ میں دونوں کا اتفاق بھی ہو گیا تھا ان سب کے متعلق علمِ یقین کے ذریعہ حقیقتِ حال کو واشگاف اور دونوں کی گمراہی کو واضح کر کے قبولِ حق کے لیے دعوت دی مگر جماعتی حیثیت سے دونوں نے انکار کر دیا اور حضرتِ مسیحؑ سے متعلق اپنے اپنے گمراہ کن عقیدہ پر قائم رہے مگر عالم الغیب والشہادہ چوں کہ ان حقائق کا ان کے وقوع سے قبل عالم و دانا تھا اس لیے اس کی حکمت کا یہ بھی تقاضا ہوا کہ مسیحِ ہدایت کو کائناتِ ارضی پر اس وقت دوبارہ بھیجا جائے جب مسیحِ ضلالت کا بھی خروج ہو چکے تاکہ یہود و نصاریٰ کے سامنے حقیقتِ حال مشاہدہ کے درجہ میں روشن ہو جائے یہود آنکھوں سے دیکھ لیں کہ جس کے قتل کے مدعی تھے قدرتِ الٰہی کے کرشمے کی بدولت وہ بقیدِ حیات موجود ہے اور نصاریٰ نادم ہوں کہ حضرتِ مسیحؑ کی سچی پیروی چھوڑ کر جو گمراہ کن عقیدہ اختیار کیا تھا وہ سرتاپا باطل اور ہیچ تھا اور اس طرح ہدایت و ضلالت کے معرکہ میں حق کی سربلندی اور باطل کی پستی کا دونوں مشاہدہ کر کے قرآنِ عزیز کی تصدیق پر مجبور ہو جائیں اور دونوں جماعتیں "ایمانِ حق" کو برضا و رغبت اختیار کر لیں اور اپنے باطل عقائد پر شرمسار و سرنگوں ہو جائیں۔ اور چونکہ ان دونوں جماعتوں کے علاوہ ہدایت و ضلالت کا یہ مشاہدہ و مظاہرہ دوسرے اہلِ باطل بھی کریں گے اس لیے وہ بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائیں گے اور اس طرح احادیثِ صحیحہ کے مطابق اس زمانہ میں کائناتِ ارضی کا صرف ایک ہی مذہب ہو گا اور وہ "اسلام" ہو گا۔

"هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا"

ادیان وملل کی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور معاندین حق کے درمیان "سنتہ اللہ" کے دو مستقل دور رہے ہیں۔ پہلا دور حضرت نوح (علیہ السلام) سے شروع ہو کر حضرت لوط (علیہ السلام) پر ختم ہوتا ہے، اس دور میں سنتہ اللہ یہ رہی کہ جب قوموں نے اپنے پیغمبروں کی صدائے حق پر کان نہ دھرا بلکہ برابر اُس کا تمسخر کرتی اور اس کے پیغام حق کے آڑے آتی رہیں، تب اللہ تعالیٰ کے عذاب نے اُن کو ہلاک کر دیا اور دوسروں کے لیے اُن کو باعث عبرت و بصیرت بنا دیا۔ اور دوسرا دور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے شروع ہو کر خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا ہے۔ اِس دور میں سنت اللہ کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ جب اعداءِ حق اور دشمنانِ دینِ قوم نے کلمۂ حق کی مخالفت پر اصرار کیا، اپنے پیغمبروں کو ایذا دی اور ان کے ساتھ تمسخر کو اپنا نصب العین بنا لیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن قوموں کو ہلاک کرنے کی بجائے اپنے پیغمبروں کو یہ حکم دیا کہ وہ خدا کی راہ میں وطن چھوڑ دیں اور ہجرت کر جائیں چنانچہ حضرت ابراہیمؑ پہلے پیغمبر ہیں جنھوں نے قوم[1] کے سامنے یہ اعلان کیا: اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ: اور عراق سے شام کی جانب ہجرت فرما گئے۔

پھر یہی صورت حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کو پیش آئی اور وہ بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر مصر سے شام کو ہجرت کر گئے مگر فرعون اور اس کے لشکریوں نے چونکہ مزاحمت کی اور ہجرت کے بھی آڑے آئے اس لیے وہ بحر قلزم میں غرق کر دیے گئے۔

اور یہی صورت نبی اکرم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پیش آئی کہ جب قریش مکہ نے اذیت، تمسخر، دینِ حق کے ساتھ تصادم، اعمالِ دین کی مزاحمت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تب مشیتِ الٰہی کا فیصلہ ہوا کہ آپ مکہ سے مدینہ کو ہجرت کر جائیں، چنانچہ ہر قسم کی نگرانی اور

[1] یہ حضرت ابراہیمؑ کی اپنی قوم نہیں تھی اس لیے کہ یہ بنی سام (سامی) تھے اور نارودِ عراق اور اس کی قوم بنی حام (حامی) تھے

مکان کے ہر طرف محاصرہ کے باوجود کرشمۂ قدرت سے آپ محفوظ و مامون مدینہ ہجرت کر گئے۔

سنت اللہ کے اسی دور میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی بعثت ہوئی اور اُن کی قوم بنی اسرائیل نے ان کے ساتھ اور ان کی دعوت حق کے ساتھ بھی وہ سب کچھ کیا جو معاندینِ حق اور دشمنانِ دین اپنے پیغمبروں کے ساتھ کرتے رہے تھے اور اُن میں ایک یہ خصوصیت زیادہ تھی کہ وہ حضرت مسیح (علیہ السلام) سے قبل چند انبیاء کو قتل تک کر چکے تھے اور اب حضرت مسیح کے قتل کے درپے تھے، اسی کے ساتھ یہ مسطورۂ بالا حقیقت بھی فراموش نہیں رہنی چاہیے کہ یہود مسیحِ ہدایت اور مسیحِ ضلالت دو مسیح کے منتظر تھے اور حضرت عیسیٰ بن مریم کو مسیحِ ضلالت قرار دے کر آج بھی مسیحِ ہدایت کے منتظر ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ کا یہ فیصلہ ہوا کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کی ہجرت، کائناتِ ارضی کی بجائے ملاءِ اعلیٰ کی جانب ہو تاکہ مقررہ وقت آنے پر وہ مسیحِ ہدایت اور مسیحِ ضلالت کے درمیان مشاہدہ سے امتیاز کر سکیں اور ایک جانب اگر مسیحِ ہدایت کو مسیحِ ہدایت کہیں تو دوسری جانب قرآن کے فیصلۂ حق کی صداقت و حقانیت کو دیکھ کر دینِ حق "اسلام" کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں اور ساتھ ہی نصاریٰ کو بھی اپنی جہالت اور یہود کی کورانہ تقلید پر ندامت ہو اور وہ بھی تعلیمِ قرآن کی صداقت پر یقین و اعتقاد کے ساتھ شہادت دینے پر آمادہ ہو جائیں۔

کچھ عجیب صورتِ حال ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) اور خاتم الانبیاء محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان دعوت و تبلیغِ حق، اور معاندین کی جانب سے حق کی معاندت و مخالفت، اور پھر اس کے نتائج و ثمرات میں بہت ہی زیادہ مشابہت پائی جاتی ہے، دونوں کی اپنی قوم نے دونوں کو جھٹلایا، دونوں کی قوموں نے سازشِ قتل کے بعد مکانوں کا محاصرہ کیا، قدرتِ حق کے کرشمۂ اعجاز نے دونوں کو دشمنوں کی دسترس سے ہر طرح محفوظ رکھا، دونوں کے لیے ہجرت کا معاملہ پیش آیا، البتہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت چونکہ بعثتِ عامہ تھی اور اس کی دعوت و تبلیغ کے لیے ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا کرۂ ارضی پر قیامِ مسلسل ضروری تھا،

اس لیے مکہ سے مدینہ کو ہجرت کا حکم ہوا اور عیسیٰ ابن مریم (علیہما الصلوٰۃ والسلام) چونکہ قوم کو دعوتِ حق پہنچا چکے تھے اور ایک خاص مقصدِ عظیم کے پیشِ نظر ان کا مدّتِ مدید کے بعد کائناتِ ارضی پر موجود ہونا ضروری تھا اس لیے اُن کو ہجرتِ ارضی کی بجائے ہجرتِ سماوی پیش آئی پھر جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ کے قائدِ ضلالت امیہ بن خلف کو اپنے حربہ سے قتل کیا، عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) بھی قوم کے مسیحِ ضلالت دجّال کو قتل کریں گے اور جس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کے بعد آپؐ کے وطن مکہ پر قدرتِ حق نے اقتدار عطا فرما دیا، عیسیٰ بن مریمؑ کا نزول بھی شام ہی کے اس مشہور شہر میں ہوگا جس نے اپنی قوم کی معاندانہ سازشوں کی بنا پر ملاءِ اعلیٰ کی جانب ہجرت پیش آئی تھی اور بیت المقدس، دمشق اور شام کے پورے ملک پر یہود کے علی الرغم ان کی حکومت ہوگی۔[1]

(۳) حضرت مسیح (علیہ السلام) سے پہلے قتلِ انبیاء (علیہم السلام) نے یہود کو اس درجہ گستاخ اور بے باک بنا دیا تھا کہ وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ کسی ہستی کے متعلق یہ فیصلہ کہ وہ نبی صادق ہے یا متنبی کاذب ہمارے ہاتھ میں ہے اور جس کو ہم اور ہمارے فقیہ کاذب قرار دیدیں، وہ واجب القتل ہے چنانچہ اسی زعمِ باطل میں انھوں نے عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو مسیحِ ضلالت کہا اور ان کے فقیہوں نے قتل کا فتویٰ صادر کر دیا۔ حالانکہ یہ وہ جلیل القدر ہستی تھی کہ موسیٰ (علیہ السلام) کے بعد بنی اسرائیل میں اس پایہ کا کوئی پیغمبر مبعوث ہی نہیں ہوا تھا اور اس نے جدید پیغامِ حق (انجیل) کے ذریعہ روحانیت کی مُردہ کھیتی میں دوبارہ جان ڈال دی تھی، تب اللہ تعالیٰ کی مشیت کا فیصلہ ہوا کہ ہمیشہ کے لیے بنی اسرائیل کے اس زعمِ باطل کو پاش پاش کر دیا جائے اور دکھا دیا جائے کہ رب العالمین، خالقِ کائنات جس کی حفاظت کا وعدہ کر لے کائنات کی کوئی ہستی یا مجموعۂ کائنات بھی اس پر دسترس نہیں پا سکتی چنانچہ یدِ قدرت نے اس وقت اس مقدس ہستی کو جسدِ عنصری کے ساتھ ملاءِ اعلیٰ کی جانب اٹھا لیا جبکہ مکان کے محاصرہ کے ساتھ دشمنوں نے اس کی حفاظتِ جان کے تمام وسائلِ دُنیوی مسدود کر دیے تھے۔

[1] خلاصہ از عقیدۃ الاسلام۔

پھر اس واقعہ نے ایک نئی صورت پیدا کر دی، وہ یہ کہ مذاہب کی تاریخ میں صرف حضرت مسیح (علیہ السلام) ہی کی شخصیت ایسی ہے جن کے قتل وعدم قتل کے متعلق حق وباطل کے درمیان سخت اختلاف پیدا ہوا اور یہود و نصارٰی کے باہم واقعۂ صلیب وقتل پر اتفاق کے باوجود دو باطل اور متضاد عقائد کی کشمکش نظر آنے لگی۔

یہود قتل وصلیب کی وجہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک وہ مسیح ضلالت تھے اور نصارٰی وجۂ صلیب یہ بتاتے ہیں کہ وہ خدا کے بیٹے تھے جو کائنات کے گناہوں کا کفارہ بننے کے لیے بھیجے گئے تھے تاکہ پاپی دنیا پاپ سے پاک ہو جائے اور صدیوں بعد جب قرآن نے "امر حق" کو واضح اور مسیح بن مریمؑ سے متعلق حقیقتِ حال کو روشن کیا تب بھی دونوں جماعتوں نے جماعتی حیثیت سے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا لہٰذا قدرتِ حق کا فیصلہ ہوا کہ خود مسیح بن مریم (علیہما السلام) ہی وقتِ موعود پر نازل ہو کر قرآن کے فیصلہ کی تصدیق کر دیں اور یہود و نصارٰی کے باطل عقائد کا خود بخود اس طرح خاتمہ ہو جائے اور اس کے بعد مدعیانِ اہلِ کتاب کو شرک و باطل کی پیروی کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہے اور خدا کی حجت ان پر تمام ہو جائے۔

نیز جبکہ اللہ تعالیٰ نے کائناتِ ہست وبود کے لیے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ خدا کی ہستی کے ماسوا ہر ایک وجود کو فنا اور موت ہے "کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ" "کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهٗ" اور یہ ظاہر ہے کہ ملاءِ اعلیٰ اور عالمِ قدس مقامِ موت نہیں ہے بلکہ مقامِ حیات ہے اس لیے از بس ضروری ہے کہ عیسٰی بن مریم (علیہما السلام) بھی موت کا ذائقہ چکھیں اور اس کے لیے کائناتِ ارضی پر اتریں تاکہ زمین کی امانت زمین ہی کی سپرد ہو اس لیے حیات و رفع کے بعد نزولِ ارضی مقدر ہوا[1]۔

علماءِ حق نے حیات و نزولِ عیسٰی علیہ السلام سے متعلق جو "اسرار و حِکَم" بیان فرمائے ہیں یہاں ان کا احاطہ مقصود نہیں ہے اس لیے مختصر چند حکمتوں کا ذکر کر دیا گیا ورنہ محدثِ عصر علامہ سید محمد انور شاہ نور اللہ مرقدہٗ نے اس سلسلہ میں ایک طویل مقالہ عقیدۃ الاسلام میں سپردِ قلم فرمایا ہے جو لائقِ مطالعہ ہے، حضرتِ استاد نے نہایت لطیف مگر دقیق پیرایۂ بیان میں کائناتِ عالم کو

[1] فتح الباری ج ۶۔

انسانِ کبیر اور انسان کو عالمِ صغیر قرار دے کر ان ہر دو عالم کی حیات و موت پر جو بحث فرمائی ہے اس سے حضرتِ مسیحؑ کے رفع اور قربِ قیامت میں کائناتِ ارضی کی جانب رجوع کی حکمت بہت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے لیکن یہ کتاب چونکہ اس دقیق بحث کی متحمل نہیں ہے اس لیے اپنی جگہ قابلِ مراجعت ہے۔

آخر میں اب اپنی جانب سے چند جملے اس سلسلہ میں اضافہ کر کے اس مبحث کو ختم کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۴) قرآنِ عزیز میں میثاقِ انبیاءؑ سے متعلق یہ ارشادِ باری ہے :-

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ	اور وہ وقت قابلِ ذکر ہے جبکہ اللہ نے نبیوں سے (یہ)
النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ	عہد لیا کہ جب تمہارے پاس (خدا کی جانب سے) کتاب اور
كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ	حکمت آئے پھر ایسا ہو کہ تمہاری موجودگی میں ایک
مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ	رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آئے جو تصدیق کرتا ہو ان
وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ	کتابوں کی جو تمہارے پاس ہیں ضرور تم اس پر ایمان لانا
وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ	اور ضرور اس کی مدد کرنا، اللہ نے کہا: کیا تم نے اقرار کیا!
قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا	انھوں نے جواب دیا ہاں ہم نے اقرار کیا، اللہ نے کہا:
وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ○	پس تم اپنے اس عہد پر گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ
(سورۂ آلِ عمران پ ۳ ع ۱)	گواہ ہوں۔

آلِ عمران کی اِن آیات میں حسب تفسیر حضرتِ ابنِ عباسؓ (رضی اللہ عنہما) اس عہد و پیمان

---

[۱] عن علی و ابن عباس فی تفسیر ایۃ ما بعث اللہ نبیا من الانبیاء الا اخذ علیہ المیثاق لئن بعث اللہ محمدا و هو حی لیؤمنن بہ ولینصرنہ و امرہ ان یاخذ المیثاق علی امتہ لئن بعث محمد و هم احیاء لیؤمنن بہ ولینصرنہ (تفسیر ابن کثیر ج ۱)

اللہ تعالیٰ نے انبیاء میں سے جس نبی کو بھی کسی قوم کی رشد و ہدایت کیلیے مبعوث فرمایا تو اس سے یہ عہد ضرور لیا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی اس وقت زندہ ہو جبکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوگی تو تم ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا اور ان سے یہ بھی کہا کہ وہ اپنی اپنی امتوں سے بھی یہی عہد و پیمان لیں کہ ان میں سے جو اس وقت موجود ہوں وہ اس پر ایمان لائیں اور اس کی مدد کریں۔

کا تذکرہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ازل میں خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق انبیاء ورسل (علیہم السلام) سے لیا، قرآن کے اسلوبِ بیان کے مطابق اگرچہ یہ خطاب انبیاء ورسل کی معرفت ان کی امتوں سے تھا کہ ان میں سے جو اُمتیں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ مبارک پائیں تو اُن پر ایمان لائیں اور دعوتِ حق میں اُن کی نصرت ویاری کریں چنانچہ ہر ایک پیغمبر نے اپنے اپنے دور میں تعلیمِ حق کے ساتھ ساتھ خدا کے اس وعدہ کو بھی یاد دلایا اور ان میں سے اہلِ حق نے وعدہ دیا اور اقرار کیا کہ ضرور اُن پر ایمان لائیں گے اور پیغامِ حق میں اُن کی مدد کریں گے۔

تو یہ "میثاق النبیین" اگرچہ اس طرح پورا ہوتا رہا تاہم ازل میں چونکہ اس عہد و میثاق کے اوّل مخاطب حضرات انبیاء ورسل تھے اس لیے اس میثاق کی عملی حیثیت کا تقاضا تھا کہ خود انبیاء ورُسل میں سے بھی کوئی نبی یا رسول اس عہد و میثاق کا عملی مظاہرہ کر کے دکھائے تاکہ یہ خطاب اوّلین براہِ راست بھی مؤثر ثابت ہو کر "ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ" میں بقاعدۂ عربیت خطاب تھا اُن تمام انبیاء ورسل سے جو ذاتِ اقدس سے پہلے اس کائناتِ ارضی میں مبعوث ہونے والے تھے کیونکہ ازل ہی میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے یہ مقرر ہو چکا تھا "وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ" پس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت "خاتم النبیین" اور ازل سے مقدر "میثاق النبیین" کا اجتماع صرف اسی ایک شکل میں ممکن تھا کہ انبیاءِ سابقین میں کوئی ایک پیغمبر بعثتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نزول فرمائیں اور وہ اور اُن کی اُمت دنیاءِ انسانی کے سامنے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں اور "دینِ حق" کی مدد و نصرت کا مظاہرہ کریں تاکہ "لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ" کا وعدۂ حق پورا ہو۔

گذشتہ صفحات میں یہ حقیقت بخوبی عیاں ہو چکی ہے کہ اگرچہ تمام انبیاء ورُسل اپنے اپنے زمانہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارات دیتے چلے آتے تھے لیکن یہ خصوصیت حضرت عیسیٰؑ ہی کے حصہ میں آئی کہ وہ ذاتِ اقدسؐ کی بعثت کے لیے تمہید اور براہِ راست منادِ و مبشر بنے اور بنی اسرائیل کو تعلیمِ حق دیتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا: "اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ

يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ " اور حقیقت یہ ہے کہ خاتم انبیاء بنی اسرائیل ہی کا یہ حق تھا کہ وہ خاتم الانبیاء والرسل کی بعثت کا "مُنَادِ" اور "مُبَشِّر" ہو اسلیے حکمتِ ربانی کا یہ فیصلہ ہوا کہ میثاق النبیین کے وقار کے لیے ان ہی کو منتخب کیا جائے اور اس معاملہ میں وہی تمام انبیاء و رسل کی نمائندگی کریں تاکہ امتوں کی جانب سے ہی نہیں بلکہ براہِ راست انبیاء و رسل کی جانب سے وفاءِ عہد کا عملی مظاہرہ ہو سکے، اسی حقیقت کے پیشِ نظر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا: انا اولی الناس بعیسی بن مریم والانبیاء اولاد علات لیس بینی وبینہ نبی

مگر قرآن چونکہ خدا کا آخری پیغام ہے اور "اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" کے وعدۂ الٰہی نے رہتی دنیا تک اس کو تحریف سے محفوظ کر دیا ہے اس لیے قدرتی طور پر اس کی تعلیم کے ثمرات دوسرے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے مقابلہ میں مدتِ طویل تک اپنا کام کرتے رہیں گے اور اس کی روشنی سے قلوب کو گرمانے اور طاعتِ ربانی کے لیے مشتعل کرنے کے لیے "علماء امت" انبیاء بنی اسرائیل کی طرح خدمتِ حق انجام دیتے رہیں گے۔ لیکن جب بعثتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو گذرے ہوئے بہت ہی طویل عرصہ ہو جائے گا اور امتِ مرحومہ کے عملی قومی اور اجتماعی اعضاء میں انتہائی اضمحلال پیدا ہو کر یہ کیفیت ہو جائے گی کہ ان کی بیداری اور تیز روی کے لیے صرف علماء حق کی روحانیت ہی کافی ثابت نہیں ہوگی وہ وقت اس کا متقاضی ہوگا کہ کوئی "قائم بالحجۃ" ان کو سنبھالے اور اس لیے مشیتِ الٰہی نے مقدر کیا کہ جو ہستی (عیسیٰ بن مریمؑ) انبیاء و رسل کے میثاقِ ازل کی نمائندگی کے لیے مامور ہے اس کا ایسے ہی وقت نزول ہو اور وہ امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان رہ کر ذاتِ اقدسؐ کی نیابت اور امت کی امامت کا فرض انجام دے اور "لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ" کا عملی مظاہرہ کر کے دکھائے۔

اب کرشمۂ قدرت دیکھیے کہ ازل کے ان مقدرات نے جو کہ ملاءِ اعلیٰ سے تعلق رکھتے تھے کائناتِ ارضی میں کس طرح اپنی بساط بچھائی؟ بنی اسرائیل اپنے جلیل القدر پیغمبر کے قتل کے لیے سازش مکمل کر چکے ہیں شاہی دستہ چہار جانب سے مکان کو محصور کیے ہوئے ہے مگر

مگر قدرت حق اپنا کام اس طرح نہیں کرتی کہ معجزانہ کرشمہ کے ذریعہ ان کو محفوظ وہاں سے نکال کر خدا کی وسیع زمین کے دوسرے حصہ میں "ہجرت" کرا دیتی نہیں بلکہ ہوا یہ کہ اُن کو ملاءِ اعلیٰ کی ہجرت کے لیے محفوظ و مامون زندہ اٹھالیا اور سازش و محصور کرنے والوں کو ظن و ریب کی دلدل میں پھنسا کر ان کے خسر الدنیا والآخرہ کا نشان عطا کر دیا اور پھر ارضی انسان کے ارضی احکام کے لیے وہ وقت مقرر کر دیا جو "میثاق النبیین" کی نمایندگی کے لیے موزوں تھا، یہی ہے وہ حقیقت جس کو زبانِ وحی ترجمان نے اس طرح ظاہر فرمایا: "والذی نفسی بیدہ لیوشکن ان ینزل فیکم ابن مریم حکمًا عدلًا" اور اسی کو نصِ قرآن نے یوں واضح کیا ہے:

"وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ"

پھر یہ ہستی میثاق انبیاء و رسل کی نمائندگی کا اس طرح حق ادا کرے گی کہ جب اس کا نزول ہوگا تو اس کرشمۂ قدرت کو دیکھ کر مسلمانوں کے قلوب تصدیقِ قرآن اور تازگیِ ایمان سے روشن ہو جائیں گے اور وہ حق الیقین کے درجہ میں یقین کریں گے کہ بلاشبہ راہِ مستقیم صرف اسلام ہی ہے اور مخبرِ صادق کی جس طرح یہ خبرِ صادق بجلی عالمِ غیب سے متعلق اس کی تمام خبریں اسی طرح حق اور بلاشبہ حق ہیں؛ اور نصاریٰ بحیثیتِ قوم اپنے باطل عقیدۂ تثلیث و کفارہ پر نادم و شرمسار ہوں گے اور قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کو اپنے لیے راہِ نجات اور راہِ سعادت یقین کریں گے اور یہود جب مسیحِ ہدایت اور مسیحِ ضلالت کے معرکۂ حق و باطل کا مشاہدہ کرلیں گے اور مسیحِ ہدایت کے نزول سے اپنے دعوئ قتل و صلیب کے ملعون عقیدہ کو باطل پالیں گے تو اب ان کو بھی "ایمان بالحق" کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہے گا اور مسیحِ ضلالت کے رفقاء کے علاوہ وہ سب ہی "مسلم" بن جائیں گے یہی ہے قرآن کی وہ خبر صادق "وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ" مسلمانوں میں ایمان کی تازگی و شگفتگی، نصاریٰ اور یہود میں تبدیلیِ عقائد کا حیرت انگیز انقلاب دیکھ کر اب مشرک جماعتوں پر بھی قدرتی اثر پڑے گا اور ساتھ ہی خدا کے مقدس پیغمبر کے زبردست روحانی اثرات کارفرما ہوں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ

وہ بھی حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں گے اور اس طرح وحی ترجمان، حامل قرآن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ ارشاد اپنی صداقت کو نمایاں کرے گا۔ ویدعوالناس الی الاسلام ویھلك اللہ فی زمانہ الملل کلھا الا الاسلام ویھلك اللہ فی زمانہ الدجال۔

اس تفصیل سے یہ بھی روشن ہو گیا کہ قرآن اور احادیث کی تصریحات ثابت کر رہی ہیں کہ اگر اس فرض کی انجام دہی کے لیے کوئی جدید نبی مبعوث ہوتا تو ایک جانب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصی شرف "خاتم النبیین" باقی نہ رہتا اور دوسری جانب "میثاق النبیین" کے خطاب "لتؤمنن" کا عملی مظاہرہ عالم وجود میں نہ آتا کیونکہ وہ ہستی بہر حال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہی میں سے ہوتی۔ البتہ سابقہ نبی کی آمد نقلاً اور عقلاً دونوں حیثیت سے شرف خصوصی "خاتم النبیین" کے لیے بھی قادح نہیں ہے۔ اور "میثاق النبیین" کو بھی پورا کرتی ہے۔

واقعات نزول صحیح احادیث کی روشنی میں

گذشتہ صفحات میں نزول عیسیٰ (علیہ السلام) سے متعلق جو صحیح احادیث ذکر کی گئیں اور ان سے اور بعض دوسری صحیح احادیث سے جو تفصیلات ظاہر ہوتی ہیں ان کو ترتیب کے ساتھ یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

قیامت کا دن اگرچہ معین ہے مگر ذات باری کے ماسوا کسی کو اس کا علم نہیں ہے اور اس کا وقوع اچانک ہوگا "وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ" اور قیامت کا علم خدا ہی کو ہے "حَتّٰۤى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً" حتیٰ کہ ان پر اچانک قیامت کی گھڑی آجائے گی "لَا تَاْتِیْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً" قیامت ان پر نہیں آئے گی مگر اچانک" اور حدیث جبرئیل میں ہے "ما المسؤل عنھا باعلم من السائل" (جبرئیل نے کہا) قیامت کے بارہ میں آپ سے زیادہ مجھے بھی علم نہیں جو اجمالی علم آپ کو ہے اسی قدر مجھ کو بھی ہے" اور ایک حدیث میں ہے "سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول قبل ان یموت بشھر، تسألون عن الساعۃ وانما علمھا عند اللہ۔ تم مجھ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہو تو اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔"

البتہ قرآن عزیز اور احادیث صحیح نے چند ایسی علامات بیان کی ہیں جو قیامت کے قریب

پیش آئیں گی اور اُن سے صرف اُس کے نزدیک ہو جانے کا پتہ چل سکتا ہے، اُن "اشراطِ ساعت" میں سے ایک بڑی علامت حضرتِ مسیحؑ کا ملاءِ اعلیٰ سے نزول ہے جس کی تفصیلات یہ ہیں۔

"مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان سخت معرکۂ جنگ بپا ہو رہا ہوگا اور مسلمانوں کی قیادت و امامت سُلالۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہوگی جس کا لقب "مہدی" ہوگا، اس معرکہ آرائی کے درمیان ہی میں "مسیحِ ضلالت" دجال کا خروج ہوگا، یہ نسلاً یہودی اور یک چشم ہوگا، کرشمۂ قدرت نے اس کی پیشانی پر (ک، ا، ف، ر) کافر لکھ دیا ہوگا جس کو اہلِ ایمان فراستِ ایمانی سے پڑھ سکیں گے اور اس کے دجل و فریب سے جُدا رہیں گے۔ یہ اوّل خدائی کا دعویٰ کرے گا اور شعبدہ بازوں کی طرح شعبدے دکھا کر لوگوں کو اپنی جانب توجہ دلائے گا، مگر اس سلسلہ کو کامیاب نہ دیکھ کر کچھ عرصے کے بعد "مسیحِ ہدایت" ہونے کا مدعی ہوگا، یہ دیکھ کر یہود بکثرت بلکہ قومی حیثیت سے اس کے پیرو ہو جائیں گے، اور یہ اس لیے ہوگا کہ یہود مسیحِ ہدایت کا انکار کر کے ان کے قتل کا ادعاء کر چکے ہیں اور مسیحِ ہدایت کی آمد کے آج تک منتظر ہیں، اسی حالت میں ایک روز دمشق (شام) کی مسجدِ جامع میں مسلمان منہ اندھیرے نماز کے لیے جمع ہوں گے، نماز کے لیے اقامت ہو رہی ہوگی اور مہدی موعود امامت کے لیے مصلے پر پہنچ چکے ہوں گے کہ اچانک ایک آواز سب کو اپنی جانب متوجہ کرے گی، مسلمان آنکھ اٹھا کر دیکھیں گے تو سپید بادل چھایا ہوا نظر آئے گا اور تھوڑے سے عرصہ میں یہ مشاہدہ ہوگا کہ عیسیٰ (علیہ السلام) دو زرد حسین چادروں میں لپٹے ہوئے اور فرشتوں کے بازوؤں پر سہارا دیے ہوئے ملاءِ اعلیٰ سے اتر رہے ہیں، فرشتے اُن کو مسجد کے منارۂ شرقی پر اُتار دیں گے اور واپس چلے جائیں گے، اب حضرت عیسیٰؑ کا تعلق کائناتِ ارضی کے ساتھ دوبارہ وابستہ ہو جانے کا اور وہ عام قانونِ فطرت کے مطابق صحنِ مسجد میں اُترنے کے لیے سیڑھی کے طالب ہوں گے، فوراً تعمیل ہوگی اور وہ مسلمانوں کے ساتھ نماز کی صفوں میں آ کھڑے ہوں گے، مسلمانوں کا

امام (مہدی موعود) از رہِ تعظیم پیچھے ہٹ کر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے امامت کی درخواست کرے گا۔ آپ فرمائیں گے کہ یہ اقامت تمہارے لیے کہی گئی ہے اس لیے تم ہی نماز پڑھاؤ، فراغتِ نماز کے بعد اب مسلمانوں کی امامت حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کے ہاتھوں میں آجائے گی اور وہ حربہ لے کر مسیحِ ضلالت (دجّال) کے قتل کے لیے روانہ ہو جائیں گے اور شہر پناہ کے باہر اُس کو بابِ لُدّ پر مقابل پائیں گے، دجّال سمجھ جائے گا کہ اُس کے دجل اور زندگی کے خاتمہ کا وقت آ پہنچا اس لیے خوف کی وجہ سے رانگ کی طرح پگھلنے لگے گا اور حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام آگے بڑھ کر اس کو قتل کر دیں گے اور پھر جو یہود دجّال کی رفاقت میں قتل سے بچ جائیں گے وہ اور عیسائی سب اسلام قبول کر لیں گے اور مسیحِ ہدایت کی سچی پیروی کے لیے مُسلمانوں کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آئیں گے، اس کا اثر مُشرک جماعتوں پر بھی پڑے گا اور اس طرح اس زمانہ میں اسلام کے ماسوا کوئی مذہب باقی نہیں رہے گا۔

ان واقعات کے کچھ عرصہ بعد یاجوج ماجوج کا خروج ہو گا اور اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام مسلمانوں کو اس فتنہ سے محفوظ رکھیں گے، حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کا دورِ حکومت چالیس سال رہے گا اور اس درمیان میں وہ ازدواجی زندگی بسر کریں گے اور اُنکے دورِ حکومت میں عدل و انصاف اور خیر و برکت کا یہ عالَم ہو گا کہ بکری اور شیر ایک گھاٹ پانی پئیں گے اور بدی اور شرارت کے عناصر دَب کر رہ جائیں گے۔[2]

وفاتِ مسیح علیہ السلام چالیس سالہ دورِ حکومت کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کا انتقال ہو جائے گا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں دفن ہوں گے حضرت ابو ہریرہؓ کی طویل حدیث میں ہے:

---

[1] اور مسلم میں ہے کہ دورِ حکومت سات سال رہے گا حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ تطبیق کی صورت یہ ہے کہ جب مسیحؑ کا رفعِ سماوی ہوا تو اُن کی عمر تینتیس سال تھی اور نزول کے بعد سات سال مزید بقیدِ حیات رہیں گے اس طرح کائناتِ ارضی میں کل مدتِ حیات چالیس سال ہو جائے گی۔ [2] ماخوذ از صحیح احادیث عن ابن عساکر تاریخ۔

فیمکث اربعین سنة ثم	پھر وہ کائناتِ ارضی پر اُتر کر چالیس سال قیام کریں گے اور
یتوفی ویصلی علیہ المسلمون	اس کے بعد وفات پا جائیں گے اور مسلمان ان کے جنازہ کی
ویدفنونہ [1]	نماز پڑھیں گے اور ان کو دفن کریں گے۔

اور ترمذی نے بسندِ حسن محمد بن یوسف بن عبداللہ بن سلام کے سلسلہ سے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے:۔

قال مکتوب فی التوراة	عبداللہ بن سلام (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا، تورات میں محمد صلی اللہ
صفة محمد وعیسیٰ ابن مریم	علیہ وسلم کی صفت (حلیہ وسیرت) مذکور ہے اور یہ بھی مسطور ہے کہ
یدفن معہ [2]	عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) ان کے ساتھ (پہلو میں) دفن ہوں گے۔

ویوم القیٰمة یکون علیھم شھیدا

سورۂ مائدہ میں حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کے مختلف حالات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ پھر آخر سورۃ بھی ان ہی کے تذکرہ پر ختم ہوتی ہے۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے اوّل قیامت کے اس واقعہ کا نقشہ کھینچا ہے جب انبیاء علیہم السلام سے اُن کی اُمتوں کے متعلق سوال ہوگا اور وہ غایتِ ادب سے اپنی لاعلمی کا اظہار کریں گے اور عرض کریں گے خدایا! آج کا دن تو نے اس لیے مقرر فرمایا ہے کہ ہر معاملہ میں حقائقِ امور کے پیشِ نظر فیصلہ سنائے اور ہم چونکہ صرف ظواہر ہی پر کوئی حکم لگا سکتے ہیں اور قلوب اور حقائق کا دیکھنے والا تیرے سوا کوئی نہیں اس لیے آج ہم کیا شہادت دے سکتے ہیں صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں تو علام الغیوب ہے اس لیے تو ہی سب کچھ جانتا ہے:۔

یَوْمَ یَجْمَعُ اللّٰہُ الرُّسُلَ	وہ دن (قابلِ ذکر ہے) جبکہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو جمع کرے گا
فَیَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ قَالُوْا	پھر کہے گا تم (اپنی اپنی اُمتوں کی جانب سے) کیا جواب دیے گئے؟
لَاعِلْمَ لَنَا اِنَّکَ اَنْتَ	وہ (پیغمبر) کہیں گے (تیرے علم کے سامنے) ہم کچھ نہیں جانتے

[1] اس سے قبل یہ حدیث مکمل نقل کی گئی ہے۔ اس کو ابن ابی شیبہ نے مصنف میں، امام احمد نے مسند میں، ابوداؤد نے سنن میں، ابن جریر نے تفسیر میں اور ابن حبان نے صحیح میں حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے۔ [2] تفسیر ابن کثیر ج۱ ص ۵۷۸۔

عَلَّامُ الْغُيُوْبِ (مائدہ پ ۷ ع ۱۶) بلاشبہ تو ہی غیب کی باتوں کا خوب جاننے والا ہے

ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا "لاعلم لنا" فرمانا علم حقیقی کی نفی پر ہی مبنی ہوگا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ وہ درحقیقت اپنی اُمتوں کے جواب سے لاعلم ہیں کہ کس نے ایمان کو قبول کیا اور کس نے انکار کیا کیونکہ جواب کا مقصد اگر یہ ہو تو یہ صریح جھوٹ اور کذب بیانی ہے اور انبیاء علیہم السلام کی جانب اِس عمل بد کی نسبت ناممکن ہے اس لیے انبیاء علیہم السلام کا یہ جواب مسطورۃ بالا حقیقت کے ہی پیش نظر ہوگا۔ ظاہر حالات کے علم سے انکار پر مبنی نہیں ہوگا اِس کے لیے خود قرآن عزیز ہی شاہد عدل ہے کیونکہ وہ متعدد جگہ یہ کہتا ہے کہ قیامت کے دن انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی اُمتوں پر شہادت دیں گے کہ ہم نے اُن تک خدا کا پیغام پہنچا دیا تھا اور یہ کہ انھوں نے ہماری دعوت کو قبول کیا یا رُد کر دیا۔ تو ان ہر دو مقامات پر نظر رکھنے کے بعد یُوں کہا جائے گا کہ پاس ادب کے طریقہ پر اوّل انبیاء علیہم السلام کا یہی جواب ہوگا جو مائدہ میں مذکور ہے لیکن جب ان کو خدائے برتر کا یہ حکم ہوگا کہ وہ صرف اپنے علم کے مطابق شہادت دیں تب وہ شہادت دیں گے۔

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ	پھر (اے پیغمبر!) کیا حال ہوگا اس دن (یعنی قیامت کے دن)
أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ	جب ہم ہر ایک امت سے ایک گواہ طلب کریں گے (یعنی اس کے
عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا۔	پیغمبر کو طلب کریں گے جو اپنی اُمت کے اعمال و احوال پر گواہ ہوگا)
(نساء پ ع)	اور ہم تمہیں بھی ان لوگوں پر گواہی دینے کے لیے طلب کریں گے۔
وَجِيءَ بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ	اور لائے جائیں گے (قیامت کے دن) انبیاء اور شہداء اور فیصلہ کیا
وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْحَقِّ (زمر پ ع)	جائے گا ان لوگوں کے درمیان اچھائی اور برائی کا حق کے ساتھ۔

حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) نے بھی "لاعلم لنا" کی یہی تفسیر بیان فرمائی ہے۔

عن ابن عباس یوم یجمع	حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) آیت يَوْمَ يَجْمَعُ اللَّهُ
الله (الآیۃ) یقولوا الرب	الرُّسُلَ (الآیۃ) کی تفسیر میں فرماتے ہیں: انبیاء علیہم السلام رب
عزّ وجلّ لاعلم لنا الّا	عزّ وجل سے عرض کریں گے ہم کو کوئی علم نہیں ہے مگر ایسا علم کہ

علم انت اعلم بہ منا[۱] جس کے متعلق تو ہم سے بہتر جانتا ہے۔

اور شیخ المحققین علامہ سید انور شاہ (رحمہ اللہ) آیت کے جملہ "لاعلم لنا" کو علم حقیقی کے انکار" پر محمول کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

"یہ بات مسلّم ہے کہ ایک انسان کو ـــــ خواہ وہ کسی درجہ اور رتبہ کا ہو ـــــ دوسرے انسان کے متعلق جو کچھ بھی معلوم ہوتا ہے وہ علمِ حقیقی کے لحاظ سے "ظن" کے درجہ سے آگے "علم" تک نہیں پہنچتا، اسی بناء پر نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ہے "نحن نحکم بالظواھر واللہ متولی السرائر" ہم ظاہر معاملات پر حکم لگاتے ہیں اور بھیدوں اور حقیقتوں پر تصرف خدا کو ہی قابو حاصل ہے' نیز ایک دوسری حدیث میں ہے ذاتِ اقدسؐ نے ارشاد فرمایا، تم میرے پاس اپنے جھگڑے لاتے ہو اور بعض تم میں سے زیادہ چرب زبان ہوتے ہیں اور مجھ کو علم غیب نہیں ہے کہ حقیقت سے آگاہ ہو جایا کروں اس لئے جو بھی فیصلہ دیتا ہوں ظاہر حالات پر ہی دیتا ہوں تو یاد رہے کہ جو شخص بھی اپنی چرب زبانی سے کسی بھائی کا ادنیٰ سا ٹکڑا بھی ناحق حاصل کرے گا وہ بلاشبہ جہنم کا ٹکڑا حاصل کرے گا۔"[۲]

بہر حال قرآن عزیز، احادیثِ رسولؐ، آثارِ صحابہؓ، اور اقوالِ علماء سب یہی ظاہر کرتے ہیں کہ اس موقع پر انبیاء علیہم السلام کا جواب "عدمِ علم" کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ از راہِ پاسِ ادب "حقیقی علم پر انکار" کو واضح کرتا ہے۔

غرض ذکر یہ تھا کہ اصل مقام پر اصل تذکرہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ کا ہو رہا ہے جو قیامت میں پیش آئے گا جبکہ اللہ تعالیٰ اُن پر اپنے انعامات شمار کرانے کے بعد اُن سے اُن کی اُمت کے متعلق سوال کرے گا اور وہ حسبِ حال جوابات پیش کریں گے مگر سابق آیات میں چونکہ دوسرے مطالب ذکر ہوئے تھے اس لئے اُن سے امتیاز پیدا کرنے کے لیے تمہیداً قیامت میں ہونے والے اُن سوال وجواب کا ذکر ضروری ہوا جو عام طور پر انبیاء علیہم السلام سے اُن کی اُمتوں کے متعلق کیے جائیں گے اور اس لیے بھی یہ تذکرہ ضروری

[۱] تفسیر ابن کثیر جلد ۱۔ [۲] عقیدۃ الاسلام ص ۱۶۵۔

تھا کہ اگلی آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جواب کا جو ذکر کیا گیا ہے اس کا پیرایۂ بیان بھی انبیاء علیہم السلام کے جواب کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِيْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ؕ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (مائدہ ع)

اور (وہ وقت بھی قابل ذکر ہے) جب اللہ تعالیٰ عیسیٰ ابن مریمؑ سے کہے گا "کیا تو نے لوگوں (بنی اسرائیل) سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو دونوں کو اللہ کے ماسوا خدا بنا لینا" عیسیٰؑ کہیں گے "پاکی تجھ کو ہی زیبا ہے میرے لیے کیسے ممکن تھا کہ میں وہ بات کہتا جو کہنے کے لائق نہیں۔ اگر میں نے یہ بات ان سے کہی ہوتی تو یقیناً تیرے علم میں ہوتی (اس لیے کہ) تو وہ سب کچھ جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں تیرا بھید نہیں پا سکتا بلاشبہ تو غیب کی باتوں کا خوب جاننے والا ہے، میں نے اس بات کے ماسوا جس کا تو نے مجھ کو حکم دیا ان سے اور کچھ نہیں کہا وہ یہ کہ صرف اللہ ہی کی پوجا کرو جو میرا اور تمہارا سب کا رب ہے اور میں اُن پر اس وقت تک کا گواہ ہوں جب تک میں ان کے درمیان رہا پھر جب تو نے مجھ کو قبض کر لیا تب تو ہی ان پر نگہبان تھا اور تو ہر چیز پر گواہ ہے اگر تو ان سب کو عذاب چکھائے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر ان کو بخش دے پس تو ہی بلاشبہ غالب حکمت والا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب اپنا جواب دے چکیں گے تب اللہ تعالیٰ یہ ارشاد فرمائے گا:

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ

اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ ایسا دن ہے کہ جس میں راستبازوں کی راستبازی ہی کام آسکتی ہے، ان ہی کے لئے بہشت ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں اور جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے

رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ ؕ اور وہ خدا سے راضی اور خدا اُن سے راضی (کا مقام اعلیٰ

ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (مائدہ پ ۷ ع ۶) پائیں گے) یہ بہت ہی بڑی کامیابی ہے۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا جواب ایک جلیل القدر پیغمبر کی عظمتِ شان کے عین مطابق ہے وہ پہلے بارگاہِ رب العزت میں عذر خواہ ہوں گے کہ یہ کیسے ممکن تھا کہ میں ایسی نامناسب بات کہتا جو قطعاً حق کے خلاف ہے "سُبْحٰنَکَ مَا یَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ" پھر پاسِ ادب کے طور پر خدا کے علمِ حقیقی کے سامنے اپنے علم کو ہیچ اور بے علمی کے مرادف ظاہر کریں گے "اِنْ کُنْتُ قُلْتُہٗ فَقَدْ عَلِمْتَہٗ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِکَ اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ" اور اس کے بعد اپنے فرض کی انجام دہی کا حال گذارش کریں گے "مَا قُلْتُ لَھُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِیْ بِہٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبَّکُمْ" اور پھر اُمت نے اس دعوتِ حق کا جواب کیا دیا؟ اس کے متعلق ظاہر امور کی شہادت کا بھی اس اسلوب کے ساتھ ذکر کریں گے جس میں ان کی شہادت خدا کی شہادت کے مقابلہ میں بے وقعت نظر آئے "وَکُنْتُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْھِمْ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْھِمْ وَاَنْتَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدٌ" اور اس کے بعد یہ جانتے ہوئے کہ اُمت میں مومنین قانتین بھی ہیں اور منکرین جاحدین بھی، وقوعِ عذاب اور طلبِ مغفرت کا اس انداز میں ذکر کریں گے جس سے ایک جانب خدا کے مقرر کردہ پاداشِ عمل کے قانون کی خلاف ورزی بھی مترشح نہ ہو اور دوسری جانب اُمت کے ساتھ رحمت و شفقت کے جذبہ کا جو تقاضا ہے وہ پورا ہو جائے۔ "اِنْ تُعَذِّبْھُمْ فَاِنَّھُمْ عِبَادُکَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَھُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ"

جب حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) عرضداشت یا جواب کے مضمون کو ختم کر چکے تو رب العالمین نے اپنے قانونِ عدل کا یہ فیصلہ سُنا دیا تاکہ مستحقِ رحمت و مغفرت کو مایوسی نہ پیدا ہو بلکہ مسرت و شادمانی سے اُن کے قلوب روشن ہو جائیں اور مستحقِ عذاب غلط توقعات قائم نہ کر سکیں قَالَ اللّٰہُ ھٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُھُمْ (الآیہ)

اِن تمام تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ آیاتِ زیر بحث کا سیاق و سباق صراحت کرتا ہے

کہ یہ واقعہ قیامت کے روز پیش آئے گا اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے ملاء اعلیٰ پر اُٹھا لیے جانے کے وقت پیش نہیں آیا۔ اس لیے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کی ابتداء "یَوۡمَ یَجۡمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ" (الآیہ) سے کرنا اور انتہاءِ واقعہ "هٰذَا یَوۡمُ یَنۡفَعُ الصّٰدِقِیۡنَ صِدۡقُهُمۡ" (الآیہ) پر ہونا روزِ قیامت کے ماسوا اور کسی دن پر صادق نہیں آسکتا اور اس ایک قطعی بات کے علاوہ دوسرے کسی احتمال کی مطلق گنجائش نہیں ہے۔

نیز یہ تفصیلات واضح کرتی ہیں کہ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) اپنی اُمت کے قبول و انکار کے حالات سے آگاہی کے باوجود آیاتِ مائدہ میں مذکور اسلوبِ بیان اس لیے اختیار فرمائیں گے کہ دوسرے انبیاء و رسل (علیہم السلام) بھی مقام کی نزاکتِ حال اور ربّ العزت کے دربار میں غایتِ پاسِ ادب کے لیے یہی اسلوبِ بیان اختیار فرمائیں گے۔

اور حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے اور انبیاء علیہم السلام کے جوابات میں اسلوبِ بیان کی یکسانیت کے باوجود اجمال و تفصیل کا فرق صرف اس لیے ہے کہ زیرِ بحث آیات میں اصل مقصود حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) اور اُن کی اُمت کے قبول و انکار اور اُن کے نتائج و ثمرات کا تذکرہ ہے اور انبیاء علیہم السلام کا ذکر صرف واقعہ کی تمہید کے طور پر ہے۔

حقیقتِ حال کے اس انکشاف کے بعد اب جمہور امتِ مسلمہ کے خلاف خلیفہ قادیانی مسٹر محمد علی لاہوری کی تحریفِ معنوی بھی قابلِ مطالعہ ہے، کہتے ہیں کہ سورۂ مائدہ میں مذکور حضرتِ عیسیٰؑ اور پروردگارِ عالم کا یہ سوال و جواب اس وقت پیش آچکا جب حضرتِ عیسیٰؑ کی نعش ملنے پر شاگردوں نے ان کا علاج کر کے چنگا کرلیا اور پھر وہ شام سے فرار ہو کر مصر اور مصر سے کشمیر پہنچے اور گمنامی کی حالت میں انتقال فرما گئے۔ مسٹر لاہوری نے اپنے دعوے میں دو دلائل پیش کئے ہیں: ایک یہ کہ عربیت کے قاعدے سے لفظ "اذ" ماضی کے لیے مستعمل ہے نہ کہ مستقبل کے لیے اور دوسری دلیل یہ کہ اگر جمہور کے عقیدہ کے مطابق حضرتِ مسیحؑ کا انتقال نہیں ہوا اور وہ قیامت کے قریب نازل ہوں گے تو ضروری ہے کہ ان کو اپنی

اُمت (نصاریٰ) کے عقیدۂ الوہیتِ مسیح اور تثلیث کا علم ہو چکا ہوگا کیونکہ نصاریٰ نے ان کے رفع کے زمانہ تک تثلیث کو نہیں اپنایا تھا اور اگر ایسا ہوتا تو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا جواب ایسے اسلوب پر نہ ہوتا جس سے اُن کی لاعلمی ظاہر ہوتی ہے۔

مسٹر لاہوری نے قرآن کی تحریفِ معنوی پر یہ اقدام یا تو اس لیے کیا کہ اپنے مرشد متنبیٔ قادیان (علیہ ما علیہ) کے دعوئے مسیحیت کو قوت پہنچائیں اور مغالطہ اور سفسطہ سے کام لے کر "خسرانِ مبین" کا سامان مہیا کریں اور یا پھر وہ قواعدِ عربیت سے اس درجہ ناواقف ہیں کہ نہ اُن کو نحو کے معمولی استعمالات ہی کا علم ہے اور نہ وہ آیاتِ قرآنی کے سیاق و سباق کا ہی کچھ درک رکھتے ہیں اور صرف جاہلانہ دعاوی پر دلیر نظر آتے ہیں۔

جن قوانینِ عربیت میں "اذ" اور "اذا" کے درمیان یہ فرق بیان کیا گیا ہے کہ "اذ" اگر فعل مستقبل پر بھی داخل ہو تب بھی "ماضی" کے معنی دیتا ہے اور "اذا" اگرچہ فعلِ ماضی پر بھی داخل ہو تب بھی مستقبل کے معنی دیا کرتا ہے، ان ہی قوانین میں علماءِ معانی و بلاغت یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی گذرے ہوئے واقعہ کو اس طرح پیش کرنے کے لئے گویا وہ زمانۂ حال میں پیش آ رہا ہے صیغہ مستقبل سے تعبیر کر لیا کرتے ہیں یعنی اس کے لیے "اذ" کا استعمال جائز رکھتے بلکہ مستحسن سمجھتے اور اس کو "استحضار" اور "حکایۃ الحال" کہتے ہیں اور اسی طرح مستقبل میں ہونے والے ایسے واقعہ کو جس کے وقوع سے متعلق یہ یقین دلانا ہو کہ وہ ضرور ہو کر رہے گا اور ناممکن ہے کہ اس کے خلاف ہو سکے اکثر ماضی کے صیغہ سے تعبیر کرنا مستحسن سمجھتے بلکہ بلاغتِ تعبیر کے لحاظ سے ضروری اور مفیدِ یقین کرتے ہیں، کیونکہ اس طرح مخاطب اور سامع کے سامنے ہونے والے واقعہ کا نقشہ اس طرح آ جاتا ہے گ یا وہ ہو گذرا ہے اور یہ بھی "استحضار" ہی کی ایک صورت سمجھی جاتی ہے، دور کیوں جائیے، لفظ "اذ" کا استعمال مستقبل کے لیے خود قرآنِ عزیز میں متعدد مقامات پر ثابت ہے:۔

سورۂ انعام میں قیامت کے دن مجرموں کی کیا کیفیت ہوگی (۱) کا نقشہ کھینچتے ہوئے

کہا گیا ہے :-

وَلَوْ تَرٰىٓ اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ	اور کاش کہ تو دیکھے جس وقت کہ وہ کھڑے کئے جائیں گے
فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ	آگ (جہنم) کے اوپر، پس کہیں گے اے کاش کہ ہم لوٹا دیے
بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ	جائیں دنیا میں اور نہ جھٹلائیں ہم اپنے رب کی نشانیوں کو
الْمُؤْمِنِيْنَ (الانعام پ ع)	اور ہو جائیں ہم ایمان والوں میں سے۔

اور اسی سورۂ انعام میں روزِ قیامت مجرموں کی حالت کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے :-

وَلَوْ تَرٰىٓ اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ	اور کاش کہ تو دیکھے، جب وہ اپنے پروردگار کے سامنے
قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ قَالُوْا	کھڑے کیے جائیں گے تو (پروردگار) کہے گا کیا یہ حق نہیں
بَلٰى وَرَبِّنَا قَالَ فَذُوْقُوا	ہے؟ وہ کہیں گے قسم ہے پروردگار کی یہ (روزِ حشر) حق
الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ	اور سچ ہے، پس پروردگار کہے گا تو چکھو اس کے بدلے میں
تَكْفُرُوْنَ (الانعام پ ع)	عذاب جو تم کفر کیا کرتے تھے۔

اور ان ہی مجرمین کی روزِ قیامت حالت کا نقشہ سورۂ سبا میں اس طرح بیان کیا گیا ہے :-

وَلَوْ تَرٰىٓ اِذْ فَزِعُوْا فَلَا فَوْتَ	اور کاش کہ تو دیکھے جبکہ وہ (منکرین) گھبرائیں گے، پس نہیں
وَاُخِذُوْا مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ	بھاگ سکیں گے اور پکڑے جائیں گے قریب سے اور
وَّقَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ (سبا پ ع)	کہیں گے ہم (اب) اس پر ایمان لے آئے۔

اور سورۂ سجدہ میں اس حقیقت کو ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے :-

وَلَوْ تَرٰىٓ اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا	اور کاش کہ تو دیکھے جبکہ مجرم اپنا سر نیچے ڈالے ہوئے
رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (السجدہ پ ع)	ہوں گے اپنے رب کے سامنے۔

یہ اور اسی قسم کے متعدد مقامات ہیں جن میں مستقبل کے واقعات کو ماضی کے ساتھ تعبیر کیا گیا اور اس لیے لفظ "اذ" کا استعمال مفید سمجھا گیا پس جس طرح ان مقامات میں "اِذْ وُقِفُوْا" "قَالَ" "قَالُوْا" "اِذْ فَزِعُوْا" "وَاُخِذُوْا" "اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا" تمام افعال لفظ "اِذْ" کے باوجود

مستقبل کے معنی دے رہے ہیں اِسی طرح "اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسٰی" کے استعمال کو مستقبل کے لیے سمجھئے اور جس طرح ان تمام مقامات کے سیاق و سباق دلالت کر رہے ہیں کہ اِن واقعات کا تعلق روزِ قیامت سے ہے ٹھیک آیاتِ مائدہ کی زیرِ بحث آیات کا سیاق و سباق صراحت کر رہا ہے کہ اس واقعہ کا تعلق قیامت کے دن سے ہے۔

قاعدۂ عربیت کی اس حقیقت افروز تحقیق کے بعد مسٹر لاہوری کی دوسری دلیل پر نظر ڈالیے تو وہ اِس سے بھی زیادہ لچر نظر آئے گی اس لیے کہ گذشتہ تحقیق سے یہ واضح ہو چکا کہ سورۂ مائدہ کی آیاتِ زیرِ بحث میں حضرتِ عیسٰی (علیہ السّلام) کا جواب ہرگز اس بات پر مبنی نہیں ہے کہ اُن کو اپنی اُمت کی گمراہی کا علم نہیں ہوگا اور وہ اپنی لاعلمی ظاہر کریں گے، ایک مرتبہ اِن آیات پر پھر غور کرو گے تو صاف نظر آئے گا کہ حضرتِ عیسٰی علیہ السّلام کا اصل جواب صرف یہ ہے "مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِیْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ" اور اوّل و آخر باقی آیات ہیں یا جواب کے مناسبِ حال تمہید ہے اور یا اللہ تعالیٰ کی جلالت و جبروت اور اپنی بیچارگی و درماندگی بلکہ عبودیت کا اظہار ہے جس میں ایک جلیل القدر پیغمبر کی شان کے مناسب حضرۃ القدس کے سامنے شہادت پیش کی گئی ہے، علاوہ ازیں اگر مسٹر لاہوری کا یہ قول صحیح مان لیں کہ حضرتِ عیسٰیؑ کے رفعِ سماوی تک نصاریٰ نے چونکہ تثلیث کا عقیدہ نہیں اختیار کیا تھا اِس لیے انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا یہ سوال کیا معنی رکھتا ہے "ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" کیا العیاذ باللہ اس کا یہ مطلب نہ ہوا کہ خدا نے عیسٰی علیہ السّلام کی اُمت پر جھوٹا الزام لگایا؟ پھر یہ کیا کم حیرت کی بات ہے کہ قادیانی اور لاہوری ایک جانب تو یہ کہہ رہے ہیں مگر اس کے قطعاً متضاد آئینۂ کمالات میں قادیانی نے یہ کہا ہے کہ جب عیسٰی علیہ السّلام کی رُوح کو یہ معلوم ہوا اور اس کو بتایا گیا کہ اس کی اُمت کس طرح شرک میں مبتلا ہو گئی تب عیسٰی علیہ السّلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی، خدایا! تو میرا مثیل نازل فرما تاکہ میری اُمت اس شرک سے

نجات پائے اور تیری سچی پرستار بنے ؎ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا۔

حقیقت یہ ہے کہ کادیانی اور لاہوری کی تفسیر کا معیار یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن کی آیات کے مطالب قرآن کی زبان سے سُننا چاہتے ہیں بلکہ پہلے سے ایک باطل عقیدہ کو عقیدہ بناتے ہیں اور پھر اس کے سانچہ میں قرآن کو ڈھالنا چاہتے ہیں اور جب قرآن اس سانچہ میں ڈھلنے سے انکار کرتا ہے تو تحریف کے حربہ سے زبردستی اس پر مشقِ ستم کرنا چاہتے ہیں، مگر وہ ایسا کرتے وقت حقیقت فراموش کر دیتے ہیں کہ قرآن اُمت کی ہدایت کے لیے رہتی دنیا تک امام الہُدیٰ ہے۔ اس لیے کوئی "ملحد و زندیق" خواہ کتنی ہی تحریفِ معنوی کی کوشش کرے ہمیشہ ناکام اور خاسر رہے گا اور خود قرآنی اطلاقات ہی اس کے عقیدہ و فکر کے بطلان کے لیے ناطق ہوں گے بلکہ بمصداق 'دروغ گو را حافظہ نباشد' وہ اکثر اپنے ہی متضاد اقوال کی بھول بُھلیّاں میں پھنس کر اپنی کذب بیانی اور تفسیری افترا پر مُہر لگا لیتا ہے جس کی تازہ شہادت ابھی سطورِ بالا میں نقل ہو چکی ہے۔

فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ

حیات و رفع مسیح (علیہ السلام) سے متعلق گذشتہ مباحث میں "توفی" کی حقیقت پر کافی روشنی پڑ چکی ہے اور سورۂ مائدہ کی آیاتِ مسطورہ بالا کی تفسیر کے بھی تمام پہلو واضح ہو چکے ہیں، تاہم قرآن کے اعجازِ بلاغت اور اسلوبِ بیان کی لطافت سے مستفید ہونے کے لیے چند سطور اس مسئلہ پر بھی سپردِ قلم کر دینا مناسب ہے کہ اس مقام پر قرآن نے عیسیٰ (علیہ السلام) کے قیامِ ارضی کو "ما دمت فیھم" سے اور کائناتِ ارضی سے انقطاعِ تعلقات کو "توفیتنی" سے کیوں تعبیر کیا۔

گذشتہ سطور میں لغت اور معانی کے حوالوں سے یہ تو ثابت ہو چکا کہ "توفی" کے حقیقی معنیٰ "اخذ و تناول" (لے لینے اور قبضہ میں کر لینے) کے ہیں اور موت کے معنی میں بطور کنایہ اس کا استعمال ہوتا ہے اور یہ کہ کنایہ میں حقیقی معنیٰ برابر ساتھ ساتھ رہتے ہیں مجاز کی طرح یہ نہیں ہوتا کہ حقیقی معنیٰ سے جدا ہو کر لفظ غیر موضوع لہٗ میں استعمال ہونے لگے، پس اگر

حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کے متعلق قرآن کا عقیدہ یہ ہوتا کہ اُن کو موت آچکی اور سوال و جواب کا یہ سلسلہ موت کے اسی وقت سے متعلق ہے نہ کہ قیامت کے دن سے تو پھر بلاغت و معانی کا تقاضا یہ تھا کہ اس موقع پر "حیات" اور "موت" ایک دوسرے کے متضاد الفاظ کو استعمال کیا جاتا تاکہ یہ حیثیت واضح ہو سکتی کہ سوال و جواب کا معاملہ "موت" کے ہم قرین ہے اور پھر لفظ "موت" کی صراحت اپنے مقابل لفظ "حیات" کی طالب ہوتی مگر قرآن نے ان دونوں الفاظ کی بجائے "مادُمتُ فِیھِمۡ" کو "حیوٰۃ" کی اور "توفیٰ" کو "موت" کی جگہ استعمال کیا ہے تو یہ کس لئے اور کس مقصد سے یا بغیر کسی حکمت و مصلحت کے یہ اسلوب اختیار کر لیا؟ جمہور اُمت تو اس کا ایک ہی جواب رکھتی ہے اور وہ یہ کہ قرآن نے دوسرے مقامات کی طرح اس مقام پر بھی اعجاز و ایجاز سے کام لیا ہے اور ان دو لفظوں میں وہ حضرتِ مسیح علیہ السلام کی زندگی، رفع، نزول اور موت تمام مراحل کو سمو دینا چاہتا ہے، وہ اگر یہ کہتا "ماحییتُ" "میں جب تک زندہ رہا" اور "فلما امتنی" "پس جب تو نے مجھ کو موت دے دی" تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کو بھی عام حالات کے مطابق دو ہی مراحل پیش آئے ہیں "زندگی" اور "موت" ان دونوں مرحلوں کے درمیان کوئی خاص صورتِ حال پیش نہیں آئی لیکن جبکہ یہ خلافِ واقعہ تھا اور اُن کی زندگی اور موت کے درمیان دو اہم مراحل پیش آچکے ہوں گے: ایک "ملاءِ اعلیٰ کی جانب بقیدِ حیات رفع" اور دوسرے کائناتِ ارضی پر دوبارہ رجوع (نزول)" اس لیے از بس ضروری ہوا کہ حیات اور موت کی جگہ دو ایسے الفاظ اختیار کیے جائیں جو ان چاروں مراحل پر صادق آسکیں اور جبکہ متعدد مقامات پر حسبِ حال ان مراحل کی تفصیل بیان ہو چکی ہے تو اعجازِ بلاغت کا یہی تقاضا ہے کہ اب انکو ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کیا جائے۔

صورتِ حال کا یہی نقشہ تھا جس کے لیے قرآنِ عزیز نے "ماحییت" کی جگہ "ما دمت فیھم" استعمال کیا تاکہ یہ جملہ اختصار کے ساتھ حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کی زندگی کے

دونوں حصوں پر حاوی ہو جائے، اس حصہ پر بھی جو ابتداءِ زندگی سے شروع ہو کر "رفع الی السماء" پر ختم ہوتا ہے اور اس حصہ پر بھی جو "نزولِ ارضی" سے شروع ہو کر "موت" پر جا کر ختم ہو جاتا ہے اور اسی طرح قرآن نے "فَلَمَّا امتنی" کا اسلوبِ بیان اختیار کیا تاکہ یہ جملہ بھی پہلے کی طرح باقی دونوں مرحلوں کو اپنے اندر سمو لے، اس مرحلہ کو بھی جو "رفع الی السماء" کی صورت میں پیش آیا اور اس مرحلہ کو بھی جو نزول کے بعد "موت" کی صورت میں نمودار ہوا کیونکہ موت سے تو صرف ایک ہی حقیقت ظاہر ہو سکتی تھی مگر "توفی" میں بیک وقت دونوں حقیقتیں موجود تھیں، حقیقی معنی کے لحاظ سے صرف "اخذ و تناول" اور کنایہ کے اعتبار سے اخذ و تناول کے ساتھ ساتھ "موت" جیسا کہ سطور بالا میں "کنایہ" اور "مجاز" کے باہمی فرق سے معلوم ہو چکا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسٰی (علیہ السلام) عرض کریں گے خدایا! جو وقت میں نے ان کے درمیان گذارا اس کے لیے تو بیشک میں شاہد ہوں لیکن "توفی" کے اوقات میں ان پر فقط تو ہی نگہبان رہا۔ باقی تیری شہادت تو ہر حالت میں ہر وقت ہر شے پر حاوی ہے مسئلہ متعلقہ کی یہ پوری بحث اس سے قطع نظر کہ نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیات کی تفسیر میں کیا ارشاد فرمایا ہے، لغت، معانی، بلاغت کے پیشِ نظر تھی ورنہ ان آیات کی تفسیر میں ایک مومن صادق کے لیے وہ صحیح مرفوع احادیث کافی ہیں جن کو محدثین نے بسندِ صحیح روایت کیا ہے۔ مثلاً مشہور محدث حافظ ابن عساکرؒ نے بروایت ابوموسٰی اشعری (رضی اللہ عنہ) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیث نقل کی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے :۔

جب قیامت کا دن ہو گا تو تمام انبیاء علیہم السلام کو اور ان کی اُمتوں کو بُلایا جائے گا اور عیسٰی علیہ السلام بھی بُلائے جائیں گے۔ اللہ تعالٰی اوّل ان کے سامنے اپنی اُن نعمتوں کو شمار کرائے گا جو دنیا میں اُن پر نازل ہوتی رہیں اور عیسٰی (علیہ السلام) ان سب کا اعتراف کریں گے اس کے بعد اللہ تعالٰی ارشاد فرمائے گا: ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ

اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ" توحضرت عیسیٰ (علیہ السلام) انکار فرمائیں گے پھر نصاریٰ بلائے جائیں گے اور ان سے سوال کیا جائے گا تو وہ دروغ بیانی کرتے ہوئے کہیں گے کہ ہاں، عیسیٰؑ نے ہم کو یہی تعلیم دی تھی، یہ سُن کر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام پر سخت خوف طاری ہو جائے گا، بدن کے بال کھڑے ہو جائیں گے اور خشیتِ الٰہی سے ان کا رُواں رُواں بارگاہِ صمدی میں سجدہ ریز ہو جائے گا اور یہ مدت ایک ہزار سال معلوم ہوگی حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نصاریٰ کے خلاف حجت قائم کردی جائیگی اور اُن کی خود ساختہ صلیب پرستی کا راز فاش کر دیا جائے گا اور پھر اُن کو جہنم میں جھونک دیے جانے کا حکم ہو جائے گا۔[1]

اور محدث ابن ابی حاتم نے حضرتِ ابوہریرۃؓ سے بسندِ صحیح یہ روایت نقل کی ہے۔ حضرتِ ابوہریرۃؓ فرماتے ہیں "کہ اللہ تعالیٰ جب قیامت کے دن عیسیٰ (علیہ السلام) سے اُن کی اُمت کے متعلق سوال کرے گا تو اپنی جانب سے عیسیٰ علیہ السلام پر جواب بھی القاء کر دے گا" اور اس القاء کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرتِ عیسیٰؑ پر القاء ہوگا کہ وہ یہ جواب دیں: "سُبْحَانَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ"[2]

اور صحیحین (بخاری ومسلم) اور سنن میں جو حدیثِ شفاعت منقول ومشہور ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح قیامت میں تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی اُمتوں سے متعلق اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہوں گے اور معاملہ کے پیش آنے سے قبل خائف وہراساں ہوں گے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام بھی ان میں سے ایک ہوں گے اور اُن پر یہ خوف طاری ہو رہا ہوگا کہ جب ان سے اُمت کی مشرکانہ بدعت پر سوال ہوگا تو وہ درگاہِ صمدی میں کس طرح اُس سے عہدہ برآ ہو سکیں گے؟

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۱ سورۂ مائدہ۔ [2] ایضاً۔

الحاصل سورۂ مائدہ کی ان آیات کی تفسیر وہی صحیح ہے جو جمہور اُمت کی جانب سے منقول ہے اور کادیانی اور لاہوری کی تفسیر بالرائے الحاد و زندقہ سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

حضرتِ مسیحؑ کی دعوتِ اصلاح اور بنی اسرائیل کے فرقے

گذشتہ مباحث میں پڑھ چکے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرتِ عیسیٰ (علیہ السلام) کو انجیل عطا کی تھی اور یہ الہامی کتاب دراصل توراۃ کا تکملہ تھی یعنی حضرتِ مسیحؑ کی تعلیمی اساس اگرچہ توراۃ ہی پر قائم تھی مگر یہود کی گمراہیوں مذہبی بغاوتوں اور سرکشیوں کی وجہ سے جن اصلاحات کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے حضرتِ مسیح علیہ السلام کی معرفت انجیل کی شکل میں ان کے سامنے پیش کر دیا تھا، حضرتِ مسیحؑ کی بعثت سے پہلے یہود کی اعتقادی اور عملی گمراہیاں اگرچہ بے شمار حد تک پہنچ چکی تھیں اور حضرتِ مسیحؑ نے مبعوث ہو کر ان سب کی اصلاح کے لیے قدم اٹھایا، تاہم چند اہم بنیادی باتیں خصوصیت کے ساتھ قابلِ اصلاح تھیں جن کی اصلاح کے لیے حضرتِ مسیح علیہ السلام بہت زیادہ سرگرمِ عمل رہے۔

(۱) یہود کی ایک جماعت کہتی تھی کہ انسان کے اعمالِ نیک و بد کی سزا اسی دنیا میں مل جاتی ہے باقی قیامت، آخرت، آخرت میں جزا و سزا، حشر و نشر، یہ سب باتیں غلط ہیں یہ "صدوقی" تھے۔

(۲) دوسری جماعت اگرچہ ان تمام چیزوں کو حق سمجھتی تھی مگر ساتھ ہی یہ یقین رکھتی تھی کہ وصول الی اللہ کے لیے ازبس ضروری ہے کہ لذاتِ دنیا اور اہلِ دنیا سے کنارہ کش ہو کر "زہادت" کی زندگی اختیار کی جائے چنانچہ وہ بستیوں سے الگ، خانقاہوں اور جھونپڑوں میں رہنا پسند کرتے تھے مگر یہ جماعت حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کی بعثت سے کچھ پہلے اپنی یہ حیثیت بھی کھو چکی تھی اور اب ترکِ دنیا کے پردہ میں دنیا کی ہر قسم کی گندگی میں آلودہ نظر آتی تھی، ظاہر رسم و طریق زاہدوں کا سا ہوتا مگر خلوت کدوں میں وہ سب کچھ نظر آتا جن سے رندانِ بادہ خوار بھی ایک مرتبہ حیا سے آنکھیں بند کر لیں، یہ "فریسی" کہلاتے تھے۔

(۳) تیسری جماعت مذہبی رسوم اور خدمت ہیکل سے متعلق تھی لیکن اُن کا بھی یہ حال تھا کہ جن رسوم اور خدمات کو لوجہ اللہ کرنا چاہیے تھا اور جن اعمال کے نیک نتائج خلوص پر مبنی تھے ان کو تجارتی کاروبار بنا لیا تھا اور جب تک ہر ایک رسم اور خدمتِ ہیکل پر بھینٹ اور نذر نہ لے لیں قدم نہ اُٹھائیں حتیٰ کہ اس مقدس کاروبار کے لیے انھوں نے توراۃ کے احکام تک میں تحریف کر دی تھی یہ "کاہن" تھے۔

(۴) چوتھی جماعت ان سب پر حاوی اور مذہب کی اجارہ دار تھی' اِس جماعت نے عوام میں آہستہ آہستہ یہ عقیدہ پیدا کر دیا تھا کہ مذہب اور دین کے اصول و اعتقادات کچھ نہیں ہیں مگر وہ جن پر وہ صاد کر دیں اُن کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دیں، احکام دین میں اضافہ یا کمی کر دیں۔ جس کو چاہیں جنت کا پروانہ لکھ دیں اور جس کو چاہیں جہنم کی سند تحریر کر دیں۔ خُدا کے یہاں اُن کا فیصلہ اٹل اور ان مٹ ہے غرض بنی اسرائیل کے "اربابًا من دون اللہ" بنے ہوئے تھے۔ اور تورات کی لفظی اور معنوی ہر قسم کی تحریف میں اِس درجہ جری تھے کہ اس کو دنیا طلبی کا مستقل سرمایہ بنا لیا تھا اور عوام و خواص کی خوشنودی کے لیے ٹھہرائی ہوئی قیمت پر احکام دین کو بدل ڈالنا ان کا مشغلۂ دینی تھا یہ "احبار" یا "فقیہ" تھے۔

یہ تھیں وہ جماعتیں اور یہ تھے اُن کے عقائد و اعمال جن کے درمیان حضرتِ مسیح (علیہ السلام) مبعوث ہوئے اور جن کی اصلاحِ حال کے لیے اُن کی بعثت ہوئی انھوں نے ہر ایک جماعت کے فاسد عقائد و اعمال کا جائزہ لیا، رحم و شفقت کے ساتھ ان کے عیوب و نقائص پر نکتہ چینی کی، ان کو اصلاحِ حال کے لیے ترغیب دی اور ان کے عقائد و افکار اور ان کے اعمال و کردار کی نجاستوں کو دور کر کے ان کا رشتہ خالقِ کائنات اور ذاتِ واحد کے ساتھ دوبارہ قائم کرنے کی سعی کی۔ مگر ان بدبختوں نے اپنے اعمالِ سیاہ کی اصلاح سے یکسر انکار کر دیا اور نہ صرف یہ بلکہ اُن کو "مسیحِ ضلالت" کہہ کر اُن کی دعوتِ حق و ارشاد کے

دشمن اور ان کے خلاف سازشیں کر کے اُن کی جان کے درپے ہو گئے۔

اناجیلِ اربعہ | حضرتِ مسیح (علیہ السلام) پر جو انجیل نازل ہوئی تھی کیا موجودہ چاروں انجیلیں وہی ہیں یا یہ حضرتِ مسیحؑ کے بعد کی تصانیف ہیں؟ اس کے متعلق تمام اہلِ علم کا جن میں نصاریٰ بھی شامل ہیں، اتفاق ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کی انجیل نہیں ہے اور نہ اس کا ترجمہ ہے لیکن پھر ان موجودہ انجیلوں کے متعلق عیسائی کیا کہتے ہیں اور ناقدین کی رائے کیا ہے۔ یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے۔

یہ بات بہرحال تسلیم شدہ ہے کہ موجودہ چاروں انجیلوں کے متعلق نصاریٰ کے پاس کوئی ایسی سند موجود نہیں جس کی بنا پر وہ یہ کہہ سکیں کہ اُن کی روایات کا سلسلہ یا ان کی ترتیب و تالیف کا زمانہ حضرتِ مسیحؑ یا اُن کے شاگردوں (حواریوں) تک پہنچتا ہے نہ اس کیلئے کوئی مذہبی سند ہے اور نہ تاریخی بلکہ اس کے خلاف خود عیسائیت کی مذہبی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ پہلی صدی عیسوی سے چوتھی صدی عیسوی کے اوائل تک عیسائیوں میں "اکیس" سے زیادہ انجیلیں الہامی یقین کی جاتی اور رائج و معمول بہا تھیں، لیکن ۳۲۵ء میں نالیسیا کی کونسل نے ان میں سے صرف چار کو منتخب کر کے باقی کو متروک قرار دیدیا اور سخت حیرت کا مقام ہے کہ کونسل کا یہ انتخاب کسی تاریخی اور علمی بُنیاد پر نہیں ہوا بلکہ ایک طرح کی فال نکالی گئی اور اس کو الہامی اشارہ تسلیم کر لیا گیا، چنانچہ ان "اکیس" سے زائد انجیلوں میں سے بعض یورپ کے قدیم کتب خانوں میں پائی گئی ہیں مثلاً انیسویں صدی میں ڈیٹیکان کے مشہور کتب خانہ سے متروک اناجیل کا ایک نسخہ برآمد ہوا تھا جس میں موجودہ چاروں انجیلوں سے بہت کچھ زائد موجود ہے، موجودہ نسخوں میں سے سینٹ لوقا کی انجیل میں خصوصیت کے ساتھ حضرتِ مسیحؑ کی پیدائش کا واقعہ تفصیل سے درج ہے لیکن سورۂ مریم میں قرآنِ عزیز نے اِس واقعہ کو جس طرح حضرتِ مریمؑ کی پیدائش اور ھیکل میں تربیت کے ذکر سے شروع کیا ہے نہ لوقا کی انجیل میں اس کا ذکر ہے اور نہ باقی تینوں انجیلوں میں،

ویٹیکان کے اس نسخہ میں یہ واقعہ ٹھیک سورۂ مریم میں مذکور واقعہ کی طرح درج ہے۔[1]

اسی طرح سولہویں صدی میں روما کے مشہور پوپ سکٹس (SKITS) کے قدیم کتب خانہ میں ایک اور متروک انجیل کا نسخہ برآمد ہوا جس کا نام انجیل برنایاہے، یہ نسخہ پوپ کے مقرب لاٹ پادری فرامرینو نے پڑھا اور پوپ کی اجازت کے بغیر کتب خانہ سے چرا لایا۔ چونکہ اس میں خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق کثرت سے واضح اور صاف بشارتیں موجود تھیں حتیٰ کہ "احمد" نام تک مذکور تھا، نیز الوہیت مسیحؑ کے خلاف عقیدہ کی تعلیم پائی جاتی تھی اس لیے وہ لاٹ پادری مسلمان ہوگیا، حال ہی میں اس کا عربی ترجمہ مصر میں علامہ سید رشید رضا مرحوم نے المنار پریس سے شائع کیا ہے جو قابلِ مطالعہ ہے، ڈاکٹر سعادہ نے اس کے مقدمہ میں جو قابلِ قدر علمی تحقیق پیش کی ہے اُس میں ہے کہ اس انجیل کا پتہ پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں اس تاریخی منشور (حکمنامہ) سے چلتا ہے جو خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عیسائیوں کے پوپ گلیسیوس کی جانب سے کلیساؤں کے نام بھیجا گیا تھا اور جس میں ان کتابوں کے نام درج تھے جن کا پڑھنا پڑھانا عیسائیوں پر حرام کیا گیا تھا ان ہی میں انجیل برنایا کا نام بھی شامل تھا۔

علاوہ ازیں محققینِ یورپ بھی آج اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کے بعد ابتدائی تین صدیوں میں ایک سو سے زائد انجیلیں پائی جاتی تھیں جو بعد میں چار کو چھوڑ کر باقی متروک کردی گئیں اور کلیسہ کے فیصلہ کے مطابق اُن کا پڑھنا حرام کردیا گیا اس لیے آہستہ آہستہ وہ سب مفقود ہوتی چلی گئیں اور کہتے ہیں کہ ان مفقود نسخوں میں ایک مشہور انجیل، انجیل ایگنٹس (انجیل اغنطسی)، بھی تھی جو اَب ناپید ہے۔

نیز یہ بات بھی خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہے کہ سینٹ پال (پولوس رسول) کے جو خطوط ہیں اور جن پر موجودہ عیسائیت کی بُنیادیں قائم ہیں اُن کے مطالعہ سے جگہ جگہ یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگوں کو خبردار کرتا اور ڈراتا ہے کہ وہ ان انجیلوں کی جانب توجہ نہ دیں جو مسیحؑ

[1] ترجمان القرآن جلد دوم۔

کے نام کی بجائے دوسرے ناموں سے منسوب ہیں کیونکہ مجھ کو روح القدس نے اسی کے لیے مامور کیا ہے کہ میں انجیلِ مسیحؑ کی حمایت کروں، اسی کو اُسوہ بناؤں اور اس کی تعلیم کو تمام عیسائی دنیا میں پھیلاؤں، چنانچہ حسب ذیل جملے اس کی صراحت کرتے ہیں کہ اس کے نزدیک مسیحؑ کی انجیل عیسائیوں میں متروک ہو چکی تھی اور بعد کی بے سند انجیلوں کا عام رواج ہو گیا تھا اور ان ہی میں سے یہ چار ہیں جو نائسیا کی کونسل نے بغیر کسی سند کے فال کے ذریعہ صحیح تسلیم کر لیں۔

اب ان چار کا حال بھی سُنیے۔ ان میں سے سب سے قدیم متّیٰ کی انجیل تسلیم کی جاتی ہے، بایں ہمہ اس کے متعلق نصاریٰ میں سے علماءِ متقدمین تو بالاتفاق اور علماءِ موجودہ میں سے اکثر اس کے قائل ہیں کہ موجودہ انجیلِ متّیٰ اصل نہیں ہے بلکہ اس کا ترجمہ ہے اس لیے کہ اصل کتاب عبرانی میں تھی جو اَب ناپید ہے اور ضائع ہو گئی لیکن یہ اصل کا ترجمہ ہے یا اس میں بھی تحریف ہوئی ہے اس کے متعلق کوئی تاریخی سند موجود نہیں حتیٰ کہ مترجِم کا نام تک معلوم نہیں اور نہ یہ پتہ کہ کس زمانہ میں یہ ترجمہ ہوا اور مشہور عیسائی عالم جرجیس زوبن الفتوحی اللبنانی نے اپنی کتاب میں تصریح کی ہے کہ متّیٰ نے اپنی انجیل بیت المقدس میں بیٹھ کر ۳۹ء میں عبرانی میں تصنیف کی تھی جیسا کہ مقدس ایرونیموس نے کہا ہے کہ اوسیبوس نے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے کہ متّیٰ کی انجیل کا یونانی ترجمہ اصل نہیں ہے اور جب بانیتوس نے یہ ارادہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان جا کر عیسائیت کی تبلیغ کرے تو اس نے متّیٰ کی انجیل کو عبرانی میں مکتوب اسکندریہ کے کتب خانۂ قیصر میں محفوظ دیکھا تھا مگر وہ نسخہ مفقود ہو گیا اور نہیں کہا جا سکتا کہ کس زمانہ میں کس شخص نے یونانی زبان میں موجودہ ترجمہ کو روشناس کرایا[1]۔

دوسری انجیل مرقس کی ہے، اس کے متعلق مشہور عیسائی عالم پطرس گوامگ اپنی

---

[1] الفارق بین المخلوق والخالق جلد اوّل ص ۲۰ ماخوذ از کتاب جرجیس زوبن لبنانی مطبوعہ بیروت۔

کتاب مروج الاخبار فی تراجم الابرار میں مرقس کی سوانح حیات پر لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ نسلاً یہودی لاوی اور پطرس حواری عیسیٰ (علیہ السلام) کا شاگرد تھا۔ رومیوں نے جب عیسائیت اختیار کرلی تو اُن کے مطالبہ پر یہ انجیل تصنیف کی یہ الوہیت مسیحؑ کا منکر تھا اور اس نے اپنی انجیل میں اس حصّہ کو بھی نہیں لیا جس میں حضرت مسیح (علیہ السلام) پطرس کی مدح کرتے ہیں، یہ ۶۸ء میں اسکندریہ کے قیدخانہ میں قتل ہوا، بت پرستوں نے اس کو قتل کردیا[1] اور عیسائی دنیا کو اِس بارے میں اختلاف ہے کہ مرقس کی انجیل کب تصنیف ہوئی چنانچہ الفارق کے مصنف مرشد الطالبین منشا کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ علماء نصاریٰ کا خیال یہ ہے کہ یہ پطرس کی نگرانی میں ۶۱ھ میں تصنیف ہوئی۔[2]

تیسری انجیل سینٹ لوقا کی انجیل ہے جس قدر اختلاف علماء نصاریٰ میں متی کی انجیل سے متعلق ہے اس سے بھی زیادہ لوقا کی انجیل کی صحت وعدم صحت کے متعلق اختلاف ہے چنانچہ الفارق کے مصنف نے اس سلسلہ میں خود علماء نصاریٰ کے ہی اقوال نقل کیے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ یہ الہامی کتاب نہیں ہے، وہ فرماتے ہیں کہ مسٹر گڈلن اپنے رسالہ الہام میں دعویٰ کرتا ہے کہ لوقا کی انجیل الہامی نہیں ہے وجہ یہ ہے کہ لوقا نے خود اپنی انجیل کی ابتداء میں یہ لکھا ہے کہ یہ (انجیل) اس نے ثاوفیلس کے ساتھ خط وکتابت کی بناء پر لکھی ہے، وہ اس کو مخاطب کرکے لکھتا ہے کہ مسیحؑ کی باتیں جن لوگوں نے آنکھوں سے دیکھی تھیں انھوں نے ہم تک جس طرح پہنچائی ہیں ان کو بہت سے لوگ ہم سے نقل کررہے ہیں اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کو خود ہی صحیح طریقہ پر جمع کردوں تاکہ تم کو صحیح حقیقت معلوم ہوجائے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نے حضرت مسیحؑ کا زمانہ نہیں پایا، اور محققین نصاریٰ یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ لوقا کی انجیل مرقس کی انجیل کے بعد وجود میں آئی ہے اور پطرس اور پولوس کے مرنے کے بعد تصنیف کی گئی ہے۔[3]

---

[1] قصص الانبیاء للنجار۔ [2] الفارق ص ۳۱۶۔ [3] قصص الانبیاء للنجار ص ۴۷۷ - ۴۷۹۔

اصل بات یہ ہے کہ لوقا انطاکیہ میں طبابت کرتا تھا، اس نے مسیحؑ کو نہیں دیکھا اور مسیحیت کو سینٹ پال (پولوس) سے سیکھا ہے اور پولوس کے متعلق یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ وہ در اصل متعصب یہودی اور عیسائیت کا بدترین دشمن تھا اور نصاریٰ کے خلاف علی الاعلان اپنی جدوجہد جاری رکھتا تھا۔ مگر جب اس نے یہ دیکھا کہ اس کی ہمہ قسم کی مخالفتوں اور رکاوٹوں کے باوجود مسیحیت کی ترقی ہوتی جارہی ہے اور رونکے نہیں رُکتی تب اس نے یہودیانہ مکروفریب سے کام لیا اور اعلان کیا کہ عجب معجزہ ہوا میں بحالتِ صحت تھا کہ ایک دَم اِس طرح زمین پر گرا جیسا کہ کوئی کُشتی میں پچھاڑ دیتا ہے' اس حالت میں حضرتِ مسیحؑ نے مجھ کو چھُوا اور پھر سخت زجر وتوبیخ کی کہ آئندہ تو ہرگز میرے پیرووں کے خلاف کوئی اقدام نہ کرنا پس میں اُسی وقت حضرتِ مسیحؑ پر ایمان لے آیا اور پھر حضرتِ مسیحؑ کے حکم سے میں مسیحی دُنیا کی خدمت کے لیے مامور ہوگیا، انھوں نے مجھ کو فرمایا کہ میں لوگوں کو مسیحؑ کی انجیل کی بشارت سُنادوں اور اس کے اتباع کی ترغیب دوں چنانچہ اس نے آہستہ آہستہ "کلیسہ" پر ایسا قبضہ کیا کہ دینِ عیسوی کی اصل صداقتوں کو مٹا کر بدعتوں اور بُرائیوں کا مجموعہ بنا دیا، الوہیتِ مسیحؑ، تثلیث و ابنیت اور کفارہ کی بدعت ایجاد کرکے مسیحیت کو وثنیت میں تبدیل کردیا اور شراب، مُردار اور خنزیر سب کو حلال بنادیا یہی وہ مسیحیت ہے پولوس کے صدقہ میں جس سے آج دنیا روشناس ہے' اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ پولوس کے شاگرد لوقا کی انجیل الہامی انجیل ہے اور جیروم کہتا ہے کہ بعض قدیم علماءِ نصاریٰ اس کے قائل ہیں کہ لوقا کی انجیل کے ابتدائی دو باب الہامی نہیں الحاقی ہیں کیونکہ یہ اس نسخہ میں موجود نہیں ہیں جو مارسیوں فرقہ کے ہاتھوں میں ہے اور مشہور نصرانی عالم اکھارن لکھتا ہے کہ لوقا کی انجیل کے باب ۲۲ آیات ۴۳-۴۴ الحاقی ہیں' وہ یہ بھی کہتا ہے کہ معجزات سے متعلق جو بیان ہے اس میں کذب بیانی اور شاعرانہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے جو غالباً کاتب کی جانب سے اضافہ ہیں لیکن اب

صدق کا کذب سے امتیاز حد درجہ دشوار ہے اور کلی ہیٹس .... لکھتا ہے کہ متی اور مرقس کی انجیلیں بہت جگہ آپس میں مخالف اور متضاد واقعات کی حامل ہیں لیکن جس معاملہ میں دونوں کا اتفاق ہو اس کو لوقا کی انجیل کے بیان پر ترجیح حاصل [1] ہے اور یہ واضح رہے کہ لوقا کی انجیل میں بیس سے زیادہ مواقع پر متی کی انجیل سے اضافہ ہے اور مرقس کی انجیل سے تو اس سے بھی کہیں زیادہ [2]۔ پس ان تمام دلائل سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ لوقا کی انجیل ہرگز الہامی نہیں ہے اور نہ کسی حواری کی تصنیف ہے۔

چوتھی انجیل یوحنا کی ہے اس کے متعلق نصاریٰ کا عام عقیدہ یہ ہے کہ یہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کے محبوب شاگرد یوحنا زبدی کی ہے، زبدی صیاد، یوحنا کے والد کا نام تھا، جلیل کے بیتِ صیدا میں ولادت ہوئی اور حواریِ عیسیٰ (علیہ السلام) کا شرف حاصل ہوا اور نصاریٰ میں مشہور بارہ حواریوں میں سے سب سے زیادہ ان ہی کو تقدیس حاصل ہے۔ جرجیس زوبیں اللبنانی لکھتا ہے کہ جس زمانہ میں شیرنیطوس اور ابیسوں اور ان کی جماعت اپنے عقیدہ کی تشہیر کر رہی تھی کہ الوہیتِ مسیح کا عقیدہ باطل ہے وہ بشر تھے اور حضرتِ مریم کے بطن سے پیدا ہوئے اور حضرتِ مریمؑ سے قبل وہ عالمِ وجود میں نہیں تھے اُس زمانہ میں ۹۶ء میں پادریوں، لاٹ پادریوں کی مجلسِ مشاورت ہوئی اور انھوں نے یوحنا کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست پیش کی کہ وہ حضرتِ مسیح کی باتیں تحریر کریں اور جو باتیں دوسری انجیلوں میں پائی جاتی ہیں ان کے ماسوا جو کچھ معلوم ہو وہ لکھیں خصوصیت سے الوہیتِ مسیح کا مسئلہ ضرور لکھیں تاکہ شیرنیطوس وغیرہ کی جماعت کے خلاف ہمارے ہاتھ مضبوط ہوں تب یوحنا اُن کی بات نہ ٹال سکے اور یہ انجیل لکھنے پر مجبور ہوئے [3]۔ مگر اس کے باوجود مسیحی علماء زمانۂ تصنیف کی تعیین میں مختلف نظر آتے ہیں، بعض کہتے ہیں ۶۵ء میں تالیف ہوئی اور بعض ۹۶ء اور بعض ۹۸ء میں تصنیف ہونا بیان کرتے ہیں۔

[1] قصص الانبیاء ص ۴۷۷۔ [2] ایضاً ص ۴۷۷۔ [3] ایضاً ص ۴۷۷۔

مگر ان کے مقابلہ میں ان مسیحی علماء کی تعداد کم نہیں ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یوحنا کی انجیل، حواری یوحنا کی تصنیف ہرگز نہیں ہے چنانچہ کیتھولک ہیرالڈ جلد ۷ میں پروفیسر لن سے منقول ہے کہ انجیلِ یوحنا از ابتدا تا انتہا مدرسہ اسکندریہ کے ایک طالب علم کی تصنیف ہے اور برٹش نیدر لکھتا ہے کہ انجیلِ یوحنا اور رسائلِ یوحنا ان میں سے کوئی ایک بھی حضرت مسیحؑ کے شاگرد یوحنا کی تصنیف نہیں ہے بلکہ کسی شخص نے دوسری صدی کے اوائل میں اس کو تصنیف کر کے اس لیے یوحنا کی جانب منسوب کر دیا تاکہ وہ لوگوں میں مقبول و مشہور بن جائے اور صاحب الفارق کہتے ہیں کہ مشہور مسیحی عالم کروٹیس کا بیان ہے کہ یہ انجیل شروع میں بیس ابواب پر مشتمل تھی بعد میں افاس کے کنیسہ نے اس میں اکیسویں باب کا اضافہ کر دیا جبکہ یوحنا کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان حوالجات سے یہ بخوبی آشکارا ہوتا ہے کہ بلاشبہ یوحنا حواری کی انجیل نہیں ہے اور صرف اس مقصد سے تصنیف کر کے یوحنا کی جانب منسوب کی گئی کہ الوہیتِ مسیحؑ کے عقیدہ کنیسہ کو قوت پہنچائی جائے اور اصلاحِ عقیدہ کی جو آواز کبھی کبھی مسیحی دنیا میں اٹھتی تھی اُس کو دبایا جائے۔

چہارگانہ اناجیل کے متعلق مسطورہ بالا مختصر تنقیدات کے علاوہ ان کے الہامی نہ ہونے کی دو واضح دلائل یہ بھی ہیں کہ ان چاروں انجیلوں میں حضرت مسیح (علیہ السلام) کی زندگی کے وقائع درج ہیں حتیٰ کہ نصاریٰ کے زعم کے مطابق ان کی گرفتاری، صلیب، قتل، مرکر جی اُٹھنے اور حواریوں پر ظاہر ہونے وغیرہ تک کے حالات بھی موجود ہیں پس اگر یہ اناجیل انجیلِ مسیحؑ یا اس کا کوئی حصہ ہوتیں تو ان میں ان باتوں کا قطعاً تذکرہ نہیں ہونا چاہیے تھا وہ واقعات تو مسیحؑ کے بعد اُن کے شاگرد جمع کرتے اور اُن کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہوتی نہ کہ وہ کتاب اللہ کہلانے کے مستحق ہوتے اور یہ کہ جس طرح ان انجیلوں کے مصنفین کے بارہ میں اختلاف ہے اسی طرح ان تصنیفات کے باہم روایاتِ واقعات میں بھی تناقض اور سخت اختلاف پایا جاتا ہے یعنی بعض معجزات و عجیب واقعات ایسے ہیں جو

ے مطبوعہ ۱۸۴۴ء ۔ ے الفارق ص ۳۴۲ - ۳۴۱ -

ایک انجیل میں پائے جاتے ہیں اور دوسری انجیل میں ان کا اشارہ تک نہیں ہے یا بعض میں ایک واقعہ جس طرح مذکور ہے دوسری میں کچھ زیادتی یا کمی کے ساتھ ایسے طریقہ پر بیان ہوا ہے کہ پہلی انجیل کے بیان میں اور اس میں صریح تضاد اور خلاف نظر آتا ہے مثلاً صلیبِ مسیح علیہ السلام کا واقعہ اناجیل میں تضادِ بیان کے ساتھ منقول ہے۔

یہ بات بھی کم حیرت کے لائق نہیں ہے کہ یہ اناجیلِ اربعہ جن جن زبانوں میں منقول ہوئی ہیں ان کی عبارات وکلمات کے بقاء و تحفظ کی کبھی پرواہ نہیں کی گئی بلکہ ایک ہی زبان کے مختلف ایڈیشنوں اور اشاعتوں میں بہ کثرت الفاظ اور جملوں کی تبدیلی، کمی اور بیشی موجود ہے خصوصاً جن مقامات پر علماءِ نصاریٰ اور علماءِ اسلام کے درمیان بشارات کے سلسلہ میں یہ بحث آگئی ہے کہ ان کا مصداق خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یا حضرتِ مسیحؑ یا کوئی اور نبی، نیز جن مقامات پر الوہیتِ مسیحؑ کی صراحت میں فرق پڑتا نظر آتا ہو اُن کو کافی تختۂ مشق بنایا جاتا رہا ہے —— اگر تحریفاتِ لفظی ومعنوی اور تضادِ بیان کی تفصیلات و تشریحات کو بہ نظرِ وسیع مطالعہ کرنا ہو تو اس کے لیے مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی اظہار الحق وحافظ ابن قیم کی ہدایۃ الحیاریٰ، باجہ جی زادہ کی الفارق بین المخلوق والخالق، اور مولانا آلِ نبی امروہی کی اظہارِ حق لائقِ دید کتابیں ہیں۔

غرض موجودہ چاروں انجیلیں الہامی انجیلیں نہیں ہیں نہ ان کے الہامی ہونے کی روایتی سند ہے اور نہ تاریخی، نہ اُن کے مصنفین کے متعلق قطعی اور یقینی علم حاصل ہے اور نہ زمانۂ تصانیف ہی متعین ہیں بلکہ اس کے خلاف پولوس کے بیانات، ان کتابوں کی تاریخی حیثیت مضامین ومطالب کا باہمی تضاد وتغیر اسی پر شاہد ہیں کہ یہ ہرگز انجیلِ مسیحؑ یا اس کا حصہ نہیں ہیں اور یہ کہ انجیلِ مسیحؑ نصاریٰ کے ہی ہاتھوں اوّل تحریفِ لفظی ومعنوی کا شکار ہوئی اور اس کے بعد مفقود ہوگئی بلکہ ان چہارگانہ انجیلوں میں سے کوئی بھی اصل نہیں ہے بلکہ یونانی اور اس سے منقول دوسری زبانوں کے تراجم ہیں جو تبدیلی وتغیر

اور نقص و ازدیاد کا برابر شکار ہوتے رہے ہیں اور صرف یہی نہیں کہ یہ اناجیلِ اربعہ انجیلِ مسیح نہیں ہیں بلکہ کسی علمی تاریخی اور مذہبی سند سے اُن کا شاگردانِ مسیح کی تصنیف ہونا بھی ثابت نہیں ہے بلکہ بعد کے مصنفین کی تصانیف ہیں البتہ ان تراجم میں مواعظ و نصائح اور مقاماتِ حکمت کے سلسلہ میں ایک حصہ ایسا ضرور ہے جو حضرت مسیح (علیہ السلام) کے ارشاداتِ عالیہ سے ماخوذ ہے اس لیے نقل میں کہیں کہیں اصل کی جھلک نظر آجاتی ہے۔

قرآن اور انجیل | قرآنِ عزیز کی بُنیادی تعلیم یہ ہے کہ جس طرح خدا ایک ہے اسی طرح اُس کی صداقت بھی ایک ہی ہے اور وہ کبھی کسی خاص قوم، خاص جماعت اور خاص گروہ کی وراثت نہیں رہی بلکہ ہر قوم اور ہر ملک میں خدا کی رشد و ہدایت، کا پیغام ایک ہی اساس و بنیاد پر قائم رہتے ہوئے اس کے سچے پیغمبروں یا ان کے نائبوں کے ذریعے ہمیشہ دنیا کے لیے راہِ مستقیم کا داعی اور منادی رہا ہے اور اسی کا نام "صراطِ مستقیم" اور "اسلام" ہے اور قرآن اِسی بھولے ہوئے سبق کو یاد دلانے آیا ہے اور یہی وہ آخری پیغام ہے جس نے تمام مذاہبِ ماضیہ کی صداقتوں کو اپنے اندر سمو کر کائناتِ ارضی کی ہدایت کا بیڑا اُٹھایا ہے اور اس لیے اب اس کا انکار گویا خدا کی تمام صداقتوں کا انکار ہے۔ اِسی بنیادی تعلیم کے پیشِ نظر اس نے حضرت مسیح علیہ السلام کی عظمتِ شان کو سراہا اور یہ اعتراف کیا کہ بلاشبہ انجیل الہامی کتاب اور خدا کی کتاب ہے لیکن ساتھ ہی جگہ جگہ یہ بھی یہ دلائل بتلایا کہ علماءِ اہلِ کتاب نے اس کی سچی تعلیم کو مٹاڈالا الابدل ڈالا اور ہر قسم کی تحریف کر کے اس کی تعلیم کو شرک و کفر کی تعلیم بنا دیا۔ مگر بعض بعض مقامات پر اہلِ کتاب کو توراۃ و انجیل کے خلاف عمل پر ملزم بناتے ہوئے موجودہ تورات و انجیل کے حوالے بھی دیتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت اصل نسخے بھی اگرچہ محرّف شکل میں ہی کیوں نہوں پائے جاتے تھے۔ بہرحال اُس وقت بھی یہ دونوں کتابیں لفظی اور معنوی دونوں قسم کی تحریفات سے اس درجہ مسخ ہو چکی تھیں کہ وہ توراتِ موسیٰ اور انجیلِ مسیح کہلانے کی مستحق نہیں رہی تھیں۔

چنانچہ قرآن نے اصل کتابوں کی عظمت اور اہلِ کتاب کے ہاتھوں اُن کی تحریف اور ان کا مسخ دونوں کو واضح طور پر بیان کیا ہے:-

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ نے تجھ پر کتاب کو اُتارا
لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ	حق کے ساتھ جو تصدیق کرنے والی ہے اُن کتابوں کی
وَالْاِنْجِيْلَ ۙ مِنْ قَبْلُ هُدًى	جو اس کے سامنے ہیں اور اتارا اس نے تورات اور انجیل
لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ؕ	کو (قرآن سے) پہلے جو ہدایت ہیں لوگوں کے لیے اور
(آل عمران پ ع)	اتارا فرقان (حق و باطل میں فرق کرنے والی)
وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ	اور سکھاتا ہے وہ کتاب کو، حکمت کو، توراۃ کو،
وَالْاِنْجِيْلَ ۚ (آل عمران پ ع)	انجیل کو۔
يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِىْۤ اِبْرٰهِيْمَ	اے اہلِ کتاب! تم کس لیے ابراہیم کے بارے میں
وَمَاۤ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ	جھگڑتے ہو اور حال یہ ہے کہ توراۃ اور انجیل کا نزول
بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (آل عمران پ ع)	نہیں ہوا، مگر ابراہیم کے بعد پس کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔
وَقَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ	اور پیچھے بھیجا ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو جو تصدیق کرنے
مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ	والا ہے اس کتاب کی جو سامنے ہے تورات اور دی ہم نے
وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ وَّ	اس کو انجیل جس میں ہدایت اور نور ہے اور جو اپنے
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى	سے پہلی کتاب تورات کی تصدیق کرتی ہے اور سراسر
وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ	ہدایت اور نصیحت ہے پرہیزگاروں کے لیے اور چاہیے
بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَاۤ	کہ اہلِ انجیل اس کے مطابق فیصلہ دیں جو ہم نے انجیل
اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۤىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝	میں اتار دیا ہے اور جو اللہ کے اتارے ہوئے قانون کے
(المائدہ، پ، ع)	موافق فیصلہ نہیں دیتا پس یہی لوگ فاسق ہیں۔
وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ	اور اگر وہ تورات اور انجیل کو قائم رکھتے

وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ (المائدہ پ ع)

(تحریف کرکے اُن کو مسخ نہ کر ڈالتے) اور اس کو قائم رکھتے جو اُن کی جانب ان کے پروردگار کی جانب سے ہوا ہے تو البتہ وہ (فارغ البالی کے ساتھ) کھاتے اپنے اُوپر سے اور اپنے نیچے سے بعض اُنہیں میانہ رو صلاح کار ہیں اور اکثر اُن کے بدعمل ہیں۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (المائدہ پ ع)

(اے محمدؐ!) کہدیجئے: اے اہلِ کتاب تمہارے لیے ٹکنے کی کوئی جگہ نہیں ہے جب تک تورات اور انجیل و اس شے کو جس کو تمہارے پروردگار نے تم پر نازل کیا قائم نہ کرو (تاکہ اس کا نتیجہ قرآن کی تصدیق نکلے)

وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ (المائدہ پ ع)

اور جب میں نے تجھ کو (اے عیسیٰؑ) سکھائی کتاب حکمت تورات اور انجیل۔

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ (الاعراف پ ع)

(نکوکار) وہ شخص ہیں جو پیروی کرتے ہیں رسول کی جو نبی اُمی ہے اور جس کا ذکر اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ (توبہ پ ع)

بلاشبہ اللہ نے خرید لیا ہے مومنوں سے ان کی جانوں اور اُن کے مالوں کو اس بات پر کہ ان کیلیے جنت ہے وہ اللہ کے راستہ میں جنگ کرتے ہیں پس قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں اُن کیلیے اللہ کا وعدہ سچا ہے جو تورات اور انجیل میں کیا گیا ہے۔

غرض یہ مدح و منقبت سے اس تورات اور انجیل کی جو تورات موسیٰ اور انجیلِ عیسیٰ کہلانے کی مستحق اور حقیقت کتاب اللہ تھیں لیکن یہود و نصاریٰ نے ان الہامی کتابوں کے ساتھ

کیا معاملہ کیا۔ اس کا حال بھی قرآن ہی کی زبان سے سنیے :۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ (بقرہ پ ع)	کیا تم توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بات مان لیں گے حالانکہ اُن میں ایک گروہ ایسا تھا جو اللہ کا کلام سُنتا تھا پھر اُس کو بدل ڈالتا تھا باوجود اس بات کے کہ وہ اُس کے مطالب کو سمجھتا تھا اور دیدہ و دانستہ تحریف کرتے تھے۔
فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝ (بقرہ پ ع)	پس افسوس اُن (مدعیانِ علم) پر جن کا شیوہ یہ ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے اور یہ سب کچھ اس لیے کرتے ہیں تاکہ اس کے معاوضہ میں ایک حقیر سی قیمت دُنیوی فائدہ کی حاصل کریں پس افسوس اس پر جو کچھ وہ لکھتے ہیں اور افسوس اس پر جو کچھ وہ اس ذریعہ سے کماتے ہیں۔
يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (المائدہ پ ع)	وہ اہلِ کتاب کتاب اللہ (تورات و انجیل) کے کلمات کو ان کے محل و مقام سے بدل ڈالتے ہیں یعنی تحریفِ لفظی اور معنوی دونوں کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ ثمنِ قلیل (معمولی پونجی) کے عوض آیات اللہ کی فروخت کرنے کے متعلق توبقرہ، آلِ عمران، نساء، توبہ میں متعدد آیات موجود ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ، تورات و انجیل کی بیع دونوں طرح کیا کرتے تھے تحریفِ لفظی کے ذریعہ بھی اور تحریفِ معنوی کے سلسلہ سے بھی۔ گویا سیم و زر کے لالچ سے عوام و خواص کی خواہشات کے مطابق کتاب اللہ کی آیات میں لفظی و معنوی تحریف اُن کے فروخت کرنے کی حیثیت رکھتی ہے جس سے بڑھ کر شقاوت و بدبختی کا دوسرا کوئی عمل نہیں اور جو ہر حالت میں موجب لعنت ہے۔

انجیل اور حواری عیسیٰ علیہ السلام

مفسرین عام طور پر حواری کو "حور" سے ماخوذ کہتے ہیں جس کے معنی کپڑے کی سپیدی کے ہیں، جب کپڑا دھل جانے کے بعد سپید ہو جاتا ہے تو اہلِ عرب کہا کرتے ہیں "حارالثوب" اس لیے دھوبی کو "حواری" کہتے ہیں اور "حواریون" اس کی جمع آتی ہے۔ اس معنی کے پیشِ نظر حضرت مسیح (علیہ السلام) کے شاگردوں کو یا اس لیے حواری کہتے ہیں کہ ان میں سے اکثر دھوبی اور مچھیرے کا پیشہ کرتے تھے اور یا اس لیے کہ جس طرح دھوبی کپڑا صاف کر دیتا ہے یہ بھی حضرت مسیح کی تعلیم سے لوگوں کے قلوب کو روشن کر دیا کرتے تھے۔ حواری کے معنی ناصر و مددگار اور ناصح کے بھی آتے ہیں اور عبدالوہاب نجار فرماتے ہیں کہ نصاریٰ حضرت مسیح کے حواریوں کو "شاگرد" کہتے ہیں یہ تعبیر بے اصل نہیں ہے بلکہ اس حقیقت پر مبنی ہے کہ یہ اصل کے اعتبار سے "حبور" عبرانی لفظ ہے جس کے معنی "شاگرد" کے ہیں اور اس کی جمع "حبوریم" آتی ہے یہی حبوریم ہے جو عربی میں جا کر حواری اور حوارین کہلایا۔

حوارینِ عیسیٰ (علیہ السلام) کا گذشتہ صفحات میں تفصیل سے ذکر آچکا ہے لیکن قرآن عزیز نے صرف "حواریون" کہہ کر مجمل تذکرہ کیا ہے، کسی کا نام مذکور نہیں ہے، انجیل نے البتہ ان کے نام بھی بتلائے ہیں اور تعداد بھی، چنانچہ متی کی انجیل کے باب ۱۰ میں بارہ نام شمار کیے ہیں اور چار انجیلوں سے خارج برنابا کی متروک انجیل کے باب ۱۴ میں بھی یہی تعداد مسطور ہے البتہ چند ناموں میں اختلاف پایا جاتا ہے نقشہ حسب ذیل ہے:۔

انجیل متی		انجیل برنابا	
شمار	نام	شمار	نام
(۱)	پطرس (سمعان)	(۱)	بطرس الصیاد (سمعان)
(۲)	اندراوس پطرس کا بھائی	(۲)	اندراوس
(۳)	یعقوب بن زبدی	(۳)	برنابا

شمار	انجیل متی — نام	شمار	انجیل برنابا — نام
(۴)	یوحنا (یعقوب کا بھائی)	(۴)	یعقوب بن زبدی
(۵)	فیلپس	(۵)	یوحنا بن زبدی
(۶)	برثولماوس	(۶)	فیلپس
(۷)	توما	(۷)	برثولماوس
(۸)	متی العشار	(۸)	تداوس
(۹)	یعقوب بن حلفی	(۹)	یعقوب بن حلفی
(۱۰)	لباوس (ملقب بہ تداوس)	(۱۰)	یہودا
(۱۱)	سمعان القانوی	(۱۱)	متی العشار
(۱۲)	یہودا اسخریوطی	(۱۲)	یہودا اسخریوطی[1]

دونوں انجیلوں کے درمیان صرف دو ناموں میں اختلاف ہے متی میں توما اور سمعان قانوی ہیں اور برنابا میں ان کی جگہ خود برنابا اور تداوس ہیں ان میں کون صحیح کہتا ہے؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے لیکن دلیل کی روشنی میں یہ کہنا بہت آسان ہے کہ کلیسہ کی کونسل نے بے دلیل اور اور بے سند صرف اس بنا پر برنابا اور اس کے رفیق تداوس کے نام منظور کر دیے کہ ان دونوں کی روایات الوہیت مسیحؑ اور کفارہ کے خلاف سچی عیسائیت پر مبنی تھیں اور یہ کلیسہ کے اس عقیدہ کے قطعاً خلاف تھیں جو سینٹ پال کی مُحرّف عیسائیت کا مقبول عقیدہ تھا اور ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ اگرچہ برنابا کا نام موجودہ عیسائیت میں حواریوں سے خارج سمجھا جاتا ہے تاہم ان رسولوں کی فہرست میں آج بھی موجود ہے جنھوں نے ملکوں میں خدائی بادشاہت کا اعلان کیا اور مسیحی دین کی دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دیا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام اور موجودہ مسیحیت | حضرت عیسٰی علیہ السلام کی تعلیم حق کا خلاصہ گذشتہ بیانات میں

[1] قصص الانبیاء للنجار۔ ص ۴۰۲۔

پسرد قلم ہو چکا ہے، وہ خدا کے سچے پیغمبر، حق و صداقت کے داعی، دینِ مبین کے ہادی و مبلغ تھے اور خدا کے تمام سچے پیغمبروں کی طرح ان کی تعلیم بھی پہلی صداقتوں کی مؤید اور وقت کی انفرادی و اجتماعی ضروریات کے انقلابات و حوادث کے مناسب حال انجیل کی شکل میں اصلاح و انقلاب کے لیے منادی تھی، توحیدِ خالص، معرفتِ کردگار کے لیے کردگار سے ہی بلاوسیلہ تقرب، محبت و شفقت، رحمت و عفو کی اخلاقی برتری اُن کی پاک تعلیم کا نچوڑ تھا، لیکن انسانی انقلابات کی ذہنی تاریخ میں اس سے زیادہ حیرت اور تعجب کی غالباً کوئی بات نہ ہوگی کہ حضرت مسیحؑ کی مقدس تعلیم ہی کے نام پر موجودہ مسیحیت، توحید کی جگہ تثلیث، معرفتِ حق کے لیے ابنیت کا عقیدہ، نجات کے لیے علم و عمل کی درستکاری کی جگہ کفارہ پر ایمان جیسی مشرکانہ اور جاہلانہ بدعات کی تبلیغ اور نشر و اشاعت میں سرگرمِ عمل ہے۔

تثلیث؛ بستانی نے دائرۃ المعارف (ENCYCLOPADIA) میں اس مسئلہ پر مسیحی نقطۂ نظر سے سیر حاصل بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عیسائی مذہب نے سب سے پہلے تثلیث کا نام رسولوں کے عہد میں سُنا، اس سے قبل مسیحیت اس عقیدہ سے قطعاً ناآشنا تھی اور رسولوں کا عہد سینٹ پال (پولوس رسول) سے شروع ہوتا ہے یہ وہی حضرت ہیں جن کی بدولت دینِ مسیحی نے نیا جنم لیا اور جن کی یہودیت نے ازرو تعصب مسیحی صداقت و توحید کے عقیدہ کو وثنیت اور شرک سے آلودہ کر کے کامیابی کا سانس لیا، یہ عقیدہ دراصل وثنی (بت پرستانہ) فلسفہ کی موشگافیوں کی پیداوار اور صنم پرستانہ عقیدہ "اوتار" کی صدائے بازگشت ہے اور اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ذات یا صفاتِ خداوندی بشکلِ انسانی کائناتِ ارضی میں وجود پذیر ہو سکتی ہے گویا یہ عقیدہ فلاسفۂ ہیلانیین اور غنوسطیین کے عقائدِ فلسفیانہ کا ایک معجونِ مرکب ہے چنانچہ تاریخ قدیم سے پتہ چلتا ہے کہ دوسری صدی عیسوی میں انطاکیہ کے بشپ (BUSHAP) تھیوفیلوس نے سب سے پہلے اس سلسلہ میں ایک یونانی کلمہ "ٹریاس" کا استعمال کیا اس کے بعد ایک دوسرے بشپ ترتلیانوس نے اس کے قریب قریب

ایک لفظ تیر ختیاس ایجاد کیا، یہی وہ یونانی لفظ ہے جو موجودہ مسیحی عقیدہ "ثالوث (تثلیث) کے مرادف اور ہم معنی ہے۔ اگر اس مسئلہ کی حقیقت کو ذرا اور گہری نظر سے دیکھنے کی کوشش کی جائے تو تاریخی حقائق سے یہ بات نمایاں نظر آئے گی کہ ثالوث کا عقیدہ دراصل مسیحیت اور وثنیت کی اس آمیزش کا نتیجہ ہے جو مسیحیت کے غلبہ اور وثنیت (بت پرستی) کی مغلوبیت کی وجہ سے پیش آیا، خصوصاً جب مصری بُت پرستوں نے اُس مذہب کو قبول کیا تو انھوں نے اس عقیدہ کو بہت ترقی دی اور فلسفیانہ دقیقہ سنجیوں کے ساتھ اس کو علمی بحث بنا دیا مسیحیت قبول کر لینے کے بعد بُت پرستوں پر جو ردِ عمل ہوا اس کے نتیجہ میں سے ایک اہم بات یہ تھی کہ اُن کی خواہش ہمیشہ یہ رہی کہ وہ کس طرح گذشتہ وثنیت کی موجودہ مسیحیت کے ساتھ مطابقت پیدا کریں؟ تاکہ اس طرح قدیم وجدید دونوں ادیان کے ساتھ ربط قائم رہ سکے، چنانچہ بقول مولانا ابو الکلام آزاد "اسکندریہ کے فلسفہ آمیز اصنامی تخیل سیراپیز (SERAPIS) سے تثلیثی وحدت کی اصل لی گئی اور ایزیز (ISIS) کی جگہ حضرت مریم (علیہا السلام) کو اور ہورس (HORS) کی حضرت مسیح کو دی گئی" اور اس یونانی اور مصری فلسفیانہ وثنیت کی بدولت موجودہ مسیحیت میں الوہیت مسیح اور تثلیث کلیسہ کا مقبول عقیدہ بن گیا۔

یہ عقیدۂ تثلیث ابھی سن طفولیت ہی میں تھا کہ علماء نصاریٰ میں اس کے ردو قبول پر معرکۃ الآراء بحثیں شروع ہو گئیں "نیقاد" کی کونسل میں مشرقی گرجاؤں میں اور خصوصی اور عمومی مجالس میں جب بحث نے طول کھینچا تو کلیسہ نے فیصلہ دیا کہ مسئلۂ ثالوث (تثلیث) حق اور اس کے خلاف "الحاد" ہے، ان ملحد جماعتوں اور فرقوں میں نمایاں فرقہ "ایونین" ہے جو کہتا ہے کہ حضرت مسیح (علیہ السلام) انسانِ محض تھے دوسرا "سابلین" ہے جس کا خیال ہے کہ خدا ذاتِ واحد ہے اور اب، ابن، روح القدس، یہ مختلف صورتیں ہیں جن کا اطلاق مختلف حیثیتوں سے ذاتِ واحد ہی پر ہوتا ہے۔ تیسرا فرقہ "آریوسین" ہے اس کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح اگرچہ "ابن اللہ" ہیں مگر اب کی طرح ازلی نہیں ہیں بلکہ کائنات بلند و پست سے قبل

"اب" کی تخلیق سے مخلوق ہوا ہے اور اس لیے وہ "اب" سے نیچے اور اس کی قدرت کے سامنے مغلوب وخاضع ہے۔ اور چوتھا فرقہ "مقدونیین" ہے، ان کا کہنا ہے کہ "اب" اور "ابن" دو ہی اقنوم ہیں "روح القدس" اقنوم نہیں ہے بلکہ مخلوق ہے۔

کلیسہ نے ان کو اور اسی قسم کے دوسرے فرقوں کو "ملحد" قرار دے کر نیقادی کی کونسل منعقدہ ۳۲۵ء اور قسطنطینیہ کی کونسل منعقدہ ۳۸۱ء کے مطابق ثالوث (تثلیث) کو مسیحی عقیدہ کی بنیاد تسلیم کیا اور فیصلہ دیا کہ "اب" اور "ابن" اور "روح القدس" تینوں جُدا جُدا مستقل اقنوم (اصل ہیں) اور عالم لاہوت میں تینوں کی وحدت ہی خدا ہے گویا اس طرح ریاضی اور علم ہندسہ کے اٹل اور ناقابلِ انکار بدیہی مسئلہ کے خلاف یا یوں کہیے کہ بداہۃً عقل کے خلاف یہ تسلیم کرلیا کہ "ایک" "تین" ہے اور "تین" "ایک" اور یہ بھی کہا کہ "ابن" ازل ہی میں "اب" سے پیدا ہوا اور "روح القدس" کا صدور بھی ازل ہی میں "اب" سے ہوا ہے اور پھر ۵۸۹ء میں طلیطلہ کونسل نے یہ ترمیم منظور کرلی کہ "روح القدس" کا صدور "اب" سے ہی نہیں بلکہ "اب" اور "ابن" دونوں سے ہوا ہے۔ اس ترمیم کو "لاطینی کلیسہ" نے تو بغیر چون وچرا تسلیم کرلیا اور اُس کو کلیسہ کا عقیدہ بنالیا لیکن "یونانی کلیسہ" اوّل تو خاموش رہا۔ مگر اس کے کچھ عرصہ کے بعد اس ترمیم کو بدعت قرار دے کر تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور اس باہمی اختلاف نے اس قدر شدید صورت اختیار کرلی کہ "یونانی کلیسہ" اور "کیتھولک لاطینی کلیسہ" کے درمیان کبھی اتفاق واتحاد پیدا نہ ہوسکا۔

ثالوث یا تثلیث کا یہ عقیدہ دینِ مسیحی کے رگ وپے میں خون کی طرح ایسا سرایت کرگیا کہ مسیحی کے بڑے فرقوں رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ کے درمیان سخت بُنیادی اختلافات کے باوجود بنیادی طور پر اس میں اتفاق ہی رہا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ حیرت ہے یہ بات کہ لوتھر کی جماعت اور اصلاح پسند کلیساؤں نے بھی ایک عرصۂ دراز تک اس کیتھولک عقیدہ کو ہی بغیر کسی اصلاح وترمیم کے عقیدہ تسلیم کرلیا۔ البتہ تیرھویں صدی

عیسوی میں فرقۂ لاہوتی کی اکثریت نے اور جدید فرقوں سوسینیائی، جرمانی، موحدین اور عمومیین وغیرہم نے اس عقیدہ کو نقل وعقل کے خلاف کہہ کر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔[1]

یہ ہے مسیحیت میں عقیدۂ تثلیث کی وہ مختصر تاریخ جس سے یہ حقیقت بخوبی آشکارا ہوجاتی ہے کہ دینِ مسیحی کی حقیقی صداقت کی تباہی کا راز اِسی الحاد اور مشرکانہ بدعت کے اندر پوشیدہ ہے جو صنم پرستانہ تخیل کا رہینِ منت ہے۔

عقیدۂ ثالوث کیا شے ہے اور اب "ابن، روح القدس" کی تعبیرات کی حقیقت کیا ہے یہ مسئلہ بھی مسیحیت کے اُن مباحث میں سے ہے جن کا فیصلہ کن جواب کبھی نہ مل سکا اور جس قدر اس کو صاف اور واضح کرنے کی کوشش کی گئی اس میں الجھاؤ اور پیچیدگی کا اضافہ ہی ہوتا گیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ جس عقیدہ کو مسیحیت میں اساسی اور بنیادی حیثیت حاصل تھی وہی معمہ بن کر رہ گیا اور قدیم وجدید علماء نصاریٰ کو یہ کہنا پڑا کہ تثلیث میں توحید ہے اور توحید میں تثلیث، یہ مذہب کا ایسا مسئلہ ہے جو دنیا میں حل نہیں ہو سکتا اور دوسرے عالم میں پہنچ کر ہی یہ عقیدہ حل ہوگا۔ اس لیے یہاں اس کو عقل سے سمجھنے کی کوشش کرنا فضول ہے بلکہ خوش عقیدگی کے ساتھ قبول کر لینا ہی نجات کی راہ ہے چنانچہ اواخرِ انیسویں صدی کے مشہور عیسائی عالم پادری فنڈر نے "میزان الحق" میں یہی بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

تاہم اس صنم پرستانہ فلسفہ کی جو تشریحات کی گئی ہیں ان کو مختصر طور پر یوں سمجھنا چاہیے کہ اس کائناتِ ہست و بود کو جس میں ہم بس رہے ہیں "عالَمِ ناسوت" کہا جاتا ہے اور طاءِ اعلیٰ کہ جس کا تعلق عالَمِ غیب سے ہے وہ اور اُس سے ماوراء جہاں نہ زمین و زماں کا گذر اور نہ مکین و مکان کا، جہاں سب کچھ ہے لیکن مادیت سے بالاتر اور وراء الوراء ہے اس کا نام "عالَمِ لاہوت" ہے تو جب زیر و بالا اور بلند و پست کچھ بھی نہ تھا اور ازل کی غیر محدود وسعت میں "وقت" ایک بے معنی لفظ تھا اُس وقت تین اقنوم[2] تھے "باپ" "بیٹا" "روح القدس" اور ان ہی تین اقانیم کی مجموعی حقیقت کا نام "خدا" ہے۔ رومن کیتھولک، پراٹسٹنٹ اور ان دونوں سے

---

[1] دائرۃ المعارف البستانی جلد ۶ ص ۳۰۵ کلمہ (ثالوث) [2] اقنوم کے معنی ہیں "اصل"

جدا کلیسۂ شرقی تینوں ہی اس پر متفق ہیں اور اسی کو دینِ مسیحیت کی روح یقین کرتے ہیں اور بڑی جسارت کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ کتابِ مقدس کی تصریحات اسی کا اعلان کرتی ہیں۔

اِس عجوبۂ روزگار عقیدہ نے اِس حد پر پہنچ کر جو نئے نئے مباحث و افکار پیدا کیے اُن کا مطالعہ کرنے سے دیدۂ حیرت اور چشمِ عبرت کے لیے بہت کچھ سامان مہیا ہو جاتا ہے، بڑی بڑی مذہبی کونسلوں، بڑے بڑے کلیساؤں کے بشپوں اور پاپاؤں نے اس عقیدہ کی تشریح میں یہ عجیب و غریب مباحث پیدا کیے کہ "اقنومِ اوّل" باپ سے کس طرح اقنومِ ثانی بیٹے کی ولادت ہوئی اور پھر باپ سے یا باپ اور بیٹے دونوں سے کس طرح اقنومِ ثالث "روح القدس" پھوٹ کر نکلی یا کس طرح اس کا صدور ہوا اور یہ کہ اُن کے باہم نسبت کیا ہے اور اُن کے جُدا جُدا کیا القاب و صفات ہیں جو ایک دوسرے کو آپس میں متمائز کرتے ہیں اور پھر جب یہ تثلیث توحید بن جاتی ہے تو اس کی صفات و القاب کی کیا صورت ہو جاتی ہے، نیز یہ کہ جس کو ہم خدا کہتے ہیں اس میں تینوں اقانیم برابر کے شریک ہیں یا کوئی ایک پورا اور دوسرے دو جزوی حصہ دار ہیں اور جزوی شرکت ہے تو کس نسبت اور تعلق سے ہے؟ غرض خدائے برتر کی مقدس اور پاک ہستی کو معاذ اللہ کمہار کے چاک پر رکھا ہوا برتن فرض کر کے جس طرح اس کو بنایا اور طیار کیا ہے اور توحیدِ خالص کو تباہ و برباد کر کے جس طرح شرک و ترکیب کا نیا سانچہ ڈھالا ہے دُنیائے مذاہب و ادیان کی تاریخ میں ایسا مذہبی تغیر و انقلاب چشمِ فلک نے کبھی دیکھا نہ سُنا ان ھٰذا الشیء عجاب۔ بہرحال "باپ" "بیٹا" "روح القدس" کی جُدا جُدا تفصیلات و تشریحات اور پھر وحدت سے ترکیب اور ترکیب سے وحدت کی عجوبہ زا تعبیرات کی ایک بھول بھلیاں ہے جس کا کہیں اور چھور نظر ہی نہیں آتا اور جب کہنے والا ہی لفظی تعبیرات کے علاوہ "حقیقت" سمجھنے سے عاری ہے تو سُننے والا کیا خاک سمجھ سکتا ہے۔

باپ اقانیم ثلاثہ میں "اب" پہلا اقنوم ہے۔ اِسی سے اقنومِ ثانی کی ولادت ہوئی اور عالمِ لاہوت میں یہ کبھی بھی دوسرے اور تیسرے اقانیم سے جُدا نہیں ہوتا، مگر مسیحی فرقوں میں کنیسہ

کی عام تعلیم کے مطابق اکثر فرقے یہ کہتے ہیں کہ وحدتِ لاہوت میں تینوں کا درجہ مساوی ہے اور کسی کو کسی پر برتری حاصل نہیں ہے اور آریوسی کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ دوسرا اقنوم "بیٹا" اقنومِ اول کی طرح ازلی نہیں ہے البتہ عالمِ بالا و پست سے غیر معلوم مدت پہلے اقنومِ اول سے پیدا ہوا ہے اس لیے اس کا درجہ "باپ" کے بعد اور اس سے کم ہے اور مقدونی فرقہ کہتا ہے کہ صرف دو ہی اقنوم ہیں "باپ" اور "بیٹا" اور "روح القدس" مخلوق ہے اور فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے جس کا پایہ تمام ملائکۃ اللہ سے بلند ہے اور طلیطلہ کی کونسل کا فیصلہ یہ ہے کہ روح القدس "باپ" اور "بیٹا" دونوں سے پھوٹ کر نکلی ہے یا دونوں سے ہی اس کا صدور ہوا ہے مگر قسطنطنیہ کی کونسل روح القدس کو صرف باپ ہی سے صادر ہونا بتلاتی ہے اور قدیم و جدید فرقوں میں سے ایک بڑی جماعت اقنومِ ثالث مریم (علیہا السلام) کو تسلیم کرتی اور روح القدس کے اقنوم ہونے کا انکار کرتی ہے۔

بیٹا | عربی میں "ابن" فرنچ میں "فی" —— اور انگریزی میں سن (SON) اور اردو میں "بیٹا" کہتے ہیں، یہ اس شکلِ انسانی پر بولا جاتا ہے جو عام قانونِ قدرت کے مطابق مرد و عورت کے جنسی تعلقات کا نتیجہ ہوتا ہے مگر عقیدۂ ثالوث کے مطابق وہ عالمِ لاہوت میں "باپ" سے جدا بھی نہیں ہے اور پیدا بھی ہے اور پھر بعض کے نزدیک اس کی پیدائش ازلی ہے اور بعض کے نزدیک غیر ازلی، آگے چل کر کہتے ہیں کہ جب "باپ" کی مشیت کا فیصلہ ہوا تو اقنومِ ثانی "بیٹا" عالمِ ناسوت (کائناتِ ہست و بود) میں مریم کے بطن سے پیدا ہو کر "مسیح" کہلایا اور بعض کا تو یہ دعویٰ ہے کہ خود باپ ہی عالمِ ناسوت میں بیٹا بن کر مریم کے بطن سے تولد ہوا اور مسیح کی شکل میں روشناس ہوا اور طرفہ تماشا یہ کہ بعض کے نزدیک تو اقنومِ ثانی "ابن" کو اقنومِ اول "اب" پر برتری اور تفوق حاصل ہے۔

روح القدس | اسی طرح "روح القدس" کے متعلق بھی سخت اختلاف ہے: کوئی کہتا ہے کہ وہ اقنوم ہی نہیں ہے اس لیے عالمِ لاہوت میں اس کو الوہیت حاصل نہیں ہے چنانچہ

مکدونی اور آریوسی کہتے ہیں کہ وہ ملائکۃ اللہ میں سے ہے اور اُن میں سب سے برتر و بلند ہے اور مار اثو ینوس کہتا ہے کہ رُوح القدس کی تعبیر مجاز ہے اور اللہ تعالیٰ کے افعال پر مجازاً اس کا اطلاق کیا جاتا ہے ورنہ الگ سے کوئی حقیقت نہیں ہے، اس بنا پر اس قول کے قائلین کو "مجازئین" کہا جاتا ہے اور علماء جدید میں کلارک کہتا ہے کہ الہامی کتابوں عہد نامۂ قدیم و جدید میں کسی ایک جگہ بھی "الوہیت" کا درجہ نہیں دیا گیا، فرقۂ مکدونی نے الوہیت روح القدس کا انکار کرتے ہوئے شد و مد سے یہ کہا ہے کہ اگر جوہرِ الوہیت میں رُوح القدس کو بھی دخل ہوتا تو یا وہ مولود ہوتی یا غیر مولود، اگر مولود ہے تو اس کے اور "ابن" کے درمیان کیا فرق رہا اور اگر غیر مولود ہے تو اس کے اور "اب" کے درمیان کیا امتیاز ہے۔

ان کے مقابلہ میں دوسری جماعتیں کہتی ہیں کہ "روح القدس" کو بھی الوہیت حاصل ہے۔ بوسیو رومانی کہتا ہے کہ روح القدس کا صدور "اب" اور "ابن" دونوں سے ہوا اور وہ اُنکے جوہرِ نفس سے ہے اور دونوں کے ساتھ وحدتِ لاہوت میں "الٰہ" ہے اور اثناسیوس کہتا ہے کہ روح القدس کی الوہیت ناقابلِ انکار ہے اور کتبِ سماویہ میں روح پر "الٰہ" کا اور "الٰہ" پر "روح" کا اطلاق ثابت و مُسلّم ہے اور اس کی جانب ان ہی اُمور کی نسبت کی گئی ہے جن کا تعلق ذاتِ خدا کے ماسوا اور کسی سے نہیں ہے مثلاً تقدیسِ ذات، معرفتِ جمیع حقائق وغیرہ اور یہ عقیدہ قدیم سے چلا آتا ہے جیسا کہ نظم دسو بجیا سے ثابت ہے جس کی قدامتِ تالیف سب کے نزدیک مُسلّم ہے اس میں اُلوہیتِ رُوح القدس کا اعتراف موجود ہے اور موٹ لغیلو پیٹرس نے انکارِ الوہیتِ روح پر تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ نصاریٰ کے نزدیک خدائے حقیقی کی توحید کا تثلیث میں مُضمر ہونا ایک مُسلّم حقیقت ہے پھر رُوح کو الوہیت سے خارج کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا اور مکدونیوں کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے مار اثناسیوس کہتا ہے کہ کتبِ سماوی میں روح کو ابن نہیں کہا گیا بلکہ روح الاب

اور روح الابن کے اطلاقات پائے جاتے ہیں لہٰذا اس کو "ابن" یا "اَب" کہنا صحیح نہیں اور نہ اس کو الوہیت سے نکال کر مخلوق کہنا درست ہو سکتا ہے اور ادراکِ بشری عاجز ہے کہ ان فلسفیانہ بحثوں سے "روح القدس" کی حقیقت تک پہنچ سکے البتہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فقط تولید (پیدا ہونا) ہی تنہا ایسا واسطہ نہیں ہے جو "اَب" کے ساتھ قائم ہو بلکہ انبثاق (صدور یا پھوٹ نکلنا) بھی ایک شکل ہو سکتی ہے مگر ہم اس دنیا میں تولید و انبثاق کے درمیان فرق ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہیں البتہ یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ تولید و انبثاق دونوں کا "اَب" کے ساتھ ازلی و ابدی اور تلازم کا تعلق ہے پس ہمارے لیے یہ ہرگز مناسب نہیں ہے کہ فلاسفۂ قدیم (فلاسفۂ یونان) کی طرح "روح القدس" اور "اب" کے درمیان فلسفیانہ موشگافیوں کے ذریعہ وہ اعتقادات قبول کر لیں جو انھوں نے خدا سے صدورِ ارواح کے متعلق پیدا کر لیے ہیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ وہ اختلافات بھی پیشِ نظر رہنے چاہئیں جو گذشتہ سطور میں بیان ہو چکے ہیں کہ بعض کلیسہ "روح القدس" کا فقط اقنومِ اوّل (باپ) سے صادر ہونا مانتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ "باپ" اور "بیٹا" دونوں سے اس کا صدور ہوا ہے یہ اختلاف بھی عیسائی فرقوں کے درمیان سخت کشاکش کا سبب رہا ہے کیونکہ ۳۸۱ء میں منعقدہ کونسل قسطنطنیہ نے "منشورِ ایمانی" میں یہ واضح کر دیا تھا کہ روح القدس کا صدور "باپ" ہی سے ہوا ہے اور عرصہ تک یہی عقیدہ مسیحی دنیا میں نافذ رہا لیکن ۴۴۷ء میں اوّل ہسپانیہ کے کلیسہ نے پھر فرانس کے کلیسہ نے اور اس کے بعد تمام لاطینی رومن کلیساؤں نے اس ترمیم کو جزوِ عقیدہ بنایا کہ "روح القدس" کا صدور اقنومِ اوّل (باپ) اور اقنومِ ثانی "بیٹا" دونوں سے ہوا ہے، عیسائی علماء کہتے ہیں کہ دراصل یہ بحث ۸۶۶ء میں سب سے پہلے شرق کے بطریق فوتیوس نے اس لیے پیدا کی کہ اس کی اور اس کی جماعت کی یہ خواہش تھی کہ کسی طرح شرق (یونان) کے کلیسہ کو غرب (روم) کے کلیسہ سے جدا کر دیا جائے اور مشرق و

مغرب کے کلیساؤں کا اتحاد باقی نہ رہنے دیا جائے اسی خیال کی تائید و تقویت کے لیے ۱۰۴۳ء میں بطریق میخائیل کرولاریوس نے اس عقیدہ کو بہت جلد شائع کیا اور آخر کار صدیوں تک اِن اختلافات نے کلیسہ ہائے مشرق و مغرب کے درمیان مخالفانہ کش مکش کو قائم رکھا اور دونوں کلیسہ ایک دوسرے پر یہ الزام قائم کرتے رہے کہ مخالف کلیسہ نے مسیحیت میں الحاد و بدعت کی آمیزش کرکے حقیقی مذہب کو مٹا ڈالا ہے اور رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ کی بالعموم اور کلیساؤں کے مختلف فرقوں کی بالخصوص کش مکش کا یہ سلسلہ اُس وقت تو انتہائی شدت اختیار کر چکا تھا اور باہم ہولناک خونریزیوں اور بہیانہ مظالم کا جہنم بن چکا تھا جبکہ اسلام اعتقادات کی سادگی اعمالِ صالحہ کی پاکیزگی اور اپنی علمی و عملی روحانیت کی شگفتگی کی بدولت "امنِ عام" اور "رحمت" کا نیّرِ درخشاں بنا ہوا تھا۔

ازمنۂ مظلمہ اور اصلاحِ کنیسہ کی آواز

یہ وہ زمانہ تھا جب عیسائیوں کے مذہبی کلیسہ معمولی معمولی اختلافات کی بنا پر پوپ کی حکومت اور پیروانِ پوپ کی حکومتوں کے ذریعہ ایک دوسری جماعت کو گردن زدنی اور کشتنی قرار دیتی اور ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کو وحشتناک عذابوں میں مبتلا کرکے قتل کر دیا کرتی تھیں اِسی بناء پر مؤرخین تاریخ کے اس دور کو ازمنۂ مظلمہ (زمانہائے تاریک) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

قرآن نے حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کے متعلق جس حقیقت اور صداقت کا اظہار کیا تھا پوپ اور کلیسا سے مرعوبیت نے اگرچہ ایک مدتِ مدید تک عیسائیوں کو اس طرف متوجہ نہیں ہونے دیا۔ مگر پھر بھی یہ صدائے حق اثر کیے بغیر نہ رہ سکی، اس کی تفاصیل اگرچہ خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں مذکور ہوں گی لیکن یہاں صرف اس قدر اشارہ کرنا مقصود ہے کہ رومن کیتھولک، پراٹسٹنٹ اور دوسرے فرقوں نے بغیر کسی جھجک کے سینٹ پال کی تحریف (تثلیث) مسیحیت کا بُنیادی عقیدہ تسلیم کر لیا تھا اور اگرچہ بعض چھوٹی چھوٹی جماعتوں یا افراد نے کبھی کبھی اس کے خلاف آواز اُٹھائی۔ مگر وہ آواز

دَب کر رہ گئی اور نقار خانہ میں طوطی کی صدا سے زیادہ اس کی حیثیت نہ بن سکی مثلاً ۳۲۵ء اور ۳۸۱ء میں جب نیقادی کونسل اور قسطنطنیہ کونسل نے تثلیث کو دینِ مسیحی کی بنیاد قرار دیا اس وقت ایوئین نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ حضرتِ مسیحؑ صرف انسان ہیں اور الوہیت کا اُن سے کوئی علاقہ نہیں اور سابلیئین کہتے تھے کہ اقانیم ثلاثہ، تین مختلف جوہر نہیں ہیں بلکہ وحدتِ لاہوتی کی مختلف صورتیں اور تعبیریں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ صرف اپنی ذاتِ واحد کے لئے اطلاق کرتا ہے تاہم اس وقت تک چونکہ پوپ اور کلیسہ کے فیصلے خدائی فیصلے سمجھے جاتے تھے اور بشپ اور پاپا "ارباباً من دون اللہ" یقین کیے جاتے تھے اس لیے ان اصلاحی آوازوں کو "الحاد" کہہ کر دبا دیا گیا۔ مگر جب صلیبی جنگوں نے عیسائیوں کو مسلمانوں کے اتنے قریب کر دیا کہ انھوں نے اسلام کے اعتقادی اور عملی نظام کا بہت کچھ نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اسلام سے متعلق بَطارِقہ (BATARIQA) بَساقِفہ (BISHAQIFA) کی غلط بیانی اور بہتان اُن پر ظاہر ہونے لگی تب اُن میں بھی آزادیٔ فکر نے کروٹ لی اور کورانہ تقلید کو شکست و ریخت کرنے کا جذبہ پیدا ہوا چنانچہ لوتھر کی آواز پہلی صدائے حق تھی جس نے جرأت کے ساتھ "ارباباً من دون اللہ" کے بُتوں کو ماننے سے انکار کر دیا اور پوپ کے مقابلہ میں کتابِ مقدس کی پیروی کی دعوت دی مگر آپ کو تعجب ہوگا یہ سُن کر کہ پوپ کی جانب سے لوتھر کے خلاف جو الحاد اور بددینی کے الزامات لگائے گئے تھے اُن میں سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ یہ در پردہ مسلمان ہوگیا ہے اور پاپا کے خلاف اس کی صدا قرآن کی صدائے بازگشت ہے۔

بہرحال یہی وہ صدائے اصلاح تھی جو بلاشبہ اسلام کی دعوت تفکر و تعقل سے متاثر ہو کر آہستہ آہستہ "اصلاحِ کنیسہ" کے نام سے مسیحی دنیا میں گونج اٹھی اور آگ کی طرح ہر طرف اس کے شعلے نظر آنے لگے ان ہی اصلاحات میں سے ایک اہم اصلاحی تخیل یہ بھی تھا کہ عقیدۂ ثالوث کتابِ مقدس (عہد نامۂ جدید) کے قطعاً خلاف ہے چنانچہ تیرھویں صدی

عیسوی ہیں قدیم لاہوتی فرقہ کے جمہور نے نسطوری فرقہ کے جماعتی فیصلہ نے اور جدید جماعتوں میں سے سوسینانیں ـــــ جرمانیں ـــــ موحدین ـــــ اور عمومیین اور دوسری جماعتوں نے تعلیمِ کلیسا کے خلاف مذہبی بغاوت کرتے ہوئے صاف کہدیا کہ تثلیث کا عقیدہ نقل وعقل دونوں کے خلاف اور ناقابلِ تسلیم ہے اور اگرچہ قومی ومذہبی عصبیت نے ان کو اسلامی عقیدہ کا پیرو ہونے سے باز رکھا تاہم انھوں نے عقیدۂ تثلیث کی مختلف شکلوں کے ساتھ ایسی تعبیرات کرنی شروع کردیں جس سے عقیدۂ ثالوث باطل ہو کر توحیدِ الٰہی کے پاک اور مقدس جراثیم پیدا ہونے لگے مثلاً سوئڈنبرگ نے کہا:۔

"اقانیمِ ثلاثہ "باپ" "بیٹا" "روح القدس" کا تعلق حضرت مسیحؑ کی ذات کے ماسوا ذاتِ احدیت سے نہیں ہے یعنی مسیحؑ کی ذات اپنی طبع لاہوتی کے پیشِ نظر "باپ" ہے اور عالمِ ناسوت میں انسانی شکل کی تقیید کی وجہ سے "بیٹا" اور "اقنومِ ثانی ہے اور اس حیثیت سے کہ روح القدس کا صدور اس سے ہوا ہے وہ اقنومِ ثالث "روح" ہے غرض "ثالوث" کا تعلق صرف حضرتِ مسیحؑ سے ہے اور کانٹ (CANT) کہتا ہے کہ عقیدۂ ثالوث کے یہ معنی نہیں ہیں کہ "باپ" "بیٹا" "روح القدس" بلکہ یہ عالمِ لاہوت میں خدائے برتر کی تین بنیادی صفات کی جانب اشارہ ہے جو باقی تمام صفات کے لیے مصدر اور منبع کی حیثیت رکھتی ہیں اور وہ "قدرت" (اب) حکمت (ابن) اور "محبت" (روح) ہیں یا اللہ کے ان تین افعال کی جانب اشارہ ہے جو "خلق" "حفظ" اور "ضبط" کے نام سے بھی تعبیر کیے جاتے ہیں اور ہیکن اور شیلنگ نے اس خیال کی کافی اشاعت کی کہ عقیدۂ ثالوث حقائق کی طرح کوئی حقیقت نہیں ہے بلکہ ایک تخییلی نظریہ ہے، ان کی مُراد یہ ہے کہ جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے خدائے برتر کی ذاتِ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے اور مسیح علیہ السلام، مخلوقِ خدا، لیکن عام خیال وتصور میں جب ہم لاہوتی عالم کی جانب پرواز کرتے ہیں تو ہمارا خیال اس عالم میں خدا، مسیحؑ اور روح القدس کو "اب" "ابن" اور "روح" کی تعبیرات دیتا اور ان کے باہم تعلق کو اقانیمِ ثلاثہ کی حیثیت میں دیکھتا ہے۔

"عقلیین" "لوتھرین" اور "موحدین" اور "جرمانیین" کے علاوہ بھی بہت لوگ ہیں جو نثالیین کے عقیدہ کو اختیار کر کے ایک بڑی جماعت کی شکل اختیار کر رہے ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یورپ کی نشاۃِ جدیدہ میں بھی عام طور پر تمام کلیساؤں کا ثالوث (تثلیث) پر ہی عقیدہ ہے اور ان کے نزدیک اس کلمہ کی تعبیر وہی ہے جو چوتھی صدی عیسوی میں متعدد مذہبی کونسلوں نے کی اور جو بلاشبہ شرکِ جلی اور توحید کے یکسر منافی ہے۔

قرآن اور عقیدۂ تثلیث | نزولِ قرآن کے وقت جمہورِ مسیحی جن بڑے فرقوں میں تقسیم تھے ثالوث کے متعلق ان کا عقیدہ تین جُدا جُدا اصولوں پر مبنی تھا، ایک فرقہ کہتا تھا کہ مسیح عینِ خدا ہے اور خدا ہی بشکلِ مسیح دنیا میں اُتر آیا ہے اور دوسرا فرقہ کہتا ہے کہ مسیح ابن اللہ (خدا کا بیٹا ہے) اور تیسرا کہتا تھا کہ وحدت کا راز تین میں پوشیدہ ہے۔ باپ، بیٹا، مریم اور اس جماعت میں بھی دو گروہ تھے اور دوسرا گروہ حضرتِ مریمؑ کی جگہ "روح القدس" کو اقنومِ ثالث کہتا تھا غرض وہ حضرتِ مسیحؑ کو ثالثِ ثلاثہ (تین میں کا تیسرا) تسلیم کرتے تھے اس لیے قرآن کی صدائے حق نے تینوں جماعتوں کو جُدا جُدا بھی مخاطب کیا ہے اور یکجا بھی اور دلائل و براہین کی روشنی میں مسیحی دنیا پر یہ واضح کیا ہے کہ اس بارہ میں راہِ حق ایک اور صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ مسیح مریمؑ کے بطن سے پیدا شدہ انسان اور خدا کا سچا پیغمبر اور رسول ہے باقی جو کچھ بھی کہا جاتا ہے وہ باطل محض ہے ——— خواہ اس میں تفریط ہو جیسا کہ یہود کا عقیدہ ہے کہ العیاذ باللہ وہ شعبدہ باز اور مفتری تھے یا افراط ہو جیسا کہ نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ وہ خدا ہیں اور خدا کے بیٹے ہیں یا تین میں کے تیسرے ہیں۔

قرآنِ عزیز نے صرف یہی نہیں کیا کہ نصاریٰ کے تردیدی پہلو کو ہی اس سلسلہ میں واضح کیا ہو بلکہ اس کے علاوہ حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کی شانِ رفیع کی اصل حقیقت کیا ہے اور عند اللہ ان کو کیا قربت حاصل ہے اس پر بھی نمایاں روشنی ڈالی ہے تاکہ اس طرح

یہود کے عقیدہ کی بھی تردید ہو جائے اور افراط و تفریط سے جُدا راہِ حق آشکار النظر آنے لگے۔

حضرت مسیحؑ خدا کے مقرب اور برگزیدہ رسول ہیں

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۝ وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَادُمْتُ حَیًّا ۝ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ۝ وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا (مریم پ ع)

مسیحؑ نے کہا "بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس نے مجھ کو نبی بنایا ہے اور مجھ کو مُبارک ٹھہرایا جہاں بھی میں رہوں اور اس نے مجھ کو نماز کی اور زکوٰۃ کی وصیت فرمائی جب تک بھی زندہ رہوں اور اس نے مجھ کو میری والدہ کے لیے نکوکار بنایا اور مجھ کو سخت گیر اور بدبخت نہیں بنایا مجھ پر سلامتی ہو جب میں پیدا ہوا جب میں مرجاؤں اور جب حشر کے لیے زندہ اٹھایا جاؤں۔

اِنْ ھُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَیْہِ وَجَعَلْنٰہُ مَثَلًا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۝ وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْکُمْ مَّلٰٓئِکَۃً فِی الْاَرْضِ یَخْلُفُوْنَ ۝ وَاِنَّہٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَۃِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِھَا وَاتَّبِعُوْنِ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ (زخرف پ ع)

وہ (مسیحؑ) نہیں ہے مگر ایسا بندہ جس پر ہم نے انعام کیا اور ہم نے اس کو مثال بنایا ہے بنی اسرائیل کے لئے، اور اگر ہم چاہتے تو کر دیتے ہم تم میں سے فرشتے زمین میں چلنے پھرنے والے اور بلاشبہ وہ (مسیحؑ) نشان ہے قیامت کے لیے پس اس بات پر تم شک نہ کرو اور میری پیروی کرو۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔

وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىۃِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُہٗٓ اَحْمَدُ ([illegible] پ ع)

اور (وہ وقت یاد کرو) جب عیسیٰؑ بن مریمؑ نے کہا اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری جانب اللہ کا رسول ہوں تصدیق کرنیوالا ہوں جو میرے سامنے ہے توراۃ اور بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہے

حضرت مسیحؑ نہ خدا ہیں نہ خدا کے بیٹے!

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُهْلِكَ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ (المائدہ پ ع)

"بلا شبہ ان لوگوں نے کفر اختیار کر لیا جنھوں نے یہ کہا "بیشک اللہ وہی مسیح بن مریم ہے" کہہ دیجیے کہ اگر اللہ یہ ارادہ کرلے کہ مسیح بن مریم مریمؑ اور کائناتِ زمینی پر جو کچھ بھی ہے سب کو ہلاک کر ڈالے تو کون شخص ہے جو اللہ سے (اس کے خلاف) کسی شے کے مالک ہونے کا دعویٰ کر سکے اور اللہ کے لیے ہی بادشاہت ہے آسمانوں کی اور زمین کی وہ جو چاہتا ہے اس کو پیدا کر سکتا ہے اور اللہ ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَقَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ النَّارُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ۝ (المائدہ پ ع)

بلا شبہ ان لوگوں نے کفر اختیار کیا جنھوں نے کہا بلا شبہ اللہ وہی مسیح بن مریم ہے۔ حالانکہ مسیحؑ نے یہ کہا: اے بنی اسرائیل اللہ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے بیشک جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے پس یقیناً اللہ نے اس پر جنت کو حرام کر دیا ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مدد نہیں ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا سُبْحَانَهُ بَلْ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلٌّ لَهُ قَانِتُونَ ۝ (بقرہ پ ع)

اور انھوں نے کہا: اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے وہ ذات تو ان باتوں سے پاک ہے بلکہ (اس کے خلاف) اللہ کے لیے ہی ہے جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے ہر شے اللہ کے لیے تابعدار ہے۔

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ

بلا شبہ عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی

اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۔ (آل عمران پ ۳ ع ۶)

کہ اس کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر اس کو کہا ہو جا تو وہ ہو گیا۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِىْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ؗ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۔ (النساء ۔ پ ۶ ع ۳)

اے اہل کتاب اپنے دینی معاملہ میں حد سے نہ گذرو اور اللہ کے بارے میں حق کے ماسوا کچھ نہ کہو بلاشبہ مسیح ابن مریم اللہ کے رسول ہیں اور اس کا کلمہ ہیں جس کو اس نے مریم پر ڈالا (یعنی بغیر باپ کے اس کے حکم سے مریم کے بطن میں وجود پذیر ہوئے) اور اس کی روح ہیں پس اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور تین (اقانیم) نہ کہو اس سے باز آجاؤ تمہارے لیے بہتر ہوگا بلاشبہ اللہ خدائے واحد ہے پاک ہے اس سے کہ اس کا بیٹا ہو، اسی کے لیے ہے (بلاشرکت غیرے) جو کچھ بھی ہے آسمانوں اور زمین میں اور کافی ہے اللہ "وکیل" ہو کر۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَىْءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ۔ (انعام پ ۷ ع ۱۹)

وہ (خدا) موجد ہے آسمانوں اور زمین کا اس کے لیے بیٹا کیسے ہو سکتا ہے اور نہ اس کے بیوی ہے اور اس نے کائنات کی ہر شئے کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر شئے کا جاننے والا ہے۔

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ (المائدہ ۔ پ ۶ ع ۱۰)

مسیح بن مریم نہیں ہیں مگر خدا کے رسول بلاشبہ ان سے پہلے رسول گذر چکے ہیں اور ان کی والدہ صدیقہ ہیں، یہ دونوں کھانے کھاتے تھے، (یعنی دوسرے انسانوں کی طرح کھانے پینے وغیرہ امور میں وہ بھی محتاج تھے۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ	ہرگز مسیح اس سے ناگواری نہیں اختیار کریگا کہ وہ
يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ	اللہ کا بندہ کہلائے اور نہ مقرب فرشتے حتی کہ روح القدس
الْمُقَرَّبُوْنَ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ	"جبرئیل" ناک بھوئیں چڑھائیں گے۔ اور جو عبادت سے
عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ	ناگواری کا اظہار کرے اور غرور اختیار کرے تو قریب
فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا	ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی جانب اکٹھا کرے گا
(النساء پ ع)	یعنی جزا و سزا کے دن سب حقیقت حال کھل جائے گی۔
وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ	اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے اور
وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ	نصاریٰ کہتے ہیں مسیح خدا کا بیٹا ہے۔ یہ اُن کے
ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُوْنَ	مُنہ کی باتیں ہیں ریس کرنے لگے اگلے کافروں کی
قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ قَاتَلَهُمُ	بات کی اللہ ان کو ہلاک کرے کہاں سے پھرے
اللّٰهُ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ۔ (توبہ پ ع)	جاتے ہیں۔
قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ	اے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجیے اللہ کیتا ہے
لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۚ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ	اللہ بے نیاز ہستی ہے، نہ کسی کا باپ ہے، اور نہ کسی کا
كُفُوًا اَحَدٌ ۚ (اخلاص)	بیٹا اور کائنات میں کوئی اُس کا ہمسر نہیں ہے۔

قرآن نے اِس سلسلہ میں اپنی صداقت اور اصلاحِ عقائد و اعمال کا جو مُدلّل اور واضح اعلان کیا اس کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ موجودہ کتابِ مقدس کے مُحرّف اور مسخ کر دیے جانے کے باوجود جس شکل و صورت میں آج موجود ہے وہ کسی ایک مقام پر بھی "ثالوث" کے اس عقیدہ کا پتہ نہیں دیتی جس کی تفصیلات و تشریحات ابھی سطورِ بالا میں علماءِ نصاریٰ، مذہبی کونسلوں اور کلیساؤں سے نقل ہو چکی ہیں اور بجز تعبیر کے جگہ جگہ حضرتِ مسیح کی زبان سے خدا کو "باپ" اور خود کو "بیٹا" ظاہر کیا گیا ہے اس کے لیے اور کوئی ثبوت واضح اور مُصرّح طور پر مہیا نہیں ہے پس اگر ہم اس سے قطع نظر بھی

کرلیں کہ یہ تعبیرات "تحریفی" اور صنم پرستی کے تخیل کی رہینِ منت ہیں اور اگر بالفرض یہ تسلیم کرلیں کہ خدائے برتر کی جانب سے سچی الہامی انجیل میں بھی یہ تعبیرات موجود تھیں تب بھی ان سے نصاریٰ کا عقیدۂ "تثلیث" کسی طرح صحیح ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ "ابن" کا لفظ اگرچہ حقیقی معنی کے لحاظ سے اُس انسان پر بولا جاتا ہے جو کسی کی صُلب یا کسی کے بطن سے مادۂ منویہ کے ذریعہ پیدا ہوا ہو' تاہم محاوراتِ زبان اور اہلِ زبان کے استعمالات و اطلاقات شاہد ہیں کہ یہ لفظ کبھی مجاز کے طور پر، اور کبھی تشبیہ یا کنایہ کے طریق سے اور بھی مختلف معانی پر بولا جاتا ہے، مثلاً ایک بڑی عمر کا شخص اپنے سے چھوٹے کو مجازاً "ابن" (بیٹا) کہدیا کرتا ہے یا بادشاہ اپنی رعایا کو اولاد کہہ کر خطاب کرتا ہے یا استاد اپنے شاگردوں کو "بیٹا" کہہ کر پکارتا ہے یا جو شخص کسی علم و ہنر کا ماہر یا اس کی خدمت میں سرشار ہوتا ہے تو اس کو کنایۃً اس علم و ہنر کا بیٹا کہہ کر یاد کرتے ہیں اور کہا کرتے ہیں "ابن القانون" "ابن الفلسفۃ" "ابن الفلاحۃ" "ابن الحدادۃ" یا دنیا طلبی کی حرص و آرزو میں اگر حد سے گذر چکا ہے تو اس کو "ابن الدراہم" "ابن الدنانیر" کہہ دیا کرتے ہیں، اسی طرح مسافر کو "ابن السبیل" مشہور شخصیت کو "ابن جلا" بڑے ذمہ دار انسان کو "ابن لیلہا" آنے والے دن سے بے پرواہ شخص کو "ابن یومیہ" دنیا ساز ہستی کو "ابن الوقت" کہتے ہیں یا جس کے اندر کوئی وصف نمایاں طور پر موجود ہوتا ہے تو اس وصف کی جانب لفظ ابن کو منسوب کرکے ذاتِ موصوف کو یاد کرتے ہیں مثلاً صبح کو "ابن ذکاء" کہتے ہیں اور ان تمام مثالوں سے زیادہ یہ کہ انبیاء بنی اسرائیل اپنی اُمتوں کو ابناء اور اولاد کے ساتھ ہی خطاب کرتے اور نصائح و مواعظ میں یہ ظاہر فرماتے ہیں کہ امم و اقوام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی روحانی اولاد ہوتی ہیں۔

اور یہی حال "اب" اور "باپ" کے اطلاقات و استعمالات کا ہے' ایک چھوٹا اپنے بڑے کو' ایک ضرورت مند اپنے مربی کو، ایک شاگرد اپنے اُستاد کو' ایک اُمتی اپنے نبی رسول کو "اب" اور "باپ" کہنا فخر سمجھتا ہے حالانکہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے تمام اطلاقات مجاز، کنایہ اور تشبیہ کے

طور پر کیے جاتے ہیں اسی طرح بے نظیر مقرر اور خطیب کو "ابو الکلام" بہترین انشاء پرداز کو "ابو القلم" ماہر نقاد کو "ابو النظر" ڈراؤنی اور ہیبت ناک شئے کو "ابو الہول" سخی کو "ابو الجاد" فن کاشتکاری کے ماہر کو "ابو الفلاح" صنعت و حرفت کے حاذق کو "ابو الصنع" شب و روز بولتے رہتے ہیں۔

تو ان اطلاقات کے پیشِ نظر بآسانی یہ کہا جا سکتا ہے کہ کتابِ مقدس میں ذاتِ احدیت پر اَبْ (باپ) کا اطلاق ربِ حقیقی کی حیثیت میں اور حضرتِ مسیح پر ابن (بیٹا) کا اطلاق محبوب و مقبولِ الٰہی کی حیثیت میں ہوا ہے یعنی جس طرح باپ اور بیٹے کے درمیان محبت و شفقت کا رشتہ مضبوط و مستحکم ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ محبت و شفقت کا وہ رشتہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے اور اُس کے مقدس پیغمبر مسیح (علیہ السلام) کے درمیان قائم ہے ایک صحیح حدیث میں بھی نبیِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس استعارہ اور تشبیہ کو استعمال فرماتے ہوئے کہا ہے "الخلق عیال اللہ" (تمام مخلوق خدا کا کنبہ ہے)

پس روزمرہ کے محاورات و اطلاقات کو نظر انداز کر کے کتابِ مقدس کے لفظ "اَب" اور "ابن" کے ایسے معانی و مطالب مراد لینا جو صریح شرک کے مرادف ہوں بلکہ اس سے بھی زیادہ قباحت و شناعت کے ساتھ خدا کی ہستی کو تین اقانیم سے مرکب ظاہر کرتے اور خدا کے حصے بخرے بناتے ہوں" کسی طرح بھی جائز نہیں ہو سکتا اور صریح ظلم اور اقدامِ شرک ہے "تعالی اللہ علواً کبیراً" بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ ان ہی اناجیل میں بصراحت حضرتِ مسیح کے انسان اور مخلوقِ خدا ہونے پر نصوص موجود ہوں مثلاً یوحنا کی انجیل میں حضرت مسیح کا یہ ارشاد مذکور ہے:[1]

"میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ تم آسمان کو کھلا ہوا اور خدا کے فرشتوں کو اوپر جاتے ہوئے اور ابن آدم (مسیح) پر اُترتے دیکھو گے۔"

اور باب ۱۳ میں بصراحت خود کو "رسول" کہا ہے:۔

[1] باب ۱۔ آیت ۵۱۔

"میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ نوکر اپنے مالک سے بڑا نہیں ہوتا اور نہ "رسول" اپنے بھیجنے والے سے۔"

اور باب ۴ میں ہے :-

"کیونکہ یسوع نے خود گواہی دی کہ "نبی" اپنے وطن میں عزت نہیں پاتا۔"

اور باب ۳ میں ہے :-

"اور آسمان پر کوئی نہیں چڑھا سوائے اُس کے جو آسمان سے اُترا یعنی ابن آدم جو آسمان میں ہے۔"

اور باب ۶ میں ہے :-

"پس جو معجزہ اس نے دکھایا وہ لوگ اُسے دیکھ کر کہنے لگے جو نبی دنیا میں آنے والا تھا وہ فی الحقیقت یہی ہے۔"

اور انجیلِ متی میں[1] ہے :-

"لیکن اس لیے کہ تم جان لو کہ ابنِ آدم (مسیح) کو زمین پر گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار ہے۔"

علاوہ ازیں اگر عہد نامۂ جدید میں حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کے لیے ابن کا اطلاق موجود ہے تو نیکوکار انسانوں پر بھی "ابناء اللہ" اور بدکاروں کے لیے "ابناء ابلیس" کا اطلاق پایا جاتا ہے. چنانچہ انجیلِ متی میں ہے[2] :-

"مُبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے۔"

اور انجیلِ یوحنا میں ہے[3] :-

"یسوع نے ان سے کہا: اگر تم ابراہیم کے فرزند ہوتے تو ابراہیم کے سے کام کرتے" ...... انھوں نے اس سے کہا ہم حرام سے پیدا نہیں ہوئے ہمارا ایک باپ ہے، یعنی خدا۔"

[1] باب ۹ آیت ۶۔ [2] باب ۵ آیت ۹۔ [3] باب ۸ آیت ۴۰، ۴۱۔

لہٰذا عقیدۂ تثلیث میں نصاریٰ کے لیے موجودہ کتابِ مقدس سے بھی کوئی حجت ودلیل نہیں ملتی اور اس لیے بغیر کسی شک وریب کے یہ کہنا حق ہے کہ یہ عقیدۂ تثلیث صنم پرستانہ عقائد کے امتزاج کا نتیجہ ہے۔

لائقِ توجہ بات | یہ بات کبھی فراموش نہیں ہونی چاہیے کہ ادیانِ ملل سابقہ کے مسخ وتحریف میں تحریف کرنے والوں کو اس سے بہت زیادہ مدد ملی کہ بنیادی عقائد میں صراحت اور وضاحت کی جگہ وقت کے معبّروں، مُفسّروں اور ترجمانوں نے کنایات، استعارات اور تشبیہات سے بہت زیادہ کام لیا۔ ان تعبیرات کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب اِن مذاہبِ حق کا صنم پرستوں اور فلسفیوں سے واسطہ پڑا اور انھوں نے کسی نہ کسی طرح اس دینِ حق کو قبول کر لیا تو اپنے فلسفیانہ اور مشرکانہ افکار وخیالات کے لیے اِن ہی استعارات اور تشبیہات کو پشت پناہ بنایا اور آہستہ آہستہ ملتِ حقیقی کی شکل وصورت بدل کر اس کو معجونِ مرکب بنا ڈالا، اسی حقیقت کے پیشِ نظر قرآنِ عزیز نے وجودِ باری، توحید، رسالت، الہامی کتب، ملائکۃ اللہ، غرض بنیادی عقائد میں ذو معنی الفاظ، پُرپیچ تشبیہات اور توحید میں خلل انداز استعارات وکنایات کی بجائے واضح صریح اور غیر مبہم اطلاقات کو اختیار کیا ہے تاکہ کسی ملحد، زندیق اور مشرک فلسفی کو توحیدِ خالص میں شرک اور اوہام وظنون کی نکتہ آفرینیوں کا موقع ہاتھ نہ آنے پائے اور اگر کوئی شخص اس کے باوجود بھی بے جا جسارت کرے تو خود قرآنِ عزیز کی نصوصِ صریحہ ہی اس کے الحاد کو پاش پاش کر دیں۔

کفارہ | موجودہ مسیحیت کا دوسرا عقیدہ جس نے دینِ مسیحیت کی حقیقت کو برباد کر ڈالا کفارہ کا عقیدہ ہے اس کی بنیاد اس تخیل پر قائم ہے کہ تمام کائنات جس میں نکوکار اور انبیاء ورُسُل سب ہی شامل ہیں" ابتداءِ آفرینش سے ہی گنہگار ہے، آخر رحمتِ الٰہی کو جوش آیا اور اس کی مشیت نے ارادہ کیا کہ بیٹے کو کائناتِ ارضی میں بھیجے اور وہ مصلوب ہو کر اول وآخر تمام کائنات کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے اور اس طرح دُنیا کو نجات اور مکتی حاصل ہو سکے لیکن اس عقیدہ

کے قوام بنانے کے لیے چند ضروری اجزاء کی ضرورت تھی جن کے بغیر یہ عمارت کھڑی نہیں کی جا سکتی تھی اس لیئے عہدِ رسول میں سب سے پہلے مسیحیت نے یہودیت کے اس عقیدے کو تسلیم کرلیا کہ اُن کو صلیب پر بھی چڑھایا گیا اور مار بھی ڈالا گیا اور اس کو شرفِ قبولیت دینے کے بعد دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ "الوہیت" کے باوجود مسیحؑ کا صلیب پانا اور قتل ہونا اپنے لیے نہیں بلکہ کائنات کی نجات کے لیے تھا۔ چنانچہ جب اس پر یہ حادثہ گذر لیا تو اس نے پھر الوہیت کی چادر اوڑھ لی اور عالمِ لاہوت میں باپ اور بیٹے کے درمیان دوبارہ لاہوتی رشتہ قائم ہوگیا۔

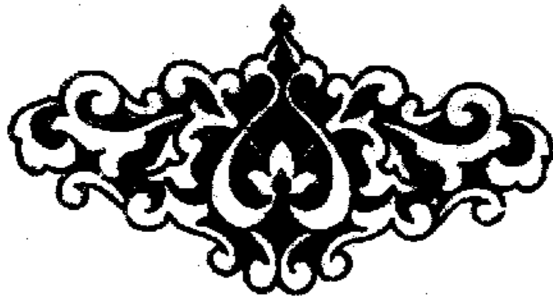
پس جب مذہب میں خدائے برتر کے ساتھ صحتِ عقیدہ اور نیک عملی مفقود ہو کر نجات کا دار و مدار عمل و کردار کی بجائے "کفارہ" پر قائم ہو جائے اس کا حشر معلوم؟

قرآن نے اسی لیے جگہ جگہ یہ واضح کیا ہے کہ نجات کے لیے عقیدہ کی صحت یعنی صحیح خدا پرستی اور نیک عملی کے ماسوا کوئی دوسری راہ نہیں ہے اور جو شخص بھی اس "راہِ مستقیم" کو ترک کرکے خوش عقیدگی اور اوہام و ظنون کو اسوہ بنائے گا اور نیک عملی اور صحیح خدا پرستی پر گامزن نہ ہوگا بلاشبہ گمراہ ہے اور راہِ مستقیم سے یکسر محروم ہے:-

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا	جو لوگ اپنے کو مومن کہتے ہیں اور جو یہودی ہیں
وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ	اور جو نصاریٰ ہیں اور جو صابی ہیں اُن میں سے
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ	جو بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لے آیا
صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ	اور اُس نے نیک عمل کیے تو یہی وہ شخص ہیں جن کا
رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ	اجر اُن کے پروردگار کے پاس ہے، نہ اُن پر خوف
يَحْزَنُوْنَ ○ (بقرہ پ غ)	طاری ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

یعنی قرآن کی دعوتِ اصلاح ادیان و ملل کا مقصد یہ نہیں ہے کہ یہودی، نصرانی صابی گروہوں کی طرح ایک نیا گروہ مومنوں کے نام سے اس طرح اضافہ کردے کہ گویا

وہ بھی ایک قومی، نسلی یا ملکی گروہ بندی ہے کہ خواہ اس کی خدا پرستانہ زندگی اور عملی زندگی کتنی ہی غلط اور برباد ہو یا سرے سے مفقود ہو مگر اس گروہ بندی کا فرد ہونے کی وجہ سے ضرور کامیاب اور خدا کی جنت و رضا کا مستحق ہے۔ قرآن کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے بلکہ وہ یہ اعلان کرنے آیا ہے کہ اس کی دعوتِ حق سے پہلے کوئی شخص کسی بھی گروہ اور مذہبی جماعت سے تعلق رکھتا ہو اگر اس نے (قرآن کی تعلیمِ حق) کے مطابق خدا پرستی اور نیک عملی کو اختیار کر لیا ہے تو بلاشبہ وہ نجات یافتہ اور کامیاب ہے ورنہ تو وہ اگر مسلمان گھر میں پیدا ہوا پلا اور بڑھا اور اسی سوسائٹی میں زندگی گذار کر مر گیا مگر قرآن کی دعوتِ حق کے مطابق خدا پرستی اور نیک عملی دونوں سے محروم رہا یا مخالف تو اس کے لیے نہ کامیابی ہے اور نہ فوز و فلاح۔ باقی رہا مسیحیت کے کفارہ کا خصوصی مسئلہ تو قرآن نے اس کے ابطال اور تردید کے لیے یہ راہ اختیار کی کہ جن بنیادوں پر اس کو قائم کیا گیا تھا ان کی ہی جڑ کاٹ دی، چنانچہ گذشتہ سطور میں صلیب اور قتلِ مسیحؑ کے انکار، رفع الی السماء کے اثبات کے بحث میں اس پر کافی روشنی پڑ چکی ہے۔





محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور قرآن • بشارات النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) • صبحِ سعادت • تاریخِ ولادت کی تحقیق • نسبِ مبارک یتیمی • بُت پرستی سے نفرت • خلوت پسندی اور عبادتِ الٰہی کا ذوق • حقیقتِ وحی • صاحبِ وحی کی معرفت کی وجدانی دلیل بعثت • حدیثِ بخاری • بشریت اور نبوت کا باہمی تعلق • نبی اور مصلح • کیفیتِ وحی اور بعض مستشرقین کی گمراہی • نزولِ وحی کا پہلا دور • نزولِ وحی کا دوسرا دور • دعوت و ارشاد کی پہلی منزل • دعوت وارشاد کی دوسری منزل • دعوت وارشاد کی تیسری منزل (بعثتِ عامہ) دعوتِ اسلام کا مجمل خاکہ • قرآن اور تجدیدِ دعوت • توحید و رسالت • یومِ آخرت • اسریٰ (معراج) • ہجرت • غزوات • غزوۂ بدر • غزوۂ احد • غزوۂ خندق یا احزاب • واقعۂ حدیبیہ • معاہدۂ صلح • فتحِ مکہ (الفتح الاعظم) • حاطب بن بلتعہ کا واقعہ • بت شکنی • خطبہ غزوۂ حنین • غزوۂ تبوک اور قبولِ توبہ کا عجیب واقعہ • غزوات نتائج و بصائر • تبنیٰ • خرافی داستان • بصائر • بنونضیر • بصیرت • واقعۂ افک • موعظت بناء فاسق • موعظت • مسجدِ ضرار • وفات یا وصل بالرفیق الاعلیٰ • عبرت و موعظت

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور قرآن	قرآن کلامِ الٰہی ہے اور خاتم الانبیاء محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے مہبط ہیں وہ ان پر نازل ہوا ہے، قرآن، علم و یقین کی روشنی ہے اور ذاتِ اقدس

اس کا عملی نمونہ اسوہ اور نقشہ ہیں: "لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ" قرآن رشد و ہدایت ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) راشد و ہادی، قرآن حق و صداقت کے لیے دعوت و پیغام ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے داعی اور پیغامبر، اس لیے قرآن کا ہر ایک جملہ اور اس کی ہر ایک آیت کسی نہ کسی حیثیت میں ذاتِ قدسی صفات سے تعلق رکھتی ہے تو اب کس طرح یہ کہا جائے کہ قرآن میں اتنی جگہ اس مقدس ہستی کا ذکر ہے۔

ایک مرتبہ حضرتِ عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے چند صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے عرض کیا کہ آپ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ حالاتِ زندگی ہم کو سنائیں، صدیقہ عائشہؓ نے نگاہِ تعجب سے دریافت کیا: کیا تم قرآن نہیں پڑھتے جو مجھ سے خُلقِ نبی کے متعلق سوال کرتے ہو۔ "فانّ خُلقہ کان القرآن" آپؐ کی تمام اخلاقی زندگی قرآن کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی تھی، قرآن جو کچھ کہتا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کو کر دکھایا۔ پس قرآن کے کسی حصّہ کو سامنے لانا گویا حیاتِ طیّبہ کا پیشِ نظر لے آنا ہے۔

البتہ قرآنِ عزیز نے جن آیات میں آپؐ کے اسمائے گرامی یا اوصافِ عالی کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا "یا ایھا النبی" اور "ایھا الرّسول" کہہ کر مخاطب کیا اس کی تفصیل مسطورہ ذیل نقشہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس نقشہ میں نبی، اور رسول، کے علاوہ جن اسماء اور اوصاف کی تفصیل مسطور ہے وہ یہ ہیں:۔

(۱) محمّد	(۲) احمد	(۳) عبداللہ	(۴) شاہد	(۵) بشیر
(۶) نذیر	(۷) مُبَشِّر	(۸) مُذَکِّر	(۹) عزیز	(۱۰) رؤف
(۱۱) رحیم	(۱۲) امین	(۱۳) مُزّمّل	(۱۴) مُدّثّر	(۱۵) مُنذِر
(۱۶) ہادی	(۱۷) یٰسین	(۱۸) رحمۃ	(۱۹) نعمۃ	(۲۰) طٰہٰ
(۲۱) نور	(۲۲) حق	(۲۳) سراجِ منیر	(۲۴) شہید	(۲۵) داعی الی اللہ
(۲۶) خاتم النّبیین	(۲۷) نبی	(۲۸) رسول)	(۲۹) عبدہٗ	❋

نقشہ

نام یا صفت	سورۃ	آیات
(۱) محمد	آلِ عمران	۱۴۴
	احزاب	۴۰
	محمد	۱
	الفتح	۲۹
(۲) احمد	صف	۶
(۳) عبداللہ	حدید	۹
	جن	۱۹
	کہف	۱
(۴) شاہد	الفتح	۹
	احزاب	۴۶
	مزمل	۱۵
(۵) مبشر	احزاب	۴۶
	الفتح	۹
	فرقان	۵۶
(۶) بشیر	نساء	۱۹
	اعراف	۱۸۸
	ہود	۲
	سبا	۲۸
	فاطر	۲۴

نام یا صفت	سورۃ	آیات
(۷) نذیر	بقرہ	۱۱۹
	عنکبوت	۵۰
	نساء	۱۹
	اعراف	۱۸۸
	ہود	۲
	حجر	۸۹
	فاطر	۲۳-۲۴-۳۷-۴۲-۴۶-
	الفتح	۹
	الذاریات	۵۰-۵۱
	ملک	۸-۹-۱۷-۲۶
	فرقان	۵۶
	بقرہ	۱۱۹
	سبا	۲۸-۴۶
	ص	۷
	احقاف	۵
(۸) مُذَکِّر	الغاشیہ	۲۱
(۹) سراجِ منیر	فاطر	۴۶
(۱۰) داعی الی اللہ	فاطر	۴۶
(۱۱) حق	یونس	۱۰۸

نام یا صفت	سورۃ	آیات
(۱۲) عزیز	توبہ	۱۲۸
(۱۳) رؤف	توبہ	۱۲۸
(۱۴) رحیم	توبہ	۱۲۸
(۱۵) امین	دخان	۱۹
(۱۶) نور	مائدہ	۱۵
(۱۷) نعمۃ	بقرہ	۲۳۱
	نمل	۸۱
(۱۸) ھادی	روم	۵۳
(۱۹) رحمۃ	انبیاء	۱۱۷
(۲۰) طٰہٰ	طٰہٰ	۱
(۲۱) یٰس	یٰس	۱
(۲۲) مُزَمِّل	مزمل	۱
(۲۳) مُدَّثِر	مدثر	۱
(۲۴) مُنْذِرْ	نمل	۹۲
(۲۵) خاتم النبیین	احزاب	۴۰
(۲۶) نبی	آلِ عمران	۱۶۱
	اعراف	۱۵۷-۱۵۶
	مائدہ	۸۱
	انفال	۶۵-۶۴ / ۷۰-۶۷
	براۃ	۱۱۳-۷۳-۶۱

نام یا صفت	سورۃ	آیات
نبی	حجرات	۲
	احزاب	۴۶-۳۸-۳۲-۲۸-۱
	فاطر	۵۲-۵۰
	تحریم	۹-۸-۳-۱
	طلاق	۱
	ممتحنہ	۱۲
(۲۷) رسول	بقرہ	۲۵۰-۱۴۲
	آلِ عمران	۱۳۲-۱۰۱-۸۶-۸۱-۲۳ / ۱۸۳-۱۶۹-۱۶۲-۱۵۳
	نساء	۶۹-۶۹-۶۴-۶۱-۵۲-۱۴ / ۱۷۰-۱۳۶-۱۱۵-۱۰۰-۸۰
	مائدہ	۹۶-۵۶-۵۵-۴۱-۳۲-۱۵ / ۱۴۰-۹۹-۹۲-۸۲
	اعراف	۱۵۸-۱۵۷
	انفال	۲۴-۱۲-۱
	توبہ	۲۹-۲۶-۲۴-۱۶-۷-۳-۱ / ۶۵-۶۳-۵۹-۵۴-۳۳ / ۸۸-۸۶-۸۴-۸۱-۸۰ / ۱۰۵-۹۹-۹۷-۹۴-۹۱ / ۱۲۸-۱۰۷-
	نحل	۱۱۳
	اسراء	۹۳
	حج	۷۸
	مومن	۷۸
	زخرف	۲۹

نام یا صفت	سورۃ	آیات	نام یا صفت	سورۃ	آیات
رسول	عنکبوت	۱۸	رسول	جمعہ	۲
	حجرات	۱-۳-۸-۱۴-۱۵		صف	۹-۱۱-۶۶
	الفتح	۹-۱۲-۱۳-۱۷-۲۶-۲۷-۲۸-۹۶-		حشر	۴-۶-۷-۸
	احزاب	۶-۲۱-۲۹-۳۱-۳۳-۳۶-۴۰		ممتحنہ	۱
	فاطر	۵۲-۵۷-۷۱		جن	۲۲-۲۸
	دخان	۱۴-۱۹		الحاقہ	۴۲
	حدید	۷-۸-۲۹		نور	۴۷-۴۸-۵۱-۵۲-۵۴-۵۶-۶۲-۶۳
	مجادلہ	۵-۸-۹-۱۲-۱۳-۲۰-۲۲	شہید (۲۴)	بقرہ	۱۴۳
	محمد	۳۲-۳۳		نساء	۴۱
	منٰفقون	۱-۷-۸		نحل	۸۹
	تغابن	۸-۱۲		حج	۷۸
	فرقان	۷-۲۷-۳۰-۴۱	عبدہ (۲۵)	الفرقان	۱
	طلاق	۱۱		اسراء	۱

قرآنِ عزیز اور صحیح احادیث میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جن اسماء وصفات کا ذکر ہے علماءِ اسلام نے اس پر مستقل تصانیف کی ہیں اور ابن دِحیہ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے اس پر قلم اٹھایا۔ ان کے علاوہ ابن کثیر، بیہقی، ابنِ عساکر (رحمہم اللہ) جیسے محدثین نے ان تمام احادیث و آثار کو یکجا جمع کر دیا ہے جن میں آپؐ کے اسمائے صفات اور القاب مذکور ہیں، مشہور محدث ابو بکر بن عربی نے شرح ترمذی میں اُن کی شمار چونسٹھ کرائی ہے بعض نے ننانوے بعض نے تین سو اور بعض اہلِ علم نے اُن کو ایک ہزار تک پہنچایا ہے[۱] مگر یہ کثرتِ تعداد اِس لیے صحیح نہیں ہے کہ اس شمار میں ان تمام انتسابات کو بھی شامل

[۱] فتح الباری ج ۶ ص ۴۳۵۔

کرلیا گیا ہے جو کسی مناسبتِ حال سے آپؐ کی جانب منسوب ہیں اگرچہ بحیثیت اسماء صفات یا القاب کے ان کا اطلاق ذاتِ اقدس پر صحیح نہیں ہو سکتا مثلاً آپؐ نے انبیاء علیہم السلام اور اپنے درمیان صفتِ نبوت کے تعلق کو ظاہر اور ختمِ نبوت کو واضح کرنے کے لیے خود کو قصرِ نبوت کی آخری لبنۃ (اینٹ) فرمایا ہے تو جن بزرگوں کو آپؐ کے اسماء و صفات کی کثرت سے شغف تھا انھوں نے صفات النبی میں "اللبنۃ" کو بھی شمار کر لیا۔[1]

بخاری کی ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: میرے پانچ نام ہیں: محمد ہوں۔ احمد ہوں۔ ماحی ہوں یعنی کفر و شرک کو مٹانے والا ہوں۔ حاشر ہوں۔ اسلیے کہ قیامت کے دن تمام کائنات سے پہلے میں حضرتِ حق کی بارگاہ میں حاضر ہوں گا۔ اور عاقب ہوں (بقولِ زہری آخری پیغمبر ہوں) حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں: پانچ کا یہ عدد حصر کے لیے نہیں ہے بلکہ اس جگہ ان اسماء و صفات کا ذکر ہے جو کتبِ سابقہ اور امم و اقوامِ ماضیہ میں آپؐ سے متعلق مشہور و معروف اور بشارات و پیشین گوئیوں میں مسطور تھے۔ ابنِ حجر یہ بھی فرماتے ہیں کہ باتفاقِ علماءِ اسلام قرآن میں آپؐ کے جو اسماء و صفات مذکور ہیں وہ یہ ہیں:۔

الشاہد، البشیر، النذیر، المبین، الداعی الی اللہ، السراج المنیر، المذکر، الرحمۃ النعمۃ، الہادی، الشہید، الامین، المزمل، المدثر۔ لیکن ہماری فہرست کے مقابلہ میں یہ فہرست ناقص ہے، جن اسماء و صفات کا ذکر نقشہ میں ہے وہ بھی جمہور کے نزدیک مسلّم، حافظ ابنِ حجر (رحمہ اللہ) یہ بھی لکھتے ہیں کہ احادیث میں مذکور اسماء و صفات میں سے حسبِ ذیل صفات بہت مشہور و معروف ہیں:۔

المتوکل، المختار، المصطفیٰ، الشفیع المشفع، الصادق المصدوق

بہرحال محمد اور احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دو اسماءِ اعلام (نام ہیں) اور باقی اسماء صفات و القاب ہیں اور قرآن میں آپؐ کے نام پاک کے انتساب سے ایک سورۃ کا نام

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۴۳۶۔

سورۂ محمد ہے جس کے شروع میں ہی آپ کا اسم گرامی مذکور ہے: وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّھُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّھِمْ اور صرف ایک جگہ سورۂ صف میں احمد منقول ہے یعنی حضرت مسیح (علیہ السلام) کی اُس بشارت کے تذکرہ میں یہ نام آیا ہے جو آپ کی آمد سے متعلق انھوں نے بنی اسرائیل کو سنائی تھی: وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْ بَعْدِی اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ۔

یہ حقیقت بھی قابلِ فراموش نہیں ہے کہ آپ کے اسماء وصفات محض رسمی نہیں ہیں کہ والدین نے جو چاہا نام رکھ دیا اور احباب واصحاب نے جس صفت ولقب سے جی چاہا پکار لیا بلکہ اِن اسماءِ صفات کا آپ کی زندگی اور آپ کے اخلاق واعمال کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے جیسا کہ ابھی ماحی، حاشر اور عاقب کے متعلق خود زبانِ وحی ترجمان سے سُن چکے ہو یا مثلاً محمد اس ہستی کو کہتے ہیں جس کے تذکرے ہمیشہ خوبی اور نیک گوئی کے ساتھ ہوتے ہوں، یہ انبیاء سابقین (علیہم السلام) کی بشارات اور مستقبل میں تذکرہ ہائے حیات کی جانب اشارہ ہے اور احمد اُس ذات پر اطلاق ہوتا ہے جو سب سے زیادہ حمدِ الٰہی کے لیے نغمہ سنج ہو، یہ ذاتِ اقدس کی عبدیتِ کاملہ اور انسانِ کامل ہونے کو ظاہر کرتا ہے بلاشبہ آپ خدا پرست انسانوں کے لیے مُبشِّر و بشیر اور فتنہ جو مُفسدوں، کافروں اور مشرکوں کیلیے مُنذِر ونذیر ہیں، روزِ قیامت، صادق وکاذب دونوں پر شاہد وشہید ہیں، چشمِ حق بین اور گوشِ حق نیوش کے لیے مذکِّر (ناصح) ہیں، راہِ حق سے بھٹکے ہوؤں کے لیے ہادی اور خدا سے بھاگے ہوؤں کے لیے داعی ہیں، اُن کا وجود رحمۃ ہے کائناتِ عالم کے لیے اور اُن کی ہستی نظامِ کائنات کے لیے نعمۃ ہے، جہل وشرک کے لیے نور ہیں اور پیغامِ الٰہی کیلیے نبی ورسول، مصائب وآلام میں عزیز ہیں اور نوعِ انسانی کے ہر ایک گوشۂ حیات کے لیے رؤف ورحیم، اُن کی صدا، صدائے حق ہے اور اُن کی ذات الصادق الامین، قرآن خدا کا آخری پیغام ہے اس لیے وہ خاتم النبیین ہیں اُن کی بعثت عالمگیر ہے اس لیے طٰہٰ ویٰسٓ ہیں اور آسمانِ نبوت کے سراجِ منیر ہیں اور کائناتِ رسالت کے بشیر ونذیر، عالمِ ادیان وملل کی

سلطانی کے باوجود گدائے کملی پوش ہیں اس لیے مزمّل ہیں اور مدثر پھر با اینہمہ حُسن کمال "انما انا بشر" اور لما قام عبد اللّٰہ کے مصداق ہیں اللھم صل وسلم وبارک علیہ۔

خدا پر توکل اس کا شعار ہے اس لیے متوکل اس کا وصفِ عالی وقار ہے اور وہ خدائے برحق کا برگزیدہ ومختار ہے بارگاہِ الٰہی میں ابرار ومقربین سے بھی زیادہ مصطفےٰ، مجتبیٰ نکوکار وصالحین کے لیے الشفیع المشفع اور ہر ایک شعبہ ہائے حیات میں الصادق المصدوق ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ہم جانتے ہیں کہ اظہارِ مقصد کے لیے یہ اشارات کافی نہیں ہیں بلکہ اپنے معنوی مناسبات کے لحاظ سے ہر ایک وصف ونام قرآن سے شہادت کا طالب ہے اور قرآن کی شہادت بلاشبہ ہر ایک گوشہ کی تفصیل کے لیے شاہد عدل لیکن افسوس کہ کتاب کا موجودہ ترتیبی نقشہ اس کا متحمل نہیں ہے اس لیے صرف آیات کے حوالجات اور ارشادات پر ہی اکتفا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بشارات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُم مِّنَ الشَّاهِدِينَ ۝

(آل عمران پ ۳ ع ۹)

اور (وہ وقت یاد کرو) جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد کیا کہ میں تم کو جو کچھ کتاب اور حکمت عطا کروں اور پھر تمہارے پاس وہ پیغمبر آئے جو ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہو جو تمہارے پاس ہیں تم ضرور اس پر ایمان لانا اور ضرور اس کی مدد کرنا (پھر) اللہ نے فرمایا کیا تم اس عہد کا اقرار کرتے ہو اور اس کو میرا اہم عہد سمجھ کر قبول کرتے ہو تو انھوں نے کہا بیشک ہم اقرار کرتے ہیں، اللہ نے فرمایا اب تم اس عہد پر گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ بنتا ہوں۔

حضرتِ عبد اللہ بن عباس اور حضرتِ علی (رضی اللہ عنہم) فرماتے ہیں کہ اس آیت "میثاق" میں اس عہد ومیثاق کا تذکرہ ہے جو ازل میں تمام انبیاء ورسل (علیہم السلام)

سے خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق لیا گیا، خطاب اگرچہ براہ راست انبیاء علیہم السلام سے ہے مگر مقصود و مراد ان کی امتیں بھی شامل ہیں کیونکہ عمومی طور پر اُن ہی کے ذریعہ وفاء عہد کا مظاہرہ ہونے والا تھا۔

اِس عہدِ میثاق کو اِس درجہ اہمیت کیوں حاصل ہے؟ یہ بات کچھ تمہید کی محتاج ہے مادیات و روحانیت پر فاعلِ مختار ایک ہی ہستی ہے اور وہ خدا ہے مگر مادیات میں خدائے برتر کے جاری قانونِ فطرت کا ہم شب و روز مشاہدہ کرتے رہتے ہیں اور وہ ہم کو محسوس نظر آتا ہے اس کے برعکس عالمِ روحانیات حواسِ خمسہ سے بلند احساسات تعقل و تفکر کا محتاج ہے یہاں وجدان و شعور جب عقل و فکر کو رہنما بناتے اور دونوں راہنما ریب و شک اور اوہام و ظنون سے محفوظ "سلیم" بن کر رہنمائی کا حق ادا کرتے ہیں تو انسان کے سامنے روزِ روشن کی طرح یہ حقیقت چمک اٹھتی ہے کہ خدائے واحد کی احدیت و یکتائی عالمِ مادیات و روحانیت میں ایک ہی قسم کے قانونِ فطرت کو نافذ رکھتی ہے۔

اب ذرا دیدۂ عبرت کو وا کیجئے اور کائناتِ ہست و بود پر نظر ڈالئے تو یہ حقیقت ہر جگہ اُبھری ہوئی ملے گی کہ ذاتِ واحد کے ماسوا یہاں کائنات کی ہر ایک شے کے لیے دو ہی سرحدیں مقرر ہیں آغاز و انجام اور درمیان کی تمام کڑیاں نشو و ارتقاء کے لیے وقف ہیں ہر ایک چیز شروع ہوتی اور درمیانی دور میں ترقی پذیر رہتی اور پھر حدِ کمال کو پہنچ کر اپنی ضرورت کو پورا کر دیتی ہے اس کو انجام اور شروع کو آغاز کہتے ہیں۔

روحانیات میں بھی یہی سلسلہ جاری ہے نسلِ انسانی کا جب آدم ؑ سے آغاز ہوا تو مادی وجود کے ساتھ خدا کی معرفت یعنی خدا پرستی کی امانت کو بھی ساتھ لایا وہ اگر ایک جانب نسلِ انسانی کے مادی باپ تھے تو دوسری جانب خدا کی بخشی ہوئی ہدایت و صداقت کے لیے "نبی" اور "ایلچی" بھی تھے اور جب کہ خدا کی ہستی ایک اور اس کی بنیادی صداقت و ہدایت کا پیغام بھی ایک ہے تو ضروری ہوا کہ نوعِ انسانی کی رشد و ہدایت اور خدا پرستی کی بنیادی

تعلیم کا سلسلہ بھی ایک ہی لڑی میں پرویا جائے اور آغاز سے انجام تک اس سلسلہ کی تمام کڑیاں ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہوں کہ اُن میں سے کسی ایک کی بھی تکذیب گویا پورے سلسلۂ روحانیت کی تکذیب کے مرادف ہو۔ چنانچہ اسی حقیقت کو قرآن نے اس طرح ظاہر کیا ہے۔ "لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ" "ہم ایمان و تصدیق میں خدا کے کسی ایک پیغمبر کے درمیان بھی تفریق جائز نہیں رکھتے" اور اسی کو زبانِ وحی ترجمان نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے، "نحن بنو علات دیننا واحد" "ہم تمام انبیاء و رسل کی تعلیمات اصل و بنیاد میں اسی طرح ایک ہیں جیسا کہ علاتی بھائی کہ ان سب کا باپ ایک ہی ہے۔

پھر اس سلسلۂ روحانیت کی اگرچہ تمام کڑیاں ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ ہیں۔ مگر آغاز، اور نشوونما اور دورِ کمال و انجام کے پیشِ نظر اسی طرح باہم فرقِ مراتب رکھتی ہیں جس کا مظاہرہ ہم کو عالمِ مادیات کے مختلف سلسلوں میں نظر آتا ہے اور جس کو ہم فطری (NATARAL) کہتے ہیں اور ان درجات و مراتب میں بھی درجۂ کمال کو جس سے کہ انجام کی سرحد ملتی ہے سب سے زیادہ رفعت و بلندی حاصل ہوتی ہے کیونکہ وہی اس سلسلہ کا محور و مرکز (CENTRE) اور قطبِ رحیٰ (چکی کی کیلی) ہوتا اور وابستہ و پیوستہ کی منزلِ مقصود سمجھا جاتا ہے۔

چنانچہ کائنات کی ہر شے کی طرح خود عالمِ انسانی نے بھی اس ربعِ مسکون پر عہدِ طفولیت گذارا ہے اس وقت دنیائے انسانی ایک چھوٹے سے کنبے کی طرح آباد تھی اور نسلِ انسانی کا باپ ہی روحانی طبیب بھی تھا لیکن جب سلسلۂ بود و ماند آہستہ آہستہ خاندانوں، برادریوں قبیلوں سے آگے بڑھ کر قوموں اور جغرافیائی نسلوں میں تقسیم ہونے لگا اور وحدت نے کثرت کی ہی شکل نہیں اختیار کر لی بلکہ کثرت میں بھی تنوع پیدا ہونے لگا تو ان مادی نشوونما اور ترقیوں کے ساتھ ساتھ روحانی رشد و ہدایت نے بھی نقطۂ وحدت پر قائم رہتے ہوئے تنوع اور کثرت کی شکل اختیار کر لی یعنی ہر ایک قوم و ملک میں جدا جدا ہادی و رہنما اور پیغمبر مبعوث ہونے لگے بلکہ بعض حالات میں ایک قوم میں بیک وقت متعدد نبیوں نے

دعوتِ حق میں ایک دوسرے کی اعانت کا فرض انجام دیا۔ اگرچہ اُن کی دعوتوں کی بنیاد سرتاسر ایک ہی "اصل و بنیاد" پر قائم تھی:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ وَاللَّهُ يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ○ (بقرہ پ ع)

ابتدا میں ایسا تھا کہ لوگ الگ الگ گروہوں میں بٹے ہوئے نہیں تھے ایک ہی قوم و جماعت تھے (پھر ایسا ہوا کہ باہم دگر مختلف ہو گئے اور الگ الگ ٹولیاں بن گئیں) پس اللہ نے (یکے بعد دیگرے) نبیوں کو مبعوث کیا وہ (ایمان و عمل کی برکتوں کی) بشارت دیتے اور (انکار و بدعملی کے نتائج سے) ڈراتے تھے نیز ان کے ساتھ کتاب الٰہی نازل کی گئی تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے تھے ان میں وہ فیصلہ کر دینے والی ہو اور تمام لوگوں کو راہِ حق پر متحد کر دے) جو لوگ باہم دگر مختلف ہوئے تو اس لیے نہیں ہوئے کہ ہدایت سے محروم اور حقیقت سے بے خبر تھے، نہیں دینِ الٰہی کے واضح احکام ان کے سامنے تھے مگر پھر بھی محض آپس کی ضد اور مخالفت سے اختلاف کرنے لگے تھے بالآخر اللہ نے ایمان والوں کو (دین کی) وہ حقیقت دکھا دی جس میں لوگ مختلف ہو رہے تھے۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے دین کی سیدھی راہ دکھلا دیتا ہے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِن رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيمَا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ○[1]

اور (ابتدا میں) انسانوں کی ایک ہی اُمت تھی پھر لوگ الگ ہو گئے اور اگر تمہارے پروردگار کی جانب سے پہلے سے ایک بات نہ ٹھہرا دی گئی ہوتی تو جن باتوں میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں ان کا فیصلہ کبھی کا ہو چکا ہوتا

لیکن خدائے واحد کی جانب سے رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ اگرچہ وقتی تقاضہ کے

[1] (یونس پ ع)

پیشِ نظر ہزاروں برس تک قوموں اور ملکوں میں تنوع اختیار کیے رہا تاہم وہ اپنے مقصدِ وحدت کو فراموش نہ کر سکا اور بُنیادی وحدت کے ساتھ اس عارضی کثرت کو بھی ایک ہی نقطۂ وحدت پر لانے کے لیے اس وقت تک برابر حرکت کرتا رہا جب تک کہ اپنے مرکزِ وحدت اور مقصدِ کمال کو نہ پا سکا۔

یعنی خدا کی صداقت کا پیغام اگرچہ جدا جدا قوموں اور ملکوں میں نبیوں اور پیغمبروں کی زبانی پہنچایا جاتا رہا اور گو ان تمام پیغامات میں فروعی اور وقتی تنوع سے قطع نظر اساسی اور بنیادی وحدت قائم رہی مگر خدا کی وحدانیت اور اس کے پیغام کی اساسی وحدت کا تقاضہ یہی تھا کہ یہ مختلف دعوتیں اور پیغامات سمٹ کر ایک ایسے نقطہ اور مرکز پر آجائیں کہ وہ تمام کائنات کے لیے بیک وقت اور رہتی دنیا تک ایک ہی پیغام بن کر اپنی نمود دکھلائے اور ایک ایسا پیغمبر مبعوث ہو جس کی بعثت، بعثتِ عام ہو اور جس کی دعوت، عالمگیر دعوت ہو تاکہ پھر اس تنوع اور کثرت کی ضرورت باقی نہ رہے۔

عالمِ روحانیات کی اپنی "مثلِ اعلیٰ" یا اپنے محور و مرکز کی جانب یہ حرکت جب کہ عالمِ مادیات کے نشوو ارتقاء کے متناسب حالات سے وابستہ تھی اور خالقِ کائنات کا قانونِ فطرت جب کہ دونوں سمتوں میں ایک ہی اصل پر کار فرما ہے تو یہ بھی از بس ضروری ہوا کہ روحانیت کے کمال و ارتقاء کا یہ دور مادی عالم کے ایسے دور کے ساتھ رونما ہو کہ کائناتِ انسانی کے ارتقاءِ دماغی و عقل کی استعدادات اپنے رشد و کمال کے ایسے نقطہ پر پہنچ جائیں کہ حجابِ مستقبل میں مستور تمام ترقیاں اسی ارتقاء کا نتیجہ کہلائیں اور گو اس سلسلہ میں ایک مدت کیوں نہ ہو جائے مگر کائناتِ ارضی کا یہ پورا مادی کارخانہ اسبابِ مادی کی بنا پر ایک کنبہ اور ایک خاندان بن کر رہ جائے اور ملکوں اور قوموں کی بہتات و کثرت کے باوجود کسی ایک گوشہ کے حرکت و سکون کے اثر سے تمام کائنات متأثر ہونے پر مجبور ہو جائے تاکہ اس وقت عالمِ روحانیات کا آخری نقطۂ ارتقاء کائناتِ انسانی کے عقل و دماغ کو اپنی

دعوت کی یکتائی و وحدت سے متأثر کر سکے اور دنیا دانستہ یا نادانستہ اسی کے بتلائے ہوئے سوسائٹی کے نظام کو آہستہ آہستہ اپنا کر عملاً خدا کا ایک کنبہ بن جائے اور مساواتِ عالم اور اخوتِ ہمہ گیر کا مظاہرہ کر دکھائے اور نتیجہ یہ نکلے کہ دینِ حق صرف تعلیمِ قرآن ہی میں منحصر ہو کر رہ جائے۔

تاریخ اقوام و ملل شاہد ہے کہ قرآن کی دعوت و اصلاح کی صدائے حق نے جب چھٹی صدی عیسوی میں دنیا کو پکارا ہے اس وقت دُنیا کے تمام مذاہب و ادیان خود اصحابِ مذاہب کی تاریخی اقوال کے مُطابق اپنی حقیقی روشنی کو یکسر فراموش کر چکے تھے[1] اور دُنیا کے ہر گوشے اور ہر سمت میں مذہب و دھرم اور نظامِ سوسائٹی تنگی و تاریکی اختیار کر چکا تھا اُس وقت قرآن کی آواز پہلی آواز تھی جس نے دنیا کے مذاہب اور اُن کی سوسائٹی کے ابتر نظام میں نیا انقلاب پیدا کر دیا اور اقوام و اُمم نے بعجلت یا بہ دیر، اعتراف و اقرار کے ساتھ یا حاسدانہ انکار کے ساتھ مذہب اور سوسائٹی دونوں میں اسی کی اصلاحات کو اپنایا اور قبولِ اصلاحات کے بغیر آنے والی دنیا میں اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکے۔

توحیدِ کامل اور خالص خدا پرستی، نسل و خاندان یا کفارہ کی جگہ خدا پرستی اور نیک عملی پر مدارِ نجات، نسلی غرور و تفاخر کا انہدام، کاسٹ سسٹم کا خاتمہ، حقوقِ انسانیت میں تمام افرادِ انسانی کی مساوات، اخوتِ عام کی داغ بیل، رواجی غلامی کے خلاف اصلاح و انقلاب کی تشکیل، عورتوں کے لیے حقوقِ انسانیت میں مساوات کا اعلان اور حقوقِ صنفی میں امتیازی احکامات، انقلاب و اصلاح، وراثت، ازدواجی زندگی میں ظالمانہ رواج کا خاتمہ اور جدید مفید اصلاحات (خلع و طلاق وغیرہ) زکوٰۃ کے وجوب، سود و قمار کی حرمت اور دوسری اصلاحات کے ذریعہ اقتصادی نظام میں بنیادی انقلاب، انفرادی اور اجتماعی ملکیت کی تسلیم اور دونوں کے مابین تجدیدی اعتدال کا اعلان سیاسی اور مُلکی نظام میں بادشاہت

[1] اس مسئلہ کے حوالجات آئندہ تعلیم الاسلام اور مسئلہ خاتم النبیین کے بحث میں ذکر ہوں گے۔

شخصی اور پارٹی اقتدار کے خاتمہ کے ساتھ شورٰوی نظام کی تشکیل ایسے اہم امور ہیں کہ آج کی دنیا میں ہر ایک انصاف پسند عاقل کے نزدیک ان کی صداقت وافادیت تسلیم ہے اور اگر یہ صحیح ہے تو بلاشبہ یوروپ و ایشیا میں افریقہ و امریکہ میں سوسائٹی کے نظام اور مذہب و دھرم کی اصلاح کے نام سے جو صدائیں بھی اس تعلیم اور اعلانِ حق کے بعد اٹھیں اگر بغیر کسی تعصب کے تاریخی انقلابات پر غور کیجئے گا تو ان میں بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی صدا کی بازگشت پائیں گے جو چھٹی صدی عیسوی میں فاران کی چوٹی سے بلند ہوئی اور جس نے وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ کو تاریخِ عالم میں سچ کر دکھایا۔

تاریخی حقائق کی اس روشنی میں اب پھر ہم کو گذشتہ مضمون کی جانب واپس جانا چاہئے کہ جبکہ مادی استعدادات نشو و نما پا رہے تھے اور چند صدیوں بعد جو قوموں کے انقلابات و اصلاحات کے لیے چند برسوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں، مادی اسباب کی بدولت یہ سارا کارخانۂ عالم ایک کنبہ بن جانے والا تھا۔ اس وقت از بس ضروری ہوا کہ "وحدتِ مذہب" کی روحانی صدا بلند ہو اور اس کی صدائے حق کسی خاص قوم اور ملک کی بجائے کائنات کے ہر گوشہ کے لیے یکساں حیثیت رکھے۔

پس منشائے تقدیرِ الٰہی یہ ہوا کہ ایسے پیغام اور پیغامبر کی نصرت و حمایت کے لیے ازل ہی میں انبیاء و رُسل سے عہد و میثاق لیا جائے اور ان کو مُطلع کیا جائے کہ جب وہ پیغامِ کامل اور آخری "صدائے حق" بلند ہو جس کا تعلق رہتی دنیا تک تمام کائناتِ ارضی کے ساتھ یکساں طور پر وابستہ ہے تو وہ اور اُن کی اُمتیں اس کو قبول کریں اور اُس کی مدد فرض سمجھیں کیونکہ کائناتِ روحانی کا یہی مرکزِ وحدت اور نقطۂ رسُل اعلیٰ ہے چنانچہ یہی وہ عہد میثاق ہے جس کو تمام اُمتوں نے اپنے اپنے دور میں اپنے پیغمبروں اور نبیوں کی معرفت "بشارات" کی شکل میں سنا اور آج بھی دنیا کے تمام مذاہب و ادیان میں خواہ وہ امتدادِ زمانہ کی بنا پر شرک کی آلودگیوں سے قطعاً منحرف ہو چکے ہوں، ان میں تحریف

صداقت کا امتزاج قریبی دور سے وابستہ ہو۔ اوتار یا نبیِ مرسل کی معرفت کے ساتھ ایک "منتظرہستی" کا مشترک عقیدہ پایا جاتا ہے، "یہودِ مسیح" کے علاوہ بھی "ایلیا" یا وہ نبی کہہ کر اس کی آمد کے منتظر ہیں، نصاریٰ بھی ہر قسم کی تحریف کے باوجود مسیح کے بعد فارقلیط (پیر اکلیوطاس) بمعنی (احمد) یا "روحِ حق" یا "ناصر" وغیرہ صفات کے تعارف سے اسی کے انتظار میں ہیں۔ مجوس آج تک ایک "نجات دہندہ" کا انتظار کر رہے ہیں اور ویدک دھرم (سناتن دھرم) ہندوؤں میں بھی ایک "اوتار" کا انتظار ہو رہا ہے۔ اور آج عقلیت کے نام پر اس "ہستیِ منتظر" کے عقیدہ کو کتنا ہی مضحکہ خیز سمجھا جائے اور خود مذہبی افراد اپنے اپنے مذہب کے اس عقیدہ کو کیسا ہی غیر معقول کیوں نہ ٹھہرائیں لیکن ان کے پاس اس کا جواب کچھ نہیں ہے کہ مذاہب وادیان کے موجودہ اختلافات کے باوجود چھوٹے سے ناستک گروہ کو چھوڑ کر ہزارہا برس کائناتِ انسانی میں اس عقیدہ کا کسی نہ کسی شکل میں مشترک عقیدہ بنا رہنا اس کے "حقیقت" ہونے کی ناقابلِ انکار دلیل ہے البتہ یہ بات جدا ہے کہ جس طرح یہود نے ازراہِ حسد مسیح ہدایت کے انتظار کے باوجود "حضرتِ عیسیٰ (علیہ السّلام) کو قبول نہ کیا اسی طرح مذاہبِ عالم کی اقلیت کو چھوڑ کر جو حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئی ان کی اکثریت نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قومی وملکی عصبیت اور گروہ بندی کی بندشوں کی وجہ سے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا یا ان کی دعوتِ حق کو عرب کے لیے محدود قرار دے کر خود کو اس سے علیحدہ کر لیا۔

بہرحال ہندوستان کا قدیم مذہب چونکہ حقیقتِ مذہب کو فراموش کر چکا اور اس کی موجودہ شکل نے کسی طرح قدیم شکل وصورت کو بدل کر نیا رُخ اختیار کر لیا اور اس کی تاریخ خود اس کے اپنے پاس بھی نہیں ہے اور اب اس کی تمام بنیاد صرف آبائی رسوم پر یا چند مخصوص فلسفیانہ عقائد پر قائم ہے اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ "منتظر ہستی" کے متعلق جو روایات رکھتے ہیں ان کی اصل حقیقت کیا تھی اور یہی حال بدھسٹ کا بھی ہے اسی لیے

ہم ابوریحان بیرونی اور بعض دیگر مفسروں اور مؤرخوں کے اُن بیانات سے قطع نظر کرتے ہیں جو انھوں نے ہندوؤں کے عقیدۂ "کلنکی اوتار" کے "شنبلی" میں نزول کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر منطبق کرنے کی سعی کی ہے۔

اور یہاں صرف یہود و نصاریٰ پر نازل کتبِ سماویہ تورات، زبور اور انجیل سے ہی اُن بشارات کو پیش کر دینا مناسب سمجھتے ہیں جن میں تحریف کے باوجود اب بھی اصل کتاب کی چمک باقی ہے اور علمائے یہود و نصاریٰ کے پاس انطباق کے انکار کی مُوجّہ دلیل موجود نہیں ہے چنانچہ حضرت مولانا رحمت اللہ (نور اللہ مرقدہٗ) کی میزان الحق اور حافظ ابن قیم کی ہدایۃ الحیاری اور باجہ جی زادہ کی الفارق وغیرہ کتب سے اور ان مناظراتِ مطبوعہ سے ظاہر ہوتا ہے جو علماءِ نصاریٰ اور علماء اسلام کے درمیان ان بشارات سے متعلق پیش آئے ہیں اور جن کے متعلق بعض علماء نصاریٰ کو اقرار و اعتراف کے ماسوا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا۔

تورات اور بشارات | تورات کتاب استثناء میں ہے :-

> خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی طرف کان دھریو، اس سب کی مانند جو تُو نے خداوند اپنے خدا سے حوریب میں مجمع کے دن مانگا اور کہا کہ ایسا نہ ہو کہ میں خداوند اپنے خدا کی پھر سنوں اور ایسی شدت کی آگ پھر دیکھوں تاکہ میں مر نہ جاؤں اور خداوند نے مجھے کہا کہ انھوں نے (بنی اسرائیل نے) جو کچھ کہا سو اچھا کیا۔ میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے مُنھ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اُسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔ اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو کہ جنھیں وہ میرا نام لیکر کہے گا نہ سُنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔ لیکن وہ نبی اگر ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اُسے حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے۔ [1]

نشان زدہ جملوں کو غور سے پڑھیے اور پھر ہر ایک جملہ کی حقیقت کو تاریخی روشنی میں دیکھیے تو

۴
۱۵

[1] باب ۱۸، آیت ۲۱-۱۵۔

تاریخ کا بے لاگ فیصلہ ایک اور صرف ایک ہی ہوگا اور وہ یہ کہ اِس بشارت کا مصداق ذات اقدس محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ماسوا دوسری کوئی ہستی نہیں ہے۔

بشارت کا پہلا جملہ یہ ہے: "میں اُن کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا۔" تاریخ کہتی ہے کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں میں بنی اسمٰعیل کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں جو اس کا مصداق بن سکے اور بنی اسمٰعیل میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ماسوا کوئی نبی ہی نہیں ہوا جو موسٰی کی مانند کہلایا جا سکے اور دوسرا جملہ ہے: "میں اپنا کلام اُس کے مُنہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اُس سے فرماؤں گا وہ سب اُن سے کہے گا۔" اِس جملہ کو ایک بار پھر غور سے پڑھئے اور اس کے بعد قرآن کی اُن آیات کا مُطالعہ کیجئے جن میں بعینہٖ یہی صفات نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کیلئے مذکور ہیں:

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ (سورۃ النجم پ ع)	وہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں خدا کی وحی سے کہتے ہیں جو اُن پر وحی کی جاتی ہے۔
فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لُّدًّا ۝ (سورۃ مریم پ ع)	پس بے شبہ ہم نے اس (قرآن) کو تیری زبان پر آسان کردیا تاکہ تو اس کے ذریعہ متقیوں کو بشارت دے اور کج راہوں کو (عذابِ الٰہی سے) ڈرائے۔
وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ۝ وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ ۝ (سورۃ الشعراء پ ع)	اور یقیناً یہ جہانوں کے پروردگار کا اتارا ہوا ہے اس کو روح الامین (جبرئیل) نے تیرے قلب پر اتارا تاکہ تو گمراہوں کو (اعمالِ بد کے نتائج سے) ڈرانے والوں میں سے ہو یہ صاف عربی زبان میں اور اس کا ذکر پہلی کتابوں میں موجود ہے۔

بشارت کے جملوں اور قرآن کی ان آیات کے اسلوبِ بیان کا مطالعہ کرنے کے بعد کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ دونوں کسی ایک ہی ہستی کی صفات کا ذکر ہے، اب تیسرے جملہ کو پڑھئے "جو کوئی میری باتوں کو جنھیں وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سُنے گا تو میں اُس کا حساب اُس سے لوں گا": اور ساتھ ہی ان آیاتِ قرآنی کا مُطالعہ کیجئے:

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ	اور پھر (اے پیغمبر) کیا حال ہوگا اُس دن (قیامت کے دن) جب کہ ہم
وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ۝	ہر ایک اُمت میں سے اُن پر ایک گواہ طلب کریں گے اور تم کو
يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا	ان سب پر گواہ بنائیں گے سو جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی
وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ	اور رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی نافرمانی کی وہ اس دن یہ پسند
بِهِمُ الْأَرْضُ وَلَا يَكْتُمُونَ	کریں گے کاش کر (وہ دھنس جائیں اور) زمین ان کے اوپر برابر ہو جائے
اللَّهَ حَدِيثًا ۝ (سورۂ نساء پ ۵ ع ۶)	اور اس دن یہ اللہ سے کوئی بات بھی پوشیدہ نہ رکھ سکیں گے

غور کیجیے کہ دونوں عبارتوں میں کس درجہ مُطابقت ہے اور سب کے بعد اس فقرے کو باسعانِ نظر دیکھیے، لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے۔" اور پھر قرآن کی اس آیت کو بھی پڑھیے اور فرمائیے کہ کیا یہ دونوں مضامین ایک ہی حقیقت کے دو نقش نہیں ہیں؟

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ۝	اور یہ پیغمبر بعض باتوں کو اپنی جانب سے گھڑ کر ہماری جانب منسوب
لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا	کردے تو بے شبہ ہم اُس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیں اور
مِنْهُ الْوَتِينَ ۝ فَمَا مِنكُم مِّنْ	پھر اُس کی گردن کی رگ کاٹ ڈالیں (قتل کر دیں)
أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ۝ وَإِنَّهُ	اور اُس وقت تم میں سے کوئی بھی اس کو ہماری گرفت
لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ۝ (الحاقہ پ ۲۹ ع ۲)	سے باز نہیں رکھ سکتا۔

توراۃ کی پیش گوئی اور آیاتِ قرآنی کے مسطورۂ بالا تطابق کے بعد تحدی (چیلنج) کے ساتھ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ بشارات میں ذکر کردہ مجموعۂ صفات کا مصداق ذاتِ اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ماسوا کوئی دوسری ہستی تاریخی دنیا میں نہیں پائی جاتی' یہ مجموعۂ صفات نہ حضرت مسیح (علیہ السلام) پر صادق آتے ہیں نہ حضرت داؤد و سلیمان (علیہما السلام) پر اور نہ حضرت زکریا و یحییٰ (علیہما السلام) پر اور نہ دوسرے انبیاءِ بنی اسرائیل پر صادق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب علماءِ یہود سے اس کے متعلق دریافت کیا جاتا ہے تو وہ ایک منتظر ہستی کے مزید انتظار کے ماسوا

دوسرا کوئی جواب نہیں رکھتے اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا مصداق نہ سمجھنے میں بے دلیل انکار اور خموشی کے علاوہ اُن کے پاس اور کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح نصاریٰ بھی حضرت مسیح (علیہ السلام) کو اس بشارت کا مصداق ثابت کرنے میں مجموعۂ صفات کے پیشِ نظر عاجز و درماندہ نظر آتے اور صاف اور واضح باتوں کو دور از کار تاویلات کا جامہ پہنا کر اعترافِ حقیقت سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔

اور تورات استثناء ہی میں حضرتِ موسیٰؑ کا ایک نغمہ باب ۳۱ میں مذکور ہے جو انھوں نے موت سے چند لمحات قبل بحکمِ الٰہی بنی اسرائیل کو سُنایا۔ اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ میدانِ تیہ میں اپنی قوم کو جمع کرو اور خدا کا یہ پیغام سُناؤ کہ جب بنی اسرائیل خدا کے وعدے کے مُطابق شہروں میں جا بسیں گے تو حکومت، تموّل اور رَفاہیت میں بدمست ہو کر خدا کی نافرمانیوں میں مبتلا ہو جائیں گے حتیٰ کہ بُت پرستی سے بھی باز نہیں رہیں گے۔ پس جب اُن کی حالت اِس درجہ ابتر ہو جائے گی تو میں اُن سے خفا ہو جاؤں گا اور اُن سے اپنا مُنہ چھپا لوں گا اور اُس کے بعد میری غیرتِ حق حرکت میں آئے گی اور میں بھی اُن (بنی اسرائیل) کو ایک ایسی قوم کے ذریعہ خفا کروں گا اور ان سے اپنی نعمت (نبوّت) چھین کر اُس قوم کو بخش دوں گا جو اَن پڑھ[1] اور تمدن سے دور، بے عقل، خانہ بدوش ہو گی جس کو تم اور دنیا کی قومیں "متمدن جماعت" نہ سمجھیں گی۔ اُس کے بعد باب ۳۲ میں اس نغمہ کی تکمیل اِن الفاظ کے ساتھ کی گئی ہے :-

"اور اس خدا کو جس نے تجھے صورت بخشی بھول گیا۔ اور جب خداوند نے یہ دیکھا تو ان سے (بنی اسرائیل سے) نفرت کی اس لیے کہ ان کے بیٹوں اور بیٹیوں نے اسے غصہ دلایا، اور

---

[1] کتابِ مقدس کے قدیم نسخوں میں "ان پڑھ" کا لفظ تمام زبانوں میں موجود ہے مگر بعد کے ایڈیشنوں میں اس کی جگہ کہیں "بے عقل" اور کہیں اسی کے مرادف الفاظ پائے جاتے ہیں حاصل اگرچہ پھر بھی وہی رہتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ قرآن میں محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی صفت "اُمّی" اور آپ کی قوم کی "اُمّیین" مذکور ہے جس کا لفظی ترجمہ "اَن پڑھ قوم" ہوتا ہے اس لیے محض اس لیے کہ پیشین گوئی کا یہ صاف تطابق باقی نہ رہے قدیم لفظ کو بدل کر اس قسم کے الفاظ رکھے گئے۔ مختلف ایڈیشنوں کی اس قسم کی لفظی تحریفات کے لیے میزان الحق کا مُطالعہ از بس ضروری ہے۔

اُس نے یہ فرمایا کہ میں اُن سے اپنا مُنہ چھپاؤں گا تاکہ میں دیکھوں کہ اُن کا انجام کیا ہوگا۔ اس لیے کہ وہ کج نسل ہیں ایسے لڑکے کہ جن میں امانت نہیں۔ انھوں نے اس کے سبب سے جو کہ خدا نہیں ہے مجھے غیرت دلائی اور اپنی واہیات باتوں سے مجھے غصہ دلایا۔ سو میں بھی انھیں اُس سے جو گروہ نہیں غیرت میں ڈالوں گا اور ایک اَن پڑھ قوم سے اُن کو خفا کروں گا۔[1]

تم اس بشارت یا پیغمبرانہ پیشین گوئی کے لیے تاریخ ماضی پر نظر ڈالو اور دیکھو کہ بنی اسرائیل کی متمردانہ سرگرمیاں، باغیانہ اور سرکشانہ شر انگیزیاں جب حد سے زیادہ متجاوز ہوگئیں اور انھوں نے مسیحِ ہدایت جیسی جلیل القدر ہستی کو بھی رد کر دیا اور حضرتِ یحییٰؑ جیسے مقدس پیغمبر کو قتل کر ڈالا تو اُن کی جگہ خدا نے کس قوم کو پسند کیا، کس کو شرفِ رسالت سے نوازا اور کس نے ساری کائنات میں حیرت زا انقلاب بپا کر کے سچی خدا پرستی اور نیک عملی کا غُلغلہ بلند کر دیا اور بنی اسرائیل نے کس کے عظمت و جلال کو دیکھ کر حاسدانہ اس کے روکنے کی سعی کی۔ کیا یہ عرب قوم نہیں تھی اور کیا یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس ہستی اور اُن کی قوم نہ تھی جس پیغمبر نے دُنیوی وسائل و اسباب کی نظر میں اُمّی "اَن پڑھ" ہونے کے باوجود متمدن قوموں کے ظالمانہ و جابرانہ تمدن کو فنا کے گھاٹ اُتار کر اس عظیم الشان عادلانہ تمدن کی بنیاد ڈالی کہ ہر قسم کے اسباب و وسائل کے فقدان اور موانع کے باوجود جس کی عظمت و سرعتِ رفتار نے ماہرینِ فلسفۂ تاریخ کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ اسلام کی دعوت و اصلاح اور انقلاب، دنیائے تاریخ کی مُستثنیات میں سے ہے۔ یہی وہ اُمّی اور گلّہ بان قوم تھی جو ایک "اُمّی" کی خدا پرستانہ تعلیمات سے تربیت پاکر چند ہی برسوں میں دنیا کی قوموں کی تربیت و اصلاح کے لیے "بہترین معلم" ثابت ہوئی اور اونٹوں اور بکریوں کے چرانے والے دیکھتے ہی دیکھتے انسانوں کے چرواہے بن گئے اور بنی اسرائیل کی ہمہ قسم کی حاسدانہ اور معاندانہ جدوجہد اس کی راہِ ترقی میں پرِکاہ کی برابر بھی سنگِ راہ نہ بن سکی تو کیا تاریخ کے اِن اُبھرے ہوئے نقوش کے بعد بھی اس انکار کے لیے کوئی گنجائش رہ جاتی ہے کہ توراۃ کی اس پیشین گوئی کا مصداق محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور بنی اسمٰعیل (علیہ السلام) کے ماسوا کوئی اور ہستی ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔

[1] آیت ۱۵–۲۰۔

یہی وہ صاف اور واضح حقیقت ہے جس کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ	(پس میں ان کے لیے رحمت لکھ دوں گا) جو الرسول (محمد صلی اللہ
النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ	علیہ وسلم) کی پیروی کریں گے کہ وہ نبی اُمّی ہوگا (یعنی دنیا کے
مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ	سلسلۂ تعلیم و تعلم کے لحاظ سے اَن پڑھ ہوگا اور) اس کے ظہور
وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ	کی خبر وہ اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھی پائیں گے وہ
وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ	انھیں نیکی کا حکم دے گا اور بُرائی سے روکے گا اور پسندیدہ
الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ	چیزیں حلال کرے گا اور گندی چیزیں حرام ٹھہرائے گا اور
وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ	اُس بوجھ سے نجات دے گا جس کے تلے وہ دبے ہونگے
الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا	اور اُن پھندوں سے نکالے گا جن میں گرفتار ہوں گے تو
بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا	جو لوگ ان پر ایمان لائے اس کے مخالفوں کے لیے روک
النُّوْرَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ مَعَهٗۤ اُولٰٓئِكَ	ہوئے (راہِ حق میں) اُس کی مدد کی اور اُس روشنی کے پیچھے
هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ قُلْ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ	ہوئے جو اُس کے ساتھ بھیجی گئی ہے (یعنی قرآن) سو وہی ہیں
اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعَا	جو کامیابی پانے والے ہیں (اے پیغمبر!) تم لوگوں سے کہو:
الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	اے افرادِ نسلِ انسانی! میں تم سب کی طرف بھیجا ہوا آیا ہوں، وہ
لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ فَاٰمِنُوْا	خدا کہ آسمانوں کی اور زمینوں کی بادشاہت اسی کے لیے ہے،
بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ[1] الَّذِیْ	کوئی معبود نہیں مگر وہی ایک ذات' وہی جلاتا ہے وہی مارتا ہے
یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ	پس اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول اور نبی اُمّی پر کہ اللہ اور

---

[1] اُمّی لفظ اُم کی جانب منسوب ہے جس کے معنی ماں کے ہیں اہلِ عرب یہ لفظ اس شخص کے لیے بولتے ہیں جس نے پڑھا لکھا نہ ہو گویا وہ ماں کے پیٹ سے آج ہی پیدا ہوا ہے اہلِ عرب چونکہ عام طور سے اَن پڑھ تھے اس لیے "اُمّیّین" کہلائے اور پیغمبرِ اسلام نے بھی چونکہ "وحی الٰہی" کے ذریعہ تعلیم و تربیت کے ماسوا دُنیا کے اسبابِ تعلیم و تعلم کے لحاظ سے کسی کے سامنے زانوے ادب تہہ نہیں کیا اس لیے ان کی صفت بھی اُمّی رہی آپ نے خود بھی یہ ارشاد فرمایا ہے: "نحن اُمّة اُمّیة لا نکتب ولا نحسب"

لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ اس کے کلمات (یعنی اس کی تمام کتابوں) پر ایمان رکھتا ہے،
(سورہ اعراف پ ۹ ع) اس کی پیروی کرو تاکہ کامیابی کی راہ تم پر کھل جائے۔

اور تورات استثنا میں ہے:۔

اور یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مرد خدا نے اپنے مرنے سے آگے بنی اسرائیل کو بخشی اور اُس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے اُن پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت اُن کے لیے تھی؛

موسیٰ (علیہ السلام) نے یہ بشارت بھی بنی اسرائیل کو اپنی موت سے قبل ایسی حالت میں سُنائی تھی کہ وہ موسیٰ (علیہ السلام) کی وداعی حالت کو دیکھ کر دل تنگ اور دل گیر ہو رہے تھے اور یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ اب خداوند خدا موسیٰ جیسا کوئی پیغمبر مبعوث نہ کرے گا۔

سینا جو طور کے نام سے مشہور اور وادیِ سینا میں واقع ہے اور زبانِ حال سے شہادت دے رہا ہے کہ آگ کی جستجو کے بہانے موسیٰ کو یہیں خدا سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا تھا اور کَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا " کا مظاہرہ میرے ہی سینہ پر ہوتا رہا ہے اور شعیر (ساعیر یا سراۃ) اس پہاڑی سلسلہ کا نام ہے جو عرب میں سب سے زیادہ طویل اور شام سے یمن تک شمالاً جنوباً پھیلا ہوا ہے اور القدس (یروشلم) کے سامنے ہو کر گزرتا ہے یہیں وہ جگہ ہے جو بیت اللحم کے نام سے آج بھی حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کی ولادتِ مبارک کی گواہ اور بعثتِ مسیح کا مناد ہے اور فاران عبرانی (جبرو) میں عرب کے اُس حصہ کو کہتے ہیں جو حجاز کے نام سے مشہور ہے یہی مقام اُس وادیِ غیر ذی زرع (بن کھیتی کی سرزمین) کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے جس کو مکہ کہتے ہیں اور جو بہت مشہور و معروف ہے اور مقام ولادت و بعثت ہے خاتم الانبیاء محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا۔

اس تفصیل کے بعد پیشین گوئی کا مطلب واضح ہے حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا؛

خدائے برتر کی صداقت وہدایت کا پیغام نورِ ہدایت بن کر سینا سے حضرتِ موسیٰ ؑ کی شکل میں نمودار ہوا اور سراۃ (شعیر) پر حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کی صورت میں طلعت افروز ہوا اور فاران پر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رُخِ انور بن کر جلوہ گر ہوا۔

فراعنۂ مصر کی طویل و مدید غلامی سے اِس خانوادۂ نبوت (بنی اسرائیل) کے قلوب میں یاس و حرمان نے ایسی جگہ کر لی تھی کہ اب ان کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اس بنجر زمین پر خدا کی رحمت کی بارش ہوگی اور تو بر تو حجابہائے تاریک سے "نورِ ہدایت" اپنی نمود دکھلائے گا اسلیے حضرتِ موسیٰ ؑ کی صدائے حق گویا نورِ ہدایت کی وہ نمود تھی جس نے صدیوں بعد پھر اُن کے گھرانے پر رُونمائی کی اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد اگرچہ بہت انبیاء علیہم السلام احیائے حق کے لیے مبعوث ہوئے مگر حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کے وجودِ گرامی نے جس شان و عظمت کے ساتھ اس درمیان کی پیداشدہ اندھیاریوں کا پردہ چاک کر کے ہدایت و رشد کی روشنی چمکائی گویا وہ طلوع تھا اس نورِ ہدایت کا جو حضرتِ موسیٰ ؑ کی حیاتِ طیبہ میں اپنی نمود دکھا چکا تھا اور جس کے ذریعہ آسمانِ ہدایت کے افق میں صبحِ سعادت نے شبِ ظلمت سے جھانکنا شروع کر دیا تھا اور تاریخ شاہد ہے کہ یہی نورِ ہدایت بنی اسرائیل سے منتقل ہو کر جب بنی اسمٰعیل تک پہنچا تو خاتم الانبیاء محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اس طرح جلوہ گر ہوا کہ فاران کی چوٹیوں سے جب اس کی کرنیں کائنات کے چہار جانب پھیلیں تو تمام عالمِ انسانی کو روشن و منور بنا دیا اور ظلمتِ شرک و کفر کو مٹا کر نورِ توحید سے ہر گوشۂ عالم کو تاباں و درخشاں کر دیا چنانچہ توراۃ میں مذکورہ اس حقیقت کو قرآنِ عزیز نے اس سے زیادہ بہتر اور معجزانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ ادا کیا ہے:-

وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۙ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۙ	شاہد ہے (وہ مقام جو مرکز ہے) انجیر و زیتون کے باغوں کا
وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۙ لَقَدْ خَلَقْنَا	(یعنی حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کا مقامِ ولادت "بیت اللحم" اور شاہد ہے
الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۡ ثُمَّ	طورِ سینا اور شاہد ہے یہ بلدِ امین مکہ۔ یقیناً ہم نے انسان کو بہترین
رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ	مخلوق بنایا پھر اُس کو انتہائی پستی میں پھینک دیا سوا اُن انسانوں کے

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جو ایمان لائے اور کام کئے نیک پس اُن کے لیے اجر ہے بے منت
اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ (سورۃ التین پ ۳۰) (یعنی خدا کا فضل اور رضا اور جنت)

الواو للشهادة، واؤ کا استعمال شہادت کے لیے بھی ہوتا ہے' عربیت کا مشہور قاعدہ ہے اور اس قسم کی شہادت اکثر ایسے مواقع کے لیے مخصوص ہے کہ متکلم جس حقیقت کو ظاہر کرنا چاہتا ہے مختلف وجوہ کی بنا پر مخاطب کو اس کے سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے تب بعض بدیہی اور محسوس مثالیں دے کر مخاطب کے لیے اس حقیقت کا سمجھنا آسان بنا دیتا ہے سورۂ والتین کی آیات میں بھی صورت حال ایسی ہی ہے اس لیے کہ بتلانا یہ مقصود ہے کہ خدائے تعالیٰ نے انسان کو بہترین مخلوق بنایا ہے اس کے باوجود اگر سچا خدا پرست اور نیک کردار نہیں ہے تو انجام کار وہ انتہائی پستی میں پھینک دیا جائے گا اور اس کی حقیقت چوپاؤں سے بھی بدتر ہو جائے گی اولٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ۔ مگر یہ کہ سچا خدا پرست اور نیک اعمال ثابت ہو تو پھر انسانیت کے بلند سے بلند درجہ کا مستحق اور بے حساب و بے منت خدا کی نعمتوں کا مستوجب ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات کافی تفکر و تدبر کی محتاج ہے' ایک ہستی تمام مخلوقات سے اپنی تخلیق و تکوین میں احسن بھی ہو اور پھر قعرِ مذلت کی گہرائیوں میں بھی پھینک دی جائے اس لیے بطور شہادت نہایت لطیف پیرایہ میں تین مشہور اور نمایاں دورِ ہدایت کا ذکر کر کے اس جانب توجہ دلائی کہ "اگر تاریخ کا مقصد یہ ہے کہ ماضی کے آئینہ میں مستقبل کی تصویر دیکھی جا سکے تو ان ہر سہ ادوارِ تاریخ کا مطالعہ کرو اور دیکھو کہ خدائے برتر نے کائنات کی رشد و ہدایت کا شرف "انسان" ہی کو بخشا اور پھر غور کرو کہ وہ بھی انسان ہی تھے جنھوں نے خدا کے پیغمبروں کی پیروی میں سچی خدا پرستی اور نیک عملی اختیار کی اور نتیجہ یہ نکلا کہ روزِ قیامت کے فیصلہ سے قبل بھی اسی دنیا میں انھوں نے عزت' شرافت' حکومت سب کچھ پایا اور آخرت کا اجر تو بے منت و بے حساب الگ رہا اور وہ بھی انسان ہی تھے جو سرکشی' بغاوت اور پیغمبرانہ تعلیم کے خلاف فساد انگیزی کی بدولت آخرت سے پہلے ہی ذلت و رسوائی اور ہلاکت و بربادی کے قعرہائے مذلت سے دوچار ہوئے اور جہنم کے اسفل سافلین سے

جو واسطہ آئندہ پڑنے والا ہے وہ جُدا ہے پس اگر ان حقائق کو پیشِ نظر رکھو گے اور تاریخِ ماضی کے ان اوراق کو دیدۂ عبرت سے دیکھو گے تو پھر تمہاری یہ حیرت، اعترافِ حقیقت سے بدل جائے گی اور آئینۂ عقل وفکر میں یہ سب کچھ روشن ہو جائے گا۔ توراۃ کی بشارت کے یہ الفاظ بھی خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہیں:۔

"وہ دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اُس کے داہنے ہاتھ میں آتشی شریعت اُن کے لیے تھی"

قابلِ توجہ اس لیے ہے کہ جب ہم تاریخ کے اس واقعہ کا مطالعہ کرتے ہیں کہ رمضان ۸ھ ہجری مطابق جنوری ۶۳۰ء میں فتحِ مکہ کی غرض سے جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) روانہ ہوئے ہیں تو دس ہزار صحابہ (رضی اللہ عنہم) جلو میں تھے اور آتشی شریعت یعنی "جہاد بالسیف کا حکمِ الٰہی ...... ان کے ہاتھ میں تھی" تو قدرتِ الٰہی کے اِس اعجاز کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ جس ذات برتر نے موسیٰ (علیہ السلام) کی لسانِ حق سے ان جملوں کو ادا کرایا۔ اُسی نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اس کو کر دکھایا۔ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ تو کیا کسی حق پرست حق آگاہ کو ذرا سا بھی تامل ہو سکتا ہے کہ بلاشبہ موسیٰ (علیہ السلام) کی بشارت کا مصداق خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذاتِ گرامی ہے۔

توراۃ کی یہ اور اسی قسم کی دوسری بشارات ہیں جن کے پیشِ نظر بعثتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے صدیوں پہلے یہود کو نبی آخر الزماں کا انتظار تھا اور وہ یہ یقین رکھتے تھے کہ اب وہ وقت دور نہیں ہے کہ نورِ ہدایت "آفتابِ عالمتاب" بن کر جلوہ گر ہونے والا ہے، اسی لیے جب کبھی ان کے اور مشرکین کے درمیان جنگ پیش آجاتی تو کہا کرتے تھے کہ وہ وقت قریب آرہا ہے کہ نبی آخر الزماں مبعوث ہوں گے اور ہم اُن پر ایمان لا کر اُن کی قیادت میں تم سے حق و باطل کی جنگ کریں گے اور کامیاب ہوں گے چنانچہ جب قومی اور نسلی تعصب اور بغض وحسد کی بنا پر انھوں نے آفتابِ ہدایت کی روشنی سے منہ پھیر لیا اور آنکھیں بند کرلیں تو قرآنِ عزیز نے اُن کو (یادِ ایام) کے ساتھ ملزم ومجرم بناتے ہوئے یہ کہا۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ چنانچہ جب ایسا ہوا کہ اللہ کی طرف سے ان کی ہدایت کے لیے

عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا	ایک کتاب نازل ہوئی اور وہ اس کتاب کی تصدیق کرتی تھی جو
مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ	پہلے سے ان کے پاس موجود ہے تو باوجودیکہ وہ (تورات کی
قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى	پیشنگوئیوں کی بنا پر اس ظہور کے منتظر تھے اور) کافروں کے
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا	مقابلہ میں اس کا نام لے کر فتح و نصرت کی دعائیں مانگتے تھے،
جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا	لیکن جب وہی جانی بوجھی ہوئی بات سامنے آ گئی تو صاف انکار
كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ	کر گئے اور مخالفت پر کمر باندھ لی پس ان لوگوں کے لیے جو دیدہ و
عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ (سورۂ بقرہ ۱۱ع)	دانستہ کفر کی راہ اختیار کریں اللہ کی لعنت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ایک دفعہ قبیلۂ غطفان اور یہود کے درمیان جنگ ہوئی تو خیبر کے یہود اُن کے مقابلہ میں فتح و نصرت کے لیے یہ دعا مانگتے تھے[1]

اللھم انا نسئلك بحق محمد النبی	خدایا! ہم تجھ سے اس نبی اُمّی کا واسطہ دیکر دعا مانگتے ہیں جس کے
الامی الذی وعدتنا ان تخرجه فی	متعلق تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ وہ آخر الزماں ہوں گے:
آخر الزمان ان تنصرنا علیھم۔	کہ تو ہم کو ان پر فتح و نصرت عطا فرما۔

اور علی ازدی سے منقول ہے کہ یثرب (مدینہ) کے یہود ہمارے مقابلہ کے وقت اکثر یہ دعا کرتے تھے،

اللّٰھم ابعث ھذا النبی یحکم	خدایا! اس نبی موعود کو مبعوث فرما جو ہمارے اور لوگوں (مشرکین)
بیننا وبین الناس۔	کے درمیان حق کا فیصلہ کر دے[2]

اور عقبۂ ثانیہ میں جب مدینہ کے ستر اشخاص آپؐ سے دعوتِ اسلام کی حقیقت معلوم کرنے آئے اور آپؐ نے اُن پر حقیقتِ حال ظاہر فرمائی تو انھوں نے اسی وقت ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، بلاشبہ یہ وہی پیغمبر ہیں جن کی بعثت سے متعلق ہم اکثر یہودی علماء سے سُنا کرتے ہیں[3] اور کیا اس تاریخی پہلو سے اُن نقول کی صداقت پر روشنی نہیں پڑتی کہ جب رومیوں کے ہاتھوں بنی اسرائیل کی آخری اور فیصلہ کُن تباہی عمل میں آئی تو آخر شام، فلسطین، شرقِ اردن

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۲ عن بیہقی۔ [2] بدائع الفوائد جلد ۲ از مسند بزار۔ [3] تفسیر ابن کثیر جلد ۱۔

یمن جیسے شاداب وزرخیز علاقوں کو چھوڑ کر وہ کون سی اہم وجہ تھی جس نے یہود کے نمایاں اور مشہور قبائل بنو قریظہ اور بنو نضیر (وغیرہ) کو یثرب اور نواحِ یثرب میں آباد ہونے کی ترغیب دی، یقیناً صرف ایک ہی وجہ تھی اور وہ یہ کہ انھوں نے حضرت موسیٰؑ اور ان کے بعد اپنے انبیاءؑ کی بشارات میں یہ بھی سُنا تھا کہ اس "منتظر ہستی" کا ظہور یثرب اور نواحِ یثرب میں ہوگا۔ مگر وائے بدبختی کہ قبولِ حق کا سب سے بڑا مانع اُن کو یہ پیش آیا کہ قومی جاعتی اور نسلی حسد نے اُن کو اس کی اطاعت سے باز رکھا۔ حتیٰ کہ جب انصار (رضی اللہ عنہم) میں سے بعض حضرات علماءِ یہود کے سامنے یہ کہہ گزرتے کہ ہم نے تو اس نبی اُمّی پر ایمان لانے کی بات سب سے پہلے تمہاری ہی زبانی سُنی تھی اور اس کے ظہور سے قبل تم ہی اس کے چرچے کیا کرتے اور اُن کتابوں سے متعلق بشارات سنایا کرتے تھے پھر اب کیا ہوا کہ جب اس کا ظہور ہوا تو تم انکار کر بیٹھے تو وہ علانیہ جھوٹ بول دیتے اور کہتے کہ ہم کو یاد نہیں کہ کب ہم نے تم سے ایسی باتیں کہی تھیں۔[1]

توراۃ کی طرح عہد نامۂ جدید (اناجیل) میں بھی تحریفِ لفظی و معنوی کے باوجود نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت سے متعلق یہ بشارات ملتی ہیں۔ متی کی انجیل میں ہے:

لیکن بہت سے اول آخر ہو جائیں گے اور آخر اول۔ کیونکہ آسمان کی بادشاہت اس گھر کے مالک کی مانند ہے جو سویرے نکلا تاکہ اپنے انگوری باغ میں مزدور لگائے اور اُس نے مزدوروں سے ایک دینار روز ٹھہرا کر انھیں اپنے باغ میں بھیج دیا۔ پھر پہر دن چڑھے کے قریب نکل کر اُس نے اوروں کو بازار میں بیکار کھڑے دیکھا۔ اور اُن سے کہا تم بھی باغ میں چلے جاؤ جو واجب ہے تمھیں دوں گا پس وہ چلے گئے پھر اُس نے دوپہر اور سہ پہر کے قریب نکل کر ویسا ہی کیا اور کوئی ایک گھنٹہ دن رہے پھر نکل کر اوروں کو کھڑا پایا اور اُن سے کہا تم کیوں یہاں تمام دن بیکار کھڑے رہے۔ انھوں نے اُس سے کہا اس لیے کہ کسی نے ہم کو مزدوری پر نہیں لگایا۔ اُس نے اُن سے کہا۔ تم بھی باغ میں چلے جاؤ، جب شام ہوئی تو باغ کے مالک نے اپنے کارندے سے کہا کہ مزدوروں کو بلاؤ اور پچھلوں سے لیکر پہلوں تک انھیں مزدوری دیدو۔ جب وہ آئے جو گھنٹہ بھر دن رہے

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۱۔

لگائے گئے تھے تو انھیں ایک ایک دینار ملا جب پہلے مزدور آئے تو انھوں نے یہ سمجھا کہ ہمیں زیادہ ملے گا اور ان کو بھی ایک ہی دینار ملا تو گھر کے مالک سے یہ شکایت کرنے لگے کہ ان پچھلوں نے ایک ہی گھنٹہ کام کیا ہے اور تو نے انھیں ہمارے برابر کر دیا جنھوں نے (ہم نے) دن بھر کا بوجھ اٹھایا اور سخت دھوپ سہی ۰ اس نے جواب دے کر اُن میں سے ایک سے کہا: میاں میں تیرے ساتھ بے انصافی نہیں کرتا، کیا تیرا مجھ سے ایک دینار نہیں ٹھہرا تھا جو تیرا ہے اُٹھالے اور چلا جا، میری مرضی یہ ہے کہ جتنا تجھے دیتا ہوں اس پچھلے کو بھی اتنا ہی دوں ۰ کیا مجھے روا نہیں کہ اپنے مال کو جو چاہوں سو کروں؟ یا تو اس لیے کہ میں نیک ہوں بُری نظر سے دیکھتا ہے ۰ اس طرح آخر، اول ہو جائیں گے اور اول آخر ۰

اِس بشارت میں حضرتِ مسیح (علیہ السلام) نے مثالی رنگ میں اقوام و اُممِ عالم کی عملی زندگی اور خدا کی جانب سے ان پر اجر و ثواب کا مرقع پیش فرمایا ہے پہلے مزدور حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) سے قبل کی دنیا کے لوگ ہیں اور دوسری جماعت سے حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کی اُمت بنی اسرائیل مراد ہیں تیسرا گروہ نصاریٰ ہیں اور چوتھی جماعت خاتم الانبیاء محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اُمت ہے، کائناتِ ارضی کی عمر کے لحاظ سے پہلی، دوسری اور تیسری جماعت کے مقابلہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اُمت کا زمانۂ حیات یوں سمجھئے گویا دن کا آخری حصہ ہے اور اجر و ثواب میں اس آخری اُمت کو پہلی اُمتوں کے مقابلہ میں برابر کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے یہاں ان کو دوسری تمام اُمتوں پر برتری حاصل ہے اس لیے کہ اگرچہ ان کا وجودِ حیات اُمتوں کے آخر میں ہوا ہے لیکن چونکہ یہ خدا کے آخری پیغام قرآن کی حامل اور خیرِ انبیاء و رسل کی اُمت ہیں اور تمام اُمتوں سے اُن ہی کے رسول پر ایمان لانے کا وعدہ و میثاق لیا گیا ہے لہٰذا حیاتِ دنیا کے لحاظ سے گو اُن کا زمانہ آخر ہے مگر مرتبہ اور عظمت کے اعتبار سے وہ سب سے اول ہیں یہی ہے مُراد بشارت کے پہلے اور آخری جُملہ کی یعنی بہت سے اول آخر ہو جائیں گے اور آخر اول اور اس طرح آخر اول ہو جائیں گے اور اول آخر ۔"

نبی آخرالزماں (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی ٹھیک اسی طرح ایک مثال بیان فرمائی ہے جو بخاری میں منقول ہے :-

دوسری اُمتوں کے مقابلہ میں دنیا کے اندر تمہاری مثال ایسی ہے جیسا کہ دن کے طویل عرصہ میں عصر (شام) سے غروب آفتاب کے وقت کی اہلِ تورات (یہود) کو تورات عطا کی گئی اور انھوں نے اس پر عمل کیا حتیٰ کہ وہ دوپہر ڈھلے عاجز رہ گئے (یعنی خدا کی تعلیمِ حق کو فراموش کر بیٹھے) تب ان کو مالک نے ایک قیراط مزدوری دیدی اور پھر اہلِ انجیل (نصاریٰ) کو کام پر لگایا اور انھوں نے دوپہر ڈھلے سے عصر (شام) تک کام کیا اور پھر وہ بھی عاجز رہ گئے تب اُن کو بھی مالک نے ایک ایک قیراط مزدوری دیدی، آخر میں ہم کو قرآن ملا اور ہم نے دنیا کی زندگی کے دن غروب ہونے تک کام کیا۔ تب مالک نے ہم کو دو دو قیراط عطا کیے اس پر پہلوں نے شکایت کی کہ ہم نے زیادہ محنت کی مگر تو نے اُن کو اور ہم کو برابر کر دیا، مالک نے کہا میں نے تمہاری مزدوری میں سے تو کم نہیں کیا۔ تب مالک نے فرمایا: تو پھر میری یہ مرضی ہے کہ میں اپنے پاس سے جس کو چاہوں (مزدوری کی کیفیت و نوعیت کے فرق اور کام کی صلاحیت و استعداد کے پیشِ نظر) زیادہ دوں۔ "فھو فضل اوتیہ من اشاء"

اور اُمم ماضیہ و اقوام سابقہ کے مقابلہ میں اُمتِ محمدیہ کی یہی فضیلت ہے جس کو قرآن نے بصراحت اِس معجزانہ اسلوب میں بیان کیا ہے :-

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (سورۂ آلِ عمران پ ۴ ع)	تم (تمام امم و اقوام میں) بہترین اُمت ہو جو کائنات انسانی (کی خدمت) کے لیے وجود میں لائی گئی ہے، تم لوگوں کو بھلائی کا حکم کرتے ہو اور بُرائیوں سے باز رکھتے ہو۔

بہرحال آخری جماعت کا اوّل ہو جانا اگر اس کا مصداق اُمتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہیں تو اور کون ہے جس کا ذکر توراۃ کی ان بشارات میں ہو رہا ہے اور جس کی تصدیق نبی اُمی اور قرآن دونوں کر رہے ہیں، عقلاً بھی یہ فرقِ مراتب واضح ہے اس لیے کہ جبکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام

انبیاء و رسل کے بعد مبعوث ہوئے اور آپ کے قبول کرنے والوں میں آپ کی قوم سے بھی زیادہ دنیا کی دوسری اقوام و امم کے افراد شامل ہیں تو یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی فرد یا جماعت پہلے سے کسی مذہبی جماعت میں شامل ہے تو اس کے لیے جدید دعوتِ حق کو قبول کرنے میں قومی، جماعتی اور نسلی عصبیت و غرور سب سے بڑی رکاوٹ بن کر سامنے آجاتا ہے پس جو شخص اس رکاوٹ کو پاؤں تلے روند کر دعوتِ حق پر لبیک کہتا ہے وہ بلاشبہ اس کا مستحق ہے کہ اپنے اپنے زمانہ میں پہلی صداقتوں پر ایمان لانے والوں کے مقابلہ میں اس کو دوچند بلکہ چند در چند اجر و ثواب عطا ہو۔

اور انجیل یوحنا میں ایک بشارت اس طرح مسطور ہے

اور یوحنا کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے "کاہن" اور "لیوی" یہ پوچھنے کو اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے۔ تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں انھوں نے اس سے پوچھا کہ پھر کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا نہیں ہوں کیا تو وہ نبی ہے اس نے جواب دیا نہیں پس انھوں نے اس سے کہا پھر تو کون ہے تاکہ ہم اپنے بھیجنے والوں کو جواب دیں کہ تو اپنے حق میں کیا کہتا ہے[1]؟

اس پیشین گوئی کا تاریخی زمانہ وہ ہے جب حضرت یحییٰ (یوحنا[2] علیہ السلام) اپنی صدائے حق سے بنی اسرائیل کو مسحور کر رہے تھے اور حضرت مسیح علیہ السلام کے ظہور کی بشارت دیتے تھے اس وقت یہود کے مقدسین کی ایک جماعت اُن کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اُس نے یہ سوالات کیے۔

سوالات میں تین پیغمبروں کے متعلق ان سے دریافت کیا گیا کہ وہ اُن میں سے کون ہیں مگر انھوں نے انکار کیا کہ وہ ان تینوں میں سے کوئی نہیں ہیں تو یہ سوالات ظاہر کرتے ہیں کہ

---

[1] باب ۱۹ آیات ۱۹-۲۱۔ [2] یوحنا عبرانی میں حضرت یحییٰ کا نام ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک حواری کا نام بھی ہے جن کی جانب انجیل یوحنا منسوب ہے۔

یہود تین یا دو پیغمبروں کے ظہور کے منتظر تھے حضرتِ مسیحؑ کے، حضرتِ ایلیاؑ[1] کے اور ایک ایسے پیغمبر کے جس کا ذکر ان کے درمیان اس درجہ مشہور تھا کہ انھوں نے سوالات کے وقت دو ناموں کی طرح نام لینا ضروری نہیں سمجھا اور صرف "وہ نبی" کہنا ہی کافی خیال کیا۔

یہ بشارت اس درجہ واضح اور صاف ہے کہ نصاریٰ بجز بے دلیل انکار کے تاریخ کے اِس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہیں کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم "وہ نبی" کا مصداق نہیں ہیں تو پھر کون ہے۔ کیا معاملہ کی صورت یہ نہیں ہے کہ جس طرح یہود، ظہورِ مسیح (علیہ السلام) کے منتظر تھے مگر اُن کی آمد پر ازراہِ حسد اُن کو رد کر دیا، اسی طرح یہود و نصاریٰ دونوں "وہ نبی" کی شہرتِ عام کے پیشِ نظر اس کے ظہور کے سخت منتظر ہونے کے باوجود اس کی بعثت و ظہور کے نسلی و قومی عصبیت کی بدولت منکر ہو گئے چنانچہ اسی حقیقت کو قرآنِ حکیم نے اِس طرح بیان کیا ہے:۔

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ	وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب عطا کی وہ تم کو اس طرح پیغمبرِ حق "
یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْؕ	پہچانتے ہیں جیسا اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور بلاشبہ
وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ	ان میں سے ایک فریق حق کو چھپاتا ہے اور وہ خوب جانتے
وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ○ (سورۃ البقرۃ پ ۲ ع ۲)	ہیں کہ وہ حق کو چھپا رہے ہیں۔

یوحنا کی انجیل میں حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کی وصیت بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کے لیے شاہدِ عدل ہے، فرماتے ہیں:۔

"تم میں سے کوئی مجھ سے نہیں پوچھتا کہ تو کہاں جاتا ہے؟ بلکہ اس لیے کہ میں نے یہ باتیں تم سے کہیں تمہارا دل غم سے بھر گیا۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اُسے

---

[1] کہا جاتا ہے کہ کتبِ قدیمہ میں ایلیا بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت منقول تھی اور اس لیے خواص علماءِ یہود ایلیا اور فارقلیط کو ایک ہی تسلیم کرتے تھے مگر بعد کو تحریفات کی بدولت ایک اور "منتظر ہستی" کا اضافہ ہو گیا اور وہ الیاس علیہ السلام ہیں یہود نے اب یہ گڑھ لیا کہ حضرتِ الیاس کا دوبارہ ظہور ہوگا اور اس لیے اب اناجیل میں بھی دو کی جگہ تین کے ظہور کا ذکر نظر آتا ہے۔

تمہارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راست بازی سے اور عدالت کے بارہ میں قصوروار ٹھہرائے گا۔[۱]

یہ بشارت حضرت مسیح کی وصیت ہے اور تمثیلی استعاروں اور تشبیہوں کی بجائے واضح الفاظ میں ایک موعود پیغمبر کی خبر دیتی ہے اور موعود ہستی کی جن صفات کا اس میں ذکر ہے وہ حرف بحرف خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہیں۔

حضرت مسیح حواریوں اور شاگردوں کو دیکھ رہے ہیں کہ وہ ان کی جدائی سے کس درجہ متاثر ہیں، دل غم سے بھرے ہوئے ہیں آنکھیں پرنم ہیں، حسرت و یاس چہرے سے ٹپک رہی ہے کیوں؟ کیا اس لیے کہ ایک انسان اُن سے جدا ہو رہا ہے نہیں، نہیں بلکہ خدا کا ایک ہادی، نبی و رسول پیغمبر صداقت کی وداعی گھڑیاں قریب ہیں اور اب نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا ایسی مقدس ہستیوں سے بہرہ ور ہوگی یا نہیں کیونکہ منکروں اور باطل پرستوں نے خدا کی اس نعمت کی کوئی قدر نہ کی اور اس کو رد کر دیا۔ اس غم آگیں منظر میں حضرت مسیح (علیہ السلام) اُن کو تسلی و تشفی دیتے اور یقین دلاتے ہیں کہ "میرا جانا تمہارے لیے "فائدہ مند" ہے اور پھر اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اگر میں نہ جاؤں تو وہ "مددگار" تمہارے پاس نہ آئے گا" یعنی میرا کائنات ارضی پر یہ قیام اُس مددگار کی آمد کے لیے تاخیر کا باعث ہو رہا ہے جس کا آنا تمہارے لیے اس درجہ مفید ہے کہ باایں محبت و خلوص میرا جانا ہی تمہارے لیے "فائدہ مند" ہے پھر اس کی معرفت کے لیے مزید باتیں بیان فرمائیں کہ وہ دنیا کو گناہوں (برائیوں) سے باز رکھے گا، راست بازی کا حکم کرے گا اور افراط و تفریط کی ان روشوں کے خلاف جو انسانی دنیا کے ہر حالہ میں رگ و ریشہ کی طرح پھیلی ہوں گی "عدل" سے گریز پر مجرم اور قصوروار ٹھہرائے گا۔

قدرتی طور پر اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ ہستی کون ہے جو ان مجموعۂ صفات کا مصداق بن سکے۔ علماء نصاریٰ کہتے ہیں کہ اس سے مراد "روح القدس" ہے اور وہ حضرت مسیح کے قبر میں جی اُٹھنے اور آسمان پر باپ کے پاس چلے جانے کے بعد شاگردوں پر

نمودار ہوئی لیکن جب اس باطل تاویل پر اُن سے یہ کہا گیا کہ ماضی یا مستقبل میں کون سا زمانہ آچکا ہے یا آئے گا جس پر بشارت کا یہ جملہ صادق آسکے جو دراصل پُوری وصیت کی روح ہے "وہ آکر دنیا کو گناہ سے اور راستبازی سے اور عدالت کے بارے میں قصور وار ٹھہرائے گا" اور کس طرح یہ عبارت صرف اس نور پر صادق آسکتی ہے جو شاگردوں پر (روح القدس) ایک کبوتر کی شکل میں نازل ہو کر دکھلائی گئی۔

یہ وصیت تو اس تاویل کے برعکس صاف یہ ظاہر کر رہی ہے کہ حضرت مسیحؑ ایک ایسے عظیم المرتبہ جلیل القدر پیغمبر کے ظہور کی بشارت سنا رہے ہیں جس کی آمد کائناتِ انسانی کے لیے حضرتِ مسیح (علیہ السّلام) کی موجودگی سے بھی زیادہ سود مند ثابت ہوگی اور جو ایک مرتبہ پھر کائنات کو اس کا بھُولا ہوا سبق یاد دلائے گی اور اس کی تعلیمِ حق کا معیار سرتا سر "عدل" پر مبنی ہوگا کہ یہی تمام اخلاقِ کریمانہ اور شعبۂ حیات کے لیے اساس اور بنیادِ کار ہے اور اس حقیقت پر نظر رکھتے ہوئے جب ہم تاریخی مذاہب سے دریافت کرتے ہیں کہ اس کا مصداق کون ہے تو اس کے ماسوا اور کوئی جواب نہیں ملتا کہ حضرتِ مسیحؑ کے بعد وصیت میں مذکور اوصاف کی مصداق ہستی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ماسوا کوئی ظہور میں نہیں آئی یہی مقدس ہستی ہے جس نے ایسے زمانہ میں جبکہ دنیا کی قوموں اور اُن کی سوسائٹیوں میں عدل ایک بے معنی شے رہ گئی تھی اور جب کہ سچی نیک عملی اور خدا پرستی قومی اور اجتماعی زندگی سے خارج ہو چکی تھی دنیائے انسانی کو یہ پیغام سنایا۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ	بیشک اللہ حکم دیتا ہے "عدل" کا "احسان" کا قرابت داروں
وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ	کے ساتھ سلوک کا اور یقیناً منع کرتا ہے فحش کاموں،
وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ	اور باتوں سے۔ اور بغاوت و سرکشی سے وہ تم کو نصیحت
تَذَکَّرُوْنَ ٥ (سورۂ نحل پ ۱۴ ع ۱۳)	کرتا ہے تاکہ تم نصیحت قبول کرو۔

اور یہی وہ مقدس ہستی ہے جس کے ظہور کی بدولت اس کی اُمت کا مقصدِ حیات یہ ظاہر کیا گیا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (سورۂ آلِ عمران پ ۴ ع ۲)

(اے اُمتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں (کی خدمت) کے لیے عالمِ وجود میں لائی گئی ہے تم لوگوں کو بھلائی اور نیکیوں کا حکم کرتے اور اُن کو برائیوں سے باز رکھنے کی تلقین کرتے ہو۔

مضمونِ وصیت کے اِس نمایاں پہلو کے ماسوا ایک اور روشن اور واضح بات اس وصیت یا بشارت میں وہ جملہ ہے جس میں موعود ہستی کو ایک خاص وصف کے ساتھ یاد کیا گیا ہے۔ یہ وصف اگرچہ جدید ایڈیشنوں میں "مددگار"۔ "وکیل"۔ "معزی" اور "شفیع" ہے، لیکن قدیم یونانی، فرنچ، لیٹن اور انگریزی تراجم میں "پیراکلیتواس" اور عبرانی (جبرو) اور عربی تراجم میں "فارقلیط" پایا جاتا ہے جو عربی لفظ احمد کے ہم معنی اور مرادف ہے۔

یہ بات تو علماءِ نصاریٰ اور ہر ایک تاریخ داں کے نزدیک متفق علیہ اور مُسلَّم ہے کہ موجودہ اناجیل میں سے کوئی ایک بھی حضرتِ مسیح (علیہ السلام) کی اصل انجیل نہیں ہے بلکہ جن ناموں سے یہ منسوب ہیں اُن کے بھی اصل نسخے نہیں بلکہ تراجم ہیں اور یہ کہ متّیٰ کی انجیل کا اوریجنل (اصل) نسخہ قدیم جبرو (عبرانی) زبان میں تھا اس لیے یہ دعویٰ بسہولت کیا جاسکتا ہے کہ اوریجنل نسخہ میں یہ لفظ بلاشبہ احمد ہی ہوگا۔ جیسا کہ سورۂ صف میں قرآنِ عزیز نے حضرتِ مسیح کا یہ قول نقل کیا ہے: "وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ" اور دلیل یہ ہے کہ موجودہ انجیل کے تراجم میں فارقلیط اسی لفظِ احمد کا ہم معنی اور مرادف لفظ اختیار کیا گیا مگر جب علماءِ نصاریٰ نے یہ دیکھا کہ صداقتِ خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کتابِ مقدس سے بصراحتِ تام بہت بڑی دلیل ہاتھ آئی اور علماءِ اسلام کی جانب سے ہم پر قوی حجت قائم ہوئی جاتی ہے تو بعد کے ایڈیشنوں میں لفظِ فارقلیط یا پیراکلیتواس نکال دیا گیا اور اب اس کی جگہ کبھی ناصر (مددگار) کبھی وکیل، کبھی شفیع اور کبھی مُعزّی (تسلی دینے والا) لکھا جانے لگا تاکہ واضح نام کی بجائے ایک ایسی صفت آجائے جس کا اطلاق بغیر کسی تعیین کے ہر ایک ذاتِ حق پر ہو سکے۔ اناجیل کے قدیم و جدید نسخوں اور

پھر قدیم وجدید کے مختلف ایڈیشنوں میں لفظ فارقلیط اور اسی قسم کی دوسری گوناگوں تحریفات کا مطالعہ کرنا ہو تو اس کے لیے میزان الحق اور الفارق کا مطالعہ از بس مفید ہے یہاں اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے کہ انجیل کے عربی تراجم میں مسطورہ بالا الفاظ کی بجائے فارقلیط تھا صرف یہ ایک ثبوت کافی ہے کہ ایک صدی قبل کے عربی نسخہ میں جو لندن سے ۱۸۲۱ء میں شائع ہوا تھا یہ لفظ یوحنا باب ۱۴ آیت ۱۶ میں موجود تھا والطلب من الاب فیعطیکم فارقلیطا آخر

تاہم علماء نصاریٰ کی اس واضح تحریف کے بعد بھی ان کا مقصد حل نہیں ہو سکتا اور ایک مرتبہ اُن سے پھر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس بشارت میں لفظ فارقلیط (احمد) کی جگہ مسطورہ بالا الفاظ میں سے ہی کوئی لفظ سہی مگر جبکہ اس بشارت کا مصداق روح القدس کا کبوتر کی شکل میں شاگردوں پر نمودار ہو جانا کسی طرح نہیں بنتا تو پھر حضرت مسیح (علیہ السلام) کے بعد تاریخ ادیان میں وہ کون سی ہستی ہے جس کو اس کا مصداق سمجھا جائے۔ کیا علماء نصاریٰ اس بے دلیل انکار کے ساتھ کہ اس کا مصداق ذات اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں جرأت کر کے یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں ہستی اس مجموعۂ صفات کا مصداق تھی یا آج ہے یا آئندہ آئے گی۔ نہیں وہ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ان کے پاس اس انکار کے لیے صرف یہی ایک مثبت دلیل ہے کہ روح القدس اس کا مصداق ہے، کاش کہ وہ قدرت بھی رکھتے کہ روح القدس کو انسانی شکل میں کائنات کی ہدایت کے لیے لا سکتے کہ وہ پیغمبرانہ صداقت کے ساتھ لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتی، برائیوں سے روکتی اور عدل ترک کر کے افراط و تفریط کی راہ بد اختیار کرنے پر لوگوں کو قصوروار ٹھہراتی تب شاید اُن کا یہ قول الفاظِ بشارت کی مطابقت کر سکتا۔ ورنہ تو یہ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس بشارت کو ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں تسلیم نہ کرنا صرف نسلی، قومی اور جماعتی گروہ بندی سے پیدا شدہ عصبیت وحسد کا نتیجہ ہے۔

اس سے قطع نظر ہم تسلیم کیے لیتے ہیں کہ مسیح کی انجیل میں احمد (فارقلیط) کی بجائے

مسطورۂ بالا الفاظ ہی میں سے کوئی لفظ تھا تب بھی اس کا مصداق خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ماسوا کوئی نہیں ہو سکتا اس لیے کہ قرآن عزیز نے مختلف مقامات پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اوصاف حمیدہ بیان کیے ہیں وہ ان ہی مسطورۂ بالا الفاظ کے ہم معنی ہیں مثلاً سورۂ توبہ میں آپ کو عزیز، رؤف، رحیم کہا گیا ہے :-

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ	(ایمان والو) تمہارے پاس (اللہ کا) ایک رسول آگیا ہے جو تمہی
مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ	میں سے ہے تمہارا رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بہت شاق گذرتا ہے
مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ	وہ تمہاری بھلائی کا بڑا ہی خواہش مند ہے وہ ایمان والوں کے
بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ	لیے شفقت رکھنے والا، رحمت والا ہے (اے پیغمبر!) اگر اس
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ	بھی یہ لوگ سرتابی کریں تو ان سے کہہ دو میرے لیے اللہ کا
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ	سہارا بس کرتا ہے کوئی معبود نہیں ہے مگر صرف اس کی ذات
وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ	میں نے اس پر بھروسہ کیا وہ تمام عالم ہستی کی جہانداری کے عرش
(توبہ پ ۱۱ ع ۶)	عظیم کا خداوند ہے۔

اور سورۂ انبیاء میں ارشاد ہے :-

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (انبیاء ع ۷) اور ہم نے تجھ کو نہیں بھیجا مگر جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر۔

اور اگر صحیح احادیث کی تصریحات کو بھی ان آیات کی تفسیر کے طور پر شامل کر لیا جائے تب تو اناجیل کے تراجم میں مذکورہ صفات بعینہٖ آپ کو مل جائیں گے مثلاً الشافع المشفع الشفیع، الناصر (مددگار) وغیرہ۔

پھر اسی باب کی آیت ۱۳ کو اس مضمون کے ساتھ اگر ملائیے تو معاملہ اور زیادہ واضح اور صاف ہو جائے گا، حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں :-

لیکن جب وہ سچائی کی روح آئے گا تو تم کو سچائی کی راہ دکھائے گا اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔

غور فرمائیے کیا یہ مضمون "روح القدس" پر صادق آسکتا ہے جس نے چند شاگردوں پر ظاہر ہو کر اپنی نمود دکھلائی یا ایسی ہستی پر جو لوازمِ بشریت سے متصف ہونے کے باوجود کائناتِ انسانی میں رہ کر سچائی کی راہ دکھلائے اور امورِ غیب سے متعلق خدا نے جو کچھ بتلایا ہے:۔

(علاماتِ قیامت، جنت و جہنم، حشر و نشر وغیرہ کی تفصیلات) اس کو مخلوقِ خدا تک پہنچائے اور پھر معلوم کرو تاریخِ ماضی سے کہ حضرت مسیحؑ کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کون آیا جس نے خدا سے بھٹکے ہوئے انسانوں کا رشتہ دوبارہ خدا سے ملایا اور ادیان و ملل کی گم شدہ صداقتوں کو قرآن کے ذریعہ روشن و نمایاں کیا، کیا موافق و مخالف دونوں شہادتیں اس پر متفق نہیں ہیں کہ اس کی قوم دوست و دشمن سب ہی اُس کو "الصادق الامین" کہہ کر پکارتے تھے اور کیا انجیل کا یہ فقرہ "اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا" اور قرآن کی یہ آیت "وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ" وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا، جو کچھ کہتا ہے اُس وحی سے کہتا ہے جو خدا کی جانب سے اتاری جاتی ہے" ایک ہی مقدس ہستی کی تقدیسِ حیات اور صداقتِ قول و عمل کے دو عکس نہیں ہیں پس سچائی کی روح میں لفظِ "روح" سے فائدہ اٹھا کر اور بقیہ تمام مضمونِ بشارت سے آنکھ بند کر کے اس کو "روح القدس" کہہ دینا علمی دیانت ہے؟ ہرگز نہیں۔

غرض وصیت یا بشارت حضرت مسیح (علیہ السلام) کی جانب سے واضح اور صاف اعلان ہے ظہورِ قدسی صفات صلی اللہ علیہ وسلم کا اور اس کا انکار بداہت کا انکار ہے اور تعصب بیجا کی دین۔[1]

بشارات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ باب بہت وسیع ہے اور چھٹی صدی ہجری میں ایک مسیحی عالم سعید بن حسن اسکندرانی نے جب کتابِ مقدس میں ان بشارات کو دیکھ کر اسلام قبول کیا تو محیط النظر ایک مستقل کتاب اسی موضوع پر تصنیف کی اور ہمیشہ سے علماء اسلام بھی اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ لکھتے رہے ہیں، حتیٰ کہ بعض علماء نے ہندوؤں کی قدیم کتابوں اور مجوس کے

---

[1] اس پیشگوئی یعنی فارقلیط سے متعلق مفصل محققانہ بحث کے لیے میزان الحق از مولانا رحمۃ اللہ نور اللہ مرقدہٗ، الفارق، ہدایۃ الحیاریٰ اور رسالہ تہذیب الاخلاق مضمون فارقلیط قابلِ مراجعت ہیں۔

قدیم نوشتوں میں بھی منتظر ہستی سے متعلق جو کچھ مذکور ہے اس کو بشارات الٰہی میں شامل کیا ہے مگر ہم اسی قدر پر اکتفا کرتے ہوئے قرآن عزیز کی اُن آیات پر اس مضمون کو ختم کر دینا چاہتے ہیں جو نزولِ قرآن کے وقت سے یہود و نصاریٰ کے سامنے برابر اعلان کرتی رہی ہیں کہ قدیم سماوی کتابوں میں اس مقدس پیغمبر کا تذکرہ برابر رہا ہے اور چونکہ خدا کی تقدیر یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اس کا آخری اور کامل و مکمل قانون اسی ذاتِ اقدس کے ہاتھوں کائناتِ ہست و بود تک پہنچے گا۔ اس لیے ازبس ضروری تھا کہ اُس کا ذکر پہلے نوشتوں میں ہو تاکہ جب اس کے ظہور کا وقت آپہنچے تو تمام صادق ادیان و ملل سے متعلق اُمتیں میثاق الٰہی کے مطابق اُس پر ایمان لائیں اور اس کی پیش کردہ صداقت اور قانونِ ہدایت "قرآن" کو اپنے لیے راہِ عمل بنائیں چنانچہ سورۂ الفتح میں ارشاد ہے:۔

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ۖ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۖ سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ۚ ذَٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْإِنجِيلِ (الفتح پ ۲۶)

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ (صحابہ) ان کے ساتھ ہیں وہ منکروں پر سخت ہیں اور آپس میں نرم خو ہیں۔ (اے مخاطب!) تو اُن کو دیکھے گا (خدا کے سامنے) جھکنے والے سجدہ کرنے والے اور اس طریقہ سے خدا کے فضل اور اس کی رضا کے خواہش مند ہیں اُن کی نشانی یہ ہے کہ ان کے چہروں (پیشانیوں) پر سجدے کے نشانات ہیں تورات اور انجیل میں ان کا ذکر اسی طرح ہے۔

یہ ذکر انجیل برنابا میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے اور آپ کی صفات بہت نمایاں الفاظ میں مذکور ہیں لیکن وہ نصاریٰ کے نزدیک متروک ہے گر جیسا کہ سابق میں کہا جا چکا ہے اس کا ترک کسی دلیل پر قائم نہیں ہے بلکہ وہ اور بعض دوسری اناجیل کا ترک محض ایک فال کی بنا پر ہوا جو اسی غرض سے نکالی گئی تھی۔

اور سورۂ شعراء میں ہے:۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اور یقیناً یہ (قرآن) جہانوں کے پروردگار کا اُتارا ہوا ہے،
نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى اس کو روح الامین (جبرئیل) نے (خدا کی جانب سے) تیرے
قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ قلب پر نازل کیا تاکہ تو (خدا کے نافرمانوں کو) ڈرانے والوں
بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝ وَاِنَّهٗ لَفِيْ میں سے ہو، صاف عربی زبان میں ہے۔ اور اس کا ذکر
زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (سورۃ الشعراء پ ۱۹ ع ۱۱) پہلوں (گذشتہ پیغمبروں) کی کتابوں میں ہے۔

اور ایک مرتبہ خود نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انہی بشارات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

دعوۃ ابی ابراھیم و (یعنی) میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں اور عیسیٰ مسیح
بشری عیسیٰ۔ کی بشارت ہوں (یعنی) دعاءِ خلیل اور نویدِ مسیحا۔

قرآن عزیز نے دعاءِ ابراہیم (علیہ السلام) کا ذکر اس طرح کیا ہے:۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ اے ہمارے پروردگار! ان (اہلِ عرب) ہی میں سے ایک رسول
يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ بھیج جو اُن پر تیری آیات پڑھے اور ان کو کتاب اور حکمت
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ اِنَّكَ سکھائے اور اُن کو (ہر قسم کی بُرائیوں سے) پاک کرے۔
اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (بقرہ پ ۱ ع ۱۵) بے شبہ تو غالب اور حکمت والا ہے۔

اور بشارتِ مسیح کا ذکر سورۂ صف میں اس طرح منقول ہے:۔

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اور (وہ وقت قابلِ ذکر ہے) جب عیسیٰ بن مریم نے کہا اے بنی اسرائیل
اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا میں تمہاری جانب اللہ کا رسول (ایلچی) ہوں تصدیق کرنے والا ہوں
بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا ۢ تورات کی جو میرے سامنے موجود ہے۔ اور بشارت دینے والا ہوں
بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد
اَحْمَدُ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ (فارقلیط) ہوگا پس جب اُن کے پاس وہ (خدا کا پیغمبر) دلائل
قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ (صف پ ۲۸ ع ۹) لے کر آیا تو یہ کہنے لگے یہ تو کھلا جادو ہے۔

صبح سعادت | تاریخ ادیان و ملل شاہد ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے ظہور پر تقریباً چھ صدیاں گزر چکی ہیں اور معمورۂ عالم خدا کے پیغمبروں کی معرفت حاصل کی ہوئی صداقتِ حق کو فراموش کر چکا ہے، تمام کائنات انسانی خدا پرستی کی بجائے مظاہر پرستی میں مبتلا ہے اور ہر ملک میں نوعِ انسانی سے لے کر نوعِ جمادات تک کی پرستش سرمایۂ نازش بنی ہوئی ہے۔ کوئی انسان کو اوتار (خدا) کہہ رہا ہے تو کوئی خدا کا بیٹا۔ ایک اگر مادہ پرست ہے تو دوسرا خود اپنی آتما (روح) کو ہی خدا سمجھ رہا ہے۔ سورج کی پوجا ہے، چاند اور تاروں کی پرستش ہے، حیوانوں درختوں اور پتھروں کی عبادت ہے، آگ، پانی، ہوا مٹی کے سامنے ناصیہ فرسائی ہے غرض کائنات کی ہر شے پرستش اور پوجا کے لائق ہے اور نہیں ہے تو صرف ذاتِ واحد قابلِ پرستش نہیں ہے نہ اس کی احدیت کا تصور خالص ہے اور نہ صمدیت کا۔ اس کو اگر مانا بھی جاتا ہے تو دوسروں کی پرستش اور عبادت کے ذریعہ، وہ اگر خالق موجودات ہے تو دوسروں کے واسطہ اور احتیاج کے ساتھ مادہ، روح اور ترکیب سب ہی باتوں کا محتاج ہے وہ اگر مالکِ موجودات ہے بھی تو انسان، حیوان، درخت، پتھر کے بل بوتہ پر، غرض ساری دنیا میں اصل کارفرمائی مظاہر کی تھی اور ذاتِ حق "صرف نام کے لیے" حقیقت سے چشم پوشی تھی مگر مجاز کے ساتھ ذوقِ عشق، ذاتِ حق سے بُعد تھا، مگر مظاہر سے قربت سرمایۂ سعادت حق سے بیگانگی تھی مگر مخلوقات کی عبادت گزاری شعارِ عام تھا اور ہر طرف مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللهِ زُلْفَى "ہم اُن کو نہیں پوجتے، مگر اس لیے تاکہ وہ خدا کی جانب ہماری قربت کا ذریعہ بن جائیں" کا مظاہرہ نظر آتا تھا۔

یہی وہ تاریک دور تھا جس میں "سنۃ اللہ" یعنی خدا کے قانونِ ہدایت و ضلالت نے ماضی کی تاریخ کو پھر دہرایا اور غیرتِ حق نے فطرت کے قانون ردِ عمل RE ACTION کو حرکت دی یعنی آفتابِ ہدایت برجِ سعادت سے نمودار ہوا اور چہار جانب چھائی ہوئی شرک و جہالت اور رسم و رواج کی تاریکیوں کو فنا کر کے عالمِ ہست و بود کو علم و یقین کی روشنی سے منور کر دیا۔

۹ ربیع الاول مطابق ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کی صبح، وہ صبح سعادت تھی جب مدنیت و

حضارت سے محروم، بن کھیتی کی سرزمین مکہ کے ایک معزز قبیلہ قریش (بنی ہاشم) میں عبداللہ بن عبدالمطلب کے یہاں آمنہ بنت وہب کے مشکوئے معلٰی سے آفتابِ رسالت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہور کیا۔

خدایا! وہ صبح کیسی سعادت افروز تھی جس نے کائناتِ ارضی کو رشد وہدایت کے طلوع کا مژدۂ جانفزا سنایا اور وہ ساعت کیسی مُبارک و محمود تھی جو معمورۂ عالم کے لیے پیغامِ بشارت دینی، عالم کا ذرہ ذرہ زبانِ حال سے نغمے گا رہا تھا کہ وقت آپہنچا کہ اب دنیائے ہست و بود کی شقاوت دُور اور سعادتِ مجسّم سے عالم معمور ہو، ظلمتِ شرک و کفر کا پردہ چاک ہو اور آفتابِ ہدایت روشن و تابناک ہو۔ مظاہر پرستی باطل ٹھہرے اور خدائے واحد کی توحید مقصدِ حیات قرار پائے۔

دنیا تو کیا ملک، قبیلہ اور خاندان کو بھی یہ علم نہ تھا کہ مذاہبِ عالم جس آفتابِ رسالت کے طلوع ہونے کے منتظر ہیں وہ اس غیر متمدن سرزمین اور عبدالمطلب کے گھرانے سے جلوہ گر ہوگا کہ اس کی ولادت باسعادت کو خاص اہمیت دیتے اور تاریخ ولادت کو اپنے سینہ میں محفوظ رکھتے مگر جس خالقِ کائنات کے نوشتۂ تقدیر نے اُس کو مقدس ہستی بنانے کا فیصلہ کیا۔ اسی کے یدِ قدرت نے ولادتِ باسعادت کے لیے ایک معجزانہ تاریخی نشان بھی ظاہر کر دیا اور وہ اصحاب الفیل کا واقعہ تھا۔

معتبر اور مستند روایات شاہد ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اس واقعہ سے چند ماہ بعد ہوئی [1]

یہ واقعہ جن خصوصیات کا حامل ہے ان کے پیشِ نظر یہ عرب کے لیے عموماً اور اہلِ حجاز کے لیے خصوصاً نہایت عجیب اور حیرت زا تھا۔ اور اس لیے وہ کبھی اس کو فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اس کا نام ہی عام الفیل (یعنی ہاتھیوں والا سال) رکھ دیا۔

---

[1] واقعہ کی تفصیلات قصص القرآن جلد ۳ میں گزر چکیں۔

مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ در اصل یہ واقعہ ایک (نشان) ہے اُس جلیل القدر ہستی کے ظہور کا جو ایک روز تمام معمورۂ انسانی کو مرکزِ توحید اور قبلۂ ابراہیمی پر جمع کر دے گی اور اس کو غیر اللہ (بتوں) کی آلودگیوں سے پاک کر کے توحیدِ الٰہی کے نغموں کے لیے مخصوص کرائے گی۔ کیونکہ یہی وہ پہلا مقام ہے جو صرف خدائے واحد کی پرستش کے لیے بنایا گیا۔ یہ مندر نہیں تھا کہ مورتی کی پُوجا کی جائے نہ گرجا اور کلیسا بھی نہ تھا کہ یسوع مسیحؑ اور کنواری مریمؑ کے مجسّموں کے سامنے سر جھکایا جائے نہ یہ آتش کدہ تھا کہ آگ کو نور کا مظہر قرار دے کر اس کی پرستش کی جائے اور نہ یہ صلوات یہود تھا کہ حضرتِ عزیرؑ کو خدا کا بیٹا بنا کر اس کی تقدیس کے نغمے گائے جائیں بلکہ یہ تو خدا اور صرف ایک خدا کی عبادت کے لیے بنایا گیا تھا: اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ؕ

غرض بعثت کے بعد جب قدرت کے اعجاز نما ہاتھوں نے عام الفیل میں آپؐ کی ولادت کا رازِ سربستہ آشکار اکر دیا تب دنیا نے یہ سمجھا کہ ابرہۃ الاشرم اور اس کے لشکر سے کعبۃ اللہ کی یہ حفاظت اس لیے تھی کہ وہ وقت قریب آپہنچا جب دوبارہ یہ مقدس مقام خدائے واحد کی عبادت اور توحیدِ خالص کی مرکزیت کا شرف حاصل کرنے والا ہے پس جو طاقت بھی اُس مقصدِ عظمیٰ سے متصادم ہو گی خود ہی پاش پاش ہو کر رہ جائے گی۔

ابرہہ عیسائی تھا اور اہلِ عرب (قریش) مشرک، پھر کون کہہ سکتا ہے کہ ابرہہ اور اس کے لشکر کی بربادی قریش کی نصرت و حمایت کے لیے تھی، نہیں! بلکہ اس لیے سب کچھ ہوا کہ مشیتِ الٰہی کے خلاف ابرہہ کی خواہش تھی کہ یمن (صنعاء) میں جو خوبصورت گرجا (القلیس) باپ، بیٹا، روح القدس (تثلیث) کے فروغ دینے کو بنایا گیا تھا مرکزِ توحید کعبۃ اللہ کی جگہ وہ مرجعِ خلائق بنے اور اس مقصد کی خاطر اس نے انہدامِ کعبہ کے لیے لشکر کشی کی، ادھر قریش یعنی سارا عرب اُس کی مقاومت سے عاجز و درماندہ تھا، ابرہہ وقت کے تمام جنگی اسلحہ اور سروسامان کا مالک، اور قریش ان سب سے یکسر محروم، تب غیرتِ حق حرکت میں آئی اور دُنیا نے دیکھ لیا کہ

دنیوی طاقت کے گھمنڈ پر مشیتِ الٰہی سے ٹکرانے والا خود ہی فنا کے گھاٹ اتر گیا اور مرکزِ توحید "کعبہ" خدائی حفاظت کے سایہ میں اسی طرح قائم رہا۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰی (بلاشبہ اس بات میں بڑی ہی عبرت ہے اس شخص کے لیے جو خوفِ خدا رکھتا ہے) قرآنِ عزیز نے سورۃ الفیل میں اسی حقیقت کو معجزانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ نقل کیا ہے۔

اَلَمْ تَرَ كَیْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ ۝ اَلَمْ یَجْعَلْ كَیْدَهُمْ فِیْ تَضْلِیْلٍ ۝ وَّ اَرْسَلَ عَلَیْهِمْ طَیْرًا اَبَابِیْلَ ۝ تَرْمِیْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّیْلٍ ۝ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ ۝	(اے پیغمبر!) کیا تجھے نہیں معلوم کہ تیرے پروردگار نے ہاتھیوں والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ کیا ان کے فریب کو ناکام نہیں بنادیا؟ اور ان پر فوج در فوج پرند بھیج دیئے وہ پرند اُن پر کنکریاں پھینکتے تھے پھر (خدا نے) اُن ہاتھیوں والوں کو کھائے ہوئے بھس کے مانند کر دیا۔

بہر حال عام الفیل، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ باسعادت کا سال ہے اور یہ واقعہ آپ کے ظہورِ قدسی کا سب سے بڑا قریبی نشان ہے اور یہ حقیقت اس شخص پر بخوبی عیاں ہے لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ (جس کے پاس قبولِ حق کے لیے دل ہے یا وہ حاضر دماغی کے ساتھ امرِ حق کی جانب کان لگائے ہوئے ہے)۔

تاریخ ولادت کی تحقیق تمام اربابِ تاریخ و سیر کا تین باتوں پر کلی اتفاق ہے ایک یہ کہ ولادت کا سال عام الفیل تھا چنانچہ سیرت و مغازی کا مشہور امام محمد بن اسحٰقؒ اور جلیل القدر محدث و مؤرخ حافظ ابن کثیر جمہور کی یہی رائے نقل کرتے ہیں۔

وكان مولده علیه الصلوٰة والسلام عام الفیل وهذا هو المشهور عن الجمهور وقال ابراهیم بن منذر الحزامی هو الذی لا یشك فیه احد من علمائنا انه علیه الصلوٰة والسلام وُلِدَ عام الفیل[1]	جمہور کے نزدیک یہی قول مشہور ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت عام الفیل میں ہوئی اور ابراہیم بن منذر کہتے ہیں کہ اس بات میں کسی عالم کو بھی شک و شبہ نہیں کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام عام الفیل میں پیدا ہوئے۔

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۶۱۔

والمجتمع علیہ انہ علیہ السلام ولد عام الفیل[1] | اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم عام الفیل میں پیدا ہوئے۔

اور دوسری اور تیسری بات یہ کہ آپ کی ولادت ربیع الاول کے مہینے میں دوشنبہ (پیر) کے دن صبح صادق کے وقت ہوئی۔

وھذا ما لا اختلاف فیہ انہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم الاثنین ثم الجمھور علی ان ذلک کان فی شھر ربیع الاول[2] | اور اس پر کلی اتفاق ہے کہ آپ دوشنبہ (پیر) کے دن پیدا ہوئے، پھر جمہور کا یہ بھی فیصلہ ہے کہ ربیع الاول کا مہینہ تھا۔

قال ابو قتادۃ (رضی اللہ عنہ) ان اعرابیا قال یا رسول اللہ ما تقول فی صوم یوم الاثنین فقال ذلک یوم ولدت فیہ وانزل علی فیہ[3] | ابو قتادہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں، گاؤں کے ایک آدمی نے کہا، اے اللہ کے رسول! آپ پیر کے دن کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا، یہ وہ دن ہے جس میں میری ولادت ہوئی اور جس میں مجھ پر سب سے پہلی وحی نازل ہوئی۔

لیکن اہل سیر و تاریخ اس باب میں مختلف الرائے ہیں کہ ربیع الاول کی کون سی تاریخ تھی، عوام میں تو مشہور قول یہ ہے کہ ۱۲ ربیع الاول تھی اور بعض کمزور روایات اس کی پشت پر ہیں اور اکثر علماء ۸ ربیع الاول کہتے ہیں لیکن صحیح اور مستند قول یہ ہے کہ ۹ ربیع الاول تاریخ ولادت ہے اور مشاہیر علماء تاریخ و حدیث اور جلیل المرتبہ ائمہ دین اسی تاریخ کو "صحیح اور اثبت" کہتے ہیں چنانچہ حمیدی، عقیل، یونس بن یزید، ابن عبد اللہ، ابن حزم، محمد بن موسیٰ خوارزمی ابو الخطاب ابن دحیہ، ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن کثیر، ابن حجر عسقلانی، شیخ بدر الدین عینی جیسے معتمد علماء کی یہی رائے ہے۔

محمود پاشا فلکی نے (جو قسطنطنیہ کا مشہور ہیئت داں اور منجم گذرا ہے) ہیئت کے مطابق جو زائچہ اس غرض سے مرتب کیا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ سے اپنے زمانہ

---

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۶۱۔ [2] ایضاً جلد ۲ ص ۲۶۱۔ [3] مسلم۔

تک کے کسوف وخسوف (سورج گرہن و چاند گرہن) کا صحیح حساب معلوم کرکے پوری تحقیق کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ سنِ ولادت باسعادت میں کسی حساب سے بھی دوشنبہ (پیر) کا دن ۱۲ ربیع الاول کو نہیں آتا۔ بلکہ ۹ ربیع الاول ہی کو آتا ہے اس لیے بلحاظِ قوت وصحتِ روایات اور باعتبار حساب ہیئت ونجوم ولادتِ مبارک کی مستند تاریخ ۹ ربیع الاول[1] ہے۔

اصحابِ فیل کے واقعہ سے کس قدر عرصہ بعد ولادت ہوئی؟ متعدد اقوال میں سے مشہور قول یہ ہے کہ پچاس دن بعد ظہورِ قدسی ہوا ہے۔

وقیل بخمسین یوماً وھو اشھر[2] — ایک قول یہ ہے کہ اصحابِ فیل کے واقعہ سے پچاس دن بعد ولادت باسعادت ہوئی اور یہی قول زیادہ مشہور ہے۔

نسبِ مبارک نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) عربی النسل ہیں اور عرب کے معزز قبیلہ قریش کی سب سے زیادہ مقتدر شاخ بنی ہاشم سے ہیں، قرآن عزیز نے اہلِ عرب کو خطاب کرتے ہوئے متعدد مقامات پر آپ کے عربی نژاد ہونے کا ذکر کیا ہے:-

ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ (جمعہ پ ۲۸) — (خدا) وہ ذات ہے جس نے اُمیین (ان پڑھ لوگوں) میں سے ہی ایک رسول بھیج دیا جو اُن پر اس کی آیات پڑھتا اور اُن کا تزکیہ کرتا اور ان کو الکتاب (قرآن) اور حکمت سکھاتا ہے۔

لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ (توبہ) — بلاشبہ تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک رسول (محمدؐ) آیا۔

اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ۔ (آلِ عمران پ ۴ ع) — جب کہ بھیج دیا اللہ نے اُن میں ایک رسول جو لحاظِ نسب اُن ہی میں سے ہے۔

وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَھَا۔ (شوریٰ پ ۲۵) — اسی طرح ہم نے آپ پر قرآن کو بزبانِ عربی اتارا ہے تاکہ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم مکہ والوں اور اُن کے گرد وپیش کے بسنے والوں کو برائیوں سے ڈراؤ۔

---

[1] ۸ اور ۹ کا اختلاف حقیقی اختلاف نہیں ہے بلکہ مہینے کے ۲۹ اور ۳۰ کے حساب پر مبنی ہے اور جبکہ حساب سے ثابت ہو گیا کہ صحیح تاریخ ۲۰ اپریل تھی تو ۸ کے متعلق تمام اقوال دراصل ۹ کی تائید میں پیش ہو سکتے ہیں ۱۲

[2] فتح الباری جلد ۹ و تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۶۰۔

أَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ		کیا (اس قرآن کو سکھا دیتا ہے کوئی عجمی) اور حالت یہ ہے کہ یہ
عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ۝ (النحل پ ۱۴ ع ۲)		واضح عربی زبان میں ہے۔

ماہرینِ انسابِ عرب کا اِس پر اتفاق ہے کہ آپؐ حضرتِ اسمٰعیل بن ابراہیم (علیہما الصلوٰۃ والسلام) کی نسل سے ہیں اس لیے کہ قریش بغیر کسی اختلاف رائے کے عدنانی ہیں اور عدنان کے اسمٰعیلی ہونے میں دو رائے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔

عرب کے علم الانساب کے مشہور عالم محدث ابن عبد البر تحریر فرماتے ہیں:۔

وأجمعوا ان محمداً رسول الله صلے الله	اور علماء انساب کا اس پر اتفاق ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم من ولد عدنان وان عدنان من ولد	علیہ وسلم عدنان کی نسل سے ہیں اور عدنان اسمٰعیل (علیہ السلام) کی نسل
اسمٰعیل وان ربیعۃ ومضر من ولد اسمٰعیل[1]	سے ہے اور ربیعہ اور مضر بھی اسمٰعیل (علیہ السلام) کی اولاد ہیں۔

علماء انساب نے نسب نامہ کی تفصیل اِس طرح بیان کی ہے:۔

محمدؐ بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرۃ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

اور والدہ کی جانب سے آپؐ کا نسب نامہ کلاب پر جا کر پدری سلسلۂ نسب کے ساتھ مل جاتا ہے یعنی آمنہ بنت وہب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب۔ کلاب کو حکیم بھی کہتے ہیں۔

البتہ عدنان اور حضرتِ اسمٰعیلؑ کے درمیانی سلسلہ کے ناموں سے متعلق ماہرینِ انساب کی آراء مختلف ہیں[2] اس لیے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کے متعلق ارشاد فرما کر کذب النسابون (نسب بیان کرنے والوں نے غلط بیانی کی ہے) کسی رائے کی توثیق نہیں فرمائی اور اپنے سلسلۂ نسب کے متعلق صرف اس قدر ارشاد فرمایا ہے۔

ان الله اصطفٰے کنانۃ من ولد		اللہ تعالیٰ نے اسمٰعیل (علیہ السلام) کی نسل میں سے کنانہ کو

---

[1] القصد والامم ص ۲۲ والانباہ علی قبائل الرواہ ص ۴۶ - [2] البدایۃ والنہایۃ جلد ۲-

اسمٰعیل واصطفٰی قریشا من	ممتاز بنایا اور کنانہ میں سے قریش کو عزت و عظمت بخشی اور
کنانۃ واصطفٰی من قریش بنی ھاشم	قریش میں سے بنی ہاشم کو امتیاز عطا فرمایا اور بنی ہاشم میں سے
واصطفانی من بنی ھاشم[۱]	مجھ کو منتخب فرمایا۔

گویا اس طرح سلسلۂ نسب کے صرف اُن حصوں کی تصدیق فرمائی جو ماہرین انساب کے درمیان بلا اختلاف مُسلّم تھے۔

اسلام نے نسبی تفاخر اور اس پر مبنی سماجی رسم و رواج کو بہت بڑا گناہ اور جرم قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے خدا کے یہاں فضیلت کا معیار ایمان اور عمل صالح ہے اور وہاں حسب و نسب کی کوئی پرسش نہیں ہے نیز نسبی تفاخر اسلام کے بنیادی قانون "اخوت اسلامی" کے قطعاً منافی ہے اس لیے اسلام کے اجتماعی دستور میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے تاہم واقعاتی طور پر تاریخ یہ پتہ دیتی ہے کہ ہمیشہ انبیاء و رسل (علیہم السلام) اپنی قوم اور اپنے ملک کے معزز خاندان میں سے ہوتے رہے ہیں، حکمت خداوندی کا یہ فیصلہ غالباً اس لیے ہوا کہ قوموں اور ملکوں کے رسم و رواج اور نسبی تفاخر کے خلاف اُن کی دعوت حق اور اُن کا پیغام صداقت کہیں ذاتی مفاد کے لیے نہ سمجھ لیا جائے اور اس طرح اس کا اخلاقی پہلو کمزور نہ ہو جائے مثلاً کسی سماجی زندگی میں ذات پات کی تقسیم اور کاسٹ سسٹم اس طرح موجود ہے کہ اُس کی وجہ سے بعض انسان بعض کو حقیر و ذلیل سمجھنے لگے ہیں تو اگر اس قوم یا ملک میں کوئی پیغمبر اس خاندان سے تعلق رکھتا ہو جس کو قومی اور ملکی رواج نے نیچ اور پست اقوام کا لقب دے رکھا ہے ایسی حالت میں اس ظلم صریح اور باطل کوشی کے خلاف اُس پیغمبر کی صدائے حق اتنی سرعت کے ساتھ کامیاب نہ ہوتی جس قدر اُس حالت میں ہو سکتی ہے جب کہ وہ خود اس قوم و ملک کے اونچے خاندان سے تعلق رکھتا ہو اور صرف ایک اسی خاص مسئلہ میں نہیں بلکہ اس کے پیغام حق کی تمام اصلاحات میں یہ فرق ضرور نظر آئے گا۔

بہر حال یہ حکمت ہر مقام اور ہر موقع پر مفید ہو یا نہ ہو عرب کے حالات و واقعات کیلئے

[۱] مسلم

ازبس مناسب اور مفید ثابت ہوئی چنانچہ صدائے اسلام نے جب اپنی انقلابی اور اصلاحی گرج سے روحانیت کی خفتہ کائنات میں تہلکہ ڈال دیا تو ایک جانب نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اہلِ عرب کو یہ سنایا کہ جہاں تک خاندانی امتیاز کا تعلق ہے تو میں قریشی بھی ہوں اور ہاشمی بھی اور یہ امتیاز تمہارے نقطۂ نظر سے بہت بلند ہے مگر میری نگاہ میں اس کی حیثیت صرف یہ ہے: "ولا فخر، یہ کوئی فخر کرنے کی چیز نہیں ہے"۔ اور دوسری جانب نسبی تفاخر کی بنیادوں کے انہدام اور مساواتِ انسانی کی دعوتِ عام کے لیے اس خدائی فرمان کا اعلان کرکے کائناتِ انسانی کی تمام تاریک ذہنیت کے خلاف انقلابِ عظیم برپا کر دیا:۔

یَا أَیُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاکُمْ	لوگو! میں نے تم سب کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا ہے (یعنی تخلیقِ انسانی
مِّن ذَکَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاکُمْ	کی ابتدا آدم اور اس کی بیوی حوا علیہما السلام سے ہوئی ہے) اور تم کو خاندانوں
شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا	اور قبیلوں میں صرف اس لیے بانٹ دیا ہے کہ آپس میں (صلۂ رحمی کے لیے) پہچان
إِنَّ أَکْرَمَکُمْ عِندَ اللَّهِ	اور معرفت کا طریقہ قائم کر لو (اور اصل یہ ہے کہ) بلاشبہ اللہ کے نزدیک وہی
أَتْقَاکُمْ (الحجرات پ ۲۶)	عزت والا ہے جو تم میں سے پرہیزگاری کی زندگی بسر کرنے والا ہے۔

اور حجۃ الوداع کے موقع پر جب آپ ہزارہا صحابہؓ کی موجودگی میں وداعی پیغام سنا رہے اور اسلام کے بنیادی اصول کے استحکام کے لیے اہم وصایا پیش فرما رہے تھے اس حکمِ خداوندی کی تائید میں یہ انقلاب آفریں پیغام بھی ارشاد فرمایا:۔

ان اللہ یقول یا ایہا الناس	اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے "اے افرادِ نسلِ انسانی! بلاشبہ ہم نے تم کو ایک
انا خلقناکم من ذکر وانثی	مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور ہم نے تمہارے درمیان خاندان اور قبائل بنا دیے
وجعلناکم شعوبا وقبائل	ہیں تاکہ (صلۂ رحمی کے لیے) تعارف پیدا کرو بلاشبہ تم میں اللہ کے نزدیک وہی برگزیدہ
لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ	ہے جو زیادہ متقی (نیک کردار ہے) پس (خوب یاد رکھو کہ) عرب کو عجمی پر کوئی فضیلت
اتقاکم فلیس لعربی علی عجمی	ہے اور نہ عجمی کو عربی پر کوئی برتری حاصل ہے نہ کالے کو گورے پر کوئی فضیلت ہے
فضل ولا لعجمی علی عربی فضل	اور نہ گورے کو کالے پر کوئی برتری۔ بلکہ ان سب کے لیے فضیلت کا معیار صرف

ولا لاسود علی الابیض فضل الا بالتقوی | تقویٰ (نیک عملی) سے۔ اے گروہ قریش ایسا نہ ہو کہ تم (خاندانی فخر کے
لا یجئ الناس بالاعمال وتجیئون بالدنیا | زعم باطل کی وجہ سے قیامت میں) دنیا کو کاندھے پر لاد کر لاؤ اور دوسرے
یامعشر القریش تحملونہا علی رقابکم | لوگ (نیک عملی کی بدولت) آخرت کا سامان لے کر آئیں، واضح رہے کہ
تحملونہا علی رقابکم فتقولوا یا محمد | (تمہارے محض قریشی ہونے کی وجہ سے) میں تم کو خدا کے فیصلے سے قطعاً
فاقول ہکذا لا اغنی عنکم | بے پرواہ نہیں بنا سکتا (خدا کے یہاں تو صرف عمل ہی کام آئے گا)
من اللہ شیئا الخ (مجمع الفوائد جلد ۱ از معجم طبرانی کبیر)

اور ایک مرتبہ نسبی فخر کے خلاف تبلیغ حق کرتے ہوئے اس کو جاہلی تعصب فرمایا اور مسلمانوں کو اس سے بچنے کے لیے سخت تاکید فرمائی۔ ارشاد فرمایا:

ان اللہ تعالیٰ قد اذھب عنکم | اللہ تعالیٰ نے (دعوت اسلام کے ذریعہ) تمہارے درمیان
عبیۃ الجاہلیۃ وفخرھا بالآباء | سے جاہلیت کے تعصب اور نسبی فخر کو مٹا دیا ہے اور اب
انما ھو مؤمن تقی او فاجر شقی | انسان یا نکوکار مومن ہے اور یا بدکار پاپی، سب انسان
الناس کلھم بنو آدم وآدم خلق | آدم کی اولاد ہیں اور آدم کی پیدائش مٹی سے ہوئی ہے،
من تراب [1] | (پھر فخر کرنے کا کیا موقع ہے)؟

اسی مقدس تعلیم کا نتیجہ تھا کہ اسلام کے دورِ اولین میں نہ ذات پات کا کوئی سوال باقی رہ گیا تھا اور نہ خاندانی تفاخر کی کوئی حیثیت سمجھی جاتی تھی اور اس صدائے حق نے غلاموں تک کو سرداری بخش دی تھی چنانچہ اسامہ بن زیدؓ کی سالاریِ لشکر اور امامتِ جہاد، بلال حبشیؓ کے لیے صدیقِ اکبرؓ کا یہ ارشاد "سیدنا ھٰذہ الامۃ" "اس امت کا سردار" قریش اور ہاشمی صحابہ کے درمیان ایک عجمی انسان ابوہریرہؓ کی جلالت وعظمت، صہیب رومی اور سلمان فارسی کی رفعت وبلندیِ مرتبت اور اسی قسم کے ہزاروں واقعات تھے جو چشم فلک نے آنکھوں سے دیکھے اور تاریخ نے آغوشِ صفحات میں محفوظ رکھے ہیں مگر وائے بدبختی کہ بیرونی اثرات اور عرب سے باہر عجمی ماحول نے ایک عرصہ کے بعد مسلمانوں کو پھر اسی لعنت سے دوچار کر دیا جس کا

[1] ابوداؤد۔ ترمذی۔

مرثیہ اقبال مرحوم کو اس طرح کرنا پڑا۔

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں ۔ کیا زمانہ میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

سرورِ دوعالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ فرماکر "انما ھو مومن تقی او فاجر شقی" اس مسئلہ کو اس درجہ صاف کر دیا تھا کہ مسلمان کی زندگی میں کبھی اس کے برعکس زندگی کا کوئی اثر پڑنا ہی نہیں چاہیے تھا، ذات پات تو صرف اس لیے تھیں کہ چھوٹے چھوٹے حلقوں میں باہمی تعارف، صلہ رحمی اور حسنِ سلوک کا معاملہ ایک دوسرے کے ساتھ بآسانی ہو سکے، ورنہ کیسی ذات کہاں کا خاندان؟ کون برادری؟ یہاں تو صرف دو ہی فطری اور نیچرل تقسیمیں ہیں یا "نکوکار" یا "بدکار" کسی قوم کسی خاندان اور کسی ملک کا انسان ہو اگر سچی "خدا پرستی" اور نکوکاری رکھتا ہے تو وہ سب ایک برادری اور ایک قوم ہیں، اور اگر مشرک، کافر اور بدکار پاپی تو یہ سب ایک گروہ اور ایک ٹولی ہیں۔

یتیمی: خاتم الانبیاء محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے والدِ ماجد کا نام عبداللہ اور والدۂ ماجدہ کا آمنہ تھا۔ ابھی آفتابِ ہدایت نے کائناتِ ہست و بود میں طلوع نہیں کیا تھا اور حضرت آمنہ کی مشکوٰۓ معلیٰ اس ودیعت کی امین ہی تھی کہ والد ماجد کا انتقال ہو گیا اور اربابِ سیرت کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ایک قافلۂ تجارت کے ساتھ شام تشریف لے گئے تھے، واپسی میں جب قافلہ مدینہ (یثرب) پہنچا تو وہ بیمار ہو گئے اور اس لیے اپنے ننہال بنی نجار میں قیام پذیر رہے قافلہ جب مکہ پہنچا تو عبدالمطلب نے بیٹے کے متعلق دریافت کیا قافلہ نے ان کی بیماری اور مدینہ میں قیام کا واقعہ کہہ سنایا۔ تب عبدالمطلب نے اپنے بڑے لڑکے حارث کو دریافتِ حال کے لیے مدینہ بھیجا، حارث جب مدینہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ نے ایک ماہ چند روز بیمار رہ کر داعیِ اجل کو لبیک کہہ دیا۔ واپس آکر جب حارث نے باپ کو حادثہ کی اطلاع دی تو عبدالمطلب اور تمام خاندان کو اس صدمۂ جانکاہ نے بے حال کر دیا۔ کیونکہ عبداللہ اپنے باپ اور بھائیوں کے بہت چہیتے تھے۔

غرض جب ولادتِ باسعادت ہوئی تو اس سے قبل ہی آپ کو یتیمی کا شرف حاصل ہو چکا تھا،

چنانچہ قرآن نے آپؐ کی یتیمی، دُنیوی وسائل سے محرومی کے باوجود آغوشِ رحمتِ کردگار میں نشوونما پاکر ہادیِ عالم بننے کا معجزانہ اختصار کے ساتھ سورۃ والضحیٰ میں تذکرہ کیا ہے:

اَلَمۡ یَجِدۡكَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰى	(اے پیغمبر!) کیا تجھ کو خدا نے یتیم نہیں پایا پھر اپنی آغوشِ (رحمت) میں جگہ
وَوَجَدَكَ ضَآلًّا	دی اور کیا تجھ کو ناواقف نہیں پایا پھر تجھ کو (کائنات کی ہدایت کے لیے)
فَهَدٰى ۞ وَوَجَدَكَ	ہدایت مآب بنایا اور کیا تجھ کو (ہر قسم کے وسائل سے محروم و) محتاج
عَآئِلًا فَاَغۡنٰى ؕ (سورۃ والضحیٰ پ۳۰)	نہیں پایا پھر تجھ کو (ہر قسم کی سروری دے کر) غنی بنا دیا۔

بقولِ حضرت ابوقتادہ (رضی اللہ عنہ) اِن آیات میں عجیب و غریب اعجاز اور اسلوبِ بیان کے ساتھ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے تمام ارتقائی مدارج کا تذکرہ ہے تم سمجھتے ہو کہ "فاوٰی" کے معنی یہ ہیں کہ پروردگارِ عالم نے آپؐ کو رہنے سہنے کی صورت پیدا کردی یا آپؐ کو بے یار و مددگار نہیں رہنے دیا، یہ بھی صحیح ہے مگر اس کلامِ ربانی کی اصل روح یہ ہے کہ اس نے ذاتِ اقدسؐ کو ہر قسم کے مادی اسباب و وسائل سے بے پرواہ رکھ کر اپنی آغوشِ رحمت میں لے لیا اور آپؐ کے نشوو ارتقاء کو خالص اپنی تربیت میں کامل و مکمل کیا[1]۔ اور "وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى" کی تفسیر کو خود قرآن ہی نے دوسری جگہ روشن کر دیا ہے مثلاً سورۃ شوریٰ میں ہے:

وَكَذٰلِكَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡكَ رُوۡحًا	اور اسی طرح ہم نے تیری جانب اپنے امر کی روح کا ارتقاء کیا
مِّنۡ اَمۡرِنَا ؕ مَا كُنۡتَ تَدۡرِیۡ	(حالانکہ اس سے پہلے) نہ تو کتاب (قرآن) سے واقف تھا اور نہ
مَا الۡكِتٰبُ وَلَا الۡاِیۡمَانُ وَلٰكِنۡ	ایمان (کی حقیقت) سے لیکن ہم نے اس کو "نور" (روشنی) بنایا
جَعَلۡنٰهُ نُوۡرًا نَّهۡدِیۡ بِهٖ مَنۡ	ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں (اس کی صلاحیت و
نَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِنَا ؕ (شوریٰ پ۲۵)	استعداد کے پیشِ نظر) اس کے ذریعہ ہدایت دیتے ہیں۔

اور آیت "عَآئِلًا فَاَغۡنٰى" میں دُنیوی احتیاج و غنیٰ کا ذکر رُوحِ کلام نہیں ہے بلکہ اس جانب اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو قربت و کمال کا وہ مرتبۂ عظمیٰ عطا فرمایا ہے کہ مادی اور رُوحانی ہر قسم کی احتیاج سے بالاتر بنا کر صفاتِ حمیدہ اور اخلاقِ کریمانہ کی شکل اعلیٰ "غنیٰ" سے بہرہ ور بنا دیا۔

[1] تفسیر ابن کثیر۔

یہی وہ غنیٰ ہے جس کا خود ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس طرح ذکر فرمایا ہے:۔

لیس الغنیٰ عن کثرۃ العرض — غنیٰ مال و دولت کی بہتات کا نام نہیں ہے حقیقی غنیٰ نفس کا

ولکن الغنیٰ عن النفس[1] — ماسوی اللہ سے مستغنی ہو جانا ہے۔

عمرِ مبارک ابھی چھ سال ہی کی تھی کہ آپ کی والدہ ماجدہ آمنہ کا بھی انتقال ہو گیا بی بی آمنہ آپ کو آپ کے ننھیال (مدینہ) میں لے کر گئی تھیں، واپسی میں مقام ابواء میں بیمار ہو گئیں اور چند روز علیل رہ کر وہیں انتقال فرمایا اور سِن مبارک ابھی آٹھ منزلیں ہی طے کر پایا تھا کہ دادا عبدالمطلب نے بھی دُنیا سے مُنہ موڑ لیا اور اس طرح عہدِ طفلی ہی میں وسائلِ تربیت اور دُنیوی اسبابِ کفالت سے محرومی نے گویا مشیتِ الٰہی کی جانب سے یہ اعلان کر دیا کہ جس ذاتِ قدسی صفات کو خدائے واحد نے خالص اپنی تربیت کے لیے منتخب کر لیا ہے کیسے ممکن ہے کہ اُس کو دنیوی اسباب و وسائل تربیت کا محتاج بنائے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک یتیم و یسیر اور مادی وسائل سے محروم ہستی کو اپنے لیے چن کر کس طرح اپنی ربوبیت کاملہ کا مظہر بنایا۔ سورۂ انشراح میں اس حقیقت کو اچھوتے انداز میں بیان فرمایا ہے:۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ — کیا ہم نے (قبولِ حق و صداقت کے لیے) تیرا سینہ نہیں کھول دیا اور

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ — (معرفتِ الٰہی کی حقیقی طلب اور قوم اور کائناتِ انسانی کی بے راہ روی پر

الَّذِي أَنْقَضَ ظَهْرَكَ — اُن کی ہدایت کی تڑپ کا) وہ بوجھ ہم نے تجھ سے دور کر دیا جس نے تیری

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (انشراح) — کمر توڑ رکھی تھی اور ہم نے تیرے ذکر کو کائناتِ پست و بالا میں بلند کر دیا۔

شرحِ صدر یہ کہ اب وسائلِ تعلیم و تعلم کے ذریعہ حاصل ہونے والے تمام علوم و معارف اس عطاءِ الٰہی اور وہبی معرفت و علم کے سامنے ہیچ ہو کر رہ گئے ہیں جس کی سمائی کے لیے ہم نے تیرے سینہ کو کھول دیا ہے، اب علوم و معارف کے بحرِ ناپیدا کنار بھی ہوں تو تیرے سینہ کا دامن وسیع ان کے لیے کافی و وافی ہے اور اسی شرحِ صدر نے معرفتِ الٰہی کے تمام

[1] تفسیر ابن کثیر۔

پوشیدہ گنجینے تجھ پر وا کر دیے اور وہ سارا بوجھ تیرے سینہ پر سے ہٹ گیا جس نے تیری کمر کو اس لیے شکستہ کر رکھا تھا کہ قلبی جستجو اور دلی تڑپ کے باوجود تو اس سے قبل نہیں جانتا تھا کہ معرفت الٰہی کی راہِ مستقیم کون سی ہے اور گم کردہ راہوں کی راہنمائی کی سبیل کیا ہے؟ مگر اب یہ سب کچھ روشن ہو جانے کے بعد ہم نے عالم بالا و پست میں تیرے ذکر کو وہ بلندی اور رفعت عطا فرمائی کہ تیرا مقام ع "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" قرار پایا، چنانچہ نام احمدؐ و محمدؐ ہے اور مقام، مقامِ محمود، سورۃ الحمد وظیفۂ حیات ہے اور لواءِ حمد قیامت میں طغرائے امتیاز۔

حسنِ یوسفؑ، دمِ عیسیٰؑ یدِ بیضا داری　　　آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

یہی نہیں بلکہ قرآن کی تجدیدِ دعوت کے ذریعہ تیری صدائے حق نے اعتقاد و عمل اور ایمان و کردار کی راہ سے تمام دنیا کے نظام ہائے اجتماعی و سماجی میں جو عظیم الشان انقلاب بپا کر دیا اور سوسائٹی کے ہر شعبہ کی پرانی اور فرسودہ بساط کو اُلٹ کر جو نئی بساط بچھا دی اس نے تیرے ذکر کو وہ رفعت و برتری عطا کی کہ کوئی قوم، کوئی مذہب اور کوئی جماعت کسی نہ کسی شکل میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

بت پرستی سے نفرت، خلوت پسندی اور عبادت الٰہی کا ذوق

عہدِ طفولیت سے ازدواجی زندگی کے ابتدائی مراحل تک کے حالات و واقعات تفصیل کے ساتھ کتبِ سیرت و حدیث میں منقول ہیں۔ اس لیے وہیں لائقِ مراجعت ہیں۔ مختصر یہ کہ دادا عبد المطلب کے انتقال کے بعد آپؐ کے چچا ابو طالب آپؐ کے ساتھ بہت اُنس رکھتے تھے اور زندگی بھر آپؐ کی رفاقت کا حق ادا کرتے رہے۔ انبیاء و رسل کی سُنّت کے مطابق آپؐ نے اپنی روزی کا بار کسی پر نہیں ڈالا اور دُنیوی مشاغل میں آپؐ نے بکریاں بھی چرائیں اور تجارت بھی کی، شام کے مشہور تجارتی شہر بُصریٰ میں بھی اس غرض سے تشریف لے گئے اور پچیس سال کی عمر میں یہی سفر حضرت خدیجۃ الکبریٰ (رضی اللہ عنہا) سے عقد کا باعث ہوا، آپؐ خدیجہؓ کا مالِ تجارت مُضاربت پر بُصریٰ کی منڈی میں لے گئے، خدیجہؓ کا غلام میسرہ بھی رفیقِ سفر تھا، اِس درمیان میں آپؐ کی صداقت و امانت،

ایک یہودی راہب کی بشارت اور بیش بہا منافع تجارت کا جو تجربہ اور مشاہدہ کیا تھا میسرؓ نے وہ سب حضرت خدیجہؓ سے کہہ سنایا چنانچہ یہی تأثر ازدواجی رشتہ کا باعث بن گیا۔

اب زندگی میں ایک اور انقلاب ہوا کہ آپؐ کو خلوت گزینی کی طرف رغبت ہوئی اور غارِ حرا میں روز و شب بسر ہونے لگے، بُت پرستی سے شروع ہی سے نفرت تھی اس لیے کبھی نہ کسی صنم کے آگے سر جھکایا اور نہ کسی ایسی مجلس میں شرکت فرمائی جو صنم پرستی کے میلے کہلاتے تھے، اب خلوت میں فطرت سلیم جس طرح راہنمائی کرتی، خدائے واحد کی عبادت کرتے مگر ایک خلش سینہ میں ایسی تھی جو اس حالت میں بھی بے چین ہی رکھتی، اکثر یہ سوچ کر تڑپ جاتے تھے کہ میری قوم خصوصاً اور دنیا انسانی عموماً کس طرح خدائے واحد کو چھوڑ کر صنم پرستی اور مظاہر پرستی میں مبتلا ہے اور یہ کہ اخلاق کی دنیا کس طرح الٹ گئی ہے آخر وہ کونسا نسخۂ کیمیا ہے جو اس حالت میں انقلاب پیدا کر دے اور سچی خدا پرستی اور نیک عمل پھر ایک مرتبہ اپنی نمود دکھلائے۔

یہی جذبات و تأثرات تھے جو قلبِ مضطرب میں موجزن تھے اور خلوت کدۂ حرا میں انہی کیفیات کے ساتھ ذاتِ اقدسؐ مصروفِ یادِ الٰہی رہتی اور جب کئی کئی دن اس طرح گزر جاتے تو کبھی حضرت خدیجہؓ حاضر ہو کر آذوقۂ حیات دے جاتیں اور کبھی خود بنفسِ نفیس جا کر چند روز کا سامانِ خورد و نوش لے آتے اور حرا میں پھر مشغولِ عبادت ہو جاتے، چنانچہ چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی آج حرا زبان سے اس کیف آگیں منظر کا شاہد ہے جس کا لطف اس نے برسوں اٹھایا ہے، مشہور محدث و مؤرخ حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ نے اس واقعہ کو ان مختصر الفاظ میں حسن و خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے:۔

وانما کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ	اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (دورِ شباب میں) خلوت پسند
وسلم یحب الخلاء والانفراد عن قومہ	ہو گئے تھے اور قوم سے الگ تنہائی میں وقت گزارتے تھے
لما یراھم علیہ من الضلال المبین من	کیونکہ وہ قوم کی اس کھُلی گمراہی کو دیکھ کر کہ وہ بُت پرستی میں مُبتلا اور
عبادۃ الاوثان والسجود للاصنام	بُتوں کے سامنے سجدہ گزار ہے کُڑھتے تھے اور جوں جوں آپؐ پر

وقویت محبۃ للخلوۃ عند مقارنۃ	وحیِ الٰہی کے نزول کا زمانہ قریب ہوتا جاتا تھا (مشیتِ الٰہی سے)
ایحاء اللہ الیہ صلوات اللہ	اسی قدر آپ کی خلوت پسندی میں اضافہ ہوتا جاتا صلوٰۃ اللہ
وسلامہ علیہ [1]	وسلامہ علیہ اس ذاتِ اقدس پر خدا کی رحمتیں اور سلامتی نازل ہو۔

بہرحال یہی وہ خلوت کدۂ عبادت تھا جہاں ذاتِ اقدس پر سب سے پہلے وحیِ الٰہی کا نزول ہوا اور بالترتیب سورۂ اقرأ اور سورۂ مدثر کی چند آیات سنانے کیلیے بشیر و نذیر بنا دیا۔

حقیقتِ وحی؟ | یہ وحی "و تنزیل" کیا ہے جس کو نبوت و رسالت" کے خصائص میں سے کہا جاتا ہے اور یہ منصبِ نبوت و رسالت" کیا شے ہے جس کا "وحی و تنزیل" کے ساتھ اتنا گہرا اور قوی تعلق ہے کہ منطقی اصطلاح میں "لازم و ملزوم" کہا جا سکتا ہے اور اس اصطلاحی گفتگو سے قطع نظر سادہ الفاظ میں اس سوال کو کیوں نہ اس طرح پیش کر دیا جائے کہ کائناتِ انسانی کے ہر معاملہ میں جبکہ حسن و قبح کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لیے فطرت نے ہم کو جوہرِ عقل عطا کر دیا ہے اور انسان کے اندر کی یہ سرچ لائٹ (SEARCH LIGHT) ہر ایک مادی شعبۂ حیات میں راہنمائی کرتی ہے تو پھر رسول و نبی کے ذریعہ پیغامِ الٰہی کی حاجت کیا ہے؟ اور عالمِ روحانیات کے مسائل اور معرفتِ الٰہی کے حصول میں تنہا عقل ہی کیوں کافی نہیں سمجھی جاتی؟ یہی وہ سوال ہے جس کے حل ہو جانے پر "وحی" اور "نبوت" دونوں کی حقیقت بھی خود بخود واضح ہو جا سکتی ہے۔

اس سوال کو حل کرنے کے لیے پہلے ایک تمہید قابلِ توجہ ہے اور در اصل وہی اس مسئلہ کی کلید ہے۔

تم جب کائنات کے وجود و خلق کو عمیق فکر و نظر سے مشاہدہ کرتے ہو تو یہ حقیقت ہر جگہ ابھری ہوئی نظر آتی ہے کہ خالقِ کائنات نے اپنی ربوبیتِ کاملہ کے فیض و عطا سے ہر شے کو جس طرح وجود بخشا اور خلق کیا اس کو "ہدایت" (راہنمائی) سے بھی سرفراز کیا ہے اور اگر یہ نہ ہوتی تو کائنات کا وجود و خلق مہمل اور بیکار ہو جاتا، کیونکہ یہی "ہدایت" ہر ایک جاندار پر زندگی اور معیشت

[1] البدایۃ والنہایۃ جلد ۳ ص ۵۔

راہ کھولتی، اُن کی حیات کو مُفید بناتی اور ضروریاتِ حیات کی طلب و حصول میں راہنمائی کرتی ہے اور یہی ناموسِ فطرت کا وہ فیضِ عام ہے جس کے بغیر کوئی مخلوق بھی سامانِ حیات اور وسائلِ تربیت سے استفادہ نہیں کرسکتی اور نہ وجودِ حیات کی یہ گرمجوشیاں ہی ظہور پذیر ہو سکتیں۔

"مچھلی کے جائے کِن تیرائے" اسی حقیقت کی جانب اشارہ ہے، وہ جب اس دُنیا میں آنکھ کھولتے ہیں تو خود بخود پانی میں تیرنے لگتے اور اپنی غذا کی جستجو میں مصروف ہو جاتے ہیں، پرندوں کے بچے انڈے سے باہر آتے ہی ہوا میں اُڑنے کی کیوں کوشش کرتے نظر آتے ہیں، حیوان اور انسان کا بچہ جب اس کارگاہِ ہستی میں قدم رکھتا ہے تو بھوک و پیاس دُور کرنے کے لیے ماں باپ سے تعلیم حاصل نہیں کرتا بلکہ خود بخود ماں کے سینہ پر مُنہ رکھ کر غذا کے خزانہ سے دودھ کیوں چوسنے لگتا ہے۔ آخر یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے؟ تم کہتے ہو کہ یہ فطرت کا قانون ہے جو ان سب کو "فیضِ ہدایت سے فیضیاب کرکے مخلوق کی نشوونما کا سامان مہیا کرتا ہے یہ "ہدایت" ہے جو ہر حرکتِ حیات میں اپنا کام کر رہی ہے اور یہ "فیضِ ہدایت" ہے جو خالقِ کائنات کی جانب سے مخلوقات کی نشوونما کے لیے "فیضِ عام" ہوا ہے۔

لیکن ابھی وسعتِ نظر کو آگے بڑھنے دیجئے اور قدرتِ حق کے مشاہدہ کے لیے تیز گام ہوجیے تو کارگہِ قدرت اور ناموسِ فطرت کی کرم فرمائیاں اور زیادہ جلوہ آرا نظر آئیں گی۔ اور تم دیکھو گے کہ "ہدایت" بھی دوسری موجودات کی طرح ارتقائی درجات رکھتی ہے اور ہر ایک درجہ اپنی فلاحیت کی نمود جُدا رکھتا ہے۔ چنانچہ اس راہ میں سب سے پہلے "وجدان کی ہدایت" سامنے آتی ہے اور یہ طبیعتِ حیوانی کے "فطری اور باطنی الہام" کا نام ہے، یہی وہ ابتدائی درجہ ہے جو بچہ کو قیدِ ہستی میں آنے کے فوراً بعد ہی کسی خارجی تعلیم و تربیت کے بغیر اُس کی غذا کا پتہ دیتا اور اسبابِ حیات کے لیے مُعلّم بنتا ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جو انسان کی ارتقائی منزل پر پہنچ کر "ضمیر کی آواز" "اندر کی صدا" بن کر حقائق کی معرفت کے لیے خارجی دلائل و براہین سے زیادہ قوی حجت ثابت ہوتی ہے۔ اس کے بعد "ہدایتِ حواس" کا درجہ ہے یہ پہلے درجے سے بلند ہے اور

اس کی عطا و بخشش سے ہر ایک ذی روح دیکھنے، سُننے، سونگھنے، چکھنے، چھُونے کی قوتیں حاصل کرتا ہے اور ان کے ذریعہ کائنات عالم میں اپنی افادیت اور استفادہ دونوں کو ترقی دیتا ہے

قدرتِ حق کی جانب سے یہ دونوں درجے انسان اور حیوان دونوں کو عطا ہوئے ہیں اور دونوں کی یکساں طور پر راہنمائی کرتے ہیں، مگر ان دونوں سے بلند ایک درجہ اور ہے جو "ہدایتِ عقل" کہلاتا ہے اور صرف "انسان" ہی کے لیے مخصوص ہے اور یہ بھی پہلے دو درجوں کی طرح بدیہی اور فطرت کے قوانین ونوامیس میں نمایاں جگہ رکھتا ہے۔ یہی وہ "ہدایت" ہے جو انسان کو بقیہ تمام حیوانات سے امتیاز بخشتی، اس کے سامنے فکر و نظر اور ترقیوں کی راہیں کھولتی ہے اور اسی کی بدولت وہ "اشرف المخلوقات" کہلانے کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔

عطیۂ الٰہی "ہدایت" کے یہ تینوں درجے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں حضرتِ انسان کی راہنمائی کا حق ادا کرتے رہتے ہیں چنانچہ "وجدان" اس میں سعی پیہم کا جوش و ولولہ پیدا کرتا ہے "حواس" اس کے لیے معلومات فراہم کرتے ہیں اور "عقل" اس کو جزئیات و کلیات کا علم بخشتی اور ان سے متعلق احکام و نتائج ترتیب دیتی ہے۔

غرض یہی وہ "ہدایت" ہے جس کا قرآن عزیز نے جس کا ذکر انسانی تخلیق و تربیت کے سلسلہ میں کیا ہے، مثلاً حضرتِ موسیٰؑ اور فرعون کے باہمی مکالمہ میں حضرت موسیٰؑ نے خدائے برحق کی ربوبیت کاملہ کا جس طرح اظہار فرمایا ہے اس کا ذکر یوں کیا ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے:-

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ۝	ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ دی پھر اس پر راہِ عمل کھول دی۔

اور سورۂ اعلیٰ میں ہے:-

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ۝ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی ۝ (الاعلیٰ پ)	وہ پروردگار جس نے ہر چیز پیدا کی پھر اُس کو درست کیا پھر ہر وجود کے لیے ایک اندازہ ٹھہرا دیا پھر اُس پر راہِ عمل کھول دی۔

لہ اس آیت میں وجود کائنات کے چار مراتب بیان کر کے قرآن نے ایک عظیم الشان حقائق علمیہ کا باب کھول دیا ہے

(باقی ص پر)

اور سورۂ "بلد" میں ہے:۔

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا	کیا ہم نے اس کو (دیکھنے کے لیے) دو آنکھیں نہیں دیں اور کیا
وَّشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ	(بولنے کے لیے) زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے اور ہم نے
(سورۃ البلد پ ۳۰)	اُس کو اچھی اور بُری دونوں راہیں دکھا دیں۔

اور سورۂ "دہر" میں ہے:۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ	ہم نے انسان کو (مرد و عورت کے) ملے جلے نطفے سے پیدا کیا
اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا	جس کو (ہم) مختلف حالتوں میں پلٹتے ہیں پھر اسے سننے والا
بَصِيْرًا اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ	اور دیکھنے والا بنا دیا، ہم نے اس پر راہِ عمل کھول دی، اب یہ
اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (دہر پ ۲۹)	اُس کا کام ہے کہ شکر گزار بنے یا ناشکر گزار۔

مگر یہ بات بھی بہت صاف ہے کہ ہدایت کے ان ہر سہ مراتب "وجدان" "حواس" "عقل" کی راہِ عمل اپنے اپنے دائرۂ عمل ہی تک محدود ہے یعنی "وجدان" ایک جاندار کے اندر زندگی کے لیے جوشِ عمل اور سعیِ مسلسل دلولہ تو پیدا کر سکتی ہے مگر حیوان یا انسان سے باہر محسوساتِ خارجیہ کا اِدراک اور علم اس کے دائرۂ عمل سے خارج ہے، اسی طرح "ہدایتِ حواس" محسوسات کا ادراک ضرور پیدا کر دیتی ہے لیکن یہ اس کے احاطۂ عمل سے باہر ہے کہ وہ محسوسات کے نتائج و احکام اور جزئیات سے کلیات کا اور کلیات سے جزئیات کا استنباط کر سکے کیونکہ یہ کار فرمائی "ہدایتِ عقل" سے متعلق ہے جو عام حیوانات کے لیے نہیں بلکہ صرف انسان کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔

تو "ہدایتِ عقل" اگرچہ پہلی دونوں ہدایات کے مقابلہ میں بلند مرتبہ رکھتی اور کائنات کی بلند ترین ہستی (حضرت انسان) کی راہنمائی کرتی ہے تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) یہ چار مراتب بالترتیب "خلق، تسویہ، تقدیر، ہدایت" ہیں اور یہی چار مراتب خلاصہ حقائق ہیں خلق یہ کہ وجود بخشا، تسویہ یہ کہ اس کی استعداد کے مطابق اس کی درست کاری کی، تقدیر یہ کہ ہر شے سے متعلق اس کے خلق سے اس کے تیز حیات تک کے لیے پہلے سے ایک مقررہ اندازہ طے کر دیا اور ہدایت یہ کہ اس پر ہر قسم کی راہِ عمل کھول دی۔ تفصیلات کتب تفاسیر میں مطالعہ فرمائیں۔

"عقل کا دائرہ وسیع تر ہونے کے باوجود پھر محدود ہے کیونکہ یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ عقل جو کچھ اور جس قدر بھی نتائج و احکام کا استنباط و استخراج کرتی ہے اس کا دائرہ محسوسات ہی تک محدود رہتا ہے اور حواس خمسہ (قوت باصرہ، سامعہ، لامسہ، شامہ، ذائقہ) نے اپنی اپنی خدمات انجام دے کر جو کچھ ہمارے لیے فراہم کیا ہے عقل اسی پر اپنا تصرف کرتی اور کر سکتی ہے لیکن یہ بات کہ محسوسات کی سرحد سے پرے کیا کچھ ہے اور اس پردے کے پیچھے کیا ہے؟ اس مقام پر پہنچ کر عقل بھی درماندہ ہو کر رہ جاتی ہے اور یہ درجہ ہدایت بھی اس سلسلہ میں ہم کو کسی قسم کی روشنی پہنچانے سے معذور نظر آتا ہے۔

علاوہ ازیں اگر وجدان کی تکمیل کے لیے حواس اور حواس کی تکمیل کے لیے عقل کی ہدایت موجود نہ ہوتی تو انسان ہرگز ان مدارج ارتقاء اور مراتب رفیع پر نہ پہنچ پاتا جن تک آج پہنچا ہوا ہے اور آئندہ جن تک پہنچنے کے لیے میدان عمل میں گامزن ہے "اگر انسان میں وجدان کی قوت نہ ہوتی تو کس طرح حواس کی دنیا تک اپنی حیات کو پہنچا سکتا اور اگر محسوسات کے ادراک کے لیے حواس کی قوتیں نہ ہوتیں تو انسان کس طرح اپنی ذات سے خارج اشیاء کا ادراک کر سکتا اور ترقی کے لیے کوئی قدم اٹھا سکتا اور جبکہ حواس کے وسائل ادراک محدود ہیں، اور نہ صرف محدود بلکہ بسا اوقات گمراہی اور غلطی میں مبتلا کر دیتے ہیں مثلاً ہم کو طویل فاصلہ کی بڑی سے بڑی چیز چھوٹی نظر آتی ہے یا اخلاط صفراء کے بڑھ جانے سے شیریں سے شیریں چیز ذائقہ سے تلخ معلوم ہوتی ہے یا فاصلہ ہونے کی وجہ سے ہم رنگوں کے امتیاز میں اکثر غلطی کر جاتے ہیں تو ان تمام حالتوں میں عقل کی ہدایت کام آتی اور صحیح راہنمائی کرتی ہے اور اصل حقیقت کو پیش نظر لاتی ہے وہ کہتی ہے کہ اگر طویل فاصلہ کی بنا پر تم کو جہاز ایک چھوٹی سی چیز نظر آتا ہے تو یہ نگاہ اور قوت باصرہ کا قصور ہے ورنہ جہاز ایک لمبی چوڑی اور بڑی شے کا نام ہے۔ اسی طرح شیریں اور تلخ کا فیصلہ کرتی ہے اور کہتی ہے کہ حقائق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی شیریں ہر حالت میں شیریں ہے، اس لیے ذائقہ کی یہ تلخی مرض کی وجہ سے ہے

غرض حواس کی غلطیوں سے محفوظ رکھ کر اس حقیقت کو واضح کرنا "عقل کی ہدایت" کا فریضہ ہے اس لیے ہم ایک قدم اور آگے بڑھا کر یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس سے قطع نظر ـــ کہ عقل محسوسات کی حدود سے آگے کچھ نہیں جاتی ـــــ انسان کی عملی زندگی کے تمام حالات میں عقل کی ہدایت بھی کافی اور مؤثر ثابت نہیں ہوتی اس لیے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ نفسِ انسانی جذبات، رُجحانات اور قسم قسم کی خواہشات سے متأثر و مغلوب ہے بلکہ اکثر یہ مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ جب "عقل" اور "جذبات" کے درمیان کشمکش ہوتی ہے تو فتح "جذبات" ہی کی ہوتی ہے اور "عقل" درماندہ ہو کر رہ جاتی ہے۔

تو ان حالات میں "عقل" ہی تقاضا کرتی ہے کہ یہاں "عقل سے بھی بلند" اور کوئی جذبہ ہونا چاہیے جو عقل سے زیادہ مؤثر رہنما اور ہر قسم کی کوتاہیوں سے پاک اور بے لوث ثابت ہو۔

اس تمہید کا حاصل یہ نکلا کہ انسان محسوسات کے دائرہ میں محدود رہ کر بھی اور ماوراء محسوسات کے ادراک کے لیے بھی "ہدایتِ عقل" سے بلند (ایک چوتھے) درجۂ ہدایت کا محتاج ہے تو اب لائقِ غور و فکر یہ بات ہے کہ جس "ربّ العٰلمین" نے اپنی ربوبیت کاملہ سے انسان کے ارتقائی کمالات کی حاجات و ضروریات کے پیشِ نظر ہدایتِ وجدان سے بلند ہدایتِ حواس اور ہدایتِ حواس سے رفیع ہدایتِ عقل عطا فرمائی تو جبکہ عقل کی ہدایت بھی خاص حدود سے آگے نہیں جا سکتی اور حصولِ کمالات اور اعمال کے صحیح نفع و ضرر کے لیے کافی نہیں ہے۔ نیز ماوراء محسوسات کے عدمِ علم کے باوجود اس کے انکار پر کوئی حجت بھی موجود نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس وجدانی جذبات و احساسات اور شعورِ نفس اس کے "حقیقت" ہونے کا پتہ دیتے ہیں تو کیا اس خدائے برحق کی ربوبیت اور فیضِ رحمت کے لیے یہ منافی نہ تھا کہ وہ انسان کو "ہدایتِ عقل" سے بلند کوئی "مرتبۂ ہدایت" عطا نہ کرے؟ ضرور منافی تھا، اس لیے ایسا نہیں ہوا بلکہ اس نے اس کو ایک اور بلند تر مرتبۂ "ہدایتِ وحی" بخشا، یہ مرتبۂ ہدایت اپنی راہنمائی میں ہر قسم کی کوتاہیوں اور خطاء و قصور سے مامون و محفوظ ہے کیونکہ

یہ خدا کی جانب سے ہر شے کی حقیقت کا علم و یقین عطا کرتا ہے اور ہدایتِ وحی کے افاضہ کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ایسی مقدس ہستی کو جو ہر قسم کے گناہوں اور عیوب سے "معصوم" ہوتی ہے اس مقصد کے لیے چن لیتا ہے کہ وہ اس کی جانب سے کائناتِ انسانی تک "ہدایتِ وحی" کو پہنچا دے، اس لیے یہ مقدس ہستی ایک جانب لوازمِ بشریت کے ساتھ مقید رہ کر دوسرے انسانوں کی طرح "انسان" اور "بشر" کہلاتی ہے اور دوسری جانب عیوب و مآثم سے "معصوم" رہ کر خدا کے ساتھ وہ تعلق رکھتی ہے جو دوسرے مقدس انسانوں کو بھی حاصل نہیں ہوتا اور اس طرح خدا اور اس کے بندوں کے درمیان افاضۂ "ہدایتِ وحی" کے لیے ایلچی اور واسطہ بنتی ہے، ایسی حقیقت کا نام مذہب کی اصطلاح میں "نبوت و رسالت" ہے۔

قرآن حکیم نے ہدایت کے اس "مرتبۂ عالی" کا جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ حسب ذیل چند شواہد ملاحظہ ہوں:۔

وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (حٰم سجدہ پ ع)	لیکن قوم ثمود تو اُسے بھی ہم نے راہِ حق و ہدایت دکھلائی تھی لیکن اس نے اندھے پن کو پسند کیا اور ہدایت کی راہ نہ چلی،
قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (انعام پ ع)	(اے پیغمبر!) کہہ دیجیے، یقیناً اللہ کی ہدایت ہی حقیقی "ہدایت" ہے اور ہم سب کو اس کا حکم دیا گیا ہے کہ تمام کائناتِ عالم کے پروردگار کے آگے سرِ عبودیت جھکا دیں۔
وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى ۝ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى (پ ع)	اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں سعی و جانفشانی کی تو ضرور ہے کہ ہم بھی اُن پر اپنی راہیں کھول دیں اور بلاشبہ اللہ نیک لوگوں کا ساتھی اور مددگار ہے جو نیک کردار ہیں۔ بلاشبہ یہ ہمارا کام ہے کہ ہم رہنمائی کریں (ہدایتِ وحی عطا کریں) اور یقیناً آخرت اور دنیا دونوں ہمارے ہی لیے ہیں۔

ارتقائی نقطۂ نظر سے "ہدایتِ وحی" اور مسئلۂ نبوت و رسالت کی وضاحت کے لیے

اشہبِ فکر کو یُوں بھی مہمیز کیا جا سکتا ہے کہ جب کہ یہ عقلی اور عملی نظریہ مسلمات میں سے ہے کہ "بقاء انفع" یا "بقاءِ اصلح" کے فطری قانون کے مطابق کائنات کی گوناگوں موجودات میں ہر ایک شے اپنے موجود رہنے کے لیے کوئی حکمت و مصلحت ضرور رکھتی ہے اور حکیم مطلق کا قانونِ فطرت کسی شے کو اسی وقت تک باقی رکھتا ہے جب تک اُس کا وجود "نافع" اور "مفید" ہونے کی صلاحیت رکھتا اور جس غرض و غایت کے لیے اس کو پیدا کیا گیا ہے اس کو پورا کرتا ہے اور اسی قانون "بقاءِ انفع و اصلح" سے یہ بات بھی بہت واضح اور نمایاں طور پر ثابت ہوتی ہے کہ "نفع اور افادیت" کا سب سے اہم جزو یہ ہے کہ ہر شے اپنے سے بلند مخلوق اور سلسلۂ مخلوقات میں سے ہر نوع اپنے سے بلند نوع کی بقاء کے لیے مفید و معاون ثابت ہو، پس جبکہ حضرت انسان کو عقل بھی موجوداتِ عالم کی سب سے بلند مخلوق اور مدارجِ ارتقاء کی بلندترین کڑی تسلیم کرتی ہے اور اسی قانون کی رُو سے موجوداتِ عالم کی ہر شے اس کی خدمت، اس کے نفع اور اس کی افادیت میں مصروفِ عمل نظر آتی ہے تو یہ کیوں کر ممکن تھا کہ اشرف المخلوقات (انسان) کا وجدان، اس کے جذباتِ عالیہ اور اس کے افکار و خیالات کی پرواز جبکہ عالمِ مادیات سے کہیں زیادہ بلند اور رفیع ہیں اور اس کی عقل یہ جاننے کے باوجود کہ وہ ماوراء مادہ سے ناواقف ہے پھر بھی اس پردہ کے پیچھے کچھ ہونے کا احساس رکھتی اور اس کی معرفت کے لیے چسک محسوس کرتی ہے۔ فطرتِ الٰہی کا فیضان اور بقاءِ انفع کا ناموس اس کو عالمِ مادیات و محسوسات ہی کے اندر محصور رکھتا، اگر ایسا ہوتا تو بلاشبہ فطرتِ "بخیل" ٹھہرتی بلکہ یہ فطرت کا بہت بڑا ظلم ہوتا اور یہ ظاہر ہے کہ تنہا عقل اس کو اس منزل تک پہنچانے کے لیے قاصر و ناکام ہے لہٰذا ازبس ضروری تھا کہ "فطرتِ الٰہی" اس کی رہنمائی کے لیے مزید کوئی سامان مہیا کرتی اور انسان کی ذہنی و فکری ترقیوں کو درجۂ تکمیل تک پہنچاتی۔ پس ماوراءِ مادہ علوم و معارف اور کائناتِ انسانی کی فلاح و نجات کے مقصدِ عظمیٰ کے لیے عقل کی رہنمائی کا یہی وہ فیضانِ الٰہی ہے جس کو قرآن کی اصطلاح اور مذہبی بول چال میں "وحی و نبوّت" کہا جاتا ہے اور آیاتِ ذیل

اسی حقیقت کا اعلان کرتی ہیں۔

وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَذَا الْقُرْآنُ لِأُنْذِرَكُمْ بِهِ وَمَنْ بَلَغَ
(انعام پ ۷ ع)

اس نے (خدا نے) مجھ پر اس قرآن کی وحی کی تاکہ اس کے ذریعہ تمہیں (اہلِ عرب کو) اور انہیں جن تک اس کی تعلیم پہنچ جائے (دوسروں کو) انکار اور بدعملی کے نتیجہ سے ڈراؤں۔

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَى نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَوْحَيْنَا إِلَى إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَى وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَى تَكْلِيمًا رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ○
(سورۃ النساء پ ۶ ع ۲۳)

(اے پیغمبر!) ہم نے تمہاری جانب اسی طرح وحی بھیجی جس طرح نوحؑ پر اور ان نبیوں پر جو نوحؑ کے بعد ہوئے بھیجی تھی، اور جس طرح ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحٰقؑ، یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ عیسیٰؑ، ایوبؑ، یونسؑ، ہارونؑ، سلیمانؑ پر بھیجی اور داؤدؑ کو زبور عطا فرمائی، نیز خدا کے وہ رسول جن کا حال ہم (قرآن میں) پہلے سنا چکے ہیں اور وہ جن کا حال ہم نے تمہیں نہیں سنایا" اور (اسی طرح) اللہ نے موسیٰؑ سے کلام کیا جیسا کہ واقعی طور پر کلام کرنا ہوتا ہے، یہ تمام رسول (خدا پرستی اور نیک عمل پر) خوش خبری دینے والے اور (انکارِ حق پر) ڈرانے والے تھے (اور اس لیے بھیجے گئے تھے) کہ ان کے آنے (اور نیک و بد بتلانے) کے بعد لوگوں کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے جو وہ خدا کے حضور پیش کر سکیں (یعنی یہ عذر کر سکیں کہ ہمیں راہِ حق کی طرف کسی نے دعوت نہیں دی تھی) اور خدا (اپنے کاموں میں) سب پر غالب ہے اور (اپنے تمام کاموں میں) حکمت والا ہے

وَلَمَّا جَاءَ عِيسَى بِالْبَيِّنَاتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَ

اور جب عیسیٰؑ (خدا کی) نشانیاں لے کر آیا، کہا میں تمہارے پاس حکمت و دانائی لے کر آیا ہوں اور اس لیے آیا ہوں کہ

لِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ	بعض اُن باتوں کو جن کے متعلق تمہارے درمیان اختلاف
فِيْهِ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ اِنَّ اللّٰهَ	ہے صاف صاف بیان کردوں، پس اللہ کے متقی بندے
هُوَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا	بن جاؤ اور میری پیروی کرو (اس بات میں کہ) بیشک اللہ ہی میرا اور
صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (زخرف. پ۲۵. ع۶)	تمہارا پروردگار ہے پس اُسی کی عبادت کرو کہ یہی سیدھا راستہ ہے۔
يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ	(اے افرادِ نسلِ انسانی!) تمہارے پاس تمہارے پروردگار
بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ	کی طرف سے بُرہان (دلیل وحجت) آگئی اور ہم نے تمہاری
نُوْرًا مُّبِيْنًا ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	طرف واضح اور آشکارا روشنی بھیج دی پس جو لوگ اس پر ایمان
بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ	لائے اور انھوں نے اس کا سہارا مضبوط پکڑ لیا تو وہ انھیں
فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَّيَهْدِيْهِمْ	عنقریب اپنی رحمت کے سایہ میں داخل کردے گا اور ان پر
اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝	اپنا فضل کرے گا اور انھیں اپنے تک پہنچنے کی راہ دکھائیگا۔
(سورۃ النساء پ۶ ع۳)	ایسی راہ جو بالکل سیدھی راہ ہے۔

قرآن نے ان آیات میں "ہدایتِ وحی" کو "حکمت" "بُرہان" (حجت ودلیل) اور نورِ مبین (آشکار روشنی) کہا ہے تاکہ یہ بخوبی واضح ہوجائے کہ جس طرح محسوسات ومادیات کے لیے "عقل" کو "روشنی" اور "دلیلِ راہ" کہا جاتا ہے اسی طرح عقل کے دائرۂ حدود سے آگے کے لیے "ہدایتِ وحی" یہی حیثیت رکھتی اور یہی خدمات انجام دیتی ہے۔

"ہدایتِ وحی" کی ضرورت پر اب تک جو کچھ کہا گیا اگر اس کے علاوہ مزید اضافہ مطلوب ہو تو مبدءِ فیّاض کے اِس لطیف وحسین فیضان کے متعلق اس روشن پہلو سے بھی نظر کی جاسکتی ہے کہ جب ہم حواس کی قوتوں کا فکرِ عمیق سے مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت صاف نمایاں نظر آتی ہے کہ ناموسِ فطرت نے یہاں ایک قوت کے عملی نظام کو اس طرح سانچہ میں ڈھالا ہے کہ انسان کے اندر ودیعت کی ہوئی قوتِ حواس اس وقت تک اپنا صحیح عمل نہیں کرپاتی، جب تک خارج سے اس کی مدد نہ کی جائے۔ مثلاً قوتِ باصرہ دیکھنے کی قوت کا

نام ہے اور تم اس سے اپنی زندگی میں برابر کام لیتے رہتے ہو اور اس بحث سے قطع نظر کہ جو شے باہر موجود ہے وہ آنکھ کے باریک پردوں پر اپنا عکس ڈال رہی ہے یا آنکھ کے پردوں میں جو روشنی ہے وہ اندر سے بشکل شعاع نکل کر موجودِ خارجی کو متاثر کر رہی ہے اور اس کو ہم "دیکھنا" کہتے ہیں۔ تم نے کبھی اس پر ضرور غور کیا ہوگا کہ جب تم کسی قسم کی بھی روشنی میں ہوتے ہو تو اپنی قوتِ باصرہ کی استعداد کے مطابق جس شے کو دیکھنا چاہتے ہو دیکھتے ہو لیکن جوں ہی تاریکی کا شکار ہو جاتے ہو اور شبِ دیجور کے ساتھ ابرِ سیاہ کے پردے روشنی پر چھا جاتے ہیں اُس وقت حلقۂ چشم میں قوتِ باصرہ کی موجودگی کے باوجود تم یہ کہا کرتے ہو کہ "ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا" تو آخر بینا ہوتے ہوئے ایسا کیوں کہتے ہو؟ تمہارا جواب اُس وقت یہ ہوتا ہے کہ قانونِ قدرت نے یہی مقرر کر دیا ہے کہ باطنی قوائے عمل اُس وقت تک اپنا صحیح کام نہیں کرتے جب تک خارج سے اسی سلسلہ کی مدد نہ پہنچے۔ اس لیے قوتِ باصرہ کی باطنی قوت بھی محتاج ہے کہ دیئے (چراغ) کی روشنی سے لے کر ماہتاب و آفتاب تک جس حیثیت کی بھی روشنی ہو اس کی مدد کرے تو وہ اپنا عملی مظاہرہ کر سکے گی۔ اور یہی حال دوسرے حواس کا بھی ہے۔

پس اگر یہ صحیح ہے اور بلاشبہ صحیح ہے کہ خدائے واحد کا قانونِ قدرت اور ناموسِ فطرت اپنی وحدت کی جلوہ نمائی کا مظاہرہ کائناتِ مادی اور عالمِ روحانی میں یکساں طور پر کرتا رہتا ہے۔ تو بے تأمل یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ عقل حضرتِ انسان کے اندر کی وہ روشنی ہے جس کو یدِ قدرت نے انسانیت کے ارتقائی منازل پر گامزن ہو کر انسانیت کی "مثلِ اعلیٰ" اور "مقصدِ عظمیٰ" کو پالنے کے لیے ودیعت کیا ہے مگر مسطورۂ بالا قانون یہاں بھی اِسی طرح کارفرما ہے جیسا کہ قوائے حواس میں کارفرما نظر آتا ہے یعنی اگر عقل عالمِ محسوسات و مادیات کے دائرے میں اپنا عملی مظاہرہ کرنا چاہتی ہے تو وہ محسوساتِ خارجی کی مدد کی ضرور محتاج رہتی ہے مثلاً اس کا یہ فریضہ ہے کہ جزئیات کے ذریعہ کلی کا استخراج کرے، لیکن وہ ایسا جب ہی کر سکے گی کہ خارج میں اِس سلسلہ کی جزئیات کا ایک بڑا ذخیرہ اپنے حقائقِ اصلیہ کو

اس کے سامنے پیش کرے پس اگر عقل کی روشنی اور ان حقائق کے درمیان، وہم، خیال اور ظن کے تاریک پردے حائل ہو جائیں تو عقل کی روشنی ہرگز اپنا صحیح کام نہیں کر سکتی۔ اسی طرح جب وہ ماورائِ محسوسات (روحانیات) کی جانب اپنی روشنی کو متوجہ کرتی ہے تو یہی اوہام، ظنون، خیالات اور جذباتِ فاسدہ کے تاریک پردے اُس کے اور عالمِ روحانیات کے درمیان عموماً حائل ہو جاتے ہیں اور وہ اکثر و بیشتر اُن سے مغلوب ہو کر گم کردہ راہ ہو جاتی اور معرفتِ حق اور معرفتِ باطل کے درمیان فرق و امتیاز سے عاجز نظر آتی ہے۔ ایسی حالت میں خالقِ کائنات کی رحمتِ کاملہ اور ربوبیتِ تامہ اس کو خام بسر دنا کام نہیں چھوڑتی اور خارج سے اس کی پوری مدد کرتی ہے اور یہی وہ خارج کی روشنی ہے جو نبی اور پیغمبر کے ذریعہ کائناتِ انسانی تک پہنچی اور دین و مذہب کی زبان میں "وحی روشنی" ہو کہی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن عزیز نے اسی حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے جگہ جگہ وحی کو "نور" (روشنی) سے تعبیر کیا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُبِينًا. (النساء، پ ۶ ع)	(اے افرادِ نسلِ انسانی!) تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے بُرہان (دلیل و حجت) آگئی اور ہم نے تمہاری جانب واضح اور آشکارا "روشنی" (وحی الٰہی بشکل قرآن) بھیج دی۔
قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ ۝ (المائدہ پ ۶ ع)	اللہ کی جانب سے تمہارے پاس (حق کی) "روشنی" آچکی اور ایسی کتاب آگئی جو (اپنی ہدایتوں میں نہایت) روشن کتاب ہے۔
يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ (توبہ پ ۱۰ ع)	یہ لوگ (مشرکین، یہود، نصاریٰ) چاہتے ہیں اللہ کی "روشنی" کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں، حالانکہ اللہ یہ "روشنی" پوری کیے بغیر رہنے والا نہیں اگرچہ کافروں کو پسند نہ آئے۔
وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ (ابراہیم پ ۱۳ ع)	اور (دیکھو واقعہ یہ ہے کہ) ہم نے اپنی نشانیوں کے ساتھ موسیٰ کو بھیجا تھا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکالے اور "روشنی" میں لائے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۙ (شوریٰ پ ۲۵ - ع ۵)

اور اسی طرح ہم نے تیری جانب اپنے امر میں سے روح امر کی وحی بھیجی حالانکہ اس سے قبل تو نہیں جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب؟ اور نہیں جانتا تھا کہ کیا ہے ایمان؟ لیکن ہم نے اسکو (قرآن کو) نور (روشنی) بنایا ہے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ان کو اس کے ذریعہ راہ دکھاتے ہیں اور اے پیغمبر! بلاشبہ تو (لوگوں) کو سیدھی راہ کی جانب راہنمائی کرتا ہے۔"

پھر اس مسئلہ کی اہمیت پر ایک دوسرے پہلو سے بھی فکر و نظر کی ضرورت ہے وہ یہ کہ ہم اس عالم ہست و بود میں روز و شب کے مشاہدات و تجربات سے یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوتے ہیں کہ یہاں ہر شے کی کیفیت و کمیت یا اس کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے ایک "ترازو" یا "پیمانہ" ضرور ہے اور یہ کہ ہر ایک "پیمانہ" اور ہر ایک "ترازو" اپنے اندر ایک خاص صلاحیت رکھتا اور اپنی صلاحیت کے مطابق ہی اشیاء کے ناپ تول میں کام دے سکتا ہے مثلاً موتی اور جواہرات کے تولنے کے لیے ایک خاص ترازو (کانٹا) ہے اب اگر ہم یہ چاہیں کہ اس میں شکر، روئی، غلہ جیسی چیزوں کو تولیں تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے یہ نہیں بلکہ دوسری قسم کا ترازو کام دے گا یا مثلاً کپڑا، زمین وغیرہ جیسی اشیاء کی پیمائش کے لیے ہم ایک خاص قسم کا پیمانہ (گز) استعمال کرتے ہیں۔ پس اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس سے حرارت و برودت کی بھی پیمائش کریں تو اس کے لیے یہ نہیں بلکہ دوسرا پیمانہ تھرما میٹر[1] کام میں لانا ہوگا، اور اسی طرح ہوا کے دباؤ اور سطح کی اونچائی معلوم کرنے کے لیے بیرو میٹر[2] اور زلزلوں اور بھونچالوں کی حالت دریافت کرنے کے لیے سیسو میٹر[3] اور آواز کی مقدار و قوت کی پیمائش کے لیے فونو میٹر[4]، جدا جدا قسم کے پیمانے استعمال کرنے ہوں گے، کیونکہ انکی اپنی صلاحیت و استعداد کار کا یہی فطری تقاضا ہے کہ اگر اس کے خلاف ان کا استعمال کیا جائیگا تو یا تو قطعاً

---

۱ THERMA METER ۲ BARO METER ۳ SE.SO METER ۴ PHONO METER

بیکار ثابت ہوں گے اور یا صحیح حقیقت نہ بتلا سکیں گے حالانکہ ان سب کا ایک ہی کام ہے یعنی "ماپ تول" اور ایک ہی نام ہے "ترازو اور پیمانہ" مگر ہر شے کی حقیقت اور اس کی کیفیت و کمیت کے پیش نظر چونکہ ان سب کی صلاحیتِ کار کی حدود متعین ہیں لہٰذا ان میں سے کوئی ایک بھی اپنی حدود سے متجاوز ہو کر کارآمد ثابت نہیں۔

قانونِ قدرت کی کارفرمائی کو رہنما بنا کر اگر ہم اسی نقطۂ نظر سے آگے قدم بڑھائیں اور خالص مادیات سے گزر کر معنویات کی حدود پر جا پہنچیں تو یہاں بھی وہی کرشمۂ قدرت نظر آتا ہے یعنی انسان کی انفرادی و اجتماعی حیات کے لیے رحمتِ کردگار نے جو پیمانے مقرر کیے ہیں اور جن کو وجدان، حواس اور عقل کہا جاتا ہے اُن میں بھی جدا جدا صلاحیتوں کے اعتبار سے حدود منقسم ہیں، مثلاً پیمانۂ "وجدان" انسان کی صرف اُسی کیفیت و حالت سے متعلق ہے جو قدرت کے ہاتھوں نے اس کے وجود کے ساتھ ساتھ اس میں ودیعت کر دی ہے اور حواس کا پیمانہ ان ہی اشیاء سے تعلق رکھتا ہے جو دیکھنے، سُننے، چکھنے، چھُونے اور سونگھنے میں آسکتی ہیں اور پیمانۂ "عقل" ان دونوں سے آگے عالمِ مشاہدات و محسوسات کے حقائق اور ان کی کیفیات کے جانچنے، اُن کے درمیان امتیاز پیدا کرنے، ان سے نتائج اخذ کرنے اور اُن پر احکام صادر کرنے کی خدمت انجام دیتا ہے۔

پس اگر ہم چاہیں کہ "وجدان" سے "حواس" اور "حواس" سے "عقل" کا کام لیں تو خود عقل ہی کے نزدیک ایسا کرنا غلط ہو گا، کیونکہ یہ قانونِ فطرت کی مقررہ حدود کی خلاف ورزی کے مرادف ہے جس کے اقدام پر ناکامی کے ماسوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

لیکن عقلِ انسانی اس کے آگے نہ جاننے کے باوجود پھر جاننے کی جو جستجو رکھتی اور اپنی ترقی کو اس کے اندر محدود نہیں سمجھتی، نیز تمام خارجی دلائل سے بڑھ کر انسان کے اندر کی قوی ترحجت و برہان "وجدان" ان ہر دو عالم سے بھی بلند تر عالم کے وجود کا جو پتہ دیتی ہے اس کے پیشِ نظر ہم وسعتِ نظر کا قدم اور آگے بڑھاتے اور مسطورۂ بالا عالمِ معنویات سے

لطیف تر معنوی عالم کا کھوج لگانا چاہتے اور اس کائنات سے اپنا رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں، جہاں حسن، صداقت اور محبت[1] (ذاتِ حق کی صفاتِ ربوبیت، عدالت اور رحمت) اپنی جلوہ آرائیوں سے اس کائنات کو بھی منور کر رہی ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں پہنچ کر پیمانۂ عقل بھی کوتاہ ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی رفعتِ پرواز وہاں تک رسائی نہیں کر پاتی خصوصاً ایسی حالت میں کہ انسانوں کے درمیان "عقل" کا اس درجہ تفاوت موجود ہے کہ ایک شخص کی عقل اس کو نہ صرف ممکن الوقوع سمجھتی ہے بلکہ اس کو وجود پذیر کر دکھاتی ہے بلکہ تفاوتِ عقلی کی بوالعجبیوں کا تو یہ حال ہے کہ ایک ہی شخص کی عقل ایک وقت جس بات پر "ناممکن" کا فتویٰ صادر کر دیتی ہے دوسرے وقت میں اسی بات کو ممکن سمجھنے لگتی ہے تو جب پیمانۂ عقل کا عالمِ محسوسات میں یہ حال ہے تو عالمِ غیب تک اس کی رسائی معلوم؟ اور پھر جس پیمانہ کے توازن کو غیر متوازن بنانے کے لیے وہم و خیال اور جذبات کا سیلِ رواں موجیں مار تا رہتا ہو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ خارج سے مدد یاری کے بغیر "عقل" معرفتِ الٰہی اور علومِ غیب تک رسائی حاصل کر سکتی ہے۔؟

پس انسان کی بیچارگی و درماندگی کے اس مقام پر بھی رحمتِ کردگار اپنے فیضان سے اس کو محروم نہیں رکھتی اور معنوی و روحانی حقائق کی معرفت کے لیے ایک مقدس ہستی (پیغمبر) کے ذریعہ اس کو عقل سے بھی رفیع و لطیف "پیمانہ" ہدایت وحی "عطا کر دیتی ہے۔ تاکہ انسان "سعادت و شقاوت" میں امتیاز کرنے کے بعد حیاتِ سرمدی اور نجاتِ ابدی" کو پا سکے۔

قرآنِ عزیز نے وحی الٰہی کو یہی حیثیت دیتے ہوئے سورۂ شوریٰ میں ارشاد فرمایا ہے:۔

اَللّٰهُ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ وَ الۡمِیۡزَانَ ؕ (شوریٰ پ ۲۵)	اللہ وہ ہے جس نے حق کے ساتھ کتاب (قرآن) کو نازل کیا اور اتارا "میزان" (ترازو) کو یعنی دینِ حق کو جو حق و باطل کے لیے ترازو اور پیمانہ ہو۔

---

[1] آج کل علماء جدید میں یہ بحث جاری ہے کہ سائنس سے اپنی حدود کو اس طرح محدود رکھا کہ اس کے دائرہ میں حسن، صداقت اور محبت کی کوئی قدر و قیمت نظر نہیں آتی اور اس لیے وہ خدا کی ہستی کی معرفت ضروری نہیں سمجھتی مگر یہ سائنس کا کمال نہیں ہے بلکہ نقص ہے جو آج نہیں تو کل ضرور پورا ہو کر رہے گا۔

چنانچہ شاہ عبدالقادر (نور اللہ مرقدہٗ) موضح القرآن میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"ترازو فرمایا دینِ حق کو جس میں بات پوری ہے نہ کم نہ زیادہ۔"

صاحبِ وحی کی معرفت کی وجدانی دلیل

"ہدایتِ وحی" یا "نبوت و رسالت" کی حقیقت و اہمیت پر گذشتہ سطور میں کوتاہ قلمی کے باوجود جو کچھ سپردِ قرطاس کیا گیا اس کی تکمیل کیلئے اس سوال کو بھی حل کرنا ازبس ضروری ہے کہ جب کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ حاملِ وحی ہو اور خدا کا پیغمبر اور ایلچی" تو اس کے دعوئے صدق و کذب کی معرفت کا کونسا طریقہ ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ "علم الکلام" کے ماہرین (متکلمین) نے اس معرفت کے لیے بہت سے دلائل و براہین پیش کیے ہیں اور اس مسئلہ کی اہمیت کے پیشِ نظر اس پر معرکۃ الآراء بحثیں کی ہیں تاہم وہ اپنے طرزِ استدلال میں اصطلاحی فلسفیانہ اسلوب رکھتی ہیں جس کو ہم "مذہبیات" و "روحانیات" میں خاص اہمیت دینے کو آمادہ نہیں ہیں کیونکہ اس راہ میں وہی اسلوبِ بیان مفید، دل نشین اور جاذبِ قلوب ہو سکتا ہے جس کی بنیاد و نہاد وجدانی طرزِ استدلال پر رکھی گئی ہو اور عقلیت کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے اصطلاحی فلسفہ و منطق کی قیود میں اس کو پابہ زنجیر نہ کر دیا گیا ہو اور یہ اس لیے کہ معرفتِ الٰہی اور معرفتِ علومِ غیبیہ کے لیے دلیل "وجدان" سے زیادہ دوسری کوئی دلیل و برہان مؤثر نہیں ہے، اسی حکمتِ بالغہ کے پیشِ نظر قرآنِ عزیز کے تمام عقلی استدلالات ——— جن پر غور کرنے کے لیے "قرآن" عقل و فکر اور تدبر کو مخاطب بناتا ہے ——— کی بنیاد بھی "وجدان" پر قائم کی گئی ہے۔ البتہ یہ قرآنِ حکیم کا اعجازِ بلاغت ہے کہ ان وجدانی دلائل کو اگر کوئی "غلسفی" دقیق فلسفیانہ طریقِ استدلال کے سانچہ میں ڈھال کر زیرِ بحث لانا چاہے تو یہ وجدان پر مبنی استدلالات اسی اہمیت و قوت کیساتھ اپنی صداقت اور ثمرہ و نتیجہ کو اس رنگ میں بھی تسلیم کرا لیتے ہیں۔

غرض "وجدان" اس سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ تم مدعیٔ نبوت کی زندگی کو "صداقت

کی کسوٹی" پر خوب کسو اور اگر آج وہ ہستی تمہارے سامنے نہیں ہے تو تعصب اور نسلی و جماعتی حسد سے پاک اور بے لوث ہو کر بے لاگ تاریخی حقائق سے دریافت کرو، پس اگر تم پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ اس کی قبل از دعویٔ نبوت زندگی کا ہر شعبۂ حیات صداقت و حقانیت کا مظہر ہے اور ہر ایک شعبۂ زندگی بے داغ صداقت کا پیکر اور نہ صرف اسی قدر بلکہ اس کا وجود ہر قسم کی بد اخلاقیوں، گناہوں اور آلودگیوں سے پاک اور "معصوم" ہے اور اخلاقی بلندیوں کا مخزن اور ان ہی کیفیات و حالات کے ساتھ اُس نے جانے بوجھے لوگوں میں زندگی کا بڑا حصہ گذارا ہے تو پھر اُس کے دعوئے صداقت میں شک و شبہ کرنا عقلِ سلیم کے خلاف ہوگا۔ کیونکہ عقل بآسانی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ جس ہستی نے اپنی مدتِ حیات کے طویل عرصہ میں نازک سے نازک موقعوں پر بھی کبھی ایک لمحہ کے لیے انسانی دنیا پر جھوٹ نہ بولا ہو، آخر دماغی و قلبی انقلابات کی وہ کونسی تاریخ ہے جس کی بنا پر ایسی با ہوش و حواس ہستی کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ وہ خالقِ کائنات "خدائے برحق" پر کذب بیانی اور افترا پردازی کیلیے یک بیک آمادہ ہو جائے، چنانچہ قرآنِ عزیز نے اسی حقیقت کو سورۂ یونس میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۚ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۚ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ۝

(سورۂ یونس پ ۱۱ ع ۲)

اور تم کہو اگر اللہ چاہتا تو میں قرآن تمہیں سناتا ہی نہیں اور تمہیں اس سے خبردار ہی نہ کرتا (مگر اس کا چاہنا یہی ہوا کہ تم میں اس کا کلام نازل ہو اور تمہیں اقوام عالم کی ہدایت کا ذریعہ بنائے) پھر دیکھو یہ واقعہ ہے کہ میں اس معاملہ سے پہلے تم لوگوں کے اندر ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں کیا تم سمجھتے بوجھتے نہیں؟ پھر اس سے بڑا ظالم کون ہے جو باندھے اللہ پر بہتان یا جھٹلائے اس کی آیتوں کو؟ بیشک بھلا نہیں ہوتا گنہگاروں کا۔

"صاحبِ وحی" کی صداقت کی یہ ایسی بہترین کسوٹی اور دلیل ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنہ ۶ھ میں پادشاہانِ دنیا کے نام اسلام کی دعوت و پیغام کے سلسلہ میں والا نامے

بھیجے تو وقت کی سب سے بڑی طاقت (رومن امپائر) کے پادشاہ ہرکلیوس (ہرقل) کے پاس حضرت دحیہ کلبیؓ نامۂ مبارک لے کر پہنچے تب اُس نے بھی جب آپؐ کی صداقت کو پرکھنا چاہا تو سب سے پہلے اسی وجدانی دلیل کو "معیارِ صداقت" ٹھیرایا اور صورتِ حال یہ پیش آئی کہ اُس نے سرکاری حکام سے دریافت کیا' یہاں کوئی حجازی قافلہ موجود ہے جس سے اس ہستی کے متعلق معلومات حاصل ہو سکیں؟ اتفاق سے ابوسفیان (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) کی سرکردگی میں ایک تجارتی قافلہ مقیم تھا۔ چنانچہ اُن لوگوں کو شاہی دربار میں طلب کیا گیا اور ہرکلیوس نے رئیس التجارۃ (ابوسفیانؓ) سے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق چند سوالات کیے جن میں سب سے اہم سوال یہ تھا کہ "وہ تمہارے اندر ہی پلا بڑھا۔ رہا سہا ہے تو کیا تم نے اس کی زندگی کے اس طویل دور میں کبھی جھوٹ کا شائبہ پایا ہے؟" ابوسفیانؓ نے جواب دیا: "کبھی نہیں' بلکہ اس کے برعکس وہ اپنی قوم میں "الصادق الامین" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے" یہ سن کر ہرکلیوس نے یہ کہا:

وسألتك هل كنتم تتهمونه بالكذب قبل ان يقول ما قال فذكرت ان لا فقد اعرف انه لم يكن ليذر الكذب على الناس و يكذب على الله. (بخاری ج۱) — میں نے تجھ سے یہ بھی دریافت کیا: کیا کبھی اس کے اس دعوی سے قبل تم نے اس کو جھوٹا پایا ہے؟ تو نے کہا کبھی نہیں" تب میں نے یقین کر لیا کہ جو ہستی انسانوں پر جھوٹ کہنے کو آمادہ نہ ہو وہ کبھی خدا پر جھوٹ نہیں بول سکتی۔

"جو ہستی انسانوں پر جھوٹ کہنے کو آمادہ نہ ہو وہ کبھی خدا پر جھوٹ نہیں بول سکتی" دیکھیے یہ جملہ اس سلسلہ میں وجدانِ انسانی کا کس درجہ صحیح ترجمان ہے کہ ہرکلیوس نے بھی تمام عقلی و نقلی دلائل سے الگ ہو کر وجدان کے تقاضے سے پہلی دلیل جو پیش کی وہ وہی تھی جس کو وجدان کے خالق (خدائے برتر) نے اپنے پیغمبر سے (صداقتِ دعویٰ کے لیے) پیش کرائی۔

چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ان آیات کی تفسیر اسی حقیقت کی روشنی میں اس طرح کی ہے:

"پھر آیت (۱۶) میں صداقتِ نبوت کی ایک سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل بیان

کی ہے..... فرمایا، ساری باتیں چھوڑ دو، صرف اس بات پر غور کرو کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی نہیں ہوں جس کے خصائل و حالات کی تمہیں خبر نہ ہو، تم ہی میں سے ہوں اور اعلانِ وحی سے پہلے ایک پوری عمر تم میں بسر کر چکا ہوں یعنی چالیس برس تک کی عمر کہ عمرِ انسانی کی پختگی کی کامل مدت ہے، اس تمام مدت میں میری زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے رہی، بتلاؤ اس تمام عرصہ میں کوئی ایک بات بھی تم نے سچائی اور امانت کے خلاف مجھ میں دیکھی؟ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کسی انسانی معاملہ میں جھوٹ بولوں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب خدا پر بہتان باندھنے کے لیے تیار ہو جاؤں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں مجھ پر اس کا کلام نازل ہوتا ہے؟ کیا اتنی سی موٹی بات بھی تم نہیں پا سکتے؟

تمام علماءِ اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس برس کا زمانہ اس کے اخلاق و خصائل کے ابھرنے اور بننے کا اصل زمانہ ہوتا ہے، جو سانچہ اس عرصہ میں بن گیا پھر بقیہ زندگی میں بدل نہیں سکتا، پس اگر ایک شخص چالیس برس کی عمر تک "صادق" و "امین" رہا ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ اکتالیسویں برس میں قدم رکھتے ہی ایسا کذاب و مفتری بن جائے کہ انسانوں پر ہی نہیں بلکہ فاطر السموات والارض (آسمان و زمین کے پیدا کرنے والے خدا) پر افترا کرنے لگے؟

چنانچہ اس کے بعد فرمایا: دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے، جو شخص اللہ پر افترا کرے اس سے بڑھ کر کوئی شریر نہیں، اور جو صادق کو جھٹلائے وہ بھی سب سے زیادہ شریر انسان ہے اور شریر و مفتری انسان کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اب صورتِ حال نے یہاں دونوں فریق پیدا کر دیئے۔ اگر میں مفتری علی اللہ ہوں تو مجھے ناکام و نامراد ہونا پڑے گا، اگر تم سچائی کے مکذب ہو تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا ہے، فیصلہ اللہ کے ہاتھ ہے اور اس کا قانون ہے کہ مجرموں کو فلاح نہیں دیتا۔

چنانچہ اللہ کا یہ فیصلہ صادر ہو گیا، جو مکذب تھے ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا،

جو صادق تھا اس کا کلمہ صدق آج تک قائم ہے اور قائم رہے گا۔[1]

بہر حال "صاحبِ وحی" کے دعوئے صداقت کی یہ وجدانی دلیل عقلِ سلیم اور فکرِ مستقیم کی نگاہ میں "علم الیقین" پیدا کرنے کے لیے کافی ووافی ہے، تاہم بقیہ شرائط یعنی صداقتِ تعلیم نزولِ وحی کا ادعاء، اور مخالفین کے مقابلہ میں تحدی (چیلنج) اور تحدی کا ایفاء "مدعیِ نبوت و رسالت" کے لیے یہ تمام امور بھی از بس ضروری ہیں اور اپنی جگہ تفصیل طلب اور قابلِ لحاظ ہیں، اس لیے کہ ان شرائط کے پیشِ نظر ہی نبی اور مصلح کے درمیان امتیاز، نبی اور ساحر و شعبدہ باز کے مابین فرق بیّن اور نبی اور متنبی میں تضاد قائم کیا جا سکتا ہے۔[2]

بعثت غرض خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں کا یہ حال تھا کہ ایک جانب خلوتہائے راز میں معرفتِ الٰہی کے لیے استغراق، صراطِ مستقیم کی جستجو، نوعِ انسانی کے اصلاحِ حال کی تڑپ اور طلب تھی اور دوسری جانب افرادِ قوم و ملک کے ساتھ راست گفتاری، صداقت شعاری، حسنِ معاملت اور اصابتِ فکر جیسے اخلاقِ کریمانہ وصفاتِ حمیدہ سے متصف معاشرتی زندگی کا مظاہرہ تھا اور ان امتیازات کی وجہ سے ہر فرد کی نگاہ میں آپ کی وہ قدر و منزلت تھی کہ باتفاق رائے "الصادق الامین" کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے اور کل جو دشمنی ان کو محمد رسول اللہ سے دعوئے نبوت کی بناء پر ہوئی وہ آج محمد بن عبداللہ کے ساتھ قطعاً نہیں تھی اور سب ہی ان کی تقدیس و تطہیر کے قائل تھے۔

یہی حالات و واقعات تھے جبکہ عمرِ مبارک چالیس منزلیں طے کر چکی تھی، رمضان کا مہینہ تھا اور آپ غارِ حراء میں مشغولِ عبادت تھے کہ اچانک آپ کے سامنے جبرئیل فرشتہ نمودار ہوا اور اس نے بشارت دی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ثقلین کی رشد و ہدایت کے لیے

---

[1] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۱۵۰۔ [2] یہ مباحث علمِ کلام میں قابلِ مراجعت ہیں لیکن قصص القرآن کی تمام جلدوں کے مطالعہ سے یہ کل بحث تسلی بخش تفصیلات کے ساتھ مل جائیں گے۔

چُن لیا اور رسالت و پیغمبری کے منصبِ کبریٰ پر فائز کیا۔

یہ واقعہ چونکہ نوعِ انسانی کی تاریخ میں حیرت زا انقلاب کا باعث ثابت ہوا اور اس نے ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو معراجِ رفعت کی اس حد پر پہنچا دیا جہاں عالمِ ادیان و ملل کے تمام اصلاحات و انقلابات اس ہستی کا فیضِ رحمت نظر آتے ہیں اس لیے تاریخ و حدیث کے روشن صفحات نے اس واقعہ کی تمام تفصیلات کو بسندِ صحیح اپنے سینہ میں محفوظ رکھا ہے، چنانچہ فنِ حدیث و تاریخِ اسلام کے امام بخاری (رحمہ اللہ) نے اپنی مشہور و مقبول کتاب الجامع الصحیح میں صدیقہ عائشہؓ کی سند سے اس واقعہ کو جن الفاظ میں نقل کیا ہے اس کا ترجمہ درج ذیل ہے۔ عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں:۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر شروع میں سچّی خوابوں کا سلسلہ جاری رہا۔ کوئی خواب آپؐ نہیں دیکھتے تھے مگر وہ اپنی تعبیر میں اس درجہ روشن اور صحیح ثابت ہوتا تھا جیسا کہ طلوعِ صبح کے لیے سپیدۂ صبح کا ظہور ہوتا ہے، پھر آپؐ کو خلوت محبوب ہو گئی اور حرا میں مشغولِ عبادت رہنے لگے۔ گاہے گاہے آپؐ اہل و عیال کے پاس بھی تشریف لے آتے تھے، حضرت خدیجہ (رضی اللہ عنہا) آپؐ کے لیے کچھ توشہ طیار کرتیں اور آپؐ اس کو لیکر پھر غار میں واپس تشریف لے جاتے، اسی طرح حرا میں مشغولِ استغراق و عبادت تھے کہ اچانک ایک روز آپؐ پر غار کا فرشتہ نمودار ہوا اور کہنے لگا "اقرء" پڑھئے" نبی اُمّی نے کہا "مَآ اَنَا بِقَارِیٍٴ" میں پڑھنا نہیں جانتا" پیغمبرؐ ارشاد فرماتے تھے" کہ جب میں نے فرشتہ سے یہ کہا تو اس نے مجھ کو گرفت میں لے لیا جس کی شدت سے مجھ کو تکلیف محسوس ہونے لگی اور پھر چھوڑ کر مجھ سے دوبارہ کہا "پڑھیے" اور میں نے وہی جواب پھر دیا "میں پڑھنا نہیں جانتا" تب اس نے پھر وہی عمل کیا اور گرفت چھوڑ کر تیسری مرتبہ پھر پہلا جملہ دُہرایا اور میں نے بھی وہی سابق جواب دیا غرض تین مرتبہ یہی گفتگو اور یہی عمل ہوتے رہنے کے بعد چوتھی مرتبہ فرشتہ نے (سورۂ اقراء کی) یہ چند آیتیں تلاوت کیں: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ٥ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ٥ اِقْرَاْ

وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝[2] "اپنے اس پروردگار کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا، اس نے انسان کو خونِ بستہ سے پیدا کیا۔ پڑھ اور تیرا پروردگار بہت کرم کرنے والا ہے جس نے قلم (تحریر) کے ذریعہ (انسان کو) علم سکھایا، انسان کو وہ سب کچھ سکھایا جس سے وہ ناواقف تھا[1]" غرض نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان آیات کو دہرایا اور یہ آپؐ کے ذہن نشین ہوگئیں، اس کے بعد جب حِرا سے فارغ ہوئے تو یہ حالت کہ قلب (شدتِ وحی سے) کانپ رہا تھا، آپؐ نے مکان میں داخل ہوتے ہی فرمایا: "مجھ کو کپڑا اُڑھاؤ" (حضرت) خدیجہؓ نے فوراً کپڑا اُڑھا دیا، جب آپؐ کو سکون ہوا تو خدیجہ (رضی اللہ عنہا) کو تمام واقعہ کہہ سُنایا اور پھر فرمایا: خشیتُ علیٰ نفسی مجھے جان کا خوف ہے[2] (حضرت) خدیجہ نے سُن کر عرض کیا "قسم بخدا! خدا آپ کو ہرگز رسوا نہیں کرے گا۔ کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، مہمانوں کی مہمانداری، بیچاروں کی چارہ گری فرماتے اور مفلس کے لیے ذریعۂ معاش مہیا کرتے ہیں اور حق رسی کی کڑی سے کڑی مصیبت میں مددگار بنتے ہیں۔ اس گفتگو کے بعد حضرتِ خدیجہ (رضی اللہ عنہا) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، ورقہ زمانۂ جاہلیت کے اُن لوگوں میں سے تھے جنھوں نے بُت پرستی چھوڑ کر عیسائیت کو قبول کر لیا تھا عبرانی زبان سے واقف، اور انجیل کی کتابت کیا کرتے تھے اور بہت ضعیف العمر اور نابینا تھے (حضرت) خدیجہؓ نے ورقہ سے کہا: برادرمن آپ اپنے بھتیجے کا واقعہ تو سُنیئے۔ ورقہ نے دریافتِ حال کیا، تب نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے گذرا ہوا واقعہ سُنایا، ورقہ نے سُنا تو کہا: ھذا الناموس الذی کان ینزل علیٰ موسیٰ یہ وہ فرشتہ (جبرئیلؑ) ہے جو حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) پر وحیِ الٰہی لے کر آیا کرتا تھا، کاش کہ

---

[1] حضرتِ شاہ عبدالقادر (رحمہ اللہ) اس آیت کی تفسیر میں بہت ہی لطیف بات ارشاد فرماتے ہیں موضح القرآن میں لکھتے ہیں: اوّل جبرئیلؑ وحی لائے تو یہی پانچ آیتیں، حضرت (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی لکھا پڑھا نہ تھا اس لیے (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا کہ قلم سے بھی علم وہی دیتا ہے یوں بھی (یعنی بغیر وسائل بھی وہی خود بہ خود) وہی دے گا۔

[2] یعنی مجھے یہ خوف ہے کہ شاید میں وحی کے بار کو برداشت نہ کرسکوں۔

میں اُس وقت تک زندہ رہوں جب تیری قوم تجھ کو تیرے وطن (مکہ) سے نکالے گی"
آپؐ نے دریافت کیا: کیا میری قوم مجھ کو وطن سے بے وطن کرے گی "ورقہ نے کہا:
"بیشک ایسا ہوگا اور جس پیغام کے لیے خدا نے آپؐ کو پیغمبر بنایا ہے اس خدمت پر
جو بھی مامور ہوا اس کے ساتھ یہی صورت پیش آئی ہے، پس اگر وہ وقت میری زندگی میں
آیا تو میں پوری قوت کے ساتھ تیری حمایت کروں گا" مگر ورقہ کو یہ وقت نہیں آیا اس سے
قبل ہی اُن کا انتقال ہو گیا[1]

حدیث بخاری اور بعض مستشرقین کی کوتاہ اندیشی

صدیقہ عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی حدیث میں نزولِ وحی کی وجہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو فوری تاثر ہوا اس کو خود زبانِ مُبارک سے اس طرح ظاہر کیا گیا ہے" انی خشیت علٰی نفسی" اور پھر اس کے متصل ہی حضرتِ خدیجہؓ کے تسکین وہ الفاظ منقول ہیں، تو یہ واقعہ کا ایسا پہلو ہے جس کی فطری صداقت اور غیر مصنوعی سادگی خود بخود دل میں اُتر جاتی ہے اور واقعہ کا نقشہ اس طرح سامنے آجاتا ہے کہ ایک صادق و امین ہستی اپنی پاک اور بے لوث زندگی کے ساتھ ایک غار میں محوِ استغراق ہے' اس کے قلب میں خدائے برتر کے لیے عشق سے سرشار جذبۂ عبودیت موجزن ہے' وہ شرک اور گناہوں کی آلودگیوں سے نفور و بیزار گوشۂ تنہائی کو پسند کر کے پہاڑ کے ایک غار میں سرگرمِ عبادت ہے، یہ سلسلہ اگرچہ عرصہ سے جاری ہے مگر اچانک ایک روز خدا کا فرشتہ (جبرئیل) جو ہمیشہ سے خدا کے پیغمبروں کے پاس وحی لے کر آتا رہا ہے' اس پر ظاہر ہوتا ہے اور وحی الٰہی کی پیغام رسانی کرتے ہوئے اس کو نبوت و رسالت کی بشارت دیتا ہے۔ یہ ہستی چونکہ اس سے قبل اِس منصبِ جلیل کی حقیقت سے ناآشنا تھی اس لیے اس حیرت زا خبر اور وحی الٰہی کی عظیم ترین روحانی قوت کے زبردست اثر نے جو فوری انقلاب ذاتِ اقدسؐ میں پیدا کیا اس کی وجہ سے تشویش اور گھبراہٹ کا رونما ہونا

[1] بخاری باب کیف کان بدء الوحی علٰی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

ایک فطری بات تھی "خشیت علی نفسی" کی مراد یہ نہیں تھی کہ جان کا خوف آپ کو پریشان کیے ہوئے تھا، ایک عربی نژاد، قریشی الاصل اور شخصی شجاعت کے مالک سے اس قسم کی توقع کیسے ہو سکتی ہے؟ بلکہ مطلب یہ تھا کہ وہ اس بارِ عظیم کو برداشت بھی کر سکے گا یا نہیں، چنانچہ اس اُس لیے تاثر کو اس مقدس انسان کی رفیقۂ حیات خدیجۃ الکبریٰؓ نے محسوس کرتے ہوئے اس کے اخلاقِ کریمانہ اور اوصافِ حمیدہ کا ذکر کیا اور کہا کہ ایسی ہستی ناکام زندگی کے لیے نہیں ہوتی اور خدا کبھی آپ کو رسوا نہیں کرے گا اور پھر اس   خبر کو ورقہ کے پاس لے گئیں تاکہ ایک ایسے شخص سے جو عرصہ سے خدا کی وحی اور خدا کی   ب کا ذکر کرتا رہتا ہے اس اجمال کی تفصیل معلوم کریں۔

اس صاف اور سادہ بات کو دیکھیے اور پھر بعض مستشرقین یورپ کی اس مضحکہ خیز نکتہ چینی پر نظر ڈالیے جو تعصب اور کوتاہ نظری کی عینک لگا کر کی گئی ہے۔

"اگر پیغمبرِ اسلام پر حرا میں وحی الٰہی کا نزول اور فرشتہ کا ظہور ہوا ہوتا تو پھر آپ وحی الٰہی سے فیضیاب ہو کر اور منصبِ رسالت کی بشارت سُن کر یہ کیوں فرماتے: "انی خشیت علی نفسی" اور خدیجہ کو تسکین دینے کی ضرورت پیش نہ آتی کیا آپ کو خدا پر بھروسہ نہیں تھا"

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا، حقیقتِ حال کیا تھی اور اس کو رنگ و روغن دے کر کیا بنا دیا؟ یہاں نہ خدا پر عدمِ اعتماد کی کوئی جھلک ہے اور نہ فرشتہ کے ظہور اور وحی کے نزول پر ریب و شک کا معاملہ ہے بلکہ اس حقیقت کے اعتراف ہی کی وجہ سے یہ صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی اس کا ایک فطری تاثر ہے جو آپ کی صداقت کا مزید ثبوت فراہم کرتا ہے، کیونکہ اگر اس کے برعکس کہیں آپ اس واقعہ کو اس طمطراق کے ساتھ پیش فرماتے کہ گویا ذاتِ اقدس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ جانی بوجھی بات ہے تب البتہ اس کی گنجائش ہو سکتی تھی کہ اس شخص نے (دعوائے نبوت کے لیے) پہلے سے ایک منصوبہ قائم کر رکھا تھا، اور حرا کی خلوتیں بھی اسی مقصد کے لیے تھیں چنانچہ اب موقع دیکھ کر اس نے یہ اعلان کر دیا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور مجھ پر وحی آتی ہے۔

بہرحال اس مسئلہ پر ہم نے مختصر طور پر جو کچھ لکھا ہے علماء اسلام نے مختلف اسالیب بیان کے ساتھ اسی حقیقت کا اظہار فرمایا ہے مثلاً مشہور محدث و مفسر حافظ عماد الدین بن کثیر (رحمہ اللہ) فرماتے ہیں:۔

ثم قال: "لقد خشیت علی نفسی وذلک لانہ شاھد امرًا لم یعھدہ قبل ذلک ولا کان فی خلدہ۔ (تاریخ ابن کثیر ج ۳ ص)	آپؐ نے پھر فرمایا "لقد خشیت علی نفسی" یہ اس لیے فرمایا کہ آپ نے ایک ایسی حقیقت کا آج مشاہدہ کیا کہ اس سے قبل اس سے واقف نہیں تھے اور نہ کبھی آپؐ کے دل میں یہ خیال گذرا تھا کہ ایسا کچھ پیش آئیگا۔

اور حکیم الامۃ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی لطیف توجیہ کا حاصل یہ ہے:۔

پھر آپؐ پر غارِ حراء میں حق (وحی) کا نزول ہوا، جب فرشتہ اور آپؐ کے درمیان سلسلۂ کلام ختم ہوگیا تو آپؐ پر ایک خاص کیفیت طاری ہوئی جس کو ہم اپنی زبان میں "تشویش و اضطراب" سے تعبیر کرتے ہیں اور حقیقت میں یہ ایک نفسیاتی کیفیت تھی جس کا پیش آنا فطری تھا اس لیے کہ جب نزولِ وحی کی وجہ سے آپؐ کے بشری قویٰ پر ملکوتی صفات نے اثر کیا تو دو متضاد قوتوں کے درمیان تصادم اور پھر ملکوتی قوت کے غلبہ کی وجہ سے آپؐ کے اندر تشویش پیدا ہو جانا یقینی تھا، یہی وجہ ہے کہ ابتداءِ نزولِ وحی کے بعد کچھ مدت تک وحی کا سلسلہ منقطع رہا کیونکہ انسان بشریت اور ملکیت دو جہات کے درمیان محصور ہے، پس جس ہستی کی بشریت پر ملکوتی صفات غالب آکر اس کو ظلمتوں سے نور کی جانب لے جاتی ہیں تو جس قوت کے ساتھ یہ غلبہ اپنا اثر کرتا ہے انسان اپنے اندر اسی شدت کے ساتھ بشریت و ملکیت کے درمیان تصادم اور تزاحم محسوس کرتا ہے اور شدتِ تصادم کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی ملکوتی قوت و استعداد کو اس درجہ کامل و مکمل کر دے جو منصبِ نبوت و رسالت کے لیے ضروری ہے حتیٰ کہ اس کی قوتِ بشری (قوتِ بشری و حیوانی) قوتِ ملکوتی کے ہاتھ میں پوری طرح تابع اور منقاد ہو جاتی ہے اور اب وہ ہستی جس کو فیضانِ نبوت

سے سرفراز کیا گیا ہے مطمئن اور تصادم کی کشمکش سے بالاتر ہو کر اس منصب جلیل (نبوت و رسالت) کی خدمت کے قابل ہو جاتی ہے [1]

بشریت اور نبوت کا باہمی تعلق

"نبوت" اور "بشریت" کے درمیان اس درجہ نازک رشتہ ہے کہ قرآن حکیم کی "تعلیم" سے قبل پیروانِ مذاہب و ادیان نے اس راہ میں بھی اعتدال کو ترک کر کے افراط اور تفریط کو اسوہ بنا لیا تھا اور اس بارہ میں ان کو سخت ٹھوکر لگی تھی، چنانچہ بعض پیروانِ مذہب نے یہ دیکھ کر کہ نبی اور رسول باوجود اس امر کے کہ وہ انسان اور بشر کی شکل و صورت رکھتا ہے لیکن ساتھ ہی افرادِ انسانی سے جدا ایسی خصوصیات کا حامل نظر آتا ہے جو مجاہدات و ریاضات کے ذریعہ سے بھی دوسروں کو حاصل نہیں ہوتیں۔ اس لیے درحقیقت وہ بشر نہیں بلکہ خدا یا خدا کا بیٹا ہے جس نے انسانوں کی نجات کے لیے جامۂ بشریت اختیار کر لیا ہے [2] اس کے برعکس دوسری جماعت نے یہ کہا کہ نبوت و رسالت کوئی منصب نہیں ہے کہ خدا کی جانب سے "عطیۂ مناصب" کی طرح دیا جاتا ہو بلکہ اخلاقِ کریمانہ اور صفاتِ حمیدہ کا وہ اعلیٰ درجہ ہے جو ہر ایک انسان اپنی روحانی جدوجہد سے حاصل کر لے سکتا ہے اور کہتے ہیں کہ اگرچہ عطا و بخشش ہر شے کے لیے اسی کی جانب (خدا کی جانب) سے ہے لیکن کسی شے کا بطور "منصب" عطا ہونے کی حدود میں محدود رہنا اور روحانی جدوجہد سے ہر شخص کے حاصل کر لینے کے لیے اس کا دروازہ کھلا رہنا ان دونوں باتوں کے درمیان جو فرق ہے ہمارا خیال یہ ہے کہ "نبوت" بھی اور درجاتِ روحانیت کی ہی طرح ہے اور عطاءِ منصب کی شکل میں خاص امتیاز نہیں رکھتی۔

قرآنِ حکیم نے اس افراط و تفریط کو ختم کرنے کے لیے "نبوت و رسالت کی حقیقت کو" بہت عمدہ طریقوں سے آشکار کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ نے انسان کی راہنمائی کے لیے جو مختلف درجاتِ ہدایت کا سلسلہ قائم کیا ہے اس کا اعلیٰ درجۂ ہدایت وحی الٰہی ہے

---

[1] حجۃ اللہ البالغۃ ج ۲ ص ۱۳۳۔ [2] اوتار اور ابن اللہ کا عقیدہ دراصل ایک ہی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں۔

اور یہ انسان کی روحانیت اور مقصدِ حیات کی کامرانی کا کفیل و ضامن ہے اور جبکہ ہدایت کا یہ سلسلہ "انسانی راہنمائی کے لیے" ہے تو عقلِ سلیم کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ درجہ انسان ہی کو بخشا جائے لیکن کیا ہر شخص کو جدا جدا بخش دیا جائے۔ نہیں ایسا نہیں ہونا چاہیئے اس لیے کہ یہاں درجاتِ عقل مختلف ہیں اور درجاتِ استعداد میں بھی تنوع موجود ہے اس لیے از بس ضروری ہے کہ کسی خاص ہستی کو اس کے لیے چُن لیا جائے تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس انتخاب کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے۔ یہ کہ جو عمدہ صلاحیتوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ مجاہدات اور ریاضات کے ذریعہ نفس پر قابو پائے یا یہ کہ خدائے تعالیٰ جس کو یہ درجہ عطا فرمائے اس کی صلاحیتوں اور اس کی استعدادات کی تخلیق ہی اس طرح کر دے کہ صدق و امانت اس کا مایۂ خمیر بنا ہوا ہو اور خارجی مجاہدہ اور ریاضت کا محتاج نہ ہو۔ یہ جُدا امر ہے کہ خدائے برتر کے سامنے اظہارِ عبودیت اور تقرب الی اللہ کے لامتناہی فیض سے فیضیاب ہونے کے لیے اس سلسلہ کو بھی کُلیتہً ترک نہ کرے۔ تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ عقل و بصیرت اس فیصلہ کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ یہاں دوسری شکل عمل میں آنی چاہیئے۔ اسلیے کہ جس طرح خدائے برتر کے مقررہ قانونِ قدرت نے "ہدایتِ وحی" سے پہلے کے مختلف درجاتِ ہدایت کو انسان کے مجاہدہ و ریاضت پر موقوف نہیں رکھا اور اس بخشش و فیض کو حسبِ حال "عطیۂ الٰہی" کی حیثیت میں رکھا ہے یعنی "وجدان" "حواس" اور "عقل" ان سب درجاتِ ہدایات کا جب یہی حال ہے کہ وہ جد و جہد سے نہیں بلکہ "عطیۂ الٰہی" سے ملتے ہیں تو "ہدایتِ وحی" بھی جس کو بخشا جائے وہ بطور "منصب و عطیہ" کے ہی عطا ہو، البتہ یہ از بس ضروری ہے کہ جس کو بھی بخشا جائے اس کی روحانی صلاحیتیں اور استعدادات ہر طرح اس منصب کی اہل ہوں اور ایسی ہستی کو عطا نہ ہو کہ اس کی صلاحیت و استعداد عطا کرنے والے کی بے سلیقگی پر چشمک زن ہو۔

غرض نبی اور رسول "اس ہستی کو کہتے ہیں جو لوازمِ بشریت کے ساتھ اپنے تقدس و

طہارت اور اخلاقِ حسنہ و اوصافِ حمیدہ کے اس بلند مقام پر فائز ہو اور اس کے صفاتِ صدق و امانت اس درجہ مُسلّم ہوں کہ اس کو "بشر معصوم" کہہ سکیں، وہ نہ خدا ہوتا ہے اور نہ ابنِ خدا بلکہ خدا کی جانب سے "ہدایتِ وحی کا حامل" مخلوقِ خدا کے لیے "خدا کا ایلچی" اور ان کی ہر قسم کی رُشد و ہدایت کا کفیل، ہو، چونکہ وہ بشر ہے اس لیے افرادِ نسلِ انسانی سے تعلق رکھتا ہے، اور چونکہ ہر قسم کی آلودگیوں اور گناہوں سے پاک "اور معصوم" ہے اس لیے اس کو اللہ سُبحانہٗ کے ساتھ ہم کلامی کا شرف حاصل ہے، پس نبوت و رسالت کا بشریت کے ساتھ ہی وہ تعلق ہے جو ہر قسم کی افراط و تفریط سے بَری اور حقیقتِ حال کے لیے آئینہ دار ہے۔ اور اسی حقیقت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود زبانِ وحی ترجمان سے ظاہر فرمایا ہے: "اِنَّمَآ اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰہُ یُعْطِیْ" خدا دینے والا ہے اور میں تقسیم کرنے والا ہوں: یعنی ایک جانب خدا سے وحی ہدایت حاصل کرتا ہوں اور دوسری جانب خدا کے بندوں تک اس کو پہنچا دیتا ہوں یہی میرا فریضۂ رسالت و نبوت ہے اور اسی حقیقت کو قرآنِ حکیم نے مختلف اسالیبِ بیان کے ساتھ اس سلسلہ کے غلط کار لوگوں کی ہدایت کے لیے اس طرح بیان کیا ہے:۔

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (اسراء پ ۱۵ ع ۱۰)	کہہ دیجئے، پاکی ہے میرے پروردگار کے لیے، میں نہیں ہوں مگر انسان، اور خدا کا ایلچی (رسول)
قُلْ لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۛۚ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۛۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ (اعراف پ ۹ ع ۲۳)	وہی ہو کر رہتا ہے جو خدا چاہتا ہے، اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو ضرور ایسا کرتا کہ بہت سی منفعت بٹور لیتا اور (زندگی میں) کوئی گزند مجھے نہ پہنچتا، میں اس کے سوا کیا ہوں کہ ماننے والوں کے لیے (گناہوں کی پاداشِ عمل سے) خبردار کرنیوالا اور (نیک عمل پر) بشارت دینے والا ہوں۔
قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۙ وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا	(عیسٰیؑ نے) کہا: میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھ کو (ہدایتِ انسانی کے لیے) کتاب دی اور مجھ کو نبی بنایا اور

اَيْنَ مَا كُنْتُ ۠ (مریم پ۱۶ ع۲)

اس نے مجھ کو بابرکت کیا، خواہ میں کسی جگہ ہوں۔

فَأْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰي مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ۝ (طٰہٰ پ۱۶ ع۲)

تم (موسیٰ و ہارون) اس (فرعون) کے پاس جاؤ اور کہو ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے آئے ہیں۔ پس بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ رخصت کردے اور ان پر سختی نہ کر۔ ہم تیرے پروردگار کی نشانی لے کر تیرے سامنے آگئے ان پر سلامتی ہو جو سیدھی راہ اختیار کرے۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَي اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ (النساء پ۶ ع۳)

یہ تمام رسول (خداپرستی و نیک عملی کے نتائج کی) خوشخبری دینے والے اور (انکارِ حق کے نتائج سے) ڈرانے والے تھے (اور اسلیے بھیجے گئے تھے) کہ ان کے آنے (اور نیک و بد بتلانے) کے بعد لوگوں کے پاس کوئی حجت باقی نہ رہے جو وہ خدا کے حضور پیش کرسکیں اور (خدا) (اپنے کاموں میں) سب پر غالب ہے اور (تمام کاموں میں) حکمت والا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝ (احزاب پ۲۲ ع۶)

اے نبی! بلاشبہ ہم نے تجھ کو بھیجا ہے (حق پر) گواہی دینے والا اور (نیکی کے انجام پر) بشارت دینے والا اور (بدی کے انجام سے) ڈرانے والا اور بلانے والا اللہ کی راہ کی طرف اس کے حکم سے اور بھیجا روشن چراغ بنا کر۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰي غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا

وہ (خدا) غیب کی تمام باتوں کا جاننے والا ہے پس وہ اپنے غیب (کے معاملات) پر کسی کو خبردار نہیں کرتا مگر جس کو پیغمبر بنا کر چن لے پس بلاشبہ وہ (خدا) اس رسول کے آگے اور پیچھے نگہبان چلاتا ہے (یعنی اس کو اس بات سے محفوظ رکھتا ہے کہ خدا کی دی ہوئی خبر میں شیطان یا اس کا نفس کوئی ملاوٹ کرسکے اور اس کو شبہ پڑ جائے کہ یہ خدا کی دی ہے یا کچھ اور) تاکہ خدا یہ ظاہر کردے کہ انھوں نے (رسولوں نے)

بِرِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ۔ (الجن۔ پ۲۹۔ ع۱۲)   بلاشبہ اپنے پروردگار کے پیغام (ٹھیک ٹھیک) پہنچادے۔

اِن آیات کی تفسیر میں حضرت شاہ عبدالقادر (نوراللہ مرقدہٗ) یہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"یعنی رسول کو خبر دیتا ہے غیب کی، پھر چوکیدار (فرشتے) رکھتا ہے اس کے ساتھ کہ اس میں شیطان دخل نہ کرنے پاوے اور اپنا (رسول کا) نفس غلط نہ سمجھے یہی معنی ہیں اس بات کے کہ پیغمبروں کو عصمت ہے اوروں کو نہیں اور ان کا معلوم "بے شک" ہے اوروں کے معلوم میں شبہ ہے "۔ "

"نبی" اور "رسول" سے متعلق مسطورۂ بالا افراط و تفریط کے ساتھ ساتھ مشرکینِ عرب ایک نئی گمراہی میں مُبتلا تھے، وہ کہتے تھے کہ اول تو "پیغمبر" کا وجود ہی ہمارے لیے اچنبھے کی بات ہے، اور اگر یہ اچنبھا ہونا ہی تھا تو اس کے لیے ہماری طرح کا ایک انسان ہی کیوں چُنا گیا، کیوں ایک "فرشتہ" نہ بھیجا گیا اور اگر انسان ہی بھیجنا تھا تو یا تو مکّہ اور طائف کی کسی متموّل، سرمایہ دار ہستی کو پیغمبر بنایا جاتا ورنہ اس کو ہی غیب سے خزانے اور بے نظیر باغات عطا کیے جاتے تب ہم سمجھتے کہ بیشک یہ خدا کا فرستادہ ہے:۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ	اور وہ (مشرکین) کہتے ہیں، یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا اور
يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي	بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، ایسا کیوں نہ ہوا کہ اس کے ساتھ
الْاَسْوَاقِ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ	آسمان سے فرشتہ اُترتا اور وہ خدا کے پیغام سے خبردار کرتا
مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا	یا ایسا کیوں نہ ہوا کہ (ہماری آنکھوں دیکھتے) اس پر آسمان سے
اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ	خزانہ اُتر آتا یا قدرتی باغ ہوتا کہ وہ (ہر وقت مرضی کے مطابق)
جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا (فرقان پ۱۸ ع۱)	اس سے (پھل) کھاتا۔
وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ	اور ہم نے تجھ سے پہلے بھی ایسے ہی پیغمبر بھیجے تھے جو کھانا کھاتے
الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ	تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے (یعنی پیغمبری کے لیے
الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ	بشریت منافی نہیں ہے بلکہ انسانوں کے لیے انسان ہی کو

وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ	پیغمبر ہونا چاہیے) اور ہم نے (انسانوں میں سے انسان ہی کو
فِتْنَةً أَتَصْبِرُونَ ۚ	پیغمبر بنا کر) ایک دوسرے کی آزمائش کا سامان کر دیا کہ آیا تم صبر و
وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيرًا ۝	استقامت کا ثبوت دیتے ہو یا نہیں اور تیرا پروردگار بلاشبہ
(فرقان - پ ۱۸ - ع ۲)	(انسانوں کے کردار کا) دیکھنے والا ہے۔
وَقَالُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ	اور وہ کہتے ہیں اس پر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر) کیوں فرشتہ
مَلَكٌ ۖ وَلَوْ أَنْزَلْنَا مَلَكًا لَقُضِيَ	نہیں اُتار آگیا، اور اگر ہم فرشتہ اُتارتے تو البتہ (نتائج اعمال کا)
الْأَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُونَ ۝	فیصلہ کر دیا جاتا اور پھر وہ مہلت نہ دیے جاتے اور اگر ہم اس کو
وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَجَعَلْنَاهُ	فرشتہ کر دیتے تو بھی (انسانوں کی ہدایت کیلیے) اس کو بصورت
رَجُلًا وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَا	انسان ہی ظاہر کرتے اور (اس طرح) ہم پھر ان لوگوں کو اس
يَلْبِسُونَ ۝ (انعام - پ ۷ - ع ۸)	شبہ میں مبتلا کر دیتے جس میں اب مبتلا ہیں۔

اِس جگہ ان کی گمراہی کو دو دلائل سے واضح کیا ہے، ایک یہ کہ ایمان و اعتقاد کی زندگی سر تا سر "غیب" سے متعلق ہے پس اگر انسان کو اسی عالم میں عالمِ غیب کے معاملات کا مشاہدہ کرا دیا جائے اور پھر بھی وہ انکار پر جا رہے تو خدا کا قانونِ امہال" (مہلت کا قانون) نافذ نہیں ہوگا، بلکہ نتائجِ اعمال کا فوراً ہی ظہور ہو کر رہے گا، اور یہ اُن کے لیے بھی مُضر ہے اور خدا کی حکمتِ رحمت و ربوبیت کے بھی خلاف ہے۔ دوسری دلیل یہ کہ انسانی دنیا میں اگر فرشتہ کے ذریعہ "ہدایتِ وحی" کو بھیجا جائے تو انسان کس طرح اس سے مانوس ہو سکتے ہیں پھر اگر اسے بھی انسان ہی کی شکل میں بھیجیں تو شبہ کرنے والوں کا شبہ اسی طرح قائم رہے گا۔ اس لیے عقل و نقل دونوں کا فیصلہ یہی ہے کہ ہدایت کے لیے "انسان" ہی کو مبعوث ہونا چاہیے:

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَنْ يُؤْمِنُوا	اور لوگوں کے پاس جب ہدایت آپہنچی تو ان کو ایمان لانے
إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ إِلَّا أَنْ	سے کسی بات نے نہیں روکا مگر اس نے کہ وہ کہتے ہیں کہ
قَالُوا أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَسُولًا ۝	"کیا خدا کسی بشر کو پیغمبر بنا کر بھیجے گا" اے پیغمبر! کہہ دیجیے

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل، پ۱۵، ع۱۱)	اگر زمین پر انسانوں کی جگہ فرشتوں کی آبادی ہوتی اور وہ اس پر چلتے پھرتے تو ہم ضرور ان کے لیے آسمان سے فرشتہ کو ہی رسول بنا کر بھیجتے۔
وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ (الانبیاء۔ پ۱۷ ع۱)	اور (اے پیغمبر!) ہم نے تجھ سے پہلے بھی جن پر وحی نازل کی ہے وہ انسانوں کے سوا اور کچھ نہیں تھے پس (اے معترضین!) اگر تم نہیں جانتے ہو تو جاننے والوں سے دریافت کر لو اور نہ ہم نے ان کو بے جان (دھڑ) بنایا تھا کہ وہ کھانا نہ کھاتے ہوں اور نہ وہ (خدا کی طرح) ہمیشہ رہنے والے تھے۔

بہر حال اِن آیات میں قرآنِ عزیز نے علمی اور تاریخی دونوں قسم کے دلائل سے یہ صاف کر دیا کہ کائناتِ انسانی کی ہدایت کے لیے "انسان" کا نبی اور ہادی ہونا فطری بات ہے اور اس لیے اقوامِ ماضیہ میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔

پھر اس مسئلہ کی جانب بھی توجہ کی ہے کہ نبوت و رسالت کا تعلق سرداری، سرمایہ داری اور جتھہ بندی سے کچھ نہیں ہے اور اس کے لیے جن فطری اعلیٰ ملکات و استعدادات کی ضرورت ہے ان کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ ہی خوب واقف ہو کہ کون اس "منصب" کا اہل ہو۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ۭ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ	اور وہ کہتے ہیں یہ قرآن کیوں ان دو بستیوں (مکہ اور طائف) کے کسی سردار پر نازل نہیں ہوا (تو) کیا تیرے پروردگار کی رحمت کو یہ تقسیم کرنے والے ہیں، نہیں بلکہ ہم نے ہی ان کے درمیان ان کی دنیوی معیشت کو تقسیم کیا ہے اور ہم نے ہی بعض انسانوں کو بعض پر بلندیِ درجات عطا کی ہے تاکہ بعض بعض کے مسخر رہیں (یعنی بعض مقتدی ہوں اور بعض مقتدیٰ، بعض پیغمبر ہوں اور بعض اُمتی) اور تیرے پروردگار کی رحمت

لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا وَرَحْمَتُ	(نبوت) اس (دولت وثروت) سے کہیں زیادہ بہتر ہے
رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ؂	جو وہ خزانہ کیے ہوئے ہیں۔
وَإِذَا جَآءَتْهُمْ آيَةٌ	اور جب ان کے پاس خدا کی جانب سے کوئی آیت آتی ہے
قَالُوا لَن نُّؤْمِنَ حَتَّىٰ	تو یہ (مشرکین) کہتے ہیں ہم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے
نُؤْتَىٰ مِثْلَ مَآ أُوتِيَ	جب تک ہم کو بھی وہی چیز (وحی) نہ دی جائے جو خدا کے رسول
رُسُلُ اللَّهِ ۘ اللَّهُ أَعْلَمُ	کو دی گئی (لیکن ایسا نہیں ہوسکتا اس لیے کہ) اللہ ہی خوب
حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ ؂	جانتا ہے کہ وہ اپنے منصب رسالت کو کس کے سپرد کرے۔

اور یہ بات تو بہت واضح اور صاف ہے کہ جس شخص کو کوئی منصب عطا کیا جائے تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہر طرح اس کے لیے جوہر قابل اور اہل ہونا چاہیے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک جوہر قابل کو وہ "منصب" ملے، کیونکہ معطی کی مصلحت ہی خوب فیصلہ کرسکتی ہے کہ کس کو ملے اور کس کو نہ ملے چہ جائیکہ جو ہر قابل بھی نہ ہو۔ اس لیے ضروری ہوا کہ جو نبی اور رسول ہو وہ ہر حیثیت سے "انسان کامل" اور گناہوں سے "معصوم" ہو، لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو شخص بھی اخلاق حمیدہ اور روحانی مجاہدات کے ذریعہ "تقدیس" کا درجہ حاصل کرسکا ہو وہ منصب نبوت پر بھی ضرور فائز ہو۔

بہر حال نبوت "منصب" ہے "ڈگری" نہیں ہے، اور اس لیے جن کو دیا بھی جاتا ہے ان کو متنبہ کردیا جاتا ہے کہ یہ تم پر فضل خداوندی ہے ورنہ اگر وہ تم سے اس کو سلب کرلینا چاہے تو تمہاری طاقت بلکہ کائنات کی طاقت سے باہر ہے کہ پھر یہ تم کو مل سکے :۔

وَلَئِن شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِي	اور (اے پیغمبر!) اگر ہم چاہیں تو جو تجھ پر ہم نے وحی کی ہے
أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ	اس کو چھین لیں اور پھر تجھ کو کوئی بھی ایسا کارساز نہ ملے جو
بِهِ عَلَيْنَا وَكِيلًا ۝ إِلَّا رَحْمَةً	ہم پر زور ڈال سکے، لیکن (یہ جو سلسلۂ وحی جاری ہے تو)
مِّن رَّبِّكَ ۚ إِنَّ فَضْلَهُ كَانَ	اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تیرے پروردگار کی رحمت سے ہے

ؔ (زخرف پ۲۵، ع۳)، ؔ (انعام پ۸ ع۱۵)۔

عَلَيْكَ كَبِيْرًا ○ (بنی اسرائیل پ ۱۵ ع ۱۰) اور یقین کر کہ تجھ پر تیرے پروردگار کا بڑا ہی فضل ہے۔

نبی اور مُصلح | مسطورۂ بالا تفصیلات سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ چونکہ "نبی" اور "رسول" کو براہِ راست خدائے برتر سے شرفِ مکالمت حاصل ہوتا ہے یا خدا کا معصوم فرشتہ خدا کی وحی لاکر سُناتا ہے، اس لیے اس کا ذریعۂ "علم" "علم یقین" کا وہ درجہ رکھتا ہے جس میں شک وشبہ کی مطلق گنجائش نہیں رہتی اور اس کے علاوہ تمام ذرائع علم یقین کے اس درجہ سے نیچے ہیں بلکہ ان کی افادیت "ظن" سے آگے نہیں بڑھتی، اس لیے اگر ایک مردِ صالح اپنی قوم یا نوعِ انسانی کی اصلاحِ حال کے لیے کوئی قدم اٹھائے تو مقدس سے مقدس تر ہونے کے باوجود اس کے اپنے طریقۂ اصلاح میں غلطی کا وقوع اور امکان دونوں موجود رہتے ہیں بلکہ بعض اوقات وہ ایسی فاش غلطی کر گزرتا ہے کہ اس سے فائدہ پہنچنے کی بجائے قوم کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے اس لیے ایک نکوکار مصلح یہ کبھی دعویٰ نہیں کرتا کہ وہ اصلاحِ حال کے لیے جو کچھ اپنی جانب سے کہتا ہے غلطی سے پاک ہے، مگر ایک "نبی" اور "رسول" کے لیے ازبس ضروری ہے کہ وہ یہ بھی اعلان کرے کہ میں خدا کی جانب سے اصلاحِ حال کے لیے خدا کا پیغام رساں ہوں اور یہ بھی دعوٰے کرے کہ وہ جو "تعلیم و اصلاح" پیش کر رہا ہے، خدا کا فرمودہ ہے اور اس لیے ہر قسم کی غلطی اور لغزش سے پاک اور محفوظ ہے' وہ یہ نہیں کہے گا کہ یہ میرے دل کی آواز ہے یا اندر سے جو آواز آتی ہے اس کا نتیجہ اور ثمرہ ہے بلکہ صاف صاف یہ کہے گا کہ اس میں میرا اپنا کچھ نہیں میں تو صرف ایلچی اور پیغامبر ہوں یہ جو کچھ بھی ہے خدا کا فرمان اور اس کی "وحی" ہے۔

چنانچہ قرآنِ عزیز نے جگہ جگہ ان دونوں باتوں کو واضح کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ ہر ایک پیغمبر کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اعلان کر دیں کہ خدا نے ان کو اپنی "ہدایت وحی" کے لیے چُن لیا ہے اور وہ خدا کے پیغمبر ہیں اور یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ جو کچھ ان پر وحی کیا جاتا ہے اس کو حرف بہ حرف اُمّت تک پہنچائیں۔

حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (الاعراف پ ۸ ع)

(نوح) نے کہا اے میری قوم! مجھ کو گمراہی سے کوئی واسطہ نہیں ہے بلکہ میں تو تمام کائنات کے پروردگار کی جانب سے بھیجا ہوا ہوں تم تک اپنے پروردگار کی جانب سے پیغام پہنچاتا ہوں اور تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اور میں اللہ کی باتوں میں سے وہ باتیں جانتا ہوں جن سے تم بے خبر ہو۔

اور حضرت ہودؑ اور قوم کے درمیان مکالمہ میں حضرت ہودؑ نے یہ اعلان فرمایا:۔

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ سَفَاهَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ (الاعراف۔ پ۔ ع)

(ہودؑ نے) کہا: اے میری قوم! میں بے وقوف نہیں ہوں لیکن میں جہانوں کے پروردگار کی جانب سے بھیجا ہوا ہوں میں اپنے پروردگار کا پیغام تم تک پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور (پیغام الٰہی اور خیر خواہی میں) صاحب امانت ہوں۔

اور صالحؑ (علیہ السلام) نے یہ فرمایا:۔

قَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ (الاعراف پ ۸ ع)

(صالحؑ نے) کہا: اے قوم! بلاشبہ میں نے تم کو اپنے پروردگار کا پیغام پہنچا دیا اور تمہاری خیر خواہی کی مگر تم خیر خواہی کرنیوالوں کو ناپسند کرتے ہو۔

اور حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ آزر سے یہ ارشاد فرمایا:۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا يٰاَبَتِ اِنِّيْ

اور یاد کرو کتاب (قرآن) میں ابراہیم کا حال، بلاشبہ تھا وہ بہت ہی صادق اور نبی جب اُس نے اپنے باپ سے کہا: اے باپ! ایسی چیز کی پوجا کیوں کرتا ہے جو نہ سنتی ہے نہ دیکھتی ہے اور نہ تجھ کو کسی (نقصان) سے بے پرواہ کرتی ہے (یعنی بُت پرستی کیوں کرتا ہے؟) اے باپ! بلاشبہ

قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِكَ — مجھ کو علم (وحی) سے وہ حصہ ملا ہے جو تجھ کو حاصل نہیں ہے
فَاتَّبِعْنِیْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِیًّا۝ — پس میری پیروی کر میں تجھ کو سیدھی راہ دکھلاؤں گا۔ "

اور لوط (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے مکالمہ کرتے ہوئے یہ فرمایا:۔

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا — جب کہا اُن سے اُن کے بھائی (لوط) نے کیا تم پرہیزگاری
تَتَّقُوْنَ۝ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ۝ — اختیار نہیں کرتے، بلاشبہ میں تمہارے لیے خدا کا بھیجا ہوا ہوں
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ۝ — (اور اس پیغامبری میں) صاحبِ امانت ہوں، پس اللہ سے
(الشعراء - پ۱۹ - ع۹) — ڈرو اور میری پیروی کرو۔

اور حضرت یعقوب و یوسف (علیہما السلام) کے ایک طویل حیرت زا واقعہ کے ضمن میں یعقوب (علیہ السلام) کا وہ مقولہ بھی منقول ہے جس میں انھوں نے اپنے بیٹے یوسف (علیہ السلام) کو وحی الٰہی کے ذریعہ یہ بشارت دی ہے کہ جس طرح خدا نے تیرے باپ دادا، ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق اور یعقوب (علیہم السلام) کو پیغمبری عطا فرمائی اُسی طرح تجھ کو بھی اس منصب جلیل سے سرفراز کرے گا:۔

وَكَذٰلِكَ یَجْتَبِیْكَ رَبُّكَ وَ — اور اسی طرح تیرا پروردگار تجھ کو چن لے گا اور تجھ کو تعبیر رویا
یُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ وَیُتِمُّ — کا علم بخشے گا اور تجھ پر اپنی نعمت (نبوت) کی تکمیل کرے گا
نِعْمَتَهٗ عَلَیْكَ وَعَلٰٓی اٰلِ یَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا — اور اولادِ یعقوب پر (جو اس کے اہل ہوں گے) جیسا اس نے
عَلٰٓی اَبَوَیْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ — اس سے پہلے تیرے باپ دادا ابراہیم اسحٰق پر اس (نبوت)
اِنَّ رَبَّكَ عَلِیْمٌ حَكِیْمٌ۝ (یوسف پ۱۲ ع۱) — کو پورا کیا بیشک تیرا پروردگار جاننے والا ہے حکمت والا ہے۔

اور پھر حضرت یوسف (علیہ السلام) کی تبلیغ و دعوت اس طرح قرآن میں مذکور ہے:۔

یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ — اے میرے قید کے رفیقو! کیا بہت سے آقا اور خداوند بہتر
مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ — ہیں یا اکیلا خدا کی ذات جو ہر شے پر غالب ہے تم اس کے سوا
الْقَهَّارُ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ — جس کو پوجتے ہو ان کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ چند

ے (سورۂ مریم - پ۱۶ - ع۳)

إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ	نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے گھڑ لیے
مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ إِنِ	ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے کوئی دلیل نہیں اتاری
الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا	اور حکم تو خدا کے سوا کسی کا نافذ نہیں، اس نے یہی حکم دیا
إِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ	ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، دین کی سیدھی
النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (یوسف پ۱۲ ع۵)	راہ یہی ہے لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے۔

اور حضرت شعیب (علیہ السلام) نے اصحاب ایکہ کے سامنے یہ اعلان کیا:

كَذَّبَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ الْمُرْسَلِينَ	اصحاب ایکہ نے پیغمبروں کو جھٹلایا، جب ان سے شعیب
إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ أَلَا تَتَّقُونَ	نے کہا: کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے، بلاشبہ میں تمہارے
إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ	لیے (خدا کی جانب سے) صاحب امانت پیغامبر ہوں پس
وَأَطِيعُونِ (الشعراء پ۱۹ ع۱۰)	اللہ سے ڈرو اور میری پیروی کرو۔

اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے فرعون کے دربار میں بے دھڑک یہ اعلان فرمایا:

وَقَالَ مُوسَىٰ يَا فِرْعَوْنُ إِنِّي رَسُولٌ	اور موسیٰ نے کہا، اے فرعون! بلاشبہ میں جہانوں کے
مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ حَقِيقٌ عَلَىٰ أَنْ	پروردگار کا پیغمبر ہوں، میرے لیے یہی لائق ہے کہ میں خدا
لَا أَقُولَ عَلَى اللّٰهِ إِلَّا الْحَقَّ قَدْ	کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہوں، میں تمہارے پروردگار
جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ فَأَرْسِلْ	کی طرف سے دلیل لے کر آیا ہوں، پس تو میرے ساتھ بنی اسرائیل
مَعِيَ بَنِي إِسْرَائِيلَ (الاعراف پ۹ ع۱۳)	کو (آزاد کر کے) بھیج دے (جن کو صدیوں سے غلام بنا رکھا تھا)

اور حضرت داؤد و سلیمان (علیہما السلام) کے واقعہ میں سلیمان (علیہ السلام) نے ملکہ سبا کو دعوت اسلام کے لیے جو نامہ مبارک تحریر فرمایا تھا اس کا اسلوب بیان یہ ہے:

إِنَّهُ مِنْ سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ	یہ سلیمانؑ کی جانب سے ہے اور یہ شروع ہے اللہ کے نام
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ	سے جو رحمٰن ہے رحیم ہے، بات یہ ہے کہ مجھ پر اپنی بلندی
أَلَّا تَعْلُوا عَلَيَّ وَأْتُونِي	و برتری کا اظہار نہ کرو (کیونکہ میں بادشاہ نہیں بلکہ پیغمبر ہوں)

مُسْلِمِیْنَ (النمل۔ پ ۱۹۔ ع ۲) اور میرے پاس خدا کی فرمانبردار بندی بن کر حاضر ہو۔

اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) سے قبل ایک علاقہ میں خدا کے چند نبی دعوت و تبلیغ اسلام کے لیے مامور کیے گئے تھے انھوں نے اپنی قوم سے فرمایا:۔

قَالُوْا رَبُّنَا يَعْلَمُ اِنَّآ انھوں نے کہا ہمارا پروردگار (خوب) جانتا ہے کہ بلاشبہ
اِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ ۝ وَمَا ہم تمہاری جانب اُس کے بھیجے ہوئے ہیں، اور ہمارے
عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ اوپر اس سے زیادہ کوئی ذمہ داری نہیں کہ امرِ حق کا صاف
(یٰسٓ۔ پ ۲۲۔ ع ۱) اور کھلا پیغام پہنچا دیں۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بار بار بنی اسرائیل کے سامنے یہ اعلان فرمایا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور میری بتلائی ہوئی راہ کے سوا کوئی راہِ مستقیم نہیں کیونکہ میں جو کچھ بھی پیش کر رہا ہوں خدا کا فرمودہ ہے:۔

قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۭ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ (عیسیٰ نے) کہا بلاشبہ میں اللہ کا بندہ ہوں اُس نے مجھ کو
وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا (مریم۔ پ ۱۶۔ ع ۲) "کتاب" عطا کی ہے اور اُس نے مجھ کو "نبی" بنایا ہے۔
وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ جب کہا عیسیٰ بن مریم نے اے بنی اسرائیل! بلاشبہ میں تمہاری
اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ (الصف پ ۲۸) جانب خدا کی جانب سے بھیجا ہوا ہوں (رسول ہوں)

اور خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ میں تو جگہ جگہ یہ حقیقت بہت نمایاں نظر آتی ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا اے نبی! بلاشبہ ہم نے تجھ کو (حق کے لیے) گواہ اور نیک
وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا عمل کے لیے) بشارت دینے والا اور (بدعمل کے نتائج سے)
اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا ڈرانے والا اور خدا کے حکم سے اس کی جانب بلانے والا
مُّنِيْرًا ۝ (الاحزاب۔ پ ۲۲۔ ع ۶) اور (ہدایت و صراطِ مستقیم کے لیے) روشن چراغ بنایا ہے۔
قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجیے "اے لوگو! بیشک

رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ۨ الَّذِيْ	میں تم سب کی جانب اللہ کا بھیجا ہوا ہوں اُسی کے لیے ہے
لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ	بادشاہت آسمانوں کی اور زمین کی، کوئی خدا نہیں ہے مگر
اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ	صرف وہی یکتا ذات (وہی) زندگی بخشتا ہے اور وہی موت
وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ	دیتا ہے، پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول نبی امی
يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ	پر جو خود اللہ پر اور اس کی باتوں پر ایمان لاتا ہے اور اسکی
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝ (اعراف پ۔ ع)	پیروی کرو تاکہ تم راہ پاؤ۔
اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ [1]	بلاشبہ اللہ کے نزدیک (ہمیشہ سے) دین (حق) اسلام ہی ہے۔
وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا	جو شخص اسلام کے ماسوا کو دین بنانا چاہے تو
فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ (آل عمران پ۔ ع)	خدا کے یہاں وہ مقبول نہیں ہے۔

غرض پیغمبر اور نبی کے لیے ازبس ضروری ہے کہ وہ اپنی دعوتِ اصلاح اور تعلیم حق پر خود بھی ایمان لائے اور کائنات کے سامنے بھی یہ اعلان کرے کہ یہ "پیغام ہدایت" اور یہ "تعلیم حق" میری جانب سے نہیں بلکہ خدا کی جانب سے ہے اور اسی نے مجھ کو اپنا ایلچی بنا کر اس کی دعوت کے لیے بھیجا ہے، یہ جو کچھ ہے سب خدا کا اپنا ہے میں تو صرف اسی کی جانب پکارنے والا ہوں اور اس میں شک و شبہ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے اور یہ ہر قسم کی لغزش و خطا سے پاک "علم یقین" اور "وحیِ الٰہی" ہے جس کے متعلق خدا کا یہ فیصلہ ہے:۔ "لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ" اور "وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى" لیکن "مصلح غیر نبی" کو یہ مجاز حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی دعوتِ اصلاح کے بارہ میں یہ دعویٰ کرے کیونکہ اس کی یہ دعوتِ اصلاح یا کسی پیغمبر اور نبی کی "ہدایتِ وحی" کی پیروی میں ہوگی تب تو اس کی حیثیت ایک یاددہانی کرنے والے کی ہے اور یا ہدایتِ وحی کے اتباع کے ساتھ اس کے اپنے اجتہاد اور ضمیر کی آواز کا بھی دخل ہوگا تو اس کے اس حصۂ اصلاح کا لغزش خطا بلکہ بعض اوقات غلط روی سے بھی

[1] آل عمران۔ پ۔ ع۔

محفوظ رہنا لازمی اور ضروری نہیں ہے۔

کیفیتِ وحی وحی سے متعلق جو حقائق سپردِ قلم ہو چکے ہیں ان میں ایک یہ اضافہ بھی قابلِ توجہ ہے: عربی میں وحی کے معنی مخفی اشارہ کے ہیں، گویا یہ فطرتِ الٰہی کی وہ سرگوشی ہے جو ہر ایک مخلوق پر اس کی راہِ عمل کھولتی ہے، چنانچہ قرآن نے شہد کی مکھی کے نظامِ بیت کے متعلق فطری ہدایت کو لفظِ "وحی" سے ہی تعبیر کیا ہے:-

وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ	اور تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات
مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ	ڈال دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ان ٹھیوں میں جو
وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ۝ (النحل۔ پ۱۴۔ ع۹)	اسی غرض سے بلند کی جاتی ہیں اپنے لیے چھتے بنائے۔

اور مذہب و دین کی اصطلاح میں اُس الہام کو کہتے ہیں جو خدائے برتر کی جانب سے نبی اور پیغمبر پر اس طرح القاء یا فرشتہ کے ذریعہ نازل کیا جاتا ہے کہ اس مقدس ہستی کو اس کے منجانب اللہ ہونے کا روزِ روشن سے بھی زیادہ یقین حاصل ہو جاتا ہے اور کسی قسم کے بھی شک و شبہ اور تردد کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور اسی لیے وہ تحدی کے ساتھ یہ دعوٰے کرتا ہے کہ یہ "خدا کی وحی" اور اس کا بخشا ہوا "علم یقین" ہے۔ نزولِ وحی کی یہ صورت کس طرح پیش آتی ہے اور کون سے وہ طریقے ہیں جن کے ذریعہ نبی معصوم کو خدا کی وحی کا علم ہوتا ہے؟ قرآن عزیز اس کے متعلق یہ کہتا ہے:-

وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ	اور کسی انسان کے لیے یہ صورت ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس
اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ	سے (اس دُنیا میں بالمواجہ) گفتگو کرے مگر یا وحی (کے القاء)
اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ	کے ذریعہ یا پسِ پردہ یا بھیج دے فرشتہ کو پس وہ اس کی
بِاِذْنِہٖ مَا یَشَآءُ اِنَّہٗ عَلِیٌّ	(خدا کی) اجازت سے اس پر وحی لا اُتارے جو اُس کی (خدا
حَکِیْمٌ ۝ (شوریٰ۔ پ۲۵۔ ع۵)	کی) مرضی ہو بلاشبہ وہ (خدا) بلند و بالا حکمت والا ہے۔

غرض وحی ایک خاص ذریعۂ علم کا نام ہے جو خدا کی جانب سے اس کے نبیوں اور رسولوں

کے لیے مخصوص ہے اور اس کا تعلق براہِ راست عالَمِ قدس اور عالَمِ غیب سے ہے اسی بنا پر اگرچہ انبیاء و رسل کو اس کی معرفت اور اس کے منجانب اللہ ہونے کا یقینِ کامل آفتاب عالمتاب سے زیادہ بدیہی ہوتا ہے لیکن وہ اس کی حقیقی کیفیت کو دوسروں پر تشبیہ و تمثیل ہی کے ذریعہ واضح کر سکتے ہیں۔ چنانچہ جب بعض صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے حضرتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) سے نزولِ وحی کی کیفیت کے متعلق سوالات کیے تو آپؐ نے یہ جوابات ارشاد فرمائے:

"احیاناً یاتینی کصلصلۃ الجرس۔ کبھی یوں معلوم ہوتا ہے گویا گھنٹہ کی مسلسل گونج ہے۔" "دَوِیٌّ کدَوِیِّ النحل" (کبھی) جس طرح شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے گونج پیدا ہوتی ہے اُس طرح کی گونج محسوس کرتا ہوں۔" "واحیاناً یتمثل لی الملک رجلاً فاَعِیْ مایقول" اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فرشتہ انسان کی شکل میں ظاہر ہو کر مجھ کو خدا کی وحی سُناتا ہے اور میں اس کو محفوظ کر لیتا ہوں۔

اِن جوابات میں کیفیتِ وحی کو اگرچہ قریب الفہم بنانے کی کافی کوشش کی گئی ہے۔ پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حقیقی کیفیت کو خدا اور خدا کے پیغمبر کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں پا سکتا اور پیغمبر اُس حقیقت کا اِذعان اور اس کے منجانب اللہ ہونے پر غیر متبدل یقین تو رکھتا ہے لیکن غیر نبی پر حقیقی کیفیت کو واضح کرنے سے معذور ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اس لیے کہ یہ صورتِ حال تو دنیا کی اَن دیکھی اشیاء کے بارہ میں بھی صبح سے شام تک ہم مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً جس شخص نے سیب کو نہیں دیکھا اور نہیں چکھا اُس کے سامنے دیکھنے اور چکھ لینے والا اگرچہ سیب کی حقیقت کا بہتر سے بہتر نقشہ بھی پیش کر دے اور اس کے رنگ، مزہ، خوشبو، لطافت وغیرہ کی تعبیر بحدِ کمال بھی پہنچا دے تب بھی وہ شخص سیب کو آنکھ سے دیکھنے اور زبان سے چکھ لینے والے کے مقابلہ میں کسی طرح اس کی حقیقی کیفیت سے آگاہ نہیں ہو سکتا، وہ بلاشبہ سیب کے متعلق صحیح علم تو حاصل کر سکتا ہے لیکن حقیقی ذوق کو ہرگز نہیں پا سکتا، اسی طرح نبی کی تعلیم و تلقین سے ہم وحی کے متعلق

ایک اجمالی علم ضرور حاصل کر لیتے ہیں لیکن اس کی حقیقی کیفیت کو نہیں پا سکتے۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قرآن میں مسطور ہر سہ اقسام وحی میں سے پہلی قسم "الّا وحیًا" کے متعلق یہ بھی ارشاد فرمایا ہے: "وھو اشدہ علیّ فیفصم عنّی وقد وعیت وما قال اور وحی کی یہ صورت مجھ پر بہت سخت گذرتی ہے، پھر جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے تو وحیِ الٰہی نے جو کچھ کہا ہوتا ہے وہ سب مجھے محفوظ ہوتا ہے۔" یعنی جب فرشتہ بشکلِ انسان تمثل اختیار کر کے وحی الٰہی لاتا ہے یا "من وراء حجاب" براہِ راست خدائے برتر سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوتا ہے تو یہ دونوں صورتیں آپ پر آسان ہوتی ہیں مگر "القاءِ وحی" کی پہلی شکل سخت گذرتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کے متعلق علماءِ حق یہ ارشاد فرماتے ہیں:

خالقِ کائنات نے انسان کو لوازم بشریت کی قیود و شروط کے ساتھ اس درجہ پابند بنا دیا ہے کہ انبیاء و رسل جیسی مقدس اور معصوم ہستیوں کو بھی اپنی تطہیر و تقدیس کے باوجود ان اثرات سے متاثر ہوئے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے اس لیے جب اُن پر خدا کی وحی کا نزول ہوتا اور ایسی حالت میں ان پر عالم قدس کے تمام اثرات چھا جاتے اور انوار و تجلیات کی آغوش میں وہ حضرتِ حق سے ہم کلامی کا شرف حاصل کرتے ہیں تو اس حالت میں اُن پر دو قسم کی کیفیتوں میں سے ایک کیفیت ضرور طاری ہوتی ہے، ایک یہ کہ اس کے بشری خواص کو مغلوب کر کے اس کی روحانی کیفیات کو عالمِ قدس کی جانب اس درجہ بلند اور رفیع کیا جائے کہ وہ حضرتِ حق کی وحی کے اثرات قبول کرنے اور محفوظ رکھنے کے قابل ہو سکے اور چونکہ جذب و انجذاب کی اس خاص حالت اور عالم آب و گِل سے عالمِ قدس کی جانب اس مخصوص رفعت میں بشری خصوصیات اور روحانی مؤثرات کے درمیان سخت قسم کا تصادم پیدا ہو جاتا ہے اس لیے اس تصادم اور تزاحم سے نبی پر ابتداءً ایک اضطرابی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ جب یہ تصادم ختم ہو کر یہ عالمِ قدس کے تمام پاک اور لطیف اثرات اُس ہستی پر چھا جاتے ہیں اور وہ ان میں محو اور مستغرق ہو کر

لذتِ وحی کو پا جاتی ہے تو پھر یہ اذیت و تکلیف یکلخت جاتی رہتی ہے اور اس کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور یہ سب کچھ چند دقیقوں میں ہو گزرتا ہے۔

یہی وہ صورتِ وحی ہے جس کی کیفیات کو ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) نے "صلصلۃ الجرس" اور "دوِیِّ النحل" کی تمثیلات میں سمجھانے کی کوشش فرمائی ہے، تمثیلات میں اس پہلو کے اختیار کرنے کی وجہ بھی مسطورۂ بالا حقیقت ہے، اس لیے کہ اس صورتِ خاص میں جب بشری حواس و ادراکات پر عالمِ قدس کے روحانی اثرات کا غلبہ ہوتا ہے تو اوّل حواس و ادراکات میں اضطراب و بے چینی پیدا ہو جاتی ہے اور حاسۂ سمع کہ جس کا تعلق سماعتِ وحی سے ہے وہ شروع میں ایک خاص قسم کی گونج محسوس کرتا ہے جو اس عالمِ پست سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتی اور اس کے بعد وہ "وحیِ الٰہی کی اصل کیفیت سے لذت اندوز ہوتا اور اس کو "علمِ یقین" اور "اذعانِ حق" کے ساتھ پا لیتا ہے کیونکہ عالمِ قدس کے قوی مؤثرات اس پر غالب آکر "وحیِ الٰہی" کے حصول کا ہر طرح اہل بنا دیتے ہیں مگر دوسروں پر اس حقیقت کے تمام و کمال سمجھانے میں ان علامات و اثرات کے اظہار سے آگے نہیں جاتا جن کو ابھی "صلصلۃ الجرس" اور "دوِیِّ النحل" کی تعبیرات میں سن چکے ہو وحیِ الٰہی کی اس نوع کے علاوہ دوسری ہر دو انواع "یعنی وراءِ حجاب کلامِ الٰہی کی سماعت یا فرشتہ کے ذریعہ وحی کے نزول" میں صورتِ حال برعکس ہوتی ہے اور اس وقت نبی کے بشری خواص کو عالمِ قدس کی جانب رفعت دینے اور عالمِ خاک و گِل سے عالمِ نور کی جانب جذب و انجذاب سے متاثر کرنے کی تکلیف نہیں دی جاتی، بلکہ عالمِ قدس کی تمام کیفیات خود ہبوط و نزول کرتی اور نبی کی روحانیت کو متأثر بناتی ہیں اور یا فرشتہ بحکمِ حضرتِ حق اپنے ملکوتی جسد کو جامۂ انسانیت کے ساتھ متشکل کر لیتا اور عالمِ قدس کے اثرات اور بشری خواص میں امتزاج پیدا کر کے نبی کے حضور حاضر ہوتا اور وحیِ الٰہی کی تلاوت کرتا ہے اور اس لیے ان دونوں صورتوں میں نبی اور رسول کو پہلی قسم کے تصادم سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔

4

کیفیتِ وحی اور بعض مستشرقین کی گمراہی

چونکہ یورپ کے دورِ علمی کی بنیاد خالص مادیات پر قائم ہے اور روحانی علوم اور ماوراءِ مادیات کے ناقابلِ انکار حقائق کے۔ یہ وہ کوئی جگہ دینے کو آمادہ نہیں ہے اس لیے بعض مستشرقین نے جب وحی الٰہی کی پہلی قسم کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اقوال سنے جن کا ذکر ابھی ہو چکا ہے اور وہ حالات پڑھے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ نزولِ وحی کی اس خاص صورت میں آپؐ کرب اور اضطراب محسوس فرماتے اور سردی کے ایام میں آپؐ کی پیشانی پر پسینہ آجاتا اور آپؐ پر بیخودی کے سے آثار نظر آنے لگتے تو انھوں نے یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی کہ یہ نزولِ وحی کی کیفیت نہیں ہوتی تھی بلکہ (العیاذ باللہ) آپؐ کو ہسٹریا کا دورہ ہو جاتا تھا۔

یہ مستشرقین پُر زور الفاظ میں آپؐ کی صداقت و امانت کو تسلیم کرتے ہیں، آپؐ کی تعلیماتِ حق کو سراہتے اور کائناتِ انسانی کے لیے آپؐ کی تعلیمات کو "تعلیمِ کامل" مانتے ہیں، لیکن اس کے باوجود آپؐ کے دعویٰ "الہام و وحیِ الٰہی" کا انکار کرتے اور کیفیتِ وحی کو مرض سے تعبیر کرتے ہیں۔ "سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ"

درحقیقت یہ حضرات یا تو ازرہِ تعصب ناقابلِ انکار تعلیمِ حق کے تسلیم کے ساتھ ساتھ ایک ایسی بات کہنا چاہتے ہیں جس سے تعلیمِ حق (اسلام) پر کاری ضرب لگ سکے اور تعصب کے الزام سے بھی بچ جائیں اور یا پھر اُس علمی حقیقت سے بے بہرہ ہیں جس کو تفصیل کیساتھ ہم ابھی ظاہر کر چکے ہیں کہ نزولِ وحی کی یہ کیفیت "مرض" نہیں تھا بلکہ اپنے اثرات اور محرکات کی بنا پر ایک فطری صورتِ حال تھی جس کا پیش آنا ازبس ضروری تھا اور دراصل یہ کیفیت دماغ، حواس اور اعضائے انسانی کو مفلوج نہیں بناتی تھی جیسا کہ ہسٹریا وغیرہ میں ہوتا ہے بلکہ اس کے برعکس تمام مادی قویٰ میں روحانی کوائف کی ایسی برقی رو دوڑا دیتی ہے جس سے چند لمحات کے بعد ان کے اندر ایسی زبردست اور مافوق المادہ قوت پیدا ہو جاتی تھی جس کے ذریعہ اس ہستی (نبی) میں عالمِ قدس سے پوری طرح وابستہ ہو کر خدا کی

وحی اور اس کے کلام کو سننے اور قلب و دماغ میں بخوبی محفوظ رکھنے کی صلاحیت رونما ہو جائے چنانچہ اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد فرمایا:
"فیفصم عنی وقد وعیت ما قال" شدت و کرب کی یہ کیفیت جلد ہی مجھ سے زائل ہو جاتی ہے اور میں وحی الٰہی کو تمام و کمال محفوظ کر لیتا ہوں۔"

کیا ہسٹریا کے دوروں کا کوئی مریض ایسا پیش کیا جا سکتا ہے جس پر ایک جانب مرض کا مسلسل حملہ ہو رہا ہو اور دوسری جانب وہ علمی و عملی صلاحیتوں، معاشی و معادی حکمتوں اور دینی و دنیوی رفعتوں کے لیے ایسا کامل و مکمل دستور و آئین اور اعمال و افکار پیش کر رہا ہو، کائنات جس کا جواب نہ رکھتی ہو اور دوست و دشمن دونوں اس کی رفعت و بلندی کا اعتراف کرتے ہوں؟ کیا دماغی فتور جو کہ ہسٹریا کا ثمرہ اور نتیجہ ہے اور دماغی رفعت و بلندی جس کے ثمرات حیرت زا اور علمی دنیا میں وقیع سے وقیع تر ہوں دونوں یکجا جمع ہو سکتے ہیں؟ اور اگر نہیں ہو سکتے اور بلاشبہ نہیں ہو سکتے تو حقیقتِ حال کو نظر انداز کرتے ہوئے "وحی الٰہی سے متعلق" مستشرقین کا یہ دعویٰ کس درجہ حقیر اور بے وقعت ہو جاتا ہے۔ صاحبِ عقل و بصیرت اس کا خود اندازہ لگا سکتے ہیں؟

نزولِ وحی کا پہلا دور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے سورۂ علق کی یہ آیات نازل ہوئیں:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ	پڑھو! اپنے پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا،
خَلَقَ ۚ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ	پیدا کیا انسان کو خونِ بستہ سے، پڑھو! اور تیرا پروردگار
اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِیْ	جو سب سے زیادہ برگزیدہ ہے وہ ہستی ہے جس نے
عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ	سکھایا لکھنا، سکھایا انسان کو وہ سب کچھ جو وہ نہیں
مَا لَمْ یَعْلَمْ ۗ (علق۔ پ۔ ع)	جانتا تھا۔

ان آیات میں یہ بتلایا گیا ہے کہ حضرت انسان جو خدا کی سب سے بہتر اور سلسلۂ کائنات کی سب سے ترقی یافتہ مخلوق ہے اور اسی وجہ سے وہ کائنات ہست و بود میں

"خلیفۃ اللہ" کے منصب پر سرفراز کیا گیا ہے، اس کی خلقی کمزوریوں کا یہ حال ہے کہ اس کی نمود کی ابتدا "آبِ نجس اور خونِ بستہ" سے ہوئی ہے لیکن قدرتِ حق نے جب اس کو مقامِ رفیع بخشنے کا ارادہ کیا اور "اسفل سافلین" کے لائق مخلوق کو "درجاتِ عُلیا" پر فائز کرنا چاہا تو اس کو وہ صفتِ اعلیٰ عطا فرمائی جو صفاتِ الٰہی میں مبدء الصفات ہے یعنی اس کو "صفتِ علم" کا مظہر بنایا اس کو "قلم کے ذریعہ" لکھنا سکھایا اور علوم و عرفان کا مہبط و محور ٹھہرایا پھر اس جانب بھی اشارہ کیا کہ بہ سلسلۂ اسباب و مسببات حصولِ علم کے تین ہی طریقے ہیں "ذہنی لسانی رسمی" اور علمِ ذہنی الفاظ اور رسوم و نقوش کا محتاج نہیں ہوتا۔ اور علمِ لسانی علمِ ذہنی کا محتاج ہے مگر رسوم و نقوشِ کتابت سے بے نیاز اور علمِ رسمی، رسم الخط اور نقوش کا بھی محتاج ہے پس اگر "علمِ رسمی" کا کسی جگہ مذکور ہو تو لسانی اور ذہنی علوم کا ذکر خود بخود ہو جاتا ہے کیونکہ یہ اپنے سے بلند ہر دو علوم کے لیے بہترین مُعبِّر ہے اور ظاہر ہے کہ "علمِ رسمی" "قلم" کا محتاج ہے۔ لہٰذا قرآنِ عزیز نے "عَلَّمَ بِالْقَلَمِ" کہہ کر لطیف پیرایۂ بیان میں اس پوری حقیقت کو واضح کر دیا اس کی مزید تشریح "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ" سے کر دی۔ اور اس معجزانہ اسلوب کی غرض و غایت یہ ہے کہ ایک جانب "علم" اور "نبوت" کے درمیان کیا علاقہ ہے اس کا اظہار ہو جائے اور دوسری جانب انسان کو اپنے مقصدِ حیات کا صحیح علم ہو جائے۔

نزولِ وحی کا دوسرا دور غارِ حرا میں منصبِ نبوت سے سرفرازی کے وقت سورۂ علق کی یہ چند آیات نازل ہو کر وحی الٰہی کا سلسلہ منقطع ہو گیا، حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہ ہوا کہ حرا میں فرشتے کے ظہور اور وحی کے نزول سے فوری طور پر نبوت و رسالت کے جو خصائص و اثرات ذاتِ اقدسؐ پر وارد ہوئے ہیں وہ اچھی طرح راسخ ہو جائیں اور صلاحیت و استعدادِ نبوت و رسالت کی تکمیل ہو جائے تاکہ آئندہ سلسلۂ وحی کے قوی مؤثرات و محرکات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بشری خواص کے لیے اجنبی نہ رہیں، اس لیے کچھ عرصہ کے لیے نزولِ وحی کا سلسلہ بند رہا۔ اسی کو مذہب کی اصطلاح میں "فترتِ وحی" کہتے ہیں۔

لیکن ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حرا میں پیش آمدہ کیفیت وصورتِ حال سے جو فطری تشویش پیدا ہوتی تھی جب اس نے سکون وطمانینت کی شکل اختیار کر لی تو نزولِ وحی کی روحانی کیفیات نے اس درجہ لطف اندوز کیا کہ آپؐ اس "فترت" کو برداشت نہ کر سکے اور لطیف وعمیق جذبات نے اس حد تک اضطراب وبے چینی کی شکل اختیار کر لی کہ گاہ گاہ ناموسِ اکبر (جبرئیلِ امین) ظاہر ہو کر آپؐ کو صبر وتسکین کی دعوت دیتے اور یقین دلاتے تھے کہ اپنی تمام لطافتوں اور حسن وکمال کے ساتھ نبوت ورسالت کا یہ سلسلہ آپؐ کی ذات کے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے اور "فترت" کا یہ دور محض عارضی ہے، اس لیے آپ اندوہگیں نہ ہوں تب آپ تسکین پاتے اور وقتِ موعود کے منتظر رہتے کہ کچھ عرصہ بعد[1] نزولِ وحی کا دوسرا دور شروع ہوا اور سب سے اول سورۂ مدثر کی یہ آیات نازل ہوئیں۔

يَاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝	اے کملی پوش اٹھ (اور لوگوں کو گمراہی کے انجام سے) ڈرا
وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ وَثِيَابَكَ	اور اپنے پروردگار کی عظمت وجلال کو بیان کر اور لباس
فَطَهِّرْ ۝ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۝	کو پاک کر اور بتوں سے جدا رہ، اور زیادہ حاصل کرنے کی
وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝ وَلِرَبِّكَ	نیت سے حسن سلوک نہ کر، اور اپنے پروردگار کے معاملہ
فَاصْبِرْ (مدثر۔ پ ۲۹۔ ع)	میں (اذیت ومصیبت پر) صبر اختیار کر۔

ان آیات نے گویا انسانی مقصدِ حیات کی تکمیل کر دی کیونکہ سورۂ علق میں کہا گیا تھا کہ انسانیتِ کبریٰ کے لیے "صحیح علم" شرط ہے، یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ علمِ صحیح کی رفعت وبلندی کے اعتراف کے باوجود انسانیت کی تکمیل اس وقت تک ناممکن ہے کہ علمِ صحیح کے ساتھ "عملِ صحیح" بھی موجود ہو اس لیے کہ اگر علم صحیح ہے اور عملِ صحیح مفقود تو اس کی افادیت معطل اور بیکار ہے اور اگر عمل ہے اور علمِ صحیح ندارد تو وہ عمل موجب زیان ونقصان ہے،

---

[1] فترۃ کا زمانہ کس قدر رہا ہے اس سلسلہ میں چھ ماہ سے ڈھائی سال تک کے متعلق روایات پائی جاتی ہیں اور محدثین کا رجحان چھ ماہ کی جانب زیادہ ہے۔

رشد و ہدایت اور صراطِ مستقیم کے لیے دونوں ہی کا وجود ضروری ہے اور تب ہی "انسان" "انسانیتِ کبریٰ" حاصل کر سکتا ہے۔

غرض جس طرح سورۂ علق کی آیات نے "علمِ نافع" کی جانب اشارات کیے اسی طرح سورۂ مدثر نے "عملِ نافع" کی اساسی تفاصیل ظاہر کی ہیں۔ خدا کی ہستی اور اس کی ربوبیتِ کاملہ کا عملی اعتراف، باطنی طہارت و پاکیزگی کا کمال، ظاہری طہارت و پاکی کا لزوم، بے غرض اور بے لوث اخلاقِ حمیدہ کی اساس "احسان" پر استقامت اور قبولِ حق اور نیک عمل کے نتائج پر "صبر" ان آیات کا حاصل ہیں اور یہی وہ بنیادی امور ہیں جن میں علمِ حق اور عملِ صحیح کی تمام کائنات سمو دی گئی ہے۔

نیز ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے سورۂ علق اور سورۂ مدثر کا یہ خطاب اور پیغامِ حق اشارہ ہے اس جانب کہ یہ نظامِ عمل منصبِ رسالت کے لیے "تکمیلِ نفس" اور دعوتِ رشد و ہدایت کے لیے "مرتبۂ اولین" کی حیثیت رکھتا ہے اور یہی مستقبلِ قریب میں "بعثتِ عامہ" کا باعث ثابت ہوگا۔

اعلانِ دعوت و ارشاد کی پہلی منزل

کلامِ الٰہی کے اس حکم کے بعد جو کہ تبلیغ و دعوتِ حق کا پہلا پیغام تھا دعوت و ارشاد نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اب ذاتِ حق نے سورۂ شعراء کی آیات نازل فرما کر نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ فیصلہ سنایا کہ سب سے پہلے اہلِ قرابت اور رشتہ داروں کو دعوتِ حق دیجیے تاکہ دوسروں پر بھی اس کا اثر پڑے اور یوں بھی قریش اور بنی ہاشم کے قبولِ حق کا اثر تمام عرب قبائل پر پڑنا لازمی ہے اس لیے کہ وہ سب قبائل کے سرخیل اور سرگروہ ہیں اور ساکنانِ حرم ہونے کی وجہ سے تمام عرب پر ان کا دینی اور دنیوی اثر ہے۔ سورۂ شعراء میں ہے:-

وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ۝ اور (اے پیغمبر!) اپنے قریبی ناتے والوں کو (گمراہی سے)

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ ڈرا اور جو مسلمان تیرے پیرو ہیں ان کیلیے اپنے بازوؤں کو

اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ	پست رکھ (یعنی نرمی اور تواضع سے پیش آ) اگر وہ نافرمانی
فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيْٓءٌ	کریں تب تو ان سے کہہ دے میں تمہارے ان اعمال (بد)
مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۚ وَتَوَكَّلْ عَلَى	سے بری ہوں، اور غالب، رحم کرنے والی ذات پر بھروسہ کر
الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۙ الَّذِيْ	جو تجھ کو اس وقت بھی دیکھتی ہے، جب تو اس کی بارگاہ میں
يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۙ وَتَقَلُّبَكَ	کھڑا ہوتا ہے اور اس وقت بھی جبکہ تو سجدہ کرنے والوں
فِي السّٰجِدِيْنَ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيْعُ	میں مل کر اس کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے۔ بلاشبہ
الْعَلِيْمُ ۝ (الشعراء۔ پ۱۹۔ ع۱۱)	وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

گویا یہ "تکمیلِ علم و عمل" اور "منصبِ رشد و ہدایت کے فیضان" کے بعد دوسرا درجہ تھا، جس میں اعلانِ حق اور دعوتِ اسلام کی عملی صورت اختیار کرنے کے لیے تحریک کی گئی، چنانچہ صحیح روایات شاہد ہیں کہ آپؐ نے صفا کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اس زمانہ کے طریقِ اعلان کے مطابق "یا صباحا" "یا صباحا" کہہ کر خانوادۂ قریش کو پکارا اور جب سب جمع ہو گئے تو ایک مثال دے کر سمجھایا کہ بلاشبہ میں خدا کا پیغمبر اور رسول اور صراطِ مستقیم کے لیے ہادیٔ برحق ہوں، ارشاد فرمایا:-

> "لوگو! اگر میں تم سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک لشکرِ جرار جمع ہے اور تم پر حملے کے لیے آمادہ، تو کیا تم مجھ کو صادق سمجھو گے۔ "اَوَمُصَدِّقِیَّ"؟ لوگوں نے کہا: ہم نے تجھ کو "الصادق الامین" پایا ہے تو جو کچھ کہے گا حق اور صداقت پر مبنی ہوگا۔ تب آپؐ نے فرمایا: تو لوگو! میں تم کو خدائے واحد کی جانب بلاتا ہوں اور اصنام پرستی کی نجاست سے بچانا چاہتا ہوں، تم اُس دن سے ڈرو، جب خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے اعمال و کردار کا حساب دینا ہے۔"[1]

یہ صدائے حق جب قریش کے کانوں میں پہنچی تو وہ حیران رہ گئے اور باپ دادا کے "دینِ بت پرستی" کے خلاف آواز سن کر برافروختہ ہونے لگے گویا سب میں ایک آگ سی

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۳ ص ۳۸۔

دور ہوگئی اور سب سے زیادہ آپؐ کے حقیقی چچا ابو لہب کو طیش آیا اور غضبناک ہو کر کہنے لگا:
"تبا لک سائر الیوم اما دعوتنا الا لھذا" تو ہمیشہ ہلاکت و رسوائی کا منہ دیکھے، کیا تو نے اس غرض سے ہم کو بلایا تھا۔"[1]

عجب منظر ہے کہ چند گھڑیاں پہلے جس محمد بن عبداللہ کی صداقت و امانت اور خصائل حمیدہ سے ساری قوم متاثر رہ کر اس کی عظمت و عزت کرتی اور اس کے ساتھ والہانہ محبت کا اظہار کرتی تھی وہی آج اس اعلان پر کہ "میں محمد رسول اللہ ہوں" یکلخت بیگانہ و نفور اور خون کی پیاسی بن گئی۔

دعوت و ارشاد کی دوسری منزل

سیرت کی کتابوں میں پڑھ آئے ہو کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خاندان اور برادری کے لوگوں کو راہِ حق دکھانے اور ان کی ایمانی اور اخلاقی حالت درست کرنے کی خاطر کیا کچھ نہیں کیا مگر قریش کے چند اصحاب کے سوائے کسی نے آپؐ کی دعوت پر لبیک نہ کہا اور عداوت و بغض کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ تب دعوت و ارشاد نے ترقی کے تیسرے زینہ پر قدم رکھا اور ذاتِ حق کی جانب سے حکم ہوا: اے داعیٔ حق! خاندان اور برادری کے انکار و جحود سے متاثر و غمگین نہ ہو اور اپنی مفوضہ خدمت پر استقامت کے ساتھ قائم رہو کیونکہ سعادت و شقاوت تمہارے قبضہ میں نہیں ہے تمہارا کام تو صرف ابلاغ (پہنچانا) ہے۔ البتہ اب خاندان کے دائرہ سے آگے بڑھ کر مکہ اور اطرافِ مکہ کے قبائل و اقوام کو بھی یہ پیغامِ حق سناؤ اور دعوت و ارشاد کا یہ تحفہ ان کے سامنے بھی رکھو تاکہ جو سعید روحیں "پیغامِ حق" کے لیے مضطرب اور بے چین ہیں وہ اس پر لبیک کہہ کر تسکین پائیں اور روحِ تشنہ کو آبِ حیات سے سیراب کریں۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ	اور (دیکھو) یہ کتاب (قرآن) ہے جسے ہم نے (توراۃ کی
مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِیْ	طرح) نازل کیا، برکت والی اور جو کتاب اس سے پہلے

[1] سورۂ لہب کا نزول ابو لہب کی اسی گستاخانہ جرأت کے انجامِ بد کا اظہار کرتا ہے۔

بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ — نازل ہو چکی ہے اس کی تصدیق کرنے والی اور اس لیے
أُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا۔ — نازل کی تاکہ تم ام القریٰ (یعنی شہر مکہ) کے باشندوں کو اور ان کو
(سورۃ الانعام۔ پ۔ ع) — جو اس کے چاروں طرف ہیں (گمراہیوں کے نتائج سے) ڈراؤ۔

وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْاٰنًا — اور اسی طرح ہم نے تم پر قرآن نازل کیا زبان عربی میں
عَرَبِيًّا لِتُنْذِرَ أُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ — تاکہ (گمراہیوں کے نتائج سے) ڈراؤ شہر مکہ کے باشندوں کو
حَوْلَهَا۔ (شوریٰ۔ پ۔ ع) — اور ان کو جو اس کے آس پاس ہیں۔

چناں چہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغِ حق کو مکہ کی تحدید سے آزاد کر کے اطرافِ مکہ کے لیے عام کر دیا اور طائف، حنین اور یثرب (مدینہ) تک اپنی صدائے حق کو پہنچایا بلکہ مہاجرین کے ذریعہ حبشہ کے عیسائی بادشاہ اصحمہ تک کو کلمۂ حق سنایا۔

بعثتِ عامہ اس کے بعد دعوت و ارشاد کی وہ تیسری منزل پیش آئی جو بعثتِ محمدی کا نصب العین اور مقصدِ وحید، اور تمام انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کے مقابلہ میں ذاتِ اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے لیے طغرائے امتیاز تھی یعنی خدائے برتر نے آپ کی بعثت کو "بعثتِ عامہ" قرار دیا اور حکم ہوا کہ آپ نہ صرف قریش کے لیے، نہ صرف ام القریٰ (مکہ) اور اطرافِ مکہ کے لیے، نہ صرف عرب کے لیے نبی و رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں بلکہ آپ کی بعثت تمام کائناتِ انسانی کے لیے ہوئی ہے اور آپ عرب و عجم اور اسود و احمر سب کے لیے پیغامبر اور خدا کے ایلچی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا كَافَّةً — اور ہم نے تم کو کائناتِ انسانی کے لیے پیغام دے کر بھیجا ہے
لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّ — (اعمالِ نیک پر) خوش خبری سنانے اور (اعمالِ بد پر)
لٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ — لوگوں کو ڈرانے کے لیے اور اکثر (جاہل) لوگ اس حقیقت کو
(السبا۔ پ۔ ع) — نہیں سمجھتے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ — پاک اور برتر ہے وہ ذات جس نے حق و باطل کے درمیان تمیز

عَلٰی عَبۡدِہٖ لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ دینے والی کتاب نازل فرمائی اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ
نَذِیۡرًا ۔ (فرقان ۔ پ ۔ ع ۱) وسلم) پر تاکہ وہ تمام جہان والوں کو (انجام بد سے) ڈرائے

دعوتِ اسلام کا مجمل خاکہ اور حضرت جعفرؓ کی تقریر

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سرزمینِ عرب میں مبعوث ہوئے اس لیے فطری طریقِ کار کے پیشِ نظر سب سے اول قومِ عرب ہی ان کی دعوت وارشاد کا مخاطب قرار پائی تاکہ جو قوم کل چوپایوں کی گلہ بان تھی نورِ نبوت سے مستفیض ہوکر کائناتِ انسانی کی گلہ بان بن جائے اور خدائے برتر کے سب سے بزرگتر پیغمبر رسولؐ کے سایۂ رحمت میں تربیت پاکر کائناتِ ہدایت کے لیے "خیر اُمّۃ" کا لقب پائے۔ تو اَب دیکھنا یہ ہے کہ عرب جیسی سرکش، جاہل تمدن وحضارۃ سے یکسر محروم اور اخلاقی وملّی جذبات واحساسات سے قطعاً منحرف قوم پر "اسلام کی دعوت" نے فوری طور پر کیا اثر کیا تاکہ ہم بآسانی یہ اندازہ کرسکیں کہ جس مذہب کے بُنیادی اصول وعقائد اور افکار واعمال نے ایسی قوم کے تمام شعبہ ہائے حیات میں حیرت زا اور عظیم الشان انقلاب پیدا کرکے اس کو روحانی دُنیا کا انسان بنادیا اس مذہب کی صداقت کے لیے تنہا یہ ایک کارنامہ ہی روشن دلیل بن سکتا ہے۔

مشرکینِ مکہ کی پیہم مخالفت، ایذا رسانی اور ہولناک طریقہائے عذاب نے جب مسلمانوں کی ایک مختصر جماعت کو افریقہ کے مشہور ملک حبشہ کی جانب ہجرت پر مجبور کردیا اور وہ عیسائی حکمراں اصحمہ کی حکومت میں پناہ گزین ہوگئے تو سردارانِ قریش اس کو بھی برداشت نہ کرسکے اور اصحمہ کے دربار میں مشاہیر کا ایک وفد بھیج کر یہ مطالبہ کیا کہ وہ مسلمانوں کو اپنے ان کے حوالہ کردے کیونکہ یہ بددین ہوکر اور باپ دادا کے دین کو چھوڑکر قوم میں تفرقہ پیدا کرنے کا باعث بنے اور یہاں رہ کر بھی حکمراں کے دین کے مخالف ہیں۔

اصحمہ نے وفد کا مطالبہ سن کر مُسلمانوں کو جواب دہی کے لیے دربار میں طلب اور اسلام کے متعلق دریافتِ حال کیا، تب حضرتِ جعفر (رضی اللہ عنہ) نے اسلام سے متعلق تقریر فرمائی اور اس کی مقدس تعلیم کا مختصر اور جامع نقشہ کھینچ کر اصحمہ کو حقیقتِ حال سے آگاہ کیا۔

یہی وہ تقریر ہے جو دراصل عرب کے دورِ جاہلیت اور قبولِ اسلام کے دور کی انقلابی کیفیت کا مجمل مگر بہترین خاکہ ہے۔ حضرتِ جعفر بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) نے بادشاہ اور درباریوں کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا۔

بادشاہ! ہم پر ایک طویل تاریک زمانہ گذرا ہے، اس وقت ہماری جہالت کا یہ عالم تھا کہ ایک خدا کو چھوڑ کر بتوں کی پرستش کرتے تھے اور خود ساختہ پتھروں کی پوجا ہمارا شغل تھا مُردار خواری، زناکاری، لوٹ مار، قطع رحمی صبح وشام کا ہمارا شغل، ہمسایوں کے حقوق سے بیگانہ، رحم وانصاف سے ہم ناآشنا اور حق وباطل کے امتیاز سے ہم ناواقف، غرض ہماری زندگی سرتاسر درندوں کی طرح تھی کہ قوی ضعیف کو کچلنے اور توانا، ناتواں کو ہضم کرلینے کو اپنے لیے فخر اور طغرائے امتیاز سمجھتا تھا۔

رحمتِ خدا کا کرشمہ دیکھیے کہ اس نے ہمارے اندر ایک بزرگ پیغمبر مبعوث کیا جس کے نسب سے ہم واقف، جس کی صداقت، امانت وعصمت پر دوست ودشمن دونوں گواہ، جس کی قوم نے اس کو "محمد الامین" کا لقب دیا، وہ آیا، اور اُس نے ہم کو خدا کی توحید کا سبق دیا، خدائے واحد کی جانب بُلایا، اس نے بتلایا کہ خدا کا کوئی سہیم وشریک نہیں، وہ شرک سے پاک ہے، بُت پرستی جہالت کا شیوہ ہے اس لیے قابلِ ترک ہے اور صرف خدائے واحد ہی کی عبادت حقِ عبدیت ہے۔ اُس نے ہم کو حق گوئی اور صداقت شعاری کی تلقین کی اور صلہ رحمی کا حکم فرمایا، ہمسایوں اور کمزوروں کے ساتھ حسنِ سلوک سکھایا، قتل وغارت کی رسمِ بد کو مٹایا، زناکاری کو حرام اور فحش کہہ کر اس ننگِ انسانیت عمل سے ہم کو نجات دلائی، نکاح میں محارم، اور غیر محارم کا فرق بتایا، جھوٹ بولنے، ناحق مالِ یتیم کھانے کو حرام فرمایا۔ نماز اور خیرات وصدقات کی تعلیم دی اور ہر حیثیت سے ہم کو حیوانیت کے قعرِ مذلت سے نکال کر انسانیتِ کبریٰ کے مرتبہ پر پہنچایا۔

بادشاہ! ہم نے اس مقدس تعلیم کو قبول کیا اور اس پر صدق دل سے ایمان لائے
یہ ہے ہمارا وہ قصور جس کی بدولت یہ مشرکین کا وفد تجھ سے مطالبہ کرتا ہے کہ تو ہم کو ان کے
حوالے کر دے۔[1]

حضرتِ جعفر (رضی اللہ عنہ) نے اسلام کے صاف اور سادہ مگر روشن اصول کو جب اصحمہ کے سامنے جرات حق کے ساتھ پیش کیا تو حبشہ کے حکمراں نے مسلمانوں کو اپنی پناہ سے نکال کر وفد کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا اور پھر حضرتِ جعفرؓ نے خوش الحانی کے ساتھ سورۂ مریم کی چند آیات تلاوت کیں تو نجاشی حبشہ بے حد متاثر ہوا اور آبدیدہ ہو کر اسلام کی صداقت پر ایمان لے آیا اور حضرتِ جعفرؓ کے دستِ حق پرست پر مشرف باسلام ہو گیا۔

یہ ہے دعوتِ اسلام کا مختصر خاکہ جس نے دنیا کے شب رنگ اور تاریک ترین خطۂ انسانی کو ایک بہت ہی قلیل عرصہ میں مثلِ آفتاب تابناک اور روشن ترین بنا دیا اس خاکہ میں اعتقادات، اخلاق اور اعمالِ حسنہ کا وہ تمام عطر موجود ہے جس کو قرآنِ عزیز نے مختلف سورتوں میں حسبِ حال اور مناسب مقام پر بکثرت بیان کیا ہے بلکہ پورا قرآن انہی روشن حقائق کا ہادی و مرشد ہے۔

قرآن اور تجدیدِ دعوت | نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جبکہ بعثتِ عام ہے تو از بس ضروری ہوا کہ کائناتِ انسانی کی رشد و ہدایت کے لیے خدا کا جو پیغام آپؐ کے ذریعہ آئے وہ آخری پیغام اور کامل و مکمل پیغام ہو اور فطرت کے ایسے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو کہ عقلِ سلیم اور نظرتِ مستقیم تمام کائناتِ انسانی کے لیے اس کو ابدی اور سرمدی پیغام یقین کرے، اسی پیغامِ الٰہی کا نام "القرآن" یا "الکتاب" ہے۔

قرآن کی تعلیم اور اس کی دعوت و اصلاح کی حقیقت معلوم کرنے سے قبل چند لمحات کے لیے مذاہبِ عالم کی تاریخ پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

قرآن کے نزول سے قبل کائناتِ انسانی پر چار مذہبی تصور حاوی اور فکر و نظرِ ذہنی پر

[1] سیرت ابن ہشام جلد اول و تاریخ ابن کثیر ج ۳۔

اثر انداز تھے: ہندومت۔ مجوسی۔ یہودی اور مسیحی۔

ہندومت تصورِ الٰہی کے متعلق خواص اور عوام کے لیے دو جُدا جُدا تخیلات رکھتا تھا' خواص کے لیے وحدۃ الوجود[1] اور عوام کے لیے اصنام پرستی، وحدۃ الوجود کا تصور اس درجہ فلسفیانہ تھا کہ خدا کا صحیح تصور کسی طرح اس راہ سے ممکن نہ تھا اس لیے کہ اگر ایک جانب وہ ہر وجود کو خدا یا خدا کا جزء مانتا ہے تو دوسری جانب خدا کے لیے کوئی محدود و متعین تخیل بتانے سے عاجز تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندومت کے تمام اسکولوں (مذاہب) میں اصنام پرستی ہی کو مذہبی امتیاز رہا اور وہ توحیدِ خالص کو مقبولِ خواص و عوام نہ بنا سکا۔ چنانچہ ویدک دھرم' بدھ مت، جین مت وغیرہ بلکہ جدید اصلاحی اسکول (مذہب) آریہ سماج سب کے سب توحیدِ خالص کے تصور سے خالی ہیں۔

مجوسی مذہب کا اعتقادی تصور تو صاف صاف "ثنویت" کی بُنیادوں پر قائم ہے یعنی وہ خدا کے تصور و تخیل کو خیر و شر کی جُدا جُدا دو متقابل قوتوں میں تقسیم کر دیتا ہے' وہ کہتا ہے کہ نور اور خیر کا خدا "یزداں" اور ظلمت و شر کا "اہرمن" ہے اور اس طرح خدائے خیر اور خدائے شر دو خدا، کائناتِ ہست و بود پر متصرف اور باہم متقابل ہیں۔

یہودی مذہب اگرچہ خدا کے تصور میں مدعیِ توحید رہا ہے لیکن موجودہ تورات کے اوراق شاہد ہیں کہ اس کی نگاہ میں خدا کی ہستی تجسم سے پاک نہیں ہے اسی لیے تورات کا تخیلی خدا کہیں حضرتِ یعقوبؑ سے کشتی لڑتا نظر آتا ہے اور یعقوبؑ اس کو پچھاڑ دیتا ہے' اور کہیں اس کی انتڑیوں میں درد ہونے لگتا ہے اور وہ اس کی وجہ سے چیختا نظر آتا ہے' کبھی وہ بنی اسرائیل کو اپنی چہیتی بیوی بنا لیتا ہے تو کبھی مصر سے خروج کے وقت بادل اور آگ کا ستون بن کر بنی اسرائیل کی راہنمائی کرتا نظر آتا ہے اور کبھی اس کی آنکھیں دکھنے آجاتی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اور اس تصور کا آخری مظاہرہ حضرتِ عزیر (عزرا) علیہ السلام کو خدا کا بیٹا تسلیم کرنے پر منتج ہو جاتا ہے۔

---

[1] یہاں وہ وحدت الوجود مراد ہے جو یوگیانہ تصور کا نچوڑ ہے۔

اسی طرح مسیحی تصور بھی تجسّم و تشبّہ کے چکر میں آکر حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا مان لیتا اور اس طرح مشرکانہ عقیدۂ "اوتار" کا تخیل اپنا لیتا ہے اور اقانیم ثلٰثہ (تثلیث) اور مریم پرستی میں حقیقی خدا پرستی کو گم کر بیٹھتا ہے۔ خدا کی ہستی سے متعلق یہ وہ تصورات تھے جن میں دُنیا کے بڑے بُنیادی مذاہب نزولِ قرآن کے وقت مبتلا نظر آتے ہیں۔

اِن سب مذاہب میں توحیدِ حقیقی سے غفلت نے رسالت یعنی دعوتِ حق کے داعی کی شخصیت کے متعلق بھی غلط تصورات پیدا کر دیے تھے چنانچہ ہندوستان کے مذہبی تصور میں تو رسالت و نبوت اپنے صحیح معنی میں نظر ہی نہیں آتی اور وہ نبی و رسول کے مفہوم سے ہی یکسر ناآشنا نظر آتا ہے اور مجوسی، یہودی اور مسیحی مذاہب کے معتقدات میں اگرچہ یہ تصور پایا بھی جاتا ہے تو افراط و تفریط کی شکل میں کبھی "ابن اللہ" ہو کر اور کبھی "بد اخلاق و بد اعمال انسان" کا پیکر بن کر جیسا کہ تورات میں حضرتِ لوط علیہ السلام اور ان کی بیٹیوں کا ان کے ساتھ اختلاط کا واقعہ مذکور ہے (العیاذ باللہ من ھذہ الخرافات والافتراءات)

گویا ان کے نزدیک یا تو "رسول" اور داعیِ حق کی شخصیت کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی اور یا پھر خدا، خدا کا اوتار اور خدا کا بیٹا بن کر سامنے آتی ہے اور اس لیے جس طرح وہ حقیقی توحید سے بیگانہ نظر آتے ہیں اسی طرح رسالت و نبوت کے صحیح تصور سے بھی محروم ہو چکے ہیں۔

اسی طرح عالمِ آخرت کے متعلق بھی اِن مذاہب کے تصور کی دنیا افراط و تفریط سے خالی نہیں تھی، بعض مذاہب میں تو کائناتِ انسانی مختلف چولوں کے چکر میں گرفتار نظر آتی اور آواگون (تناسخ) کے ناقص فلسفیانہ نقطۂ نگاہ کا رہینِ منت بنی ہوئی ہے اور ایک حد پر پہنچ کر برہم یعنی خدا میں جذب ہو جانا نجات کا آخری نقطہ متعین کیا جاتا ہے نیز خیر و شر کی جزا و سزا کے بارہ میں ایک قادرِ مطلق خدا نہیں بلکہ ایک جبری قانون میں جکڑی ہوئی مجبور ہستی کا تصور پیش کرتا ہے اور بعض اگرچہ تناسخ کے غلط عقیدہ سے جدا یوم معاد اور یوم حساب

کے تصور سے آشنا بھی ہیں لیکن اُن کے نزدیک بھی عالمِ آخرت کا معاملہ اعمالِ صالحہ و سیئہ یا افعال و کردار کے حق و باطل کی جزا و سزا سے وابستہ نہیں ہے بلکہ نسلی امتیازات اور جماعتی فرقہ بندی اور یا پھر کفارہ کے ساتھ مربوط ہے۔

ان چار بُنیادی مذاہبِ عالم کے علاوہ مشرکین اور فلاسفہ کی بعض ایسی جماعتیں بھی تھیں جو نہ خدا کی ہستی کی قائل ہیں اور نہ عالمِ آخرت کی اور خدا کی ہستی پر اگر ایمان بھی رکھتی تھیں تو سیکڑوں ہزاروں بلکہ بے تعداد بُتوں کی باطل پرستی کے ساتھ ملوّث و مجروح۔

غرض یہ تھے مذاہبِ عالم کے وہ ذہنی تصورات اور فکری معتقدات جن پر کائناتِ انسانی کی روحانی اور سرمدی سعادت کا مدار سمجھا جاتا تھا اور جو بلاشبہ اپنے نتائج و ثمرات کے لحاظ سے کائناتِ انسانی کو مشعلِ ہدایت دکھا کر انسانیتِ کبریٰ کے درجہ تک پہنچانے اور انسانوں کا خدا کے ساتھ حقیقی معبود و عبد ہونے کا رشتہ قائم کر کے دین و دنیا کی خیر و فلاح تک پہنچانے میں قطعی تہی دامن تھے۔

ان ہی حالات میں "اسلام" کی دعوت و تبلیغ یا "تعلیمِ حق" نے رونمائی کی اور کائنات انسانی کے ہر شعبۂ حیات میں گوناگوں انقلاب پیدا کر کے نیا عالم پیدا کر دیا اور آفتابِ ہدایت کی روشنی سے منور بنا کر اس کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا۔

توحید | نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خدا کے کلام (قرآن) کے ذریعہ سب سے پہلے اس عقیدۂ توحید پر روشنی ڈالی اور توحیدِ خالص کی حقیقت واضح کر کے تمام کائناتِ انسانی کو اس کی جانب دعوت دی۔

قرآنِ عزیز کی دعوتِ توحید کا حاصل یہ ہے کہ اللہ ایک ایسی ہستی کا نام ہے جو اپنی ذات و صفات میں ہر قسم کے شرک سے پاک اور وراء الوراء ہے، نہ اس کا کوئی سہیم و شریک ہے اور نہ اس کا ہمتا و ہمسر، اس لیے "اِبْنِیَّتْ" کا عقیدہ ہو یا "اوتار" کا، صنم پرستی ہو یا ثنیت و تثلیث یہ سب باطل ہیں وہ یکتا و بے ہمتا ہے، باپ، بیٹا اور اس قسم کی

نسبتوں سے پاک ہے، پرستش کے قابل وہ خود ہے نہ کہ اس کے مظاہر اور اس کی مخلوقات، وہ جس طرح تجسم و تشبہ سے بالاتر ہے اسی طرح اس کا نہ کوئی مقابل ہے اور نہ کوئی حریف نہ سہیم :-

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا — اللہ اس ہستی کا نام ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود اور خدا نہیں ہے، اللہ وہ ہے کہ

ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ۔ — اس کے سوا کوئی نہ خدا ہے نہ معبود وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے اور زندگی کا بخشنے والا۔

وَاعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا — پس تم اللہ ہی کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔

لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ اِنَّ الشِّرْکَ — اللہ کا کسی کو شریک نہ بنا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شرک

لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ۔ — بہت بڑا ظلم ہے۔

وَاِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ — اور خدا تمہارا ایک ہی خدا ہے۔

یہ اور اسی مضمون کی بے شمار آیات ہیں جو قرآن عزیز میں توحید خالص کی داعی اور مناد ہیں لیکن سورۂ اخلاص یا سورۂ توحید میں جس معجزانہ اختصار کے ساتھ توحید سے متعلق موجودہ مذاہب کے ناقص اور غلط تصورات کو باطل کرتے ہوئے توحید خالص کی تعلیم دی گئی ہے وہ خود اپنی نظیر ہے :-

قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰہُ الصَّمَدُ ۚ — (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے اللہ یکتا ذات ہے، اللہ

لَمْ یَلِدْ ۚ وَلَمْ یُوْلَدْ ۚ وَلَمْ — بے نیاز ہے، نہ وہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا اور

یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۚ — نہ اس کا کوئی ہمسر اور سہیم و شریک ہے۔

ایک مرتبہ توحید سے متعلق مذاہب عالم کی تعلیم پر اور نظر کیجیے اور پھر ان چند مختصر آیات کو غور و فکر کے ساتھ ملاحظہ فرمایئے تو آپ اندازہ کر سکیں گے کہ پہلی دو آیات میں توحید خالص کا صحیح اور حق تصور پیش کر دیا گیا ہے، قرآن کہتا ہے کہ اللہ ایسی ہستی کا نام ہے جو یکتا و بے ہمتا ہے، ساری کائنات اس کی محتاج ہے اور وہ ہر قسم کی احتیاج سے پاک اور بے نیاز ہے، وہ صمد ہے یعنی مجموعۂ کمالات صرف صمدیت کا خاصہ ہے اور بس۔

اس کے بعد وہ نصاریٰ اور یہود سے مخاطب ہو کر شمع ہدایت دکھاتا ہے کہ اللہ اُس ہستی کو کہتے ہیں جو باپ اور بیٹے جیسی فانی نسبتوں سے بالاتر ہے' وہ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا' تَعَالَى اللهُ عُلُوًّا كَبِيْرًا، اور اسی طرح ہندو دھرم سے کہتا ہے کہ ایسی لازوال ہستی کی مقدس شان اس سے بلند و بالا ہے کہ وہ کسی انسان یا حیوان کے جسم میں محدود ہو کر "اوتار" کہلائے یا اس معبودِ مطلق کے ساتھ چھوٹے معبودوں کا سلسلہ قائم کر کے کسی مخلوق کو اس کا سہیم و شریک ٹھہرایا جائے۔ سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ اور وہ مجوس اور ویدک دھرم کے ان پجاریوں کو مخاطب کرتا ہے جو اس کو یزداں کہہ کر اہرمن کو اس کا مقابل حریف تسلیم کرتے ہیں یا روح (جیو) اور مادہ (پرکرتی) کو خدا کے ساتھ ازلی و ابدی (قدیم و غیر مخلوق) کہہ کر ان چیزوں کو خدا کا کفو اور ہمسر بتلاتے ہیں، اور کہتا ہے وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۔ خدا اس ہستی کا نام ہے جس کا نہ کوئی ہمسر اور حریف ہے اور نہ اس کی طرح انادی (قدیم) اور غیر مخلوق ہے۔

غرض قرآن عزیز نے خدا کی ذات واحد سے متعلق ان تمام نسبتوں کا قطعی انکار کر کے جو توحیدِ خالص کے کسی طرح بھی معارض ہوتی تھیں اس کو یکتا اور بے ہمتا ظاہر کیا ہے اور اس طرح شرک فی الذات اور شرک فی الصفات کا قلع قمع کر دیا ہے اور شرک فی الالوہیۃ اور شرک فی الربوبیۃ کے خلاف توحید اور صرف توحید کو ہی اسلام کا بنیادی تصور قرار دیا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ جس طرح قرآن نے توحید کے تمام اطراف و جوانب کو نقص و خام کاری سے پاک کر کے حقیقی توحید کے تصور کی جانب راہنمائی کی اور ہر قسم کے تجسّم سے وراء الوراء بتلا کر توحیدِ کامل کی جانب دعوت دی اُسی طرح اس نے توحید کے اس فلسفیانہ عقیدہ کو بھی باطل ثابت کیا جو اس باب میں تفریط کی حد تک بڑھ کر صفاتِ الٰہی کا بھی منکر ہو گیا اور کہنے لگا کہ وہ قادر ہے بغیر قدرت کے' خالق ہے بغیر خلق کے' بصیر ہے بغیر رویت کے' سمیع ہے بغیر سمع کے وغیرہ وغیرہ۔ اِس عقیدہ کا حاصل یہ ہے کہ خدا ایسی

ہستی کا نام ہے جس کے لیے "تعطل" لازم ہے جیسا کہ پہلی تعلیمات کا حاصل یہ تھا کہ کسی نہ کسی رنگ میں خدا کے لیے تجسّم ضروری ہے۔

قرآن نے کہا کہ پہلی کیفیت اگر افراط پر مبنی تھی تو یہ تفریط پر قائم ہے اس لیے کہ ایک ذات کے لیے متعدد صفاتِ کمال کا ہونا ذات کی وحدت پر اثر انداز نہیں ہے اسلیے بلاشبہ وہ سمیع و بصیر ہے، سنتا ہے اور دیکھتا ہے، لاریب وہ قدرتِ کاملہ کے ساتھ قادر ہے اور صفتِ رحم و کرم کے ساتھ رحیم و کریم ہے البتہ اس کی صفتِ سمع و بصر، صفتِ رحم و کرم وغیرہ صفات کا انسانی صفاتِ سمع و بصر سے دُور کا بھی تعلق نہیں ہے اور جس طرح وہ اپنی ذات میں بے ہمتا اور یکتا ہے اسی طرح صفات میں بھی ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ (پ ۲۵) اُس (خدا) کی کوئی مثال نہیں اور یہ حقیقت ہے کہ وہ سنتا ہے، دیکھتا ہے۔

غور فرمائیے کہ کس معجزانہ تعبیر کے ساتھ ایک ہی آیت اور ایک ہی جملہ میں اس کی صفاتِ کمالیہ کا اعتراف بھی مذکور ہے اور یہ بھی وضاحت موجود کہ خدا کی ان صفات کو انسانی صفات کی طرح نہ سمجھو بلکہ اس کی ذات کی طرح اُس کی صفات بھی "لیس کمثلہ شیءٌ" کے عنوان سے معنون اور انسانی صفات کی حقائق کے مقابلہ میں بے مثال و بے نظیر ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدائے برتر کی توحید جب ہی حقیقی توحید کہلا سکتی ہے کہ اس میں نہ تجسّم کا عقیدہ شامل حال ہو اور نہ تعطل کا کہ یہ دونوں افراط و تفریط کی راہیں ہیں بلکہ عقیدہ یہ ہو کہ اللہ اپنی ذات میں بھی بے ہمتا و یکتا ہے اور اپنی صفات میں بھی اور وہ ہر طرح کے شرک و کفو سے پاک اور برتر ہے۔

رسالت | توحیدِ حقیقی کے ثبوت کے بعد قرآن نے "رسالت" کے بنیادی عقیدہ کی اصلاح بھی ضروری سمجھی اور اس نے بتلایا کہ کسی تعلیم کے حسن و قبح میں معلّم کی شخصیت کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے، کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ اچھی تعلیم کا معلّم بدعمل انسان ہو یا بُری تعلیم کا معلّم نیکوکار،

اور جبکہ یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ خدا ہر ایک انسان کے ساتھ براہِ راست ہم کلام نہیں ہوتا تو ازبس ضروری تھا کہ کائناتِ انسانی کی ہدایت کے لیے ایک انسان ہی کو معلم بنایا جائے اور وہی خدا کی جانب سے رسالت اور پیغامبری کا فرض انجام دے۔

پس بشری اوصاف سے متصف یہ انسان نہ خدا ہوگا اور نہ خدا کا بیٹا یا خدا کا اوتار بلکہ بشر اور انسان ہی رہے گا، نیز خدا کے پیغامبر ہونے کی وجہ سے پاکی اور تقدس کا جو رشتہ اس کو خدا کی درگاہ سے وابستہ کیے ہوئے ہے اس کے پیش نظر اس کی ہستی کا نہ انکار کیا جاسکتا ہے اور نہ اُس کو دوسرے انسانوں کے مساوی کہا جاسکتا ہے اس لیے قرآن نے جگہ جگہ مسیح ابن مریم اور عُزیر (علیہم السلام) کے متعلق اس حقیقت کو واضح کیا کہ وہ خدا کے مقدس رسول ہیں۔ خدا یا خدا کے بیٹے نہیں ہیں۔ نیز یہ بھی بتلایا کہ اگر ایک انسان تمہاری طرح کھاتا بھی ہے اور پیتا بھی اور بازاروں میں چلتا پھرتا، خرید و فروخت کرتا اور گھر میں اہل و عیال کے ساتھ معاشرتی زندگی بسر کرتا ہے تو اُس سے یہ کیسے لازم آگیا کہ وہ خدا کا فرستادہ "رسول" نہیں ہے اور کس طرح یہ جائز ہے کہ ایک صادق و امین ہستی کے اس دعویٰ کو تم محض قیاس کی بناء پر جھٹلا دو کہ وہ خدا کا رسول نہیں ہے۔

قرآن نے ان حقائق کو جن صاف اور واضح تعبیرات کے ساتھ بیان کیا ہے گذشتہ صفحات میں آپ ان کا مطالعہ فرما چکے ہیں۔

پس جس کتاب میں نبوت و رسالت سے متعلق صحیح تصور موجود نہ ہو وہ کبھی اپنی مذہبی تعلیمات کی صداقت کی مکمل تصویر نہیں پیش کرسکتی، یہی وہ عقیدہ ہے جس کی حقیقت میں "ایمان بالرسل" "ایمان بالکتب" "ایمان بالملائکہ" سب بنیادی عقائد سمٹ کر جذب ہوجاتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ جبکہ ہدایتِ انسانی کے لیے خدائے تعالیٰ اپنی پیغامبری کیلیے ایک انسان اور بشر کو ہی چُن لیتا ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انسان نے جب سے اس کائنات میں قدم رکھا ہے اسی وقت سے رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ قائم ہے۔

وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (فاطر۔ پ۲۲۔ ع۱)	کوئی گروہ یا جماعت ایسی نہیں ہے کہ جس میں ہماری جانب سے نذیر (پیغامبر) نہ گذرا ہو۔
وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد۔ پ۱۳۔ ع)	اور ہر قوم کے لیے ہادی آئے ہیں۔
مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (المؤمن۔ پ۲۴۔ ع۸)	ان میں سے بعض کے واقعات کا ہم نے قرآن میں تذکرہ کر دیا ہے اور بعض ایسے ہیں جن کا تذکرہ قرآن میں نہیں کیا۔

اور یہ یقین لانا بھی ضروری ہے کہ جبکہ خدا ایک ہے اور اس کی تعلیم ایک تو بلاشبہ تمام پیغمبرانِ خدا کی بنیادی تعلیم بھی ایک ہی رہی ہے اور اس لیے اگر خدا کے کسی ایک برحق نبی و رسول کا بھی انکار کر دیا گیا تو گویا اس نے پوری دعوتِ قرآنی کا انکار کر دیا، پس یہ ایمان ضروری ہوا:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ (بقرہ۔ پ۳۔ ع۸)	ہم خدا کے پیغمبروں میں پیغمبر ہونے کے لحاظ سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے (کہ ایک کو مان لیں اور دوسرے کو انکار کر دیں)

لہٰذا جب تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا ازبس ضروری ہوا تو ان پر نازل شدہ تمام کتبِ سماویہ پر بھی ایمان لانا جزءِ ایمان ہوگا ورنہ تو ایک جانب سے ایمان لا کر دوسری جانب سے اُس پیغمبر کی صداقت کا انکار لازم آئے گا اور جب رسالت اور رسالت کے ساتھ کتبِ سماویہ پر ایمان حقیقتِ ثابتہ بن جائے تو ملائکۃ اللہ پر اس لیے ایمان لانا ضروری ہوگا کہ خدا کے ان پیغمبروں نے یہ صاف صاف اعلان کیا ہے کہ خدا کی جانب سے اُن پر یہ وحی خدا کا فرشتہ لے کر آتا ہے تو اب یا ہم اس پیغمبر کی صداقت کا انکار کر دیں اور یا پھر بن دیکھے فرشتہ پر اس لیے ایمان لے آئیں کہ بتلانے والی ہستی اپنے کردار و اعمال میں ہر طرح صادق و امین اور امراض دماغی و قلبی "جنون و سحر" سے ہر طرح پاک ہے اور ضروری نہیں ہے کہ جس شے کو آنکھوں نے نہ دیکھا ہو اور کانوں نے نہ سنا ہو وہ حقیقت میں بھی غیر موجود ہو کیونکہ یہ ایک مُسلّمہ اصول ہے کہ کسی شے کے عدمِ علم سے اس شے کا عدم لازم نہیں آتا یعنی یہ ضروری

نہیں کہ جس بات کو ہم نہیں جانتے وہ واقع میں بھی موجود نہ ہو۔

یوم آخرت | نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خدا کے آخری اور مکمل پیغام قرآن کے ذریعہ تیسری بُنیادی اصلاح "یوم آخرت" سے متعلق فرمائی۔

مذاہبِ عالم اس سلسلہ میں بھی راہِ مستقیم سے روگرداں اور افراط و تفریط کے بحرِ ظلمات میں پھنسے ہوئے تھے وہ یا تو آواگون[1] (تناسخ) کے چکر میں یوم آخرت کے اس تصور سے قطعاً

---

[1] اس موقع پر اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں سے متعلق اگرچہ بحث کرنے کی گنجائش نہیں ہے تاہم اس قدر سمجھ لینا ضروری ہے کہ تناسخ (آواگون) کا عقیدہ اس اساس پر قائم ہے کہ ہر ایک انسان کی موجودہ زندگی سابق میں کیے ہوئے اعمال کا ثمرہ اور نتیجہ ہے ورنہ کائنات میں یہ تنوع ہرگز نہ ہوتا کہ کوئی انسان ہے تو کوئی حیوان اور کوئی نباتات و جمادات، نیز انسانوں میں کوئی عالم ہے تو کوئی جاہل اور کوئی صحتیاب ہے تو کوئی مریض اور کوئی امیر کبیر ہے تو کوئی مفلس و محتاج وغیرہ وغیرہ۔

اس عقیدہ کا مقصد یہ ہوا کہ بغیر عمل و کردار کے اگر عالم میں یہ تغیرات موجود ہیں تو یہ خدا کی صفتِ عدل کے منافی ہے لیکن اس عقیدہ کی خام کاری اور بطلان کی مختلف وجوہ میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ اگر روح اپنے اعمال کی وجہ سے مختلف جون بدل کر ان تغیراتِ عالم کا باعث ہے جو مجموعۂ کائنات کے حسن کا باعث ہیں اور جس کی بدولت یہ پورا کارخانہ مکمل نظام کے ساتھ وابستہ نظر آتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان کے لیے فطری اور نیچرل طور پر گنہگار، بدکار اور بداعمال ہونا ازبس ضروری ہے تاکہ مجموعۂ کائنات کا یہ حسن نہ صرف یہ کہ پیدا ہو بلکہ قائم رہے جس کا تغیرات اور تنوعات پر مبنی ہونا ازبس ضروری ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہہ دیجیے کہ جون بدل کر آواگون کی زندگی اگر اعمال کی جزا و سزا سے متعلق ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرتِ انسان کے لیے نکوکار بننے کی جگہ زیادہ سے زیادہ بدکار ہونا چاہیے تاکہ آئندہ نظامِ عمل میں یہ تنوع باقی رہے جس کا باقی رہنا عقل و فطرت کے مطابق ہے ورنہ تو حیوانات، نباتات، جمادات کے فقدان سے انسانی دنیا کا یہ سارا کارخانہ درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔

تناسخ کے ناقص فلسفیانہ عقیدہ پر یقین رکھنے والوں نے اس حقیقت کو یکسر فراموش کر دیا ہے کہ ایک چیز اپنی انفرادیت کے لحاظ سے خواہ کتنی ہی قبیح اور بری معلوم ہو لیکن مجموعۂ کائنات کے پیشِ نظر اس کا وجود بھی اپنے اندر ضرور حسن رکھتا ہے مثلاً تِل (خال) اپنے رنگ و روپ میں کیسا ہی سیاہ فام کیوں نہ ہو لیکن محبوب کے رخسار پر نہ خود حسین بن جاتا ہے بلکہ حسنِ محبوب کو دوبالا کر دیتا ہے اور حافظ شیرازیؒ جیسے صوفی کو "خالِ محبوب" پر سمرقند و بخارا بخش دینے پر آمادہ کر دیتا ہے۔

اسی طرح عالم و کائنات میں انفرادی طور پر کسی کا مریض ہونا، اپاہج و معذور ہونا، ناقص الخلقت ہونا وغیرہ گو قبیح اور قابلِ افسوس نظر آتے ہوں مگر مجموعۂ کائنات کے حسن کے لیے فطری (نیچرل) ہیں اور اس تنوع پر ہی دنیا کے نظم کا بقاء ہے اور خالق کائنات کے کمالاتِ آفرینش کا آئینہ دار۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونقِ چمن ❁ اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

بیگانہ ہو چکے تھے اور قیامت (پرلے) کا تعلق انسانی اعمال کی جزاء و سزا اور یوم الحساب سے غیر متعلق سمجھ چکے تھے اور یا پھر اُس دن نجات کا مدار اور جزاء و سزا کا معیار اعمال و کردار کی جگہ نسل و خاندان اور سوسائٹی کی معاشرتی گروہ بندی پر سمجھ بیٹھے تھے اور کفارہ کو عقیدہ بنا کر حساب و محاسبہ اعمال سے مطمئن ہو چکے تھے۔ اور مشرکین اور بعض فلاسفہ نے تو یوم آخرت کے وجود ہی کا انکار کر دیا تھا اور اُن کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ آج کا مُردہ انسان کل کس طرح زندگی اختیار کر لے گا اور سیکڑوں اور ہزاروں برس کی بوسیدہ ہڈیاں یوم حساب میں کس طرح جسم بن کر اپنی روح کے لیے لباس بن سکیں گی۔

قرآن نے نازل ہو کر دنیا انسانی کو بتایا کہ اس صاف اور واضح بات کے سمجھنے میں آخر تم پر کیوں وحشت طاری ہوتی ہے اور کیوں تمہاری عقل اس کو نہیں تسلیم کرتی کہ جس خالق کائنات اور بدیع السمٰوٰت والارض نے نمونہ اور نقشہ کے بغیر یہ عجیب و غریب عالم آفرینش کر دیا وہ بلاشبہ اس پر قادر ہے کہ ماضی میں مخلوق اور حال میں مُردہ و بوسیدہ ہستی کو مستقبل میں دوبارہ وجود عطا فرما دے اور اس کے منتشر اجزاء کو جمع کر کے دوبارہ وہی ہیئتِ جسمانی عطا اور سابق روح کو اس میں واپس کر دے۔

یا تو صاف کہو کہ اس کائنات کو کسی بلند و بالا ہستی نے پیدا نہیں کیا جس کو خدا (اللہ) کہتے ہیں اور اگر یہ مانتے ہو تو یہ قطعاً عقل کے خلاف ہے کہ جو ابتدائی آفرینش کر سکے وہ اس آفرینش کو دہرا نہ سکے۔

وَيَقُولُ الْإِنسَانُ ءَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ	اور انسان کہتا ہے کہ بھلا جب میں مر گیا تو کیا میں (قبر سے)
أُخْرَجُ حَيًّا ۝ أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنسَانُ أَنَّا	زندہ نکالا جاؤں گا۔ کیا انسان یہ یاد نہیں کرتا کہ ہم نے
خَلَقْنَاهُ مِن قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا (مریم)	پہلے اُسے پیدا کیا حالانکہ وہ کوئی چیز نہیں تھا۔
وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ	اور ہماری نسبت باتیں بنانے لگا اور اپنی پیدائش کی
خَلْقَهُ قَالَ مَن يُحْيِي الْعِظَامَ	حقیقت کو بھول گیا، کہتا ہے کہ ہڈیاں جب گل کر خاک

وَهِیَ رَمِیْمٌ ۃ قُلْ یُحْیِیْهَا	ہوگئی ہوں تو کون ہے جو اُن کو زندہ کر کے کھڑا کر دے گا اے
الَّذِیْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ	محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے کہ جس نے ان ہڈیوں کو اول
وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمُ ۙ	بار پیدا کیا تھا وہی ان کو زندہ کرے گا اور وہ سب کا پیدا
(پ ۲۳ ع ۴)	کرنا جانتا ہے۔

یہ مشرکینِ مکہ تھے جو خدا اور خالقیتِ خدا کے تو قائل تھے مگر دوسری زندگی کے منکر و کافر اور جاحد تھے۔ پھر اس نے اُن کو بھی مخاطب کیا جو کہتے تھے کہ آخرت کا تصور اس لیے فضول ہے کہ یہ کائنات کسی کی مخلوق ہی نہیں۔ مادہ اور اس کی حرکت یونہی ازل سے ابد تک کائنات کا روپ و رنگ اختیار کیے ہوئے ہے اور حرکت و کشش دو قوتیں اس نظامِ عالم کے ہر قسم کے تنوعات کے کفیل ہیں۔ قرآن نے کہا یہ گمراہ کن تصور ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے وہ یہ کہ عقل اور سائنس کے خلاف یہ سمجھ لیا گیا کہ ذراتِ مادہ (اجزاء اثیریہ) میں شعور و ارادہ نہ ہونے کے باوجود حرکت، قوتِ استعداد اور کشش کے ذریعہ خود بخود ایسی اشیاء وجود پذیر ہو سکتی ہیں جن کا مواد (میٹریل) ان ذرات میں موجود نہیں یعنی مادہ میں بالقوہ بھی نہ شعور ہے اور نہ ارادہ، نہ جذبات ہیں نہ احساسات، نہ ادراکات ہیں اور نہ عقل و تمیز ورنہ تو جسم کو بالقوہ ان صفات کا حامل کہنا بجا ہوتا، لیکن یہ مسلمات میں سے ہے کہ جسم کو نہ شعوری کہہ سکتے ہیں نہ جذباتی، نہ ذی ادراک کہا جا سکتا ہے اور نہ ذی عقل و صاحب تمیز پس دلیلِ "وجدان" جو فطری دلائل میں سب سے مضبوط اور نیچرل دلیل ہے، وہ اس حقیقت کو تسلیم کراتی ہے کہ جبکہ تمام موجوداتِ عالم میں "انسان" موجوداتِ عالم کی ارتقائی ہستی اور اشرف الموجودات ہے اور اس میں جذبات، حسیات، ادراکات، شعور اور عقل جیسے لطیف اوصاف موجود نظر آتے ہیں حالانکہ بلاشبہ مادہ کی قوت و استعداد میں یہ معدوم تھے، تو اس میں قطعاً شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ انسان سے بلند ضرور ایک ایسی ہستی موجود ہے جو قدرت و ارادہ کی علی الاطلاق مالک اور تمام موجودات کی خالق ہے، اور اس میں بھی کوئی ریب و شک نہیں کہ انسان ایسی

ذی عقل و ذی شعور اور صاحبِ ارادہ ہستی کی تخلیق محض بے فائدہ نہیں ہے اور اس کی زندگی کے اعمال اور کردار بے وجہ اور مہمل نہیں ہیں اور جبکہ ہم اس دنیا میں انسانوں کے اعمال و کردار کی جزاء و سزا کا مظاہرہ نہیں دیکھتے تو وجدان ہی ہمارے لیے رہنمائی کرتا ہے کہ ایک ایسا دن ضرور مقرر ہے جب کائناتِ انسانی اپنے اعمال و کردار کی جزاء و سزا کا نتیجہ و ثمرہ پائیگی اور اسی کو یوم القیامہ، یوم الآخرہ اور یوم الحساب کہتے ہیں، چونکہ یہ دن اپنی پائیداری اور قیام کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے اس لیے یوم القیمۃ کہلاتا ہے اور چونکہ دنیائے موجودہ کے بعد ہے اس لیے یوم الآخرہ ہے اور چونکہ جزاء و سزا اور اعمال کے محاسبہ پر مشتمل ہوگا اس لیے یوم الحساب ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا	اور منکرین کہتے ہیں کہ قیامت ہم کو تو کبھی نہیں آئے گی۔
السَّاعَةُ ؕ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ	اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجئے، ہاں ہاں مجھ کو اپنے پروردگار
لَتَاْتِيَنَّكُمْ عٰلِمِ الْغَيْبِ ۚ (پ۔ ۶)	کی قسم جو عالم الغیب ہے قیامت تو تم کو ضرور پیش آکر رہے گی۔
اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ	کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ مہمل اور بیکار چھوڑ دیا
سُدًى اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ	جائے گا۔ کیا خدا اس پر قادر نہیں کہ مُردوں کو زندہ
عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِيَ الْمَوْتٰى ۔ (پ۲۹۔ ۶)	کردے؟
وَالتِّيْنِ وَالزَّيْتُوْنِ ۙ	گواہ ہے انجیر و زیتون (کے باغات سے سرسبز و شاداب وہ
وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۙ وَهٰذَا	مقام بیت اللحم جہاں حضرت عیسیٰ کی ولادت ہوئی) اور گواہ
الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۙ لَقَدْ	ہے طور سینا، (جہاں موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے سرفرازی
خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ	نصیب ہوئی) اور گواہ ہے یہ بلدِ امین (مکہ جہاں محمد صلی اللہ
اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۡ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ	علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی) کہ بلاشبہ ہم نے انسان کو
اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ	بہتر سے بہتر قوام سے بنایا پھر اس کو نشیبوں کے سب سے
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	نیچے مقام پر دھکیل دیا مگر وہ انسان جو ایمان لائے اور نیک
فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ؕ	عمل کیے ان کے لیے بے منت واحسان اجر و ثواب ہے۔

فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۝ اَلَيْسَ تو اب وہ کیا بات ہے جو تجھ کو دین (قیامت) کے جھٹلانے پر
اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۝ (التین پ ۳۰) آمادہ کرتی ہے، کیا اللہ حاکموں میں سب سے بہتر حاکم نہیں ہے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ قرآن عزیز کہتا ہے کہ آخرت کے انکار پر منطقی دلائل قائم کرنے اور سفسطہ اور غلط روش کو اختیار کر کے اِدھر اُدھر بھٹکنے کی آخر ضرورت کیا ہے جبکہ انسان کی سب سے قریب اور سب سے زیادہ مضبوط دلیل "وجدان" خود بخود اس جانب راہنمائی کرتی ہے کہ یہ نظامِ عالم جس طرح حیرت زا اور محیر العقول نظامِ فطرت سے منظم اور قوانینِ فطرت کے ہاتھوں میں مسخر ہے، ہو نہیں سکتا کہ یہ خود رو نظام ہو اور جبکہ اس کا کوئی خالق ضرور ہے تو اس نے خیر و شر کے ثمرات و نتائج کے لیے بھی ضرور کوئی وقت مقرر کیا ہے ورنہ یہ کامل و مکمل نظام ثمرہ اور نتیجہ کے پیشِ نظر ایک مہمل شے ماننی پڑے گی پس نتیجہ اور ثمرہ کا وہ دن ہی "یوم آخرت" کے نام سے موسوم ہے جو نہ تناسخ کے چکر سے وابستہ ہے اور نہ ازلیت و ابدیتِ عالم کا حامل بلکہ جس طرح عالم کی ہر شے کا ایک آغاز ہے اور ایک انجام، اسی طرح خود اس پورے عالم کا بھی ایک آغاز اور انجام از بس ضروری ہے۔

پس مومن اور مسلم وہی ہے جو توحیدِ خالص، رسالت کے صحیح تصور اور یوم آخرت پر یقینِ کامل کے سررشتہ کے ساتھ پیوستہ ہو اور یہی وہ تین بنیادی عقائد ہیں جو دین کے حقیقی تصور یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسل، ایمان بالکتب، ایمان بالملائکہ، ایمان بالقدر اور ایمان بالآخرہ سب ہی پر حاوی ہیں اور یہی وہ دینِ کامل ہے جس کی تشریح قرآن عزیز نے سورۂ بقرہ کے آخری رکوع میں اس طرح کی ہے :-

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ایمان رکھتے ہیں اس شے پر
اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ جو اس پر اُن کے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے (یعنی
كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَ قرآن) اور ہر ایک (ایماندار) ایمان رکھتا ہے خدا پر،
كُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ فرشتوں پر، سماوی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر،

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ (سورۂ بقرہ پ ۳ ع ۸)	(وہ کہتے ہیں خدایا) ہم تیرے پیغمبروں کے درمیان کسی ایک کو بھی پیغمبر تسلیم کرنے کے سلسلہ میں فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں ہم نے تیرا حکم سنا اور اُس کی پیروی کی، اے پروردگار ہم تجھ سے مغفرت کے خواہاں ہیں اور ہم کو آخر کار تیری ہی جانب لوٹنا ہے۔

مابعد الطبیعاتی عقائد و افکار سے متعلق قرآنِ حکیم کی یہی وہ اصلاحی اور انقلابی تعلیمات تھیں جن کو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اوّل عرب کے سامنے روشناس کیا اور پھر تمام کائناتِ انسانی تک پہنچا کر مذاہب کی دنیا ہی بدل ڈالی اور اسلام کی اس دعوتِ توحید نے مذاہبِ عالم میں ہلچل پیدا کر دی اور کسی نہ کسی رنگ میں ان کو توحیدِ حقیقی کے اس ارتقائی نقطہ کی جانب جھکنا پڑا اور اس نے صرف یہی نہیں کیا کہ خدا اور اس کے بندوں کے درمیان رشتۂ معبودیت و عبودیت ہی کو صحیح نقطۂ نظر پر استوار اور عقائد اور مابعد الطبیعاتی افکار کے رُخِ روشن کو آشکارا کر دیا، بلکہ اس نے "ایمان اور عملِ صالح" کو دین کی بُنیاد بنا کر اخلاق، معاشرت، معاش، غرض مذہب اور اجتماعی سیاست سب ہی کو اصلاح و انقلاب کے سانچے میں ڈھال کر دنیا کی صحیح راہنمائی کا حق ادا کر دیا۔

یہ بحث چونکہ طویل الذیل ہے اور آیت وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ کی تفسیر کے ضمن میں شرح و بسط کی محتاج، اس لیے یہ مقام اس کی وسعت کو برداشت نہیں کر سکتا۔



اسراء (معراج)

اسراء کے معنی شب میں لے جانے کے ہیں، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وہ بے نظیر شرف و مجد اور حیرت زا واقعہ جس میں خدائے برتر نے اپنے رسول کو مسجدِ حرام (مکہ) سے مسجدِ اقصیٰ (بیت المقدس) اور وہاں سے ملاءِ اعلیٰ تک بجسدِ عنصری اپنی نشانیاں دکھانے کے لیے سیر کرائی" چونکہ شب کے ایک حصہ میں پیش آیا تھا اس لیے "اسراء" کہلاتا ہے۔

"معراج" عروج سے مشتق ہے جس کے معنی چڑھنے اور بلند ہونے کے ہیں اور اسی لیے معراج زینہ کو بھی کہتے ہیں، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے چونکہ اس شب میں ملاءِ اعلےٰ کے منازلِ ارتقاء طے فرماتے ہوئے سبع سماوات، سدرۃ المنتہیٰ، اور اس سے بھی بلند ہو کر آیات اللہ کا مشاہدہ فرمایا اور ان واقعات کے ذکر میں زبانِ وحی ترجمان نے "عُرِجَ بِیْ" کا جملہ استعمال فرمایا اس لیے اس باجبروت اور پُرعظمت واقعہ کو "معراج" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بعض علماء نے اصطلاحی فرق و امتیاز کے لیے یہی فرمایا ہے کہ اس واقعہ کا وہ حصہ جس کا ذکر بصراحت سورۂ بنی اسرائیل میں ہے قرآنی تعبیر کے اتباع میں "اسراء" ہے اور وہ حصہ جس کا تذکرہ سورۂ النجم اور صحیح احادیث میں ہے ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعبیر "عُرِجَ بِیْ" کی مناسبت سے معراج کے عنوان سے معنون ہے۔

واقعہ کی وحدت اس لیے دو مختلف تعبیروں اور واقعات کی تفصیلات میں جزوی اختلاف کے پیشِ نظر تطبیقِ روایات کی خاطر اس واقعہ کے تعدد کا قائل ہونا تاریخی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے ہرگز صحیح نہیں ہے اور مشہور محقق، جلیل القدر محدث، مفسر اور مؤرخ حافظ عماد الدین بن کثیر کا

یہ ارشاد بلاشبہ درست اور حقیقتِ حال کے لیے کاشف ہے، فرماتے ہیں:-

اِن تمام روایتوں کو جمع کرنے سے یہ بات بخوبی واضح ہوگئی کہ واقعۂ معراج صرف ایک ہی مرتبہ پیش آیا ہے اور راویوں کی عبارات کے بعض حصص کا ایک دوسرے سے کچھ مختلف اور تفصیلات میں کم و بیش ہونا وحدتِ واقعہ پر اثر انداز نہیں ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ دوسرے انسان خطا کاری سے محفوظ نہیں ہیں۔

سوان روایات کے جزوی اختلافات کو دیکھ کر جن علماء نے تعددِ واقعہ کا مسلک اختیار کیا اور ہر ایک مختلف روایت کو جدا جدا واقعہ بنا دیا اور اس طرح یہ دعویٰ کر دیا کہ معراج کا واقعہ متعدد بار پیش آیا ہے۔ انھوں نے بعید از قیاس بات کہہ ڈالی اور قطعاً غلط راہ روی اختیار کرلی اور حقیقتِ حال سے دور پڑ گئے...... یہ مسلک اس لیے بھی صحیح نہیں ہے کہ نہ سلفِ صالحین سے تعددِ واقعہ منقول ہے اور نہ تاریخی دلائل اس کے مؤید ہیں اور اگر ایسا ہوتا تو خود نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) ضرور بصراحت اس سے مطلع فرماتے اور راویانِ روایت بلاشبہ اس کو روایت کرتے۔[۱]

تحقیق تاریخ و سنہ یہ عدیم النظیر واقعہ کب پیش آیا؟ اس کے تعین میں اگرچہ متعدد اقوال مذکور ہیں لیکن ان دو باتوں پر سب کا اتفاق نظر آتا ہے، ایک یہ کہ واقعۂ معراج قبل از ہجرت پیش آیا اور دوسری بات یہ کہ حضرتِ خدیجۃ الکبریٰ (رضی اللہ عنہا) کی وفات کے بعد وقوع میں آیا اور جبکہ واقعۂ ہجرت باتفاق ۱۳ سنہ نبوت کو پیش آیا اور بخاری میں مذکور حضرتِ عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی روایت کے مطابق حضرتِ خدیجہؓ کا انتقال ہجرت سے تین سال قبل اور ایک دوسری روایت کے پیشِ نظر نمازِ پنجگانہ کی فرضیت سے قبل ہو چکا تھا۔[۲] تو اب واقعۂ معراج کو ہجرت سے قبل کے ان تین برسوں کے اندر ہی ہونا چاہیے۔

نیز کتبِ تاریخ و سیرت دونوں شاہد ہیں کہ معراج اور ہجرت کے درمیان کوئی اہم واقعہ

---

[۱] ترجمہ عبارت تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲۲ مطبوعہ مصر (جدید) [۲] فتح الباری جلد ، ص ۱۶۹۔

موجود نہیں ہے اور بنظرِ تحقیق ان ہر دو کے درمیان نہایت گہرا رشتہ اور ربط و علاقہ پایا جاتا ہے تو بلا شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ واقعۂ معراج ہجرت سے بہت قریب زمانہ میں پیش آیا ہے اور درحقیقت یہ واقعہ ہجرت ہی کی پُرجلال و پُرعظمت "تمہید" تھی۔

غالباً ابن سعد نے طبقات میں اور امام بخاری نے اپنی الصحیح الجامع میں اسی لیے واقعۂ معراج اور ہجرت کو کسی تیسرے واقعہ کی مداخلت کے بغیر آگے پیچھے بیان کیا ہے اور جو حضرات بخاری کے ابواب و تراجم کی باہمی ترتیب کی دقیقہ سنجی سے واقف اور ان کے تفقہ کی بالغ نظری سے آگاہ ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ان کا رجحان یہ ہے کہ ان ہر دو واقعات کے درمیان زمانہ اور تعلق دونوں اعتبار سے انتہائی قربت ہے۔

تو اب یہ کہنا آسان ہے کہ جو اربابِ سیر و تاریخ یہ فرماتے ہیں کہ معراج کا واقعہ ہجرت سے ایک سال یا ڈیڑھ سال قبل پیش آیا ان کا ارشاد پایۂ تحقیق رکھتا ہے۔

پھر مہینہ اور تاریخ کے تعین میں بھی متعدد اقوال موجود ہیں مگر راجح قول یہ ہے کہ مہینہ رجب کا تھا اور تاریخ ۲۷ تھی۔ چنانچہ ابن عبد البر، امام نووی اور عبد الغنی مقدسی (رحمہم اللہ) جیسے مشہور اور جلیل القدر محدثین کا رجحان اسی جانب ہے کہ رجب تھا اور آخر الذکر فرماتے ہیں کہ ۲۷ تھی اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اُمتِ مرحومہ میں ہمیشہ سے عملاً اسی پر اتفاق بھی رہا ہے۔

قرآن عزیز اور واقعۂ معراج | قرآنِ عزیز میں اسرا یا معراج کا واقعہ دو سورتوں بنی اسرائیل اور النجم میں مذکور ہے، سورۂ بنی اسرائیل میں مکہ (مسجدِ حرام) سے بیت المقدس (مسجدِ اقصیٰ) تک سیر کا تذکرہ ہے اور سورۂ النجم میں ملاءِ اعلیٰ کی سیر و عروج کا بھی ذکر موجود ہے، اور اگرچہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کی صرف ابتدائی آیات ہی میں یہ واقعہ مذکور ہے مگر حقیقتِ حال یہ ہے کہ پوری سورۃ اسی عظیم الشان واقعہ سے متعلق ہے اور سورۃ کی تمام آیات اسی کا تکملہ ہیں اور اس دعوے کے لیے ایک صاف اور واضح دلیل خود اسی سورۃ میں یہ موجود ہے کہ وسطِ سورۃ میں آیت "وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ إِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ" میں اسی واقعۂ معراج کا تذکرہ

ہو رہا ہے۔ اس سے قبل حضرتِ موسیٰ اور حضرتِ نوح علیہما السلام کے واقعاتِ دعوت و تبلیغ اسی سلسلہ میں بطور شواہد و نظائر پیش کیے گئے ہیں کہ منکرین نے ہمیشہ اسی طرح خدا کی صداقتوں کو جھٹلایا ہے جس طرح آج واقعہ معراج کو جھٹلا رہے ہیں۔

احادیث اور واقعہ معراج کا ثبوت مشہور محدث زرقانیؒ کہتے ہیں کہ معراج کا واقعہ پینتالیس صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے منقول ہے اور پھر اُن کے نام بھی شمار کرائے ہیں[1] ان صحابہ میں مہاجرین بھی ہیں اور انصار بھی اور یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے کہ چونکہ انصار صحابہ مکہ میں موجود نہیں تھے اس لیے ان کی روایات صرف شنیدہ ہیں اس لیے کہ ایسے اہم واقعہ کو جس کا اسلام کی ترقی کے ساتھ بہت گہرا تعلق اور ہجرت کے واقعہ کے ساتھ خصوصی ربط ہے صحابہؓ نے براہِ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی دریافتِ حال کیا ہوگا اور اگر مہاجرین سے بھی سنا ہوگا تو پھر ذاتِ اقدس سے تصدیق ضرور کی ہوگی، چنانچہ شداد بن اوسؓ کی روایت میں یہ الفاظ موجود ہیں:-

قلنا یا رسول اللہ کیف اُسری بك (ترمذی) — ہم نے (صحابہ نے) عرض کیا اے خدا کے رسول! آپ کو معراج کس طرح ہوئی ؟

لفظ "قلنا" یہ ثابت کر رہا ہے کہ بلاشبہ معراج سے متعلق صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے عام مجمع میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کیا جاتا تھا جن میں مہاجرین و انصار سب ہی شریک ہوتے تھے اور مالک بن صعصعہؓ جو انصاری صحابی ہیں اُن کی روایتِ معراج میں ہے:-

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم حدثھم۔ (بخاری کتاب المعراج) — نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے (صحابہؓ سے) یہ واقعہ بیان فرمایا۔

واقعہ کی نوعیت چونکہ یہ واقعہ اپنی اہمیت کے ساتھ ساتھ طویل بھی تھا اس لیے بربنائے بشریت واقعہ کے اصل تفصیلی حالات میں اتحاد و اتفاق اور بحدِ تواتر روایات منقول ہونے کے باوجود متعدد روایات کی فرعی تفصیلات میں جو اختلاف نظر آتا ہے وہ معمولی توجہ سے رفع کیا جا سکتا ہے

[1] جلد ۶ ص ۱۶۔

اور بلاشبہ ان جزدی اختلافات سے اصل واقعہ کی حقیقت پر مطلق کوئی اثر نہیں پڑتا خصوصاً جبکہ قرآن عزیز نے ان عجیب اور حیرت زا واقعات کو نص قطعی سے واضح کر دیا ہے جن کے متعلق ملحدین اپنے الحاد و زندقہ کے ذریعہ باطل تاویلات پیش کر کے اس واقعہ کی معجزانہ حیثیت کا انکار کرتے ہیں۔

واقعۂ معراج و اسراء اور قرآن عزیز سورۂ بنی اسرائیل میں واقعۂ اسراء بیت المقدس تک کی سیر سے وابستہ ہے:۔

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا	پاک ہے اس ذات کے لیے جس نے اپنے بندے کو (یعنی
مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ	پیغمبر اسلام کو) راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک
الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ	کہ اس کے اطراف کو ہم نے بڑی ہی برکت دی ہے سیر
لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ	کرائی اور اس لیے سیر کرائی کہ اپنی نشانیاں اسے دکھائیں۔
الۡبَصِیۡرُ ﴿بنی اسرائیل پ ۱۵ ع ۱﴾	بلاشبہ وہی ذات ہے جو سننے والی دیکھنے والی ہے۔
وَ مَا جَعَلۡنَا الرُّءۡیَا الَّتِیۡۤ اَرَیۡنٰکَ اِلَّا	اور وہ دکھلاوا جو تجھ کو ہم نے دکھایا سو لوگوں کی
فِتۡنَۃً لِّلنَّاسِ - (بنی اسرائیل پ ۱۵ ع ۶)	آزمائش کے لیے (دکھلایا)

اور سورۂ النجم میں ملاء اعلیٰ تک عروج کا ذکر بھی موجود ہے:۔

وَ النَّجۡمِ اِذَا ہَوٰی ۙ مَا ضَلَّ	شاہد ہے ستارہ جبکہ غروب ہو، تمہارا رفیق نہ گمراہ ہوا اور
صَاحِبُکُمۡ وَ مَا غَوٰی ۚ وَ مَا یَنۡطِقُ	نہ بھٹکا اور نہیں بولتا اپنے نفس کی خواہش سے یہ نہیں ہے
عَنِ الۡہَوٰی ؕ اِنۡ ہُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی	مگر حکم جو اس کو بھیجا گیا ہے، اس کو بتلایا ہے سخت قوتوں والے
عَلَّمَہٗ شَدِیۡدُ الۡقُوٰی ۙ ذُوۡ مِرَّۃٍ ؕ	زور آور (فرشتہ) نے (کہ یہ خدا کی وحی ہے) جو سیدھا بیٹھا اور
فَاسۡتَوٰی ۙ وَ ہُوَ بِالۡاُفُقِ الۡاَعۡلٰی	تھا وہ آسمان کے اونچے کنارہ پر پھر وہ قریب ہوا پس
ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ۙ فَکَانَ	جھک آیا، پھر رہ گیا (دونوں کے درمیان) دو کمان بلکہ اس
قَابَ قَوۡسَیۡنِ اَوۡ اَدۡنٰی ۚ فَاَوۡحٰۤی	سے بھی نزدیک کا فرق پس خدا نے اپنے بندہ (محمد صلی اللہ

إِلَىٰ عَبْدِهٖ مَآ أَوْحَىٰ ۝ مَا كَذَبَ	علیہ وسلم) پر وحی نازل فرمائی جو بھی وحی بھیجی اس (بندہ) نے
الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ ۝ أَفَتُمَٰرُونَهٗ	جو دیکھا (اس کے) دل نے جھوٹ نہیں کہا (یعنی آنکھ کی دیکھی
عَلَىٰ مَا يَرَىٰ ۝ وَلَقَدْ	بات کو جھٹلایا نہیں بلکہ تصدیق کی) تو کیا تم اس سے اس پر
رَءَاهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ ۝ عِندَ	جھگڑتے ہو جو اس نے خود دیکھا ہے (یعنی واقعہ پر
سِدْرَةِ الْمُنتَهَىٰ ۝ عِندَهَا	جھگڑتے ہو) اور اس (بندہ) نے خدا کو دیکھا ایک (خاص)
جَنَّةُ الْمَأْوَىٰ ۝ إِذْ يَغْشَى	نزول کے ساتھ جبکہ وہ بندہ سدرۃ المنتہیٰ کے نزدیک موجود
السِّدْرَةَ مَا يَغْشَىٰ ۝ مَا زَاغَ	تھا جس کے پاس آرام سے رہنے کی بہشت (جنت الماویٰ)
الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ ۝ لَقَدْ	ہے) اس وقت سدرہ (بیری کا درخت) پر چھا رہا تھا جو کچھ
رَأَىٰ مِنْ ءَايَٰتِ رَبِّهِ	چھا رہا تھا اُس رویت کے وقت نہ نگاہ بہکی اور نہ حد سے
الْكُبْرَىٰ ۝	تجاوز ہوئی، بلاشبہ اُس (بندہ) نے (اس حالت میں)
(سورۃ النجم۔ پ۲۷۔ ع۶)	اپنے پروردگار کے بڑے بڑے نشان دیکھے۔

سورۂ بنی اسرائیل اور واقعۂ معراج

یہاں سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ النجم کی تفسیر کا موقع نہیں صرف اشارات ہی پر اکتفا مناسب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اگر ایک جانب یہ آیات اپنے مکمل تفسیری حق کا مطالبہ کرتی ہیں تو دوسری جانب کتاب اپنے سیاق و سباق کے پیشِ نظر اختصار کی طالب ہے، بہرحال حسبِ ضرورت دونوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اس قدر گذارش ہے کہ بنی اسرائیل کی ابتدائی آیت میں واقعہ اسراء کے متعلق جو کچھ کہا گیا اس کی اگر تحلیل کی جائے تو بآسانی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس کا فیصلہ یہی ہے کہ واقعۂ اسراء بحالتِ بیداری بجسدِ عنصری پیش آیا ہے اور اس مطلب سے ہٹ کر جب اس کو روحانی یا منام، رؤیا کہا جاتا ہے تو تاویلاتِ باردہ کے بغیر دعویٰ پر دلیل قائم نہیں ہو سکتی۔

بنی اسرائیل میں اس واقعہ کی ابتدا خدائے برتر کی قدوسیت اور سبحانیت کے بعد لفظ "اسریٰ" سے ہوئی ہے، یہ لفظ "س، ر، ی۔ سریٰ یسریٰ" سے ماخوذ ہے۔ لغت میں

جس کے معنی "رات میں چلنے" کے آتے ہیں:-

سری، یسری، سریً وسریۃً الخ — سری، یسری، سریۃ میں سری کے معنی ہیں

سار لیلاً (منجد) — وہ رات میں چلا۔

اور "اسریٰ" کے معنی بھی "شب میں لے چلا" آتے ہیں، چنانچہ کتبِ لغت میں ہے:-

اسریٰ، اسراءً، سار لیلاً (منجد) — اسریٰ کے معنی ہیں "رات میں چلا"

یہی معنی اقرب الموارد، قاموس، لسان العرب اور تمام کتبِ لغت میں بصراحت مذکور ہیں اور اسی لفظ اسریٰ کو جب متعدی بنانا چاہتے ہیں یعنی "راتوں رات لیجانا" ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو "ب تعدیہ" بڑھادیتے ہیں۔ اس موقع کے علاوہ قرآن عزیز میں جہاں جہاں "اسراء" اور اس کے مشتقات آئے ہیں ان تمام مقامات میں بھی اسی معنی میں استعمال ہوا ہے، چنانچہ سورۂ ہود میں لوط علیہ السلام کے واقعہ میں ہے:-

قَالُوْا یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ یَّصِلُوْٓا اِلَیْكَ فَاَسْرِ بِاَھْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ (پ ۱۲ ع ۸) — فرشتوں نے کہا: لوطؑ! ہم تو تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے (فرشتے) ہیں۔ یہ تجھ تک ہرگز نہیں پہنچ پائیں گے پس تو اپنے لوگوں کو کچھ رات گئے (یہاں سے) لے نکل۔

یہ آیت "فَاَسْرِ بِاَھْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ" سورۂ دخان میں بھی موجود ہے، اور سورۂ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں ہے:-

وَلَقَدْ اَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْ (طٰہٰ ع ۳) — اور بلاشبہ ہم نے موسیٰؑ پر وحی کی کہ تیرے بندوں کو راتوں رات لے جا۔

اور سورۂ شعراء میں ہے:-

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ (شعراء ع ۴) — اور ہم نے موسیٰؑ پر وحی بھیجی کہ میرے بندوں کو راتوں رات لے کر نکل جا۔ تمہارا تعاقب ضرور کیا جائے گا۔

اور یہی آیت سورۂ دخان میں بھی مذکور ہے۔

اِن تمام آیات میں لفظ "اسراء" کا جس طرح اطلاق کیا گیا ہے اس سے دو حقیقتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک یہ کہ "اسراء" اُس سیر اور اُس چلنے کو کہتے ہیں جو رات میں پیش آئے اس لیے دن یا شام کے چلنے پر "اسراء" کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

دوسری بات یہ کہ "سری یا اسراء" ان تمام آیات میں روح مع جسد پر اطلاق ہوا ہے یعنی لوطؑ اور موسیٰ علیہما السلام اور ان کے متبعین جن کے لیے یہ حکم ہو رہا ہے کہ وہ دشمنوں سے بچ کر راتوں رات ان بستیوں (مصر اور سدوم) سے نکل جائیں، ان کا رات کے حصہ میں نکل جانا نہ خواب کی شکل میں تھا اور نہ روحانی طور پر اور نہ رویاءِ کشفی کے طریقہ پر بلکہ عالمِ بیداری میں روح مع جسد کے تھا۔

پس جبکہ قرآن کے ان تمام اطلاقات میں اسراء کے یہ معنی بغیر کسی تاویل کے قابلِ تسلیم ہیں تو بنی اسرائیل کی آیت "سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی" میں "اسراء" کو روح مع جسد تسلیم کرنے میں کیوں پس و پیش ہو اور کس لیے اِس واقعہ کو فقط روحانی، منامی، یا بین النوم والیقظہ کشفی طریقہ کے ساتھ مخصوص کیا جائے؟ جبکہ اس آیت "اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا" میں ایک لفظ بھی ایسا موجود نہیں ہے جو اس اسراء کو قرآن کے عام اطلاقات سے جدا معنی پر دلالت یا اشارہ کرتا ہو۔ رہا یہ مسئلہ کہ بنی اسرائیل کی آیت "وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْیَا الَّتِیْٓ اَرَیْنٰکَ اِلَّا فِتْنَۃً لِّلنَّاسِ" کے لفظ "رویا" سے فائدہ اٹھا کر یہ کہنا کہ چونکہ "رویا" عالمِ خواب پر بولا جاتا ہے اس لیے اسراء کا واقعہ منامی یا روحانی تھا، بدیں وجہ صحیح نہیں ہے کہ عربی بول چال میں جس طرح "رویا" کا اطلاق خواب کی حالت پر ہوتا ہے اُسی طرح وہ اس رویت پر بھی بولا جاتا ہے جس کا مشاہدہ آنکھ بحالتِ بیداری کرتی ہے۔ چنانچہ عربی کے نہایت مستند اور مشہور لغت لسان العرب میں یہ تصریح موجود ہے:

وَقد جاء رویا فی الیقظۃ   اور بلاشبہ "رویا" بیداری میں عینی مشاہدہ کے لیے بھی آتا ہے

اور صاحبِ لسان نے جاہلی شاعر راعی کے اس شعر کو اس معنی کے لیے سند ٹھہرایا ہے۔

فکبّر للرؤیا وھش فؤادہٗ   وبشر نفسًا کان نفسًا یلومھا

اس نے تکبیر کہی اور اس کا دل مسرت سے لبریز ہو گیا اور اس نے اپنے نفس کو پہلے ملامت کر رکھا تھا خوشخبری دی اس منظر کو دیکھ کر جس کا اس نے عینی مشاہدہ کیا۔

اسی طرح متنبی کے اس مصرعہ کو بھی سند قرار دیا ہے:۔

ورؤیاك احلیٰ فی العیون من الغمض

اور تیرا دیدار (میری) آنکھوں میں نیند سے بھی زیادہ لذیذ ہے

اِن مستند اقوالِ عرب کے بعد "رویا" کو صرف خواب کی حالت کے ساتھ مخصوص کر دینا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟ اب جبکہ "اسریٰ بعبدہٖ" میں "اسراء" کے متبادر معنی "سیرِ روح مع جسد" کے ہیں اور "رویا" کا اطلاق دونوں قسم کی رویت پر ہوتا رہا ہے تو اس مقام پر "اسراء" کا قرینہ اس کا متقاضی ہے کہ یہاں بحالتِ بیداری "عینی مشاہدہ" کے معنی ہی متعین ہونے چاہئیں اور دوسرے معنی قیاسی اور تاویلی حیثیت سے زیادہ وقیع نہیں ہیں۔

بعض معاصر علماء نے "اسراء" کو روحانی قرار دیتے ہوئے لسان العرب کے پیش کردہ سندات کو اول تو مستند ہی تسلیم نہیں کیا اور بفرضِ تسلیم کے بعد یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان ہر دو شاعروں راعی اور متنبی کے شعر و مصرعہ سے رویا کے معنی "خواب میں رویت" ہی کے نکلتے ہیں نہ کہ رویا بصری کے مگر تعجب یہ ہے کہ دونوں باتیں محض دعویٰ پر ہی ختم ہو گئی ہیں اور دعوے کے لیے زحمتِ دلیل کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔ تسلیم کر لیجیے کہ لغتِ عرب کے لیے متنبی مستند نہیں ہے مگر مشہور جاہلی شاعر راعی کس لیے غیر مستند قرار پایا جبکہ کلامِ عرب کی سند کے لیے جاہلی شعراء سے زیادہ کوئی سند مقبول نہیں سمجھی گئی، نیز راعی نے جبکہ جملہ "فکبّر" کو "للرؤیا" کے ساتھ وابستہ کیا ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ "رویا" کی وجہ سے اس نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور ظاہر ہے کہ نعرۂ تکبیر خواب میں بلند نہیں ہوا تھا بلکہ عالمِ بیداری کا واقعہ تھا، اسی طرح متنبی کے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ شبِ وصل میں تیرے دیدار کے مقابلہ میں نیند ہیچ ہے اگرچہ یہ صحیح ہے کہ نیند خود بہت شیریں ہے مگر دیدارِ محبوب کے مقابلہ میں اس کی شیرینی بھی بے حقیقت ہے۔

اس لغوی حقیقت کے آشکارا ہو جانے کے بعد حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) کا یہ ارشاد جو صحیح بخاری میں مذکور ہے: رؤیا عین اریھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ سونے پر سہاگہ ہے کیونکہ وہ لغتِ عرب کے امام بھی ہیں اور ترجمان القرآن بھی اور ان کے مقابلہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کا یہ ارشاد پیش کرنا قطعاً مرجوح ہے کہ وہ اسراء کو رؤیا بمعنی خواب مراد لیتے ہیں۔

مرجوح اس لیے ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت امیر معاویہ (رضی اللہ عنہما) سے جو روایات اس سلسلہ میں منقول ہیں وہ بلحاظ صحتِ روایت وہ درجہ نہیں رکھتیں جو حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) کی روایت کو حاصل ہے بلکہ محدثین کے نزدیک بچند وجوہ اُن کی صحت غیر مستند ہے۔ مثلاً حضرت عائشہ صدیقہ (رضی اللہ عنہا) کی روایت کتبِ حدیث کی بجائے فقط سیرت کی روایت ہے اور پھر محمد بن اسحٰقؒ اس کے متعلق یہ کہتے ہیں "حدثنی بعض آل ابی بکر" مجھ سے یہ روایت ابوبکرؓ کے خاندان کے ایک فرد نے بیان کی ہے۔ اس کا حاصل یہ ہوا کہ یہ روایت منقطع ہے کیونکہ درمیان کا ایک راوی مجہول ہے جس کے متعلق کوئی علم نہیں کہ وہ کس درجہ کا راوی ہے نیز اس روایت کے طرق میں بھی باہم اختلاف ہے اس لیے کہ بعض روایت میں ہے "مافقدت جسد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسدِ اطہر گم نہیں پایا" حالانکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ حریم نبوی میں ہجرت کے بعد داخل ہوئی ہیں اور واقعۂ معراج ہجرت سے قبل کا واقعہ ہے تو حضرت عائشہؓ کا "مافقدت" "میں نے گم نہیں پایا" فرمانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟ اس لیے بلاشبہ اس روایت میں جرح و نقص ہے۔

اسی طرح حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی روایت بھی سیرت میں منقول روایت ہے جس کو محمد بن اسحٰق نے یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ بن الاخنس سے روایت کیا ہے اور محدثین اس پر متفق ہیں کہ یعقوب نے حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کا زمانہ نہیں پایا اس لیے یعقوب

اور حضرت معاویہؓ کے درمیان ضرور کوئی راوی متروک ہے، جس کا روایت میں کوئی ذکر نہیں ہے پس یہ روایت بھی مجروح و منقطع ہے اور بروایت ابن اسحٰق حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کا یہ قول "قال کانت رؤیا من اللہ صادقۃ" حضرت معاویہؓ نے کہا: معراج اللہ تعالیٰ کی جانب سے سچا خواب تھا" کسی طرح بھی صحت کو نہیں پہنچتا۔

اب ایک مرتبہ پھر احادیثِ معراج پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ ایک جانب بخاری و مسلم اور صحاح کی وہ روایات ہیں جو متن و سند کے لحاظ سے مسلم اور صحت کے اعلیٰ معیار پر قائم سمجھی جاتی ہیں۔ اُن کی تفصیلات واقعۂ معراج کو بجسدِ عنصری ظاہر کرتی ہیں اور اسی لیے جمہور صحابہؓ اسی مسلک کو اختیار کیے ہوئے ہیں اور دوسری جانب محمد بن اسحٰق کی سیرت میں منقول اور حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) کی جانب منسوب وہ روایات ہیں جن کی صحت تک مجروح ہے اس لیے بات صرف یہی نہیں ہے کہ جو شخص سورۂ بنی اسرائیل کی آیت میں "رؤیا" بمعنی "خواب" لیتا ہے اس کا قول درست نہیں ہے بلکہ بلحاظِ سند یہ انتساب بھی صحیح نہیں ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہما) رؤیا منامی کے قائل ہیں کیونکہ جن جلیل القدر محدثین و مفسرین نے اس قول کو ان بزرگوں کی جانب منسوب کیا ہے اُس کا مدار محمد بن اسحٰق کی ہی یہ ہر دو روایات ہیں اور ان دونوں کی صحت کا حال ابھی روشن ہو چکا۔ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے بعض روایات میں واقعہ کی ابتداء اس طرح مذکور ہے "بینا انا نائم" یا "بین النائم والیقظان" یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بحالتِ خواب تھے یا بیداری اور خواب کی درمیانی حالت میں تھے کہ خدا کا قاصد "جبرئیل" آیا، نیز بخاری کی شریک والی روایت کے ختم پر ہے "استیقظ وھو فی المسجد الحرام" اور آپؐ جاگ اٹھے جبکہ آپؐ مسجدِ حرام میں تھے" اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ گذرا خواب میں گذرا۔

مگر یہ اس لیے صحیح نہیں کہ پہلے دو جملوں کا صاف اور سادہ مطلب یہ ہے کہ جب معراج یا اسراء کا واقعہ پیش آنے والا تھا تو اس وقت آپؐ سو رہے تھے لیکن واقعہ بحالتِ بیداری

پیش آیا جیسا کہ باقی تمام روایات سے ظاہر ہوتا ہے اور بقول قرطبی (رحمہ اللہ) دوسرے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ راوی اس بیداری کا ذکر کر رہا ہے جو علی الصباح نمازِ فجر کے لیے ہوئی یعنی اگرچہ آپؐ ابتداءِ شب میں ام ہانی کے مکان میں سوئے تھے مگر کچھ حصہ شب میں جب معراج کا واقعہ پیش آیا اور آپؐ اس سے فارغ ہو کر کرۂ ارضی پر واپس تشریف لائے تو باقی رات مسجدِ حرام میں سو کر گذاری اور جب آپؐ صبح کو بیدار ہوئے ہیں تو لوگوں نے مسجدِ حرام میں آپؐ کو پایا۔

علاوہ ازیں شریک کی روایت میں تعبیرِ ادا کی فاش غلطیاں ہو گئی ہیں جن پر محدثین نے تنبیہ فرمائی ہے مثلاً ان کی روایت کہتی ہے کہ معراج کا واقعہ بعثت سے بھی قبل پیش آیا" انہ جاءہ ثلثۃ نفر قبل ان یوحی الیہ وھو نائم فی المسجد الحرام۔ آپؐ کے پاس تین فرشتے بعثت اور نزولِ وحی سے قبل اس حالت میں آئے کہ آپؐ مسجدِ حرام میں سو رہے تھے" چنانچہ امام نووی خطابی، ابنِ حزم، عبدالحق، قاضی عیاض (رحمہم اللہ) نے شریک کی روایت پر سخت تعاقب کیا ہے۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں:۔

شریک نے اس روایت میں بہت سی غلطیاں کی ہیں جن کا علماء نے انکار کیا ہے اور مسلم نے بھی یہ الفاظ کہہ کر شریک کے اوہام پر تنبیہ کی ہے"۔ شریک نے روایت میں مقدم و مؤخر کر دیا ہے اور کم و بیش کر دیا ہے، اوہام میں سے ایک وہم یہ ہے کہ شریک کی روایت میں ہے "معراج کا واقعہ نزولِ وحی سے قبل پیش آیا ہے"۔ حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے اور اس قول کا کوئی راوی بھی موافق نہیں ہے۔ حافظ عبدالحق رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الجمع بین الصحیحین میں اس شریک والی روایت کو نقل کر کے کہا ہے کہ شریک نے اس میں بہت سی غیر معروف (ناقابلِ قبول) باتیں بڑھا دی ہیں اور غیر معروف الفاظ کا بھی اضافہ کر دیا کیونکہ اسراء کی حدیث کو حفاظِ حدیث کی ایسی جماعت نے نقل کیا ہے جو بلند پایہ اور ہر قسم کی جرح سے محفوظ اور مشہور ائمۂ حدیث ہیں۔ مثلاً ابن شہاب زہری، ثابت بنانی

قتادہ، عن انس اور ان میں سے کوئی ایک حافظِ حدیث بھی ان اجزار کو بیان نہیں کرتا جن کو شریک نے بیان کیا ہے اور شریک محدثین کے نزدیک حافظِ حدیث نہیں ہے۔

بہرحال فتح الباری میں معراج اور اسریٰ کے متعلق اتحاد و تغائر کی بحث کرتے ہوئے حافظ ابنِ حجرؒ یہی فیصلہ فرماتے ہیں کہ معراج بحالتِ بیداری اور رُوح مع الجسد ہوئی ہے:

فمنهم من ذهب الى ان الاسراء والمعراج وقعا فى ليلة واحدة فى اليقظة بجسد النبى صلى الله عليه وسلم وروحه بعد المبعث والى هذا ذهب الجمهور من علماء المحدثين والفقهاء والمتكلمين وتواردت عليه ظواهر الاخبار الصحيحة ولا ينبغى العدول عن ذلك اذ ليس فى العقل مايحيله حتى يحتاج الى تاويله ؎	پس ان علمار میں سے وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ بلاشبہ واقعاتِ اسرار و معراج دونوں ایک ہی رات میں بحالتِ بیداری جسم اور روح کے ساتھ بعثت کے بعد پیش آئے۔ تمام محدثین، فقہار اور متکلمین کا یہی مذہب ہے اور صحیح احادیث سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے اور اس سے تجاوز کرنا یعنی اس کا انکار کرنا نامناسب ہے، اس لیے کہ ایسا ہونا عقل کے نزدیک محال نہیں ہے کہ تاویل کرنے کی احتیاج ہو۔

اور قاضی عیاض شفار میں یہی تحریر فرماتے ہیں:۔

وذهب معظم السلف والمسلمين الى ان الاسراء بالجسد فى اليقظة وهو الحق وهذا قول ابن عباس وجابر وانس وحذيفة وعمر وابى هريرة ومالك بن صعصعة وابى حبة البدرى وابن مسعود والضحاك وسعيد بن جبير وقتادة وابن المسيب وابن شهاب وابن زيد والحسن وابراهيم ومسروق ومجاهد وعكرمة	جلیل القدر سلفِ صالحین اور بزرگ ترین مسلمان اس جانب ہیں کہ اسرار بجسدِ عنصری بیداری میں پیش آیا اور یہی مذہب حق ہے اور یہی ابن عباس، جابر، حذیفہ، عمر، ابوہریرہ، مالک بن صعصعہ، ابوحبہ بدری، ابن مسعود (رضی اللہ عنہم) اور ضحاک، سعید ابن جبیر، قتادہ، ابن مسیب، ابن شہاب، ابن زید، حسن، ابراہیم نخعی، مسروق، مجاہد، عکرمہ، ابن جریج (رحمہم اللہ) کا قول ہے اور یہی

؎ فتح الباری جلد ۷ ص ۱۵۶ مطبوعہ البہیۃ المصریۃ

وابن جریج وھو دلیل قول عائشۃ	دلیل ہے حضرتِ عائشہ (رضی اللہ عنہا)
وھو قول الطبرانی وابن حنبل وجمعۃ	کے قول کی اور یہی طبرانیؒ کا قول ہے اور
عظیمۃ من المسلمین وھو قول اکثر	ابن حنبلؒ کا اور مسلمانوں کی جماعت عظیم کا،
المتاخرین من الفقہاء والمحدثین	اور یہی قول ہے متاخرین میں سے اکثر فقہاء،
والمتکلمین والمفسرین۔	محدثین، متکلمین اور مفسرین کا۔

اور خفاجی نسیم الریاض میں قاضی عیاض کی اس عبارت "وھو دلیل قول عائشۃ" کے متعلق فرماتے ہیں کہ اگرچہ یہ بات بظاہر خلاف معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ عائشہ صدیقہؓ کی جانب جو قول منسوب ہے وہ اس کے قطعاً خلاف ہے لیکن قاضی عیاض (رحمہ اللہ) کا یہ دعویٰ ہے کہ جلیل القدر صحابہؓ کی یہ نقول اس امر کی دلیل ہیں کہ عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی جانب منسوب قول صحیح نہیں ہے اور وہ بھی جمہور ہی کے ساتھ ہیں۔

الحاصل قرآنِ عزیز اور احادیثِ صحیحہ بغیر کسی تاویل کے بصراحت یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اسراء اور معراج کا واقعہ بجسدِ عنصری اور بحالتِ بیداری پیش آیا ہے اور ان دلائل کو بطورِ فہرست اس طرح شمار کرایا جا سکتا ہے :۔

① سورۂ بنی اسرائیل کی آیت "اسریٰ بعبدہٖ" میں اسراء کے متبادر معنی وہی ہیں جو حضرتِ موسیٰ اور حضرتِ لوط علیہما السلام سے متعلق آیات میں ہیں یعنی بحالتِ بیداری اور بجسدِ عنصری رات میں لے چلنا۔

② آیت "وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِىٓ اَرَيْنٰكَ" میں "رؤیا" بمعنی عینی مشاہدہ ہے نہ کہ خواب یا روحانی رویت اور لغتِ عرب میں "رویا" کے یہ معنی مجاز نہیں بلکہ حقیقت ہیں۔

③ آیت "الا فتنۃ للناس" میں قرآن نے اس واقعہ کو اقرار و انکار کی شکل میں ایمان و کفر کے لیے معیار قرار دیا ہے اور اگرچہ انبیاء علیہم السلام کے روحانی مشاہدہ یا خواب پر بھی مشرکین و منکرین کا انکار و جحود ممکن اور ثابت ہے لیکن اس جگہ تبادر یہی ظاہر کرتا ہے

کہ واقعہ کی عظمت و فخامت کے پیش نظر منکرین کا انکار اس لیے شدید سے شدید تر ہوا کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس واقعہ کو عینی مشاہدہ کی طرح بیان فرمایا ہے۔

④ سورۃ النجم کی آیت "مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی" میں رویت جبرئیل نہیں بلکہ واقعہ اسرار کا مشاہدۂ عینی مراد ہے اور سورۃ کی آیت "مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی" میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ آنکھ نے جو کچھ دیکھا قلب نے ہو بہو اُس کی تصدیق کی اور واقعہ سے متعلق نہ رویت عینی نے کبھی اختیار کی اور نہ رویت قلبی نے اس حقیقت کا انکار کیا بلکہ دونوں کی مطابقت نے اس کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

⑤ صحیح حدیث میں ہے کہ جب مشرکین نے اس واقعہ کے انکار پر یہ حجت قائم کی کہ اگر یہ صحیح ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی موجودہ جزئی تفصیلات بتائیں کیونکہ ہم کو یقین ہے کہ نہ انھوں نے بیت المقدس کو کبھی دیکھا ہے اور نہ بغیر دیکھے جزئی تفصیلات بتائی جا سکتی ہیں تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سے بیت المقدس کے درمیانی حجابات منجانب اللہ اٹھا دیے گئے اور آپؐ نے ایک ایک چیز کا مشاہدہ کرتے ہوئے مشرکین کے سوالات کے صحیح جوابات مرحمت فرمائے جن میں مسجد کی بعض تعمیری تفصیلات تک زیر بحث آئیں یہ دلیل ہے اس امر کی کہ مشرکین یہ سمجھ رہے تھے کہ آپؐ اسراء کو بحالت بیداری اور بجسد عنصری ہونا بیان فرما رہے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خیال کی تردید نہیں فرمائی بلکہ اس کی تائید کے لیے معجزانہ تصدیق کا مظاہرہ فرما کر اُن کو لاجواب بنا دیا۔

⑥ ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) سے بسند صحیح منقول ہے کہ قرآن میں مذکور "رویا" سے مراد "رویا عین" ہے نہ کہ خواب یا روحانی مشاہدہ۔

⑦ آیۃ "وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِيْ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ" میں یہ مذکور ہے کہ واقعۂ اسراء اور جہنم کے اندر سینڈھ کے درخت کا موجود ہونا اور آگ میں نہ جلنا یہ دونوں واقعے اقرار و انکار کی صورت میں ایمان و کفر کے لیے آزمائش ہیں پس جبکہ

مہینوں کی غذا کے لیے ایک مادی خاردار درخت کا موجود ہونا سرسبز و شاداب رہنا اور آگ سے نہ جلنا مشرکین کے انکار کا باعث ہوا، بلاشبہ اسرار کے واقعہ میں بھی آزمائش کا پہلو یہی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح زمان و مکان کی قیود کو توڑ کر بجسدِ عنصری و بحالتِ بیداری وہ سیر کرلی جس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل اور والنجم میں اور صحیح احادیث میں ہے اور یقیناً مشرکین نے اس کا انکار کیا جس کے رد میں قرآن نے اس کو "الا فتنة للناس" کہہ کر اِس قدر اہمیت دی ورنہ تو انبیاء علیہم السلام کے روحانی مشاہدات اور خواب کے واقعات کا انکار تو اُن کے لیے ایک عام بات تھی۔

(۸) اسرار کا واقعہ جب پیش آیا تو صبح کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن صحابہؓ کی محفل میں اس واقعہ کا تذکرہ کیا وہ سب باتفاق یہ فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ بجسدِ عنصری بحالتِ بیداری پیش آیا مثلاً حضرتِ عمرؓ، حضرتِ انسؓ، حضرتِ عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ اور اس کے برعکس ذیل کے قائلین میں حضرتِ امیر معاویہؓ اور حضرتِ عائشہؓ کے اسماءِ گرامی ہیں جن کا اسلام یا حرمِ نبوی سے تعلق اس واقعہ سے برسوں بعد مدینہ کی زندگیٔ پاک سے وابستہ ہے اس لیے واقعہ کے ایام میں موجود اصحاب کا قول راجح ہے۔

(۹) حضرتِ عائشہ اور حضرتِ امیر معاویہ (رضی اللہ عنہما) کا جو مسلک جمہور کے خلاف منقول ہے وہ بلحاظ درجۂ روایت وصحتِ سند نہ صرف مرجوح بلکہ مجروح ہے اس لیے اوّل تو ان بزرگوں کی جانب اِس قول کا انتساب ہی درست نہیں اور بالفرض صحیح بھی ہو تو جمہور کے مسلک کے مقابلہ میں ہر حیثیت سے مرجوح ہے۔ وذلك تسع آيات بينات۔

والنجم اور واقعۂ معراج واقعۂ معراج کی تفصیلات اگرچہ مستند، مشہور اور مقبول، روایات و احادیث سے ثابت و منصوص ہیں لیکن خود قرآنِ عزیز (والنجم) میں بھی بنصِ صریح بعض وہ تفصیلات مذکور ہیں جن کو بنی اسرائیل کے اجمال کی تفسیر کہنا چاہیے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان چند آیات کی تفسیر بھی بیان کر دی جائے۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی مَاضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی "نجم" ستارہ کو کہتے ہیں اور "النجم" کہہ کر کبھی خاص ستارہ ثریّا پر بھی اطلاق کرتے ہیں اور "ہوٰی" کے معنی سقوط و غروب کے ہیں اور "والنجم" میں "واؤ" قسم کے لیے ہے جس سے استعمالاتِ قرآنی میں اکثر مضمون مابعد کی اہمیت کے پیشِ نظر استشہاد مقصود ہوتا ہے "ضلّ" ضلالت سے ہے گمراہ ہونے اور بہک جانے کو کہتے ہیں اور "غوی" غوایت سے جس کے معنی بے راہ روی اور بچل جانے کے ہیں۔

پس ہر دو آیات کا مطلب یہ ہوا کہ شبِ دیجور کے یہ ستارے یا ثریّا اس امر کی شہادت ہیں کہ جس طرح نظامِ شمسی میں ثریّا بلکہ تمام ستارے طلوع سے غروب تک ایسے محکم اور مضبوط نظامِ فطرت میں منسلک ہیں کہ مقررہ وقت و معین رفتار کے ساتھ بغیر بھٹکے بچلے ہوئے جاری و ساری ہیں، ٹھیک اسی طرح روحانی نظامِ شمسی کے تمام ستارے (انبیاء علیہم السلام) بھی نبوت و رسالت کے مقررہ اصول و معین راہ پر جاری و ساری رہے ہیں اور کبھی خدا کے معین کردہ نظامِ نبوت سے نہ بھٹکے اور نہ بے راہ ہوئے تو پھر یقین کرو کہ اس نظامِ روحانیت (نبوت) کا آفتابِ عالمتاب یعنی تمہارا رفیق (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) بھی نہ بھٹکا اور نہ بے راہ ہوا، اور ہو بھی کیسے سکتا تھا کہ ایسا ہونے پر سارا نظامِ نبوّت ہی درہم برہم ہو کر رہ جاتا اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا، یا یُوں کہہ لیجئے کہ تمہارے سامنے جس شب کا ذکر ہو رہا ہے اس شبِ دیجور میں ثریّا جیسے روشن ستارہ کا طلوع ہو کر غروب ہو جانا اس پورے نظامِ شمسی کے تغیر و فنا کی بولتی تصویر ہے پس اگر تمہارا رفیق (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کسی ایسے واقعہ کا اظہار کرتا ہے جو عام قانونِ قدرت کے پیشِ نظر عجیب و غریب معلوم ہوتا اور اس نظامِ شمسی کے ایک خاص دورِ انقلاب اور حیرت زا تغیر کا پتہ دیتا ہے تو تم کو یقین کرنا چاہیے کہ یہ واقعہ بلاشبہ عالمِ وجود میں آیا اور تمہارا رفیق اس معاملہ میں نہ بھٹکا اور نہ بے راہ ہوا بلکہ جو کچھ دیکھا اور جو کچھ نقل کیا وہ سب حرف بحرف حق مبنی برحقیقت ہے۔

"وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡہَوٰی" "نطق" گویائی اور "ہوٰی" "خواہشِ نفس"۔ "اِنۡ ہُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی" "وحی" وہ یقینی الہام جو خدا کی جانب سے نبی پر نازل ہوتا ہے اور جس کے خدا کی جانب سے ہونے میں کسی قسم کا شک و تردد نہیں ہوتا یعنی "رسالت" اور یہ بھی واضح رہے کہ تمہارے رفیق کی صدقِ مقالی کا یہ عالم ہے کہ وہ خدا کی باتیں کبھی بھی اپنی خواہشِ نفس سے نہیں کہتا بلکہ جو کچھ بھی کہتا ہے وہ خدا کی ہی وحی سے ہوتا ہے۔

"عَلَّمَہٗ شَدِیۡدُ الۡقُوٰی، ذُوۡ مِرَّۃٍ فَاسۡتَوٰی، وَہُوَ بِالۡاُفُقِ الۡاَعۡلٰی، ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوۡسَیۡنِ اَوۡ اَدۡنٰی" "علّمہ" تعلیم، سکھلانا۔ "شدید القوٰی" زبردست روحانی طاقتوں والا، "مرّہ" زور آور، "فاستوٰی"، استوار، سیدھا ہو بیٹھا۔ "افق الاعلٰی" (آسمان کا) اونچا کنارہ "دنٰی" دنو، قریب ہونا۔ "فتدلّٰی" "تدلی"، جھک آنا۔ "قاب قوسین" دو کمان کی مقدار، "ادنٰی" قریب ترکم۔

صاحبِ وحی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور وحی نازل کرنے والے (خدا) کے باہم رشتۂ وحی کا اظہار کرنے کے بعد ضرورت تھی کہ ان دونوں کے درمیان جو وحی کے لیے رابطہ ہے یعنی جبرئیلؑ کچھ اس کے متعلق بھی کہا جائے، کیونکہ مشرکینِ مکہ اس کی شخصیت اور اس کے فرض کی تفصیلات سے قطعاً نا آشنا تھے اور یوں بھی وحی کی عظمت، صاحبِ وحی کی جلالت اور وحی نازل کرنے والی ہستی کے جلال و جبروت کا تقاضا تھا کہ رابطۂ وحی کی شخصیت کے بعض نمایاں اوصاف کو بھی بیان کیا جائے۔ اس لیے ارشاد ہوا۔ اس پر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر) جو وحی لاتا ہے وہ زبردست روحانی و جسمانی طاقتوں کا پیکر ہے۔ وہ پیغمبرِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنی حقیقی ہیئت و صورت میں صاف نمایاں نظر آیا اور آپؐ نے اس کو آسمان کے بلند کنارے پر دیکھا، پھر وہ قریب ہوگیا، پس (پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب) جھک آیا، پھر ہوگیا اتنا قریب جیسا کہ دو کمان کی مسافت یا اس سے بھی قریب تر۔

"فَاَوۡحٰۤی اِلٰی عَبۡدِہٖ مَاۤ اَوۡحٰی، مَا کَذَبَ الۡفُؤَادُ مَا رَاٰی، اَفَتُمٰرُوۡنَہٗ عَلٰی مَا یَرٰی" "فواد" قلب "رأی" رویتِ بصر "تمارونہ" ممارات بمعنی مقابلہ کرنا، جھگڑا کرنا۔

جب صاحبِ وحی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور وحی کے لانے والے (جبرئیل علیہ السلام) کے درمیان صورتِ حال یہ پیش آئی تو اس کے بعد موحی (وحی کرنے والے خدا) نے اپنے بندے پر جو کچھ چاہا وہ براہِ راست وحی فرمائی یعنی جب اس مقامِ رفیع پر بُلا کر جہاں کسی مخلوق کا گذر نہ ہُوا اور نہ ہو، مخاطب کو کیا بتلایا جائے کہ خدا اور اس کے پیغمبر کے درمیان کیا کچھ وحی کی سرگوشیاں ہوئیں، کیونکہ کسی کو وہ رفعت جب نصیب ہی نہیں تو وہ اُن حقائق کو سمجھ ہی کیا سکتا ہے، لہٰذا اسی قدر کافی ہے کہ یہ یقین کر لو کہ خدا نے جو چاہا اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سے بات چیت کی اور یہ کہ اس کی آنکھ نے اس شب میں جن اسرارِ الٰہی کو دیکھا، قلب نے اس کو جھوٹا نہیں کہا، بلکہ وہ ایک ایسی حقیقت تھی جس کے بارے میں چشم و قلب دونوں کے درمیان مطابقت و تصدیق کا ہی سلسلہ قائم رہا تو پھر اے مخاطبین جو کچھ اس (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے دیکھا ہے کیا تم اس کے متعلق جھگڑتے ہو ؟

"وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى، عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى، عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى، اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى" : "نزلۃ اخریٰ" ایک قسم کا نزول یا دوسری مرتبہ "سدرہ" بیری کا درخت "سدرۃ المنتہیٰ" ملاءِ اعلیٰ کا ایک مقامِ رفیع "جنۃ الماویٰ" نیکوں کے قیام کی جنت "یغشیٰ" غشیان، ڈھانپ لینا۔

حالانکہ جھگڑنے کی کوئی بات نہیں اس لیے کہ اس نے وحی کرنے والے (خدا) کو ایک خاص کیفیتِ نزول کے ساتھ دیکھا ہے اور اس وقت دیکھا جب وہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سدرۃ المنتہیٰ کے پاس تھا جس کے قریب جنت الماویٰ ہے اور اس وقت اس سدرہ کو ڈھانپنے والی شے (یعنی فرشتوں) نے ڈھانپ رکھا تھا[1] یا یہ کہیے کہ اس نے جبرئیل کو دوسری مرتبہ (اصلی ہیئت میں) دیکھا سدرۃ المنتہیٰ کے قریب الخ پس نہ مشاہدۂ جلوۂ حق کوئی جھگڑنے کی بات ہے اور نہ رویتِ جبرئیلؑ کہ جس کو اس سے قبل بھی اس نے دیکھا ہے اور چشمِ حق بیں اور قلبِ حق آگاہ کے لیے ان میں سے ایک بات بھی قابلِ نزاع نہیں۔

[1] مشکلات القرآن ص ۳۴۰ تا ۳۶۰۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی، لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی۔ "زاغ" زیغ، کجی۔
طغیٰ، طغیان، سرکشی، خلافِ حق رجحان۔

بہرحال اس کے مشاہدۂ حق پر کوئی جھگڑے اور انکار کرے یا تسلیم کرے اور حق جانے، حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے لیلۃ الاسراء میں جو کچھ بھی مشاہدات کیے اور آنکھوں سے جو کچھ بھی دیکھا اس چشمِ حق بیں نے حقیقتِ حال کے خلاف نہ کسی قسم کی کجی اختیار کی اور نہ وہ راہ سے بے راہ ہوئی اور بلا شائبۂ شک و شبہ اس نے اپنے پروردگار کے بڑے بڑے نشان دیکھے۔

واقعہ کی تفصیلات | وہ نشان کیا تھے جن کو اس جگہ "لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی" کہا، اور بنی اسرائیل میں "لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیٰتِنَا" فرمایا اور اسی سورۃ میں دوسرے مقام پر "وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْیَا الَّتِیْٓ اَرَیْنٰکَ اِلَّا فِتْنَۃً لِّلنَّاسِ" کہہ کر ان کی اہمیت کو روشناس کرایا تو بخاری و مسلم میں منقول صحیح، مشہور اور مقبول روایات کا مجموعی بیان یہ ہے:۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صبح کو ارشاد فرمایا: گذشتہ شب میرے خدا نے مجھ کو اپنے خاص مجد و شرف سے نوازا، جس کی تفصیل یہ ہے کہ شبِ گذشتہ جبکہ میں سو رہا تھا رات کے ایک حصہ میں جبرئیلؑ آئے اور مجھ کو بیدار کیا ابھی پوری طرح جاگ بھی نہ پایا تھا کہ حرمِ کعبہ میں اٹھا لائے اور تھوڑی دیر لیٹا تھا کہ پوری طرح بیدار کر کے اول میرا سینہ چاک کیا اور ملاءِ اعلیٰ کے ساتھ مناسبتِ تام پیدا کرنے کے لیے عالمِ دنیا کی کدورتوں کو دھویا اور ایمان و حکمت سے بھر دیا۔ اس کے بعد حرم کے دروازہ پر لایا گیا اور وہاں جبرئیلؑ نے میری سواری کے لیے خچر سے کچھ چھوٹا جانور براق پیش کیا جو سپید رنگ کا تھا جب میں اس پر سوار ہو کر روانہ ہوا تو اس کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ حدِ نگاہ اور حدِ رفتار یکساں نظر آتی تھی کہ اچانک بیت المقدس جا پہنچے، یہاں جبرئیلؑ کے اشارہ پر براق کو مسجد کے دروازہ کے اس حصہ سے باندھ دیا جس سے انبیاءِ بنی اسرائیل مسجدِ اقصیٰ کی حاضری پر اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے (اور جو اس وقت تک بطور یادگار قائم تھا) پھر میں مسجدِ اقصیٰ میں داخل ہوا اور دو رکعات پڑھیں، اب

یہاں سے ملاءِ اعلیٰ کی طیاری شروع ہوئی تو اوّل جبرئیلؑ نے میرے سامنے دو پیالے پیش کیے اُن میں سے ایک شراب (خمر) سے لبریز تھا اور دوسرا دودھ (لبن) سے، میں نے دودھ کا پیالہ قبول کیا اور شراب کا پیالہ مسترد کردیا، جبرئیلؑ نے یہ دیکھ کر کہا: آپؐ نے دودھ کا پیالہ قبول کرکے دینِ فطرت کو اختیار کیا (یعنی خدا کی جانب سے جو میں نے آپؐ کو یہ دو پیالے پیش کیے تو دراصل یہ تمثیل تھی دینِ فطرت اور دینِ زیغ کی، مگر آپؐ نے اس حقیقت کو پہچان لیا اور دودھ کے پیالہ کو قبول فرماکر جو دینِ فطرت کی تمثیل تھا دینِ فطرت کو قبول فرمالیا) اس کے بعد ملاءِ اعلیٰ کا سفر شروع ہوا اور جبرئیلؑ کی ہمرکابی میں براق نے آسمان کی جانب پرواز کی، جب ہم پہلے آسمان (سماءِ دنیا) تک پہنچ گئے تو جبرئیلؑ نے نگہبان فرشتوں سے دروازہ کھولنے کو کہا، نگہبان فرشتہ نے دریافت کیا، کون ہے؟ جبرئیلؑ نے کہا: میں جبرئیلؑ ہوں، فرشتہ نے دریافت کیا، تمہارے ساتھ کون ہے؟ جبرئیلؑ نے جواب دیا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) فرشتہ نے کہا: کیا خدا کے مدعو ہوکر آئے ہیں؟ جبرئیلؑ نے کہا: بیشک، فرشتہ نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا: ایسی ہستی کا آنا مبارک ہو۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو حضرتِ آدم (علیہ السلام) سے ملاقات ہوئی۔ جبرئیلؑ نے میری جانب مخاطب ہوکر کہا یہ آپ کے والد (اور نسلِ انسانی کے مورثِ اعلیٰ) آدم (علیہ السلام) ہیں، آپ ان کو سلام کیجیے، میں نے ان کو سلام کیا، اور انھوں نے جواب سلام دیتے ہوئے فرمایا "مرحبا بالابن الصالح والنبی الصالح" خوش آمدید برگزیدہ بیٹے اور برگزیدہ نبی" اس کے بعد دوسرے آسمان تک پہنچے اور پہلے آسمان کی طرح سوال وجواب ہوکر دروازہ میں داخل ہوئے تو وہاں یحییٰ وعیسیٰ (علیہما السلام) سے ملاقات ہوئی، جبرئیلؑ نے اُن کا تعارف کرایا اور کہا کہ آپ سلام پیش قدمی فرمایئے، میں نے سلام کیا اور ان دونوں نے جواب دیتے ہوئے فرمایا "مرحبا بالاخ الصالح والنبی الصالح، خوش آمدید اے برگزیدہ بھائی اور برگزیدہ نبی" پھر تیسرے آسمان تک پہنچ کر یہی مرحلہ پیش آیا اور جب ہم آسمانِ ثالث میں داخل ہوا تو حضرتِ یوسف (علیہ السلام) سے ملاقات ہوئی، جبرئیلؑ نے تقدیم سلام

کے لیے کہا اور میرے سلام کرنے پر یوسف (علیہ السلام) نے بھی جواب سلام کے بعد یہی کلمہ کہا: "خوش آمدید اے برگزیدہ بھائی اور برگزیدہ نبی" بعد ازاں چوتھے آسمان پر اسی سوال و جواب کے ساتھ حضرتِ ادریس (علیہ السلام) سے ملاقات ہوئی اور پانچویں آسمان پر حضرتِ ہارون (علیہ السلام) سے اور چھٹے آسمان پر موسیٰ (علیہ السلام) سے اسی طرح ملاقات ہوئی لیکن جب میں وہاں سے روانہ ہونے لگا تو حضرتِ موسیٰؑ پر رقت طاری ہوگئی، میں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا: "مجھے یہ رشک ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ نے ایسی ہستی کو جو میرے بعد مبعوث ہوئی یہ شرف بخش دیا کہ اس کی اُمّت میری امت کے مقابلہ میں چند در چند زیادہ جنّت سے فیضیاب ہوگی۔ اس کے بعد سابق سوالات و جوابات کا مرحلہ طے ہوکر جب میں ساتویں آسمان پر پہنچا تو حضرتِ ابراہیم (علیہ السلام) سے ملاقات ہوئی جو بیت المعمور سے پشت لگائے بیٹھے تھے اور جس میں ہر روز ستر ہزار نئے فرشتے (عبادت کے لیے) داخل ہوتے ہیں، انھوں نے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: "مبارک اے میرے برگزیدہ بیٹے اور برگزیدہ نبی" یہاں سے پھر مجھ کو سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچایا گیا (تمہاری بول چال میں یہ ایک انتہا کی بیری کا درخت ہے) جس کا پھل (بیر) ہجر کی ٹھلیا کی برابر ہے اور جس کے پتے ہاتھی کے کان کی طرح چوڑے ہیں[۱] اس پر ملائکۃ اللہ جگنوں کی طرح بے تعداد چمک رہے تھے

---

[۱] سدرۃ المنتہیٰ کے متعلق مختلف روایات کا حاصل یہ ہے کہ اس کی جڑ چھٹے آسمان پر ہے اور اس کی شاخیں ساتویں آسمان سے بھی نکل گئی ہیں اور یہ وہ مقام ہے جہاں سے چیزیں زمین پر اترتی اور زمین سے اوپر چڑھ کر وہاں تک پہنچتی ہیں گویا نزول و عروج کا مقامِ اتصال ہے۔ اس مقام سے آگے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ نہ جبرئیل علیہ السلام اور دوسرے ملائکۃ اللہ کا گذر ہوا اور نہ کسی نبی مرسل کا۔

محدثین کہتے ہیں کہ یہ مقام اس درخت کی شکل میں دراصل "ایمان و حکمت" کی حقیقت کو مُشکّل و مُصوَّر ظاہر کرتا ہے، اس لیے کہ ایمان، نیتِ صالح اور عملِ صالح کا جامع ہے، پس یہ درخت پھل کے ذائقہ، اپنی خوشبو اور اپنے سایہ ہر سہ صفات کے لحاظ سے حقیقتِ ایمان کا مظہر ہے یعنی اس درخت کے پھل کا لذیذ ذائقہ نیتِ صالح کا مظہر ہے اور عمدہ خوشبو قولِ صالح اور راحت بخش سایہ عملِ صالح کا مظہر ہے اور اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کی تشبیہ شجر کے ساتھ دی ہے۔ ارشادِ مبارک ہے: "الایمان بضع وسبعون شعبة" الحدیث۔

اور خدا کی خاص تجلی نے اس کو حیرت زا طور پر روشن و پُر کیف بنا دیا تھا۔

اسی سفر میں میں نے چار نہروں کا بھی معائنہ کیا ان میں سے دو ظاہر نظر آتی تھیں اور دو باطن میں بہہ رہی تھیں، یعنی دو نہریں جن کا نام نیل اور فرات[1] ہے آسمانِ دنیا پر نظر پڑیں اور دو نہریں جنت کے اندر موجود پائیں اور ان مشاہدات کے بعد محمدؐ کو شراب (خمر) دودھ اور شہد کے پیالے پیش کیے گئے اور میں نے دودھ کو قبول کر لیا اس پر جبرئیلؑ نے مجھے بشارت سنائی کہ آپ نے "دینِ فطرت" کو قبول کر لیا (یعنی جو ہر قسم کی کدورتوں سے پاک اور شفاف ہے عمل میں شیریں اور خوشگوار اور نتیجہ میں حد درجہ مفید اور احسن ہے)

پھر خدائے تعالیٰ کا خطاب ہوا کہ تم پر شبانہ روز پچاس نمازیں فرض قرار دی گئیں جب میں ان اسرارِ الٰہی کے مشاہدات سے فارغ ہو کر نیچے اُترنے لگا تو درمیان میں موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، انھوں نے دریافت کیا: معراج کا کیا تحفہ لائے؟ میں نے کہا: پچاس نمازیں۔ انھوں نے فرمایا: تمہاری اُمت اس بارِ گراں کو برداشت نہ کر سکے گی اس لیے واپس جائیے اور تخفیف کی التجا کیجیے کیونکہ میں تم سے قبل اپنی اُمت کو آزما چکا ہوں چنانچہ میں درگاہِ الٰہی میں رجوع ہوا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے پانچ کی تخفیف ہو گئی، موسیٰ علیہ السلام تک لوٹ کر آیا تو انھوں نے پھر اصرار کیا کہ اب بھی زیادہ ہیں اور کم کراؤ، اور میں اسی طرح چند مرتبہ آتا جاتا رہا حتیٰ کہ صرف پانچ نمازیں رہ گئیں، مگر موسیٰ (علیہ السلام) مطمئن نہیں ہوئے اور فرمایا میں بنی اسرائیل کا کافی تجربہ اور اُن کی اصلاح کر چکا ہوں اس لیے مجھے اندازہ ہے کہ آپ کی اُمت یہ بھی برداشت نہ کر سکے گی، اس لیے تخفیف کے لیے مزید عرض کیجیے، تب میں نے کہا کہ اب عرض کرتے شرم آتی ہے، میں اب راضی برضا اور

---

[1] یا تو یہ مُراد ہے کہ جس وقت آپؐ نے جنت میں دو نہریں دیکھیں تو آپؐ نے اسی وقت جب دنیا کی جانب نگاہ کی تو وہاں سامنے نیل اور فرات بہتی ہوئی نظر آئیں اور یا یہ مطلب ہے کہ اُن ہی کی نہروں کے اسی طرح نام ہیں جس طرح دنیا کے دو دریا نیل اور فرات ہیں۔

اس کے فیصلہ کے سامنے سرِ نیاز جھکاتا ہوں۔ جب میں یہ کہہ کر چلنے لگا تو ندا آئی ہم نے اپنا فرض نافذ کر دیا اور اپنے بندوں کے لیے تخفیف کر دی یعنی مشیتِ الٰہی قبل ہی یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ امتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر بصورتِ ادا، اگرچہ پانچ نمازیں فرض رہیں گی مگر انکا اجر و ثواب پچاس ہی کی برابر ہوگا اور یہ تخفیف ہمارا فضل و کرم ہے۔

ان ہی روایات میں ہے کہ میں نے جنت و جہنم کا بھی مشاہدہ کیا اور پھر مشاہدہ کی تفصیلات بھی منقول ہیں۔

معراج میں رویتِ باری | کیا معراج میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذاتِ احدیت کے جمالِ جہاں آرا کا بے حجاب مشاہدہ کیا؟ صحیح روایات میں اس مسئلہ کے متعلق جو تعبیرات مذکور ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشاہدہ ضرور کیا، تاہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس مشاہدہ کی کیفیت کے حقیقی اظہار سے اس لیے قاصر ہیں کہ دنیوی تعبیرات میں کوئی تعبیر ایسی موجود نہیں کہ بلند سے بلند ترین مخلوق اس کے ذریعہ جمالِ جہاں آرا کی کیفیت و حقیقت کو بیان کر سکے اس لیے آپ نفسِ واقعہ کا اقرار فرماتے ہیں جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) کی روایت میں منقول ہے "رایت۔ نورًا۔ میں نے اس کو نور دیکھا" اور مشاہدہ کے باوجود جمالِ جہاں آرا کی ناقابلِ بیان کیفیت کا پھر ان الفاظ میں اظہار بھی فرماتے جاتے ہیں نور انّی اراہ۔ اس نورِ بحت کا حقیقی مشاہدہ کہاں ہو سکتا تھا۔

پس حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے مقابلہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جانب سے رویتِ باری کی نفی میں آیتِ قرآنی کا یہ استدلال لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ۔ اس کو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں اور وہ آنکھوں کا یعنی دیکھنے والوں کی پوری حقیقت کا ادراک کیے ہوئے ہے: اس لیے مرجوح ہے کہ آیت میں موجودہ دنیا کی مادی اور محدود بصارت کے مشاہدہ کا انکار ہے جو لاریب حق ہے لیکن ملاءِ اعلیٰ کا وہ مقامِ معراج جہاں زمان و مکان اور حدود و قیود سے آزاد اسرارِ الٰہی کے مشاہدات کے لیے کسی کو نوازا گیا ہو تو اس کے

مشاہدۂ حقیقت کا یہ آیت کسی طرح انکار نہیں کرتی۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے زمانہ سے آج تک محققین علماء کی ایک کثیر جماعت سلفاً عن خلف سورۂ والنجم کی آیت "أَفَتُمَارُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ" "مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ" کی تفسیر میں صحیح احادیث کی استمداد سے یہ ثابت کرتی رہی ہے کہ ان مقامات میں رویت سے "رویتِ باری" مراد ہے چنانچہ محقق عصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہٗ نے سورۂ والنجم کی دقیق ولطیف اور بے بہا تفسیر میں اس حقیقت کو بأحسن وجوہ بیان فرمایا ہے[1]۔

ہجرت

ہجرت لفظِ "ہجر" سے ماخوذ ہے جس کے معنے چھوڑ دینے کے ہیں اور اسلام کی اصطلاح میں "اللہ کے لیے ترکِ وطن کر دینا" ہجرت کہلاتا ہے۔

ہجرتِ حبش | اللہ کے دین پر استقامت اور کلمۂ حق کی حفاظت کی خاطر فدا کارانِ اسلام کو ترکِ وطن کی پہلی آزمائش اُس وقت پیش آئی جبکہ کفارِ مکہ اور مشرکینِ قریش نے ہر قسم کے ظلم وستم کا نشانہ بنا کر مسلمانوں کے لیے اُن کے محبوب وطن (مکہ) میں دینِ حق پر قائم رہتے ہوئے لمحاتِ زندگی کو ناممکن بنا دیا اور اب ترکِ وطن کے علاوہ کوئی چارۂ کار باقی نہ چھوڑا، پس مٹھی بھر مسلمانوں پر مشرکین کے ناقابلِ برداشت مظالم اور مسلمانوں کے حیرت زا صبر واستقلال نے دنیاء تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا جو "ہجرتِ حبش" کے عنوان سے معنون ہے۔

حبشہ کا موجودہ فرمانروا اصحمہ[2] عیسائی تھا اور دینِ مسیحی کا عالم بھی، اِس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] تفسیر کا یہ حصہ فتح الملہم شرح مسلم جلد اول لعلامہ شبیر احمد عثمانی، اور مشکلات القرآن لحضرۃ الشاہ الکشمیری نور اللہ مرقدہٗ دونوں میں منقول ہے اور اپنی جگہ قابلِ مراجعت ہے۔

[2] حبشہ کے بادشاہ کا لقب "نجاشی" تھا جو "نجوس" کا معرب ہے نجوس حبشی زبان میں حکمراں کو کہتے ہیں۔

نے مسلمانوں کو اجازت مرحمت فرمائی کہ وہ سرزمینِ حبشہ کو ہجرت کر جائیں، توقع ہے کہ اصحمہ کی حکومت ان کا خیر مقدم کرے گی اور وہ کسی مزاحمت کے بغیر دینِ حق پر قائم و مستقیم رہ سکیں گے۔

ہجرت کے اس دور کی نمایاں شخصیت حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) اور ان کی رفیقۂ حیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لختِ جگر حضرت رقیہ (رضی اللہ عنہا) ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقدس جوڑے کو رخصت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ لوط اور ابراہیم (علیہما السلام) کے بعد یہ پہلا جوڑا ہے جو خدا کی راہ میں ہجرت کر رہا ہے[1]۔ پھر آہستہ آہستہ یہ تعداد اسی تک پہنچ گئی، ان مہاجرین میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عم زاد بھائی حضرت جعفرؓ بھی تھے، یہی وہ مردِ حق کوش ہیں جنھوں نے قریش کے وفد کی مہاجرین سے متعلق زہر چکانی اور مطالبۂ مراجعت کے سلسلہ میں نجاشی حبشہ کے دربار میں اسلام پر بے نظیر تقریر فرمائی اور جس کا ذکر صفحاتِ گذشتہ میں ہو چکا ہے۔

ہجرتِ مدینہ کے اسباب ۱۱ سنہ نبوت موسمِ حج کے موقع پر الحراء اور منیٰ کے درمیان مقامِ عقبہ میں یثرب (مدینہ) کے چند لوگوں نے شب کی تنہائی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغامِ حق سنا اور اسلام قبول کر لیا۔ یہ چھ یا آٹھ اشخاص تھے۔ دوسرے سال چند سابق اشخاص اور بعض دوسرے حضرات نے جو تعداد میں بارہ تھے حاضرِ خدمت ہو کر اسلام پر تبادلۂ خیالات کیا اور مشرف باسلام ہو گئے، ان کے اسماءِ گرامی بروایتِ محمد بن اسحٰقؒ یہ ہیں: ابو امامہ، عوف بن الحارث، رافع بن مالک، قطبہ بن عامر، عقبہ بن عامر، معاذ بن حرث، ذکوان بن عبد قیس، خالد بن مخلد، عبادہ بن صامت، عباس بن عبادہ، ابو الہیثم، عدیم بن ساعدہ[2]۔

حضرت عبادہ بن صامت فرماتے ہیں کہ ہم نے عقبۂ اولیٰ میں حسبِ ذیل شرائط کے ساتھ اسلام پر بیعت کی تھی:-

(۱) خدائے واحد کے ماسوا کسی کی پرستش نہیں کریں گے۔

---

[1] مستدرک، حاکم جلد ۴ صفحہ ۴۰۔ [2] البدایہ والنہایہ جلد ۳ صفحہ ۱۴۹۔

(۲) چوری نہیں کریں گے۔

(۳) زنا نہیں کریں گے۔

(۴) اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گے۔

(۵) کسی پر جھوٹی تہمتیں نہیں لگائیں گے اور نہ کسی کی غیبت کریں گے۔

(۶) اور کسی بھی اچھی بات میں آپ کی (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی) نافرمانی نہیں کریں گے۔

بیعت کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، اگر تم نے ان شرائط کو پورا کیا تو تمہارے لیے جنت کی بشارت ہے اور اگر تم ان برائیوں میں سے کسی کے مرتکب ہوئے تو پھر تمہارا معاملہ خدا کے ہاتھ ہے چاہے بخش دے اور چاہے جرم پر سزا دے۔

اس واقعہ نے مدینہ کے ہر گھر میں اسلام کا چرچا کر دیا اور آہستہ آہستہ ہر ایک خاندان میں آفتاب اسلام کی ضیاء باری ہونے لگی اور نتیجہ یہ نکلا کہ اوس و خزرج کی تمام شاخوں میں سے ۱۳ سنہ نبوت کو تہتر مرد اور دو عورتیں، اسی مقام عقبہ پر موسم حج میں شب کی تاریکی کے اندر آفتاب نبوت کی درخشانی سے فیضیاب ہونے جا پہنچے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے چچا عباس (رضی اللہ عنہ) کو ہمراہ لے کر وہاں پہنچ گئے اور ان کے سامنے اسلام پر ایک مؤثر وعظ فرمایا جس سے ان کے قلوب نور ایمان سے جگمگا اُٹھے۔ اس کے بعد انصار اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اس امر پر گفتگو ہوئی کہ اگر ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں نزول اجلال فرمائیں تو اشاعت اسلام کو بھی بہت زیادہ فائدہ پہنچے اور ہم کو بھی فیضیاب ہونے کا بخوبی موقع میسر آئے اور اس سلسلہ میں جانبین سے محبت و مودت کے قول و قرار بھی ہوئے جن کی تفاصیل کتب سیر و تاریخ میں مذکور ہیں۔ ان ہی حضرات میں سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہ اشخاص کو منتخب فرما کر دعوت و تعلیم اسلام کے لیے اپنا نقیب مقرر فرمایا۔

یثرب (مدینہ) میں اسلام کی اشاعت نے جب اس طرح روز افزوں ترقی اختیار کر لی تو اب وحی الٰہی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی جاں نثاران اسلام کو اجازت دی کہ وہ

مشرکینِ مکہ کی ہولناک ایذا رسانی سے محفوظ ہو جانے کے لیے مدینہ ہجرت کر جائیں اور خدا کے لیے ترکِ وطن اختیار کریں، چنانچہ آہستہ آہستہ مسلمانوں نے مدینہ کو ہجرت شروع کر دی، مشرکینِ مکہ نے یہ دیکھ کر مسلمانوں کو ہجرت سے روکنے کے لیے مظالم میں اور اضافہ کر دیا اور انسدادِ ہجرت کے لیے ممکن ذرائع کو اختیار کیا مگر فدا کارانِ اسلام کا جذبۂ ہجرت فرو نہ ہوا بلکہ وہ کثرت کے ساتھ مال، جان، آبرو اور اولاد کی زندگی کو خطرہ میں ڈال کر اللہ کی راہ میں وطنِ عزیز کو خیرباد کہتے رہے اور اکثر ایسا ہوا کہ جب اہلِ مکہ نے ان کے اموال اور اہل و عیال کو ساتھ لے جانے سے روک دیا تو ان مردانِ خدا نے صبر آزما زندگی کے ساتھ ہجرتِ حق کی خاطر اُن کو بھی وہیں چھوڑا اور تنہا خدا کے بھروسہ پر مدینہ روانہ ہو گئے۔

ہجرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

اب مکہ میں مشاہیر مسلمانوں میں سے صرف ابوبکر اور علی (رضی اللہ عنہما) ہی باقی رہ گئے تھے[1] اور ایک قلیل تعداد باقی مسلمانوں کی تھی تب قریش نے سوچا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر کے اسلام کو مٹا دینے کا اس سے بہتر دوسرا کوئی موقع نہیں آئے گا۔

دارالندوہ

چنانچہ تمام سردارانِ قریش قصی بن کلاب کے قائم کردہ گورنمنٹ ہاؤس "دارالندوہ" میں جمع ہوئے اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل سے متعلق سازشی مجلسِ مشاورت قائم کی۔ اس مجلس میں عتبہ، شیبہ، ابوسفیان، طعیمہ بن عدی، جبیر بن مطعم، حارث بن عامر، نضر بن حارث، ابوالبختری، زمعہ بن اسود، حکیم بن حزام، ابوجہل، منبہ بن الحجاج، امیہ بن خلف جیسے صنادیدِ قریش شریکِ مشورہ تھے۔ مشورہ شروع ہونے والا ہی تھا کہ ایک شیطان "شیخ نجدی" دارالندوہ کے دروازہ پر آ موجود ہوا اور شرکتِ مجلس کا خواستگار بنا، قریشِ مکہ نے ہم مشرب پا کر بخوشی اجازت دی اور اب مشورہ شروع ہوا، مختلف اہل الرائے نے مختلف رائیں دیں لیکن شیخ نجدی نے ہر ایک رائے کو غلط قرار دیا آخر ایک شخص نے کہا: تمام قبائل میں سے ایک ایک جوان لیجیے اور اُن سے کہیے کہ وہ بیک وقت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر حملہ کر کے قتل کر دیں اس سے کام بھی بن جائے گا اور بنو عبدِ مناف کسی سے قصاص لینے کی

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۳ ص ۱۷۵۔

جرأت بھی نہ کرسکیں گے اور صرف خونبہا پر معاملہ طے ہوجائے گا۔ شیخ نجدی نے اس رائے کو بہت سراہا اور یہی رائے طے پاگئی۔ ادھر جبرئیل ؑ نے وحی الٰہی کے ذریعہ ذاتِ اقدس ؐ کے سامنے اس پوری داستان کو کہہ سنایا اور عرض کیا کہ خدا کی مرضی یہ ہے کہ آپ آج کی شب اپنے بستر پر حضرتِ علی رضی اللہ عنہ کو سُلا کر خود مدینہ کو ہجرت کر جائیے، چنانچہ وحی الٰہی کے مطابق آپ قریش کے نوجوانوں کی حراست کے باوجود سورۂ یٰسین کی چند آیات فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ " پڑھتے ہوئے اور "شاهت الوجوه " فرما کر مٹھی بھر خاک اُن کے سروں پر ڈالتے ہوئے صاف بچ کر نکل گئے اور حضرتِ ابوبکر ؓ کے مکان پر جاکر اور وحی الٰہی کا مژدۂ رفاقت سُنا کر اُن کو ہمراہ لیے مدینہ کو روانہ ہوگئے۔

ہجرت کا یہ واقعہ ربیع الاول سنہ ۱۳ نبوت دوشنبہ کے روز پیش آیا، یہ واقعہ اپنے خصوصی حالات اور معجزانہ اثرات کے ساتھ بہت مشہور اور صحیح احادیث و روایات میں مذکور ہے اور صدیقِ اکبر (رضی اللہ عنہ) کی سفرِ ہجرت میں رفاقت کی عظمت و جلالت کیلیے رہتی دنیا تک قرآن عزیز اس طرح ناطق ہے :-

ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ — دُوسرا تھا دو کا جبکہ وہ دونوں غار میں تھے کہ یہ اپنے رفیق (ابوبکر) سے کہہ رہا تھا، ابوبکر غم نہ کھا بلاشبہ خدا ہمارے ساتھ ہے[1]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے "لاتحزن" فرمایا "لاتخف" نہیں فرمایا۔ یہ اس لیے کہ "خوف" اور "حزن" کے لغوی فروق میں سے ایک دقیق فرق یہ بھی ہے کہ عموماً "خوف" اپنی مضرت کے سلسلہ میں ہوا کرتا ہے، بخلاف "حزن" کے کہ وہ اُس رنج کو کہتے ہیں جو اکثر دوسرے کی مصیبت کی وجہ سے خود کو پیش آتا ہے۔ گویا قرآن عزیز بنصِ صریح ناطق ہے اس حقیقت کے لیے کہ ابوبکر ؓ کو اپنی جان اور اپنی ذات کا خوف نہیں تھا، بلکہ ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی گرفتاری اور مشرکین کے ہاتھوں ظلم رسانی کا حزن و ملال جانکاہی پر آمادہ کیے ہوئے تھا، پس حضورِ قدسی صفات نے ابوبکر ؓ کی اس حالت کا

[1] (پ ۱۰ ۔ ع ۱۱)

اندازہ لگایا تو لا تخف کی جگہ لا تحزن ارشاد فرمایا اور ساتھ ہی "اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا" فرما کر ابوبکرؓ کی رفاقت کی مقبولیت پر بھی مہرِ تصدیق ثبت فرما دی۔ دنیا اپنے بغض و عناد اور زندقہ و الحاد سے جو چاہے کہے لیکن رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکرؓ کی معیتِ حقہ کے لیے قرآن کے جملہ "اللہ معنا" کی ناطقیت کے بقاء و دوام کو ساری کائنات بھی مل کر مٹانا چاہے تو نہیں مٹا سکتی۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔

قرآن عزیز اور ہجرتِ مدینہ

واقعہ معراج میں گذر چکا ہے کہ درحقیقت اسراء تمہید تھی ہجرت کے عظیم الشان واقعہ کی یعنی واقعہ اسراء کے عجائبات اس امر کی تمہید تھے کہ اب آپؐ کی تبلیغی زندگی کا دور ایک دوسرا رُخ اختیار کرنے والا ہے جو کامرانیوں اور کامیابیوں سے بھرپور ہے اس لیے ازبس ضروری ہے کہ پہلے آپ کو قبلتین اور ملاء اعلیٰ کے اسرار و غوامض سے آگاہ کر دیا جائے تاکہ مکی زندگی جب مدنی حیات میں منقلب ہو تو اس سے قبل نبوت و رسالت کے کمالات غایتِ قصویٰ تک پہنچ چکے ہوں اور آپ کا منصبِ ہدایت اس مقامِ رفیع تک جا پہنچا ہو، جہاں خدا کی بلند سے بلند ترین مخلوق کا بھی گذر نہ ہوا ہو تاکہ آپ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا کے شرف کو حاصل کر سکیں۔

پس سورۂ بنی اسرائیل از ابتداء تا انتہاء ہجرتِ مدینہ کے ہی اسرار و لطائف سے معمور ہے، چنانچہ ابتدائی آیات میں اسراء کا بیان ہے اور پھر ذکر آ گیا ہے رشد و ہدایت کے اصول کا اور درمیان میں امم سابقہ اور ان کے ہُداۃ انبیاء و رسل کے واقعاتِ تبلیغی کا تذکرہ شواہد و نظائر بن کر سامنے آ جاتا ہے اور اس ضمن میں معراج کے حکم و اسرار کا بھی ذکر ہوتا جاتا ہے اور اس کے بعد "ربِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ" (الآیۃ) سے مکہ سے خروج اور مدینہ کی ہجرت کا ذکر شروع ہو جاتا ہے اور یہ ذکر آخر سورۃ تک جاری رہتا ہے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) اور حضرت قتادہ (رحمۃ اللہ علیہ) نے مسطورۂ ذیل

ہر دو آیات کے سلسلۂ مضامین کو ہجرتِ مدینہ سے ہی وابستہ قرار دیا ہے :۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ	اور قریب تھا کہ وہ (مشرکین) البتہ تجھ کو عاجز کر دیتے
الْاَرْضِ لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا	سرزمین (مکہ) سے تاکہ تجھ کو اس سے نکال دیں اور ایسی حالت
يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝	میں ان کی ہلاکت بہت قلیل عرصہ میں سامنے آجاتی۔

یہ مشرکین کے حق میں سخت قسم کی تہدید و تخویف ہے کہ جب بھی تمہارے مظالم کی بدولت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرتِ مدینہ پیش آئے گی تمہاری اجتماعی زندگی کی ہلاکت قریب سے قریب تر ہو جائے گی، گویا ہجرتِ مدینہ، اسلام کی روز افزوں ترقی اور معاندینِ اسلام کی موت۔ ہلاکت کے لیے تقدیرِ مبرم ہے۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ	اور کہیے! اے میرے پروردگار مجھ کو داخل کر (مدینہ)
وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ	میں اچھا داخلہ اور نکال مجھ کو (مکہ) سے عزت کے ساتھ
لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ۝[1]	اور میرے لیے اپنی جانب سے زبردست نصرت و مدد عطا کر۔

اسی طرح سورۂ انفال میں بعض واقعات کے ضمن میں ہجرتِ مدینہ کا تذکرہ موجود ہے :۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	اور (وہ وقت قابلِ ذکر ہے) جب منکرین تیرے خلاف
لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ	سازش کر رہے تھے تاکہ تجھ کو قید کر لیں یا مار ڈالیں یا (مکہ
يُخْرِجُوْكَ ۭ وَيَمْكُرُوْنَ وَ	سے) نکال دیں اور وہ اپنی سازشوں میں لگے ہوئے تھے
يَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ	خدا (اس کے خلاف تدبیر کر چکا تھا اور اللہ تدبیر کرنے
الْمٰكِرِيْنَ ۝ (پ ۹ - ع ۱۸)	والوں میں سب سے بہتر مدبر ہے۔

اور اسی طرح سورۂ توبہ میں صدیقِ اکبر (رضی اللہ عنہ) کی عظمت و جلالتِ قدر کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ ہجرتِ مدینہ کا ذکر اس طرح موجود ہے :۔

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ	اگر تم اللہ کے رسول کی مدد نہیں کرو گے تو (نہ کرو) اس کی
اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	اللہ تعالیٰ نے اس وقت مدد فرمائی جب اس کو منکرین نے

[1] (اسریٰ - ع ۹) ، [2] (پ ۱۰ - ع ۱۱)

ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِى الْغَارِ	(مکہ سے) نکالا جبکہ وہ دو نوں (محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور
اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ	ابوبکرؓ) غار میں (حرا میں روپوش) تھے جب وہ (رسول،
اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ	اپنے رفیق (ابوبکرؓ سے) کہہ رہا تھا، تو غم نہ کھا بلاشبہ
سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ	اللہ ہمارے ساتھ ہے، پس اللہ نے اس پر اپنا سکینہ
بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ	(طمانینت) اتارا اور اس کو ایسے لشکر کے ذریعہ قوت
كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى	پہنچائی کہ تم اس کو نہیں دیکھ رہے تھے اور (اس طرح)
وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِىَ الْعُلْيَا وَاللّٰهُ	خدا نے کافروں کا کلمہ پست کر دیا اور اللہ کا کلمہ ہی سب
عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (پ ۱۰ - ع ۱۱)	بلند ہے اور بلاشبہ اللہ غالب ہے حکمت والا ہے۔

ہجرت: اسلام میں "ہجرت" ایک اہم فریضہ ہے، کون نہیں جانتا کہ انسان کے لیے وطن، مال اور اہل و عیال کس درجہ عزیز ہوتے ہیں اور وہ ان ہی متاعِ گرانمایہ پر اپنی دنیوی عیش و راحت اور بقاءِ حیات کا مدار سمجھتا ہے لیکن اس کی انسانیت اور انسانیت کا ارتقا ان تمام مقاصدِ حیات سے بھی ایک بلند اور رفیع مقصدِ زندگی کا طالب ہے اور وہ خالقِ کائنات اور رب العالمین کی معرفت ہے جس کی ربوبیت نے اس کو یہ جامۂ ہستی عطا کیا، اسی معرفت کا نام "دین" اور "ملت" ہے۔ انسان جب اس مقصدِ حقیقی کو پا لیتا ہے تو پھر اس کی نگاہ میں اس درجہ وسعت اور رفعت پیدا ہو جاتی ہے کہ دنیا کی ان تمام رنگینیوں اور نیرنگیوں کا دامن وسیع بھی اس کو تنگ نظر آتا اور وہ اس تنگ دامنی سے عاجز ہو کر آخرکار "حیاتِ روحانی" کی آغوش میں ہی تسکین پاتا ہے اور جب اس مرحلہ پر پہنچ جاتا ہے تو پھر اس حیاتِ باقی دینِ حق کی خاطر وہ دنیا کی تمام متاعِ گرانمایہ تن، من، دھن، حتیٰ کہ اہل و عیال کو بھی تج دیتا ہے اور اس دُرِ بے بہا کو آنچ تک نہیں آنے دیتا جس کا نام "ایمان" ہے۔ اسی حقیقتِ حال کو اسلام کی مقدس اصطلاح میں "ہجرت" کہا جاتا ہے۔

اسی بنا پر "ہجرت" ایک صادق الایمان اور مخلص مسلمان کے اور منافق اور کافر ہستی کے

درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لیے بہترین "کسوٹی" اور "معیار" ہے، نیز فضاء روحانی کا ٹمپریچر معلوم کرنے کے لیے "جہاد" اور "ہجرت" ہی ایسے دو "مقیاس الحرارت" ہیں جن سے مومنوں کے ایمان کی حرارت کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔

قرآن عزیز نے "ہجرت" کی اہمیت پر جگہ جگہ توجہ دلائی ہے اور اس کو ایمان و اسلام کی کسوٹی قرار دیا ہے جس کے لیے یہ مقامات خصوصیت کے ساتھ قابل مطالعہ ہیں:

(۲۱۸/۲، ۱۹۴/۳، ۷۴/۸، ۲۰/۹، ۱۱۱/۱۶، ۵۸/۲۲، ۱۰۰/۴، ۴۱/۱۶، ۹۷/۴،)

ابتداء اسلام میں مکہ دارالکفر اور دارالحرب تھا، اس لیے وہاں سے مدینہ کو ہجرت کر جانا اسلام کے اہم ترین فرائض میں سے تھا تاکہ مسلمان مدینہ میں امن و عافیت کے ساتھ احکام اسلام کی پیروی کر سکیں اور نہ صرف اسی قدر بلکہ اسلام کے مقصدِ عظمیٰ "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" کی یا دوسرے الفاظ میں اعلاء کلمۃ اللہ کی صحیح خدمت انجام دے سکیں مگر جب ۸ھ ہجری میں فتح مبین نے مکہ کی اس حالت کو بدل کر دارالاسلام بنا دیا تو اب ہجرت کا یہ خاص فرض ختم ہو گیا اور زبانِ وحی ترجمان نے لا ہجرۃ بعد الفتح[1] فرما کر اس حقیقت کا اعلان کر دیا، البتہ اب بھی مرکزِ توحید کے ساتھ والہانہ عشق و محبت کے جذبہ میں مکہ اور مدینہ ہجرت کر کے جانا اجر و ثواب کا ضرور استحقاق پیدا کرتا ہے۔

اور اگر کسی مقام اور کسی ملک میں بھی مسلمانوں کے لیے حیاتِ ایمانی کے پیش نظر وہی صورتِ حال پیدا ہو جائے جو اسلام کے ابتدائی دور (مکی دور) میں تھی تو اس وقت مسلمانوں کے لیے وہی احکام عائد ہو جائیں گے جو مکی دور کے متعلق قرآن و حدیث اور ان سے مستنبط "فقہ اسلامی" میں پائے جاتے ہیں اور اصولی طور پر اس وقت صرف دو ہی اسلامی مطالبے سامنے آ جائیں گے یا "جہاد فی سبیل اللہ"[2] کے ذریعہ اس حالت کا انقلاب "

---

[1] فتح مکہ کے بعد مدینہ کی ہجرت فرض نہیں رہی۔

[2] البتہ جہاد فی سبیل اللہ کے طرق و اسباب پر وقت کے تقاضے کے پیش نظر ہی عمل واجب ہوگا۔

اور یا پھر ہجرت" اور کسی طرح بھی یہ جائز نہیں ہوگا کہ حالتِ راہنہ (موجودہ حالت) پر قناعت کرکے مطمئن زندگی بسر کی جائے۔

مکہ جب دارالکفر اور دارالحرب تھا تو اس وقت ہجرتِ مدینہ کو اسلام نے کس درجہ اہمیت دی اور اس مقصدِ رفیع کے لیے مسلمانوں سے کس درجہ قربانی اور ایثارِ نفس کا مطالبہ کیا۔ آیاتِ ذیل سے اِس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے:

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا	جن لوگوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے
مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ	نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور میری
وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ	راہ میں لڑے اور مارے گئے میں ضرور اُن کے
سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ	گناہ ان سے دور کر دوں گا اور ان کو ایسی جنتوں میں
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا	داخل کروں گا جن کے (درختوں کے) نیچے نہریں
مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ	جاری ہیں، یہ بدلہ ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ
حُسْنُ الثَّوَابِ ۝ (آلِ عمران پ ع)	کے پاس اچھا بدلہ ہے۔
اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا	جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ	اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے
اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ	جہاد کیا اللہ کے نزدیک بہت بلند رتبے والے ہیں
هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (انفال پ ع)	اور وہی کامیاب ہیں۔
اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ	بیشک جن کو فرشتوں نے ایسی حالت میں موت سے
ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ	دوچار کیا کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے ان سے
كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ	(فرشتوں نے) پوچھا کہ تم کس حالت میں تھے انھوں
فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ	نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور تھے، فرشتوں نے
اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا	کہا کیا اللہ کی زمین وسیع نہیں تھی کہ تم اس میں ہجرت

فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ	کرجاتے سو یہی ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ
مَصِيْرًا۝ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ	بہت بُری جگہ ہے، مگر وہ کمزور مرد اور عورتیں
الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا	اور بچے جو ہجرت کے لیے کوئی حیلہ نہیں کر سکتے
يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ	اور نہ (ہجرت کے لیے) راہ پاتے ہیں تو یہ وہ ہیں
سَبِيْلًا۝ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ	کہ امید ہے اللہ تعالیٰ اُن کو معاف کرے اور اللہ
عَنْهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا۝[1]	بے شبہ معاف کرنے والا بخشنے والا ہے

ختمِ نبوت نبوت و رسالت کا یہ سلسلہ جو حضرتِ آدم (علیہ السلام) سے شروع ہو کر حضرت عیسٰی (علیہ السلام) تک پہنچا تھا رشد و ہدایت کے اسلوب و نہج کے لحاظ سے اس معنی میں یکسانیت رکھتا ہے کہ اس تمام سلسلہ میں نبوت و رسالت جغرافیائی حدود میں محدود رہی ہے اور اس لیے مختلف زبانوں میں ایک ہی وقت میں متعدد انبیاء علیہم السلام کی بعثت فرائضِ رسالت ادا کرتی رہی ہے۔ حتیٰ کہ حضرتِ عیسٰی (علیہ السلام) کے پیغامِ حق نے اگرچہ ایک گونہ وسعت اختیار کی اور بنی اسرائیل کی گم کردہ راہ بھیڑوں کے علاوہ بھی بعض حلقۂ انسانی اس دعوت کی مخاطب بنی تاہم انھوں نے عالمگیر دعوت و پیغام کا دعویٰ نہیں کیا اور انجیل شاہد ہے کہ خود ذاتِ قدسی نے بصراحت کہدیا کہ ان کی بعثت کا تخاطب محدود ہے۔

لیکن یہ سلسلہ آخر کب تک اسی طرح محدود رہ سکتا تھا اور جو حلقۂ دعوت و ارشاد آہستہ آہستہ ترقی پذیر اور وسعت گیر ہوتا جا رہا تھا وہ قانونِ قدرت کے عام اصول کے خلاف کس طرح ہمیشہ کے لیے محصور رہ سکتا تھا۔

البتہ انتظار تھا تو اس کا کہ وہ وقت قریب آ جائے جبکہ دنیا کی وسیع پہنائیوں اور عالمگیر وسعتوں کے درمیان ایسی ہم آہنگی پیدا ہو جائے کہ نہ ایک کے مفاد و مضار دوسرے حصوں سے اوجھل ہو سکیں اور نہ بیگانہ و بے تعلق رہ سکیں بلکہ خدا کی یہ وسیع کائنات

[1] (پ۔ ع)

مادی اسباب کی ہمہ گیری کی بدولت ایک "کنبہ" بن جائے اور انسان کبیر (عالم) کے تمام جوارح (ممالک و امصار) ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ ہو جائیں کہ ایک کا نفع و ضرر دوسروں کے نفع و ضرر پر اثر انداز ہونے لگے۔ بلکہ قانونِ فطرت اپنا مظاہرہ کرے اور مادی دنیا کی ہمہ گیر ہم آہنگی کے رونما ہونے سے قبل روحانی پیغام سعادت کو عالمگیر وسعت اور ہمہ گیر عظمت عطا فرمائے۔ چنانچہ عالم اسباب میں فطرت کے عام قانون کی طرح رشد و ہدایت کا جو آغاز پہلے انسان کے ذریعہ ہوا تھا اس کا انجام اُس مقدس ہستی تک پہنچ کر کامل و مکمل ہو گیا جس کا نام محمد اور احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا:

مسئلہ کے اس پہلو کی تعبیر یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ اس عالم رنگ و بو میں دو زندگیاں توام اور ہم رشتہ نظر آتی ہیں، ایک مادی اور دوسری روحانی اور خدائے برتر کی ربوبیت کاملہ نے عالم کی ان ہر دو حیات کی رہ گذر کے لیے روشنی کا بھی انتظام کیا ہے تاکہ ان پر عمل پیرا ہو کر زندگی کی ٹھوکروں، لغزشوں اور تاریک راہوں سے محفوظ رہا جا سکے، چنانچہ اسی مقصد کے لیے اس نے مادی دُنیا کے لیے آگ کا درخت لگایا: اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَا اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِئُوْنَ ۔ چقماق میں آگ پیدا کی اور تیل کو ذریعہ بنا کر دیے کو روشنی بخشی: يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ۔ غرض اس روشنی کو آغاز بھی بخشا اور انجام بھی اور فطری اور مصنوعی دونوں طریقوں سے اس کی ابتداء کو انتہاء تک پہنچا کر کامل و مکمل کر دیا کہ اس کے بعد نہ روشنی کی طلب باقی رہے نہ انتظار۔

غرض جو روشنی صنعت کے ہاتھوں دیے کی شکل میں نمود پذیر ہوئی اور شمع کافوری لالٹین روشن گیس اور بجلی کے قمقموں کی شکل میں ترقی کرتی رہی اور جو روشنی براہِ راست فطرت کے ہاتھوں چھوٹے سے ستارہ کی صورت میں چمکی اور بڑے بڑے روشن ستاروں اور بدر و قمر کی شکل میں رو بہ ترقی نظر آتی رہی وہ آخر کار ایک ایسی روشنی پر جا کر رُک گئی جس کے

بعد کسی روشنی کی ضرورت ہی باقی نہ رہی اور طلب و انتظار کی تمام فرصتیں اس روشنی پر جا کر ختم ہو گئیں، دنیا نے جس کو آفتاب کہہ کر پکارا۔

اسی طرح اس کی رحمتِ عام اور ربوبیتِ کامل نے روحانی روشنی کا آغاز پہلے انسان حضرت آدم (علیہ السلام) کے ذریعہ کیا اور مادی دنیا کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ اس کو نوح، ہود، صالح، ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، موسیٰ، عیسیٰ (علیہم السلام) جیسے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ روحانی ستارے اور قمر و بدر بنا کر وسعت عطا فرمائی اور آہستہ آہستہ ترقی دیکر اس درجہ پر پہنچا دیا کہ مناسب وقت آنے پر وہ روشنی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیغامِ رشد و ہدایت کی شکل میں آفتابِ روحانیت بن کر سارے عالم پر چھا گئی۔

یہی وجہ ہے کہ اگر قرآن عزیز نے سورۂ قمر میں مادی آفتاب کے لیے "سراج" کی تشبیہ دے کر اس کی عالمگیر درخشانی کا ذکر فرمایا تو سورۂ احزاب میں روحانی آفتاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو "سراجاً منیراً" کہہ کر دونوں آفتاب ہائے درخشاں کی ہم آہنگی کا اعلان فرمایا اور مادی و روحانی ہر دو آفتابِ عالمتاب کو سراج (چراغ) سے تشبیہ دے کر ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ گو یہ روشنیاں اپنی ہمہ گیر وسعت کے لحاظ سے آفتاب کہلانے کی مستحق ہیں تاہم یہ بات کسی طرح فراموش نہیں ہونی چاہیے کہ یہ انجام اصل کے اعتبار سے اسی آغاز کا کامل و مکمل نمونہ ہے جس کی ابتدائی نمود روحانی اور مادی دیے (سراج) سے ہوئی اور روحانی وسعت و عظمت کے لحاظ سے بعض کو بعض پر اور ایک کو سب پر فضیلت و برتری حاصل ہوئی مگر اصل اور بنیاد کے پیشِ نظر سب کی نہاد ایک ہی روشنی "وحی الٰہی" سے وابستہ و پیوستہ ہے۔

الانبیاء اخوۃ من علات امہاتھم شتی و دینھم واحد

ان ہر دو حقائق کے پیشِ نظر لانے کے بعد یہ حقیقت بھی لائقِ توجہ ہے کہ فطرت ہم کو روز و شب یہ تماشا دکھلا رہی ہے کہ اس کارزارِ حیات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ زیر و بم،

نشیب و فراز، عروج و زوال اور زوال و کمال کے دائرہ میں محدود و محصور ہے یعنی جب کسی امر کے متعلق کہا جائے کہ یہ عروج و کمال کو پہنچ رہا ہے تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اب سے قبل اس میں جو کمی تھی وہ پوری ہو رہی ہے اور اسی طرح جب یہ سُنا جاتا ہے کہ فلاں شے ابھی ابتدائی درجہ میں ہے تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اس کو ابھی بحدِ کمال پہنچنا ہے۔

غرض آغاز اور انجام، ابتدا اور انتہا ان ہی دو نقطوں سے کارزارِ ہستی کا دائرہ بنتا ہے اور یہی دونوں زوال و عروج، نقص و کمال اور نشیب و فراز کی پرکار بناتے ہیں۔ پس آدم علیہ السلام نبوت کا آغاز تھے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کا آخری انجام۔

پس جو شخص بھی دلیل یا وجدان کی ہدایت سے یہ تسلیم کرتا ہے کہ کائناتِ ہست و بود سب کچھ اسی کی مخلوق ہے تو گویا وہ یہ تسلیم کر لیتا ہے کہ یہ سب نہ ازلی ہیں نہ ابدی بلکہ اُن کیلئے آغاز بھی ہے اور انجام بھی، اور اس لیے انسانی تخلیق نے کوئی بھی روپ اختیار کیا ہو بہرحال پہلا انسان اپنے ساتھ ہی مادی و روحانی ہدایت لے کر آیا ہے اور یہی وہ آغاز تھا جس کو ادیانِ سماوی نے نبوتِ آدم کے نام سے یاد کیا ہے اور جس کا سلسلہ برابر اس دنیا میں قائم رہا تاآنکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ظہور ہوا اور ذاتِ قدسی صفات نے بعثتِ عام کا اعلان فرمایا۔

تو اب اس روحانی رشد و ہدایت یا پیغامِ الٰہی کے نشو و ارتقاء کے لیے اگر ذاتِ اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ختمِ نبوت کو وابستہ نہ سمجھا جائے تب تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت ہی وقوع پذیر تسلیم کی جا سکتی ہے۔ ایک یہ کہ سلسلۂ نبوت و رسالت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم نہیں ہوا بلکہ اس سے آگے ترقی و تکمیل کی راہ پر گامزن ہے یہاں تک کہ اس حدِ کمال تک پہنچ جائے جس کے بعد کسی تکمیل کی حاجت باقی نہ رہے، دوسری صورت یہ کہ اس سلسلہ کے آغاز نے جو ترقی کی راہ اختیار کی ہے وہ تنزل کی جانب مائل ہو جائے اور یہ پیغام کسی طرح بھی شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکے۔ تیسری شکل یہ ہے کہ جو سلسلہ ایک خاص حیثیت میں رو بہ ترقی ہے وہ جب حدِ تکمیل کو پہنچ جائے تو پھر کمال صورتِ زوال اختیار کر لے یا یوں

کہہ دیجیے کہ حدِکمال آغاز کی جانب لوٹ جائے اور تحصیلِ حاصل کا نمونہ پیش کر دے۔
لیکن آخری دو شکلیں غیر معقول بلکہ فطری تقاضہ کے خلاف ہیں، پہلی صورت تو اس لیے
کہ اس سے خدائے تعالیٰ کی ربوبیتِ کاملہ اور صفتِ رحمت و قدرت کا نقص لازم آتا ہے کہ
جس مقصد سے اُس نے ایک آغاز کیا تھا اسی مرضی و مشیت کے باوجود اس کو درجۂ تکمیل
نہ دے سکا۔ تَعَالَى اللّٰهُ عُلُوًّا كَبِيرًا۔
اور اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو گویا یہ مان لینا ہوگا کہ کائناتِ ہست و بود میں نقص،
نشیب، زوال اور ابتدائے علاوہ کمال، فراز، عروج اور انتہاء کا وجود ہی نہیں ہے
گویا دوکانِ فطرت میں عیب کے سوا ہُنر کا کوئی سودا موجود ہی نہیں۔ اسی طرح دوسری
شکل، اس لیے جب کہ تکمیل ایسی حقیقت کا نام ہے جس کے بعد اس سلسلہ کی نہ ضرورت
باقی رہے نہ طلب تو پھر رشد و ہدایت اور پیغامِ حق جیسی روشن شے کے پایۂ تکمیل تک
پہنچ جانے کے بعد اس کو ابتداء سے پھر دُہرانا بے معنی بات ہے۔ اور تحصیل حاصل
نہ عقل کا کام ہے نہ حکمت و دانائی کا چہ جائے کہ ایسے فعل کی نسبت اس ذات کی
جانب ہو جس کے لیے کہا گیا ہے: اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔
پس اگر مؤخر الذکر دونوں صورتیں غیر معقول اور ناقابلِ توجہ ہیں تو اب پہلی شکل ہی لائقِ غور
رہ جاتی ہے مگر جب اس کی تحلیل کی جائے تو یہ سوال خود بخود سامنے آجاتا ہے کہ جب کہ
تاریخ ادیان و ملل نے بلکہ واقعات و حقائق نے یہ ثابت کر دیا اور روشن دلائل و براہین سے
ثابت کر دیا کہ قرآنِ عزیز ایک ایسا روحانی قانون، دستور، آئین اور پیغامِ رشد و ہدایت ہے
جس کی نظیر پیش کرنے سے تمام سابقہ ادیان اور موجودہ مدعیانِ وحی و الہام عاجز و درماندہ
رہے ہیں اور ہیں تو پھر علم و عقل اور حکمت و دانش کا وہ کون سا تقاضا ہے جس کے پیشِ نظر
اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ کا انکار کیا جا سکے اور جو تکمیل کہ
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہو چکی اس کو جھٹلا کر اور تاریخ ادیان کی صاف اور صادق شہادت

کا منتظر بن کر اس سلسلہ کی آخری کڑی "نبیِ منتظر" کے لیے چشم براہ ہوا جاسکے۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآنِ عزیز نے "وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ" کہہ کر روشن کیا ہے اور جس کی شہادت خود ذاتِ قدسی صفات نے یہ کہہ کر دی ہے:

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	میری اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی شان اس شخص
مثلی ومثل النبیین کمثل رجل بنیٰ	کی طرح ہے جس نے مکان بنایا اور اس کو مکمل کر دیا مگر ایک
داراً فاتمھا الا لبنۃ واحدۃ فجئت	اینٹ کی جگہ چھوڑ دی پس میں قصرِ نبوت کی وہی اینٹ ہوں
انا فاتممت تلک اللبنۃ (مسلم)	جس نے آکر اس قصر کی تکمیل کر دی۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس بات کو مان لینے میں کیا حرج ہے کہ قصرِ نبوت کی تکمیل آپؐ ہی کی ذات سے ہوئی لیکن پھر آپؐ کے کمالِ نبوت کے مختلف اطوار و احوال میں سے یہ امتیازی شان بھی منصۂ شہود پر آئی کہ جو شخص بھی جدید نبی یا رسول بنے اس کا انتساب آپؐ ہی کے فیضِ نبوت کے ساتھ وابستہ ہو یعنی آئندہ بھی نبی اور رسول آتے رہیں مگر وہ مستقل نہ ہوں بلکہ آپؐ کے ماتحت اور قرآن ہی کے زیرِ نگیں ہوں لیکن یہ کہنا اس لیے صحیح نہیں ہے کہ جو بات بھی گئی اس کو خواہ کسی خوبصورت سے خوبصورت عنوان سے کہیے سب کا حاصل یہی نکلتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے بعد بھی نبی اور رسول کی احتیاج باقی ہے اور اس کے بغیر دینِ الٰہی اور پیغامِ ربانی تشنۂ تکمیل ہے ورنہ تو تکمیلِ نبوت کے بعد نبی اور رسول کی جگہ خاتم النبیین کے صرف نائب اور جانشین ہونے چاہئیں تاکہ اُن کے ذریعہ پیغامِ کامل اور ہدایتِ تام کی یاد دہانی ہوتی رہے اور یہی وہ نیابت و وراثت ہے جس کا حق خدمت علماءِ اُمّت "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" اور "العلماء ورثۃ الانبیاء" کے مصداق بن کر ادا کرتے چلے آئے ہیں اور تاقیامِ حشر کرتے رہیں گے۔

اِس اہم مسئلہ کی وضاحت یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ کتابِ کائنات کے وہ صفحات جن پر مذاہب و ملل کی تاریخ ثبت ہے شاہد ہیں کہ اقطاعِ عالم کے درمیان رسل و رسائل

اور دیگر وسائل کے مفقود ہونے کی وجہ سے جبکہ فطرت نے رشد وہدایت کے پیغام کو عرصۂ مدید تک جغرافیائی حدود میں محدود رکھا اور اس لیے ایک ہی دور میں متعدد مقامات پر متعدد انبیاء ورسل کا ظہور ہوتا رہا اور پھر جب کائنات پر وہ زمانہ پرتو ڈالنے لگا جس کے قریبی عرصہ میں ساری کائنات کے باہم روابط نے ہم آہنگی اور تعارف کی بنیاد ڈال دی اور فطری تقاضہ کی بنا پر روحانی پیغام نے بھی بعثتِ خاص کی جگہ بعثتِ عام کی شکل اختیار کرلی اور ایک ایسا پیغام آگیا جو تمام عالم کے لیے یکساں طور پر بیک وقت رشد وہدایت کا آفتاب بن کر درخشاں ہے تو اس کے بعد یا تو یہ ہونا چاہیے کہ وہی پیغام رہتی دنیا تک کے لیے رشد وہدایت کا پیغام بنے اور جس پیغمبر کی معرفت وہ پیغام آیا ہے اس کی ذاتِ اقدس کو اس پیغام کا مکمل ومتمم مان کر خاتم الانبیاء والرسل تسلیم کیا جائے۔ ورنہ غور کیا جائے کہ محدود پیغام ودعوتِ حق کے بعد جب بعثتِ عام نے ساری کائنات کی راہنمائی کا فرض انجام دیدیا تو اس کے بعد ضرورت وطلب کا کون سا عنوان باقی رہا جس کی تکمیل کے لیے اس سلسلہ کو پھر بھی جاری رکھا جائے اور یا بعثتِ خاص کو دہرایا جائے جس کا حاصل عروج سے انحطاط کی شکل میں ظاہر ہو اور یا بعثتِ عام کی تحصیلِ حاصل کی غیر معقولیت، معقولیت کی شکل اختیار کرے اور آیت "وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ" کی بشارت کو بے حقیقت بنا دیا جائے۔

ذاتِ اقدس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ عام کے بعد ایسی حیثیت سے اس سلسلہ کا اجراء تحصیل حاصل اور غیر معقول اس لیے ہے کہ فطرت کے مادی اور روحانی تقاضہ کے خلاف اگر قدرتِ حق کو یہ منظور تھا کہ پیغام ودعوت اور نظام رشد وہدایت تدریجی طور پر ترقی پذیر نہ ہو اور مادی دنیا کے محدود حالات سے بے نیاز ہو کر انجام پائے تو بلاشبہ آغاز ہی میں وحیِ الٰہی "بعثتِ عام" کی شکل اختیار کرتی اور پھر رہتی دنیا تک وہی بروئے کار ہوتی اور یا اس کا سلسلہ کسی تکمیل کا محتاج نہ ہو کر رہتی دنیا تک تجدید کی شکل میں جاری رہتا۔

مگر واقعات اور مشاہدات اس کے خلاف ہیں اور اوّل محدود پیغامات کا سلسلہ اور ان کے درمیان ترقی پذیر وسعت کا دائرہ اور پھر دعوتِ عام کی شکل میں اس ترقی کی انتہار یہ پوری تدریجی کیفیت صاف بتلا رہی ہے کہ فطرتِ الٰہی نے فیصلہ کر لیا ہے کہ دوسرے امور کی طرح رُشد و ہدایتِ الٰہی کا یہ پیغام بھی آغاز کی نمود کے ساتھ آہستہ آہستہ ترقی پذیر اور وسعت گیر ہوتا رہے تا آنکہ وہ وقت آجائے کہ یہ وسعت عالمگیر دعوت بن کر پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے اور یہ سلسلہ اس حد پر پہنچ کر ختم ہو جائے اور آئندہ نبی و رسول کی جگہ نائبینِ رسول "علماء" تا قیامِ ساعت اس مکمل قانونِ دعوت کی روشنی میں تبلیغِ حق کا فرض انجام دیتے رہیں تاکہ ایک جانب "وحدتِ اُمت" کا وہ نظام جو بعثتِ عام اور دعوتِ عام سے وابستہ ہو چکا ہے پارہ پارہ نہ ہو سکے اور دوسری جانب حیاتِ عالم کے ساتھ ساتھ اس پیغامِ حق کا فرض بھی مسلسل ادا ہوتا رہے اور اس طرح خدائے برتر کا یہ اعلان: تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا جدید نبیِ منتظر اور رسولِ مطلوب کے نظریہ کی شکل میں بے روح ہو کر نہ رہ جائے۔

سطورِ بالا میں انبیاء علیہم السلام کے پیغامِ حق کی وحدت کا تذکرہ آچکا ہے، مسئلۂ ختمِ نبوت کے ساتھ اس کا بہت گہرا تعلق ہے اور اس سلسلہ کی دلیلِ روشن کے لیے تمہید و توطیہ بننے کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب ہم اس خاکدانِ ہستی پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے کہ ہر کثرت کے لیے کوئی نقطۂ وحدت ضرور ہے چنانچہ افراد کے لیے نوع، انواع کے لیے جنس، اجناس کے لیے جوہر، جواہر کے لیے وجود اور وجودات کے لیے وجودِ بحت (خالص) محور و مرکز ہے۔ اسی طرح اجسام کے لیے سطح، سطحات کے لیے خط اور خطوط کے لیے نقطہ مرکز و مدار ہے، نیز اعداد خواہ اپنی کثرت میں کسی حد تک کیوں نہ پہنچ جائیں ان کا محور و مرکز ہر حالت میں "اکائی" ہے۔

غرض جب بھی کسی کثرت کا تصور کیجیے اس کے ساتھ وحدت کا تصور لازم و ضروری ہے اور اگر وحدت کو پیشِ نظر لائیے تو وہ کسی نہ کسی کثرت کے لیے محور و مرکز ہونے کا ضرور پتہ دیتی ہے، پس وحدت و کثرت کا یہی رابطہ ہے جس نے حدودِ عدم سے گذر کر ہست کے ساتھ تعلق پیدا کیا۔ اور اس کو عالمِ ہست و بود کا نام دیا۔

تو اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھ کر جب ہم سلسلۂ نبوت و رسالت پر نظر ڈالتے ہیں اور سبع سماوات کی طرح سطحِ عالم پر مختلف ادوار میں ہزاروں سیارگانِ رشد و ہدایت کو ضو فشاں پاتے ہیں تب سطورۂ بالا حقیقت کی بنیاد پر فطرت تقاضا کرتی ہے کہ اس کثرت کا بھی کوئی نقطۂ وحدت ضرور ہونا چاہیے جو کثرت کے لیے محور و مرکز بن سکے اور جس طرح اکائی کے بعد کثرت کے لیے کوئی اور مبدء و منتہا نہیں ہے اسی طرح انبیاء و رسل کے سلسلۂ کثرت کیلیے بھی ایک ہی مبدء و منتہا ہونا ازبس ضروری ہے۔

یہی وہ حقیقت ہے جو "ختمِ نبوت" کے نام سے موسوم ہے اور اسی کو قرآنِ حکیم نے اس جوہرِ حکمت کے ساتھ ادا کیا ہے: "مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مَردوں میں سے کسی کے صلبی باپ نہیں ہیں تاہم وہ خدا کے پیغمبر اور آخر الانبیاء ہیں۔

نبوت "نبأ" سے ماخوذ ہے جس کے معنی "خبر دینا" ہے اور رسالت کے معنی "پیغام" ہیں اور اسلام کی اصطلاح میں نبوت و رسالت خدا کی جانب سے ایک منصب ہے جو مخلوق کی رشد و ہدایت کے لیے کسی مخصوص انسان کو عطا ہوتا ہے اور اُس کے لائے ہوئے پیغام کو "وحی" کہتے ہیں، کیونکہ یہ پیغام درحقیقت پیغامبر کا اپنا کلام نہیں ہوتا، بلکہ خدائے برتر کا فرمان ہوتا ہے جس میں خطاء و قصور یا سہو و نسیان کی مطلق گنجائش نہیں ہوتی۔

لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ	اس (وحیِ الٰہی) کے سامنے سے اور نہ اس کے
يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ	پیچھے سے باطل کا گذر بھی نہیں ہوتا یہ تو اُتارا ہے

تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝ حکمت والے ہر طرح قابلِ ستائش والے کی جانب سے
(حم سجدہ، پ ۲۴) (یعنی خدا کی جانب سے)

گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب خدائے برحق کسی شخصیت کو نبوت و رسالت یعنی پیغامِ حق سے سرفراز کر دیتا ہے تو تمام انسانوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک خدا کے فرمان "وحی الٰہی" کے سامنے بے چون و چرا سرِ تسلیم خم کر دیں۔ وہ شخصیت کی صداقت اور خدا کی جانب سے اس کے دعویٰ وحی کی حقانیت کا تو ہر حیثیت سے حق رکھتے ہیں لیکن اگر اس کے دونوں دعووں کی تصدیق و تائید عقل کی راہ سے دلائل و براہین کے ساتھ ہو جائے اور کسوٹی پر اس کی صداقت بے لوث اور صاف روشن ہو جائے تب اس کے دئے ہوئے پیغامِ خدا کو ماننے نہ ماننے میں وہ آزاد نہیں رہ سکتے اور بلا شبہ اس کے پیغام کو پیغامِ حق سمجھ کر قبول کر لینا اور اس کے سامنے سرِ نیاز جھکا دینا فرضِ اولین ہے۔ ہاں چونکہ وہ پیغام کسی بڑے سے بڑے عاقل و فرزانہ انسان کا پیغام نہیں بلکہ "پیغامِ الٰہی" ہے، اس لیے وہ خود یہ ضروری سمجھتا ہے کہ جو کچھ ہے عقل کی کنج و کاؤ سے خواہ کتنا ہی بالاتر ہو لیکن عقل کی نگاہ میں اور دلائل و براہین کی ترازو میں ناممکن اور محال نہ ہو کیونکہ فطرت اور عقل کے درمیان بیر نہیں ہے بلکہ عقل، فطرت کے قوانین کے سمجھنے اور سمجھ کر قبول کرنے کے لیے بہترین ذریعہ اور آلہ ہے اور وحی الٰہی درحقیقت فطرت کے روحانی قوانین کی ترجمان ہے۔

بہرحال کسی نبی یا رسول کے مبعوث ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدا کی مخلوق "جن و بشر" اپنی روحانی سعادت اور اخلاق و کردار کی بلندی کے لیے اپنے عقل و دماغ کے اختراع کی بجائے پیغامِ حق کو راہنما بنائے تاکہ ذی عقل کائناتِ الٰہی اس راہ میں رقیبانہ تضاد و تصادم سے بے نیاز ہو کر انسانوں کے نہیں بلکہ انسانوں کے پیدا کرنے والے خدا کے قوانین پر عمل پیرا ہو کر اجتماعی وحدت، عالمگیر اخوت و مساوات کی قدروں کو حاصل کر سکیں اور ایک دوسرے کا حاکم و محکوم اور آقا و غلام بننے کے بجائے سب ہی یکساں طور پر صرف

اپنے پیدا کرنے والے ہی کے محکوم و غلام بن جائیں۔

دوسری جانب اس خاکدانِ عالم کا یہ حال ہے کہ اس کی ہر ایک شے نشو و ارتقاء کے قانونِ قدرت میں جکڑی ہوئی نظر آتی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر مادی اور روحانی قوانین ونوامیس کی خالق ایک ہی ذات ہے تو بلاشبہ دونوں کے نوامیس و قوانین میں ہم آہنگی اور وحدت کار فرما نظر آنی چاہیئے ورنہ العیاذ باللہ وحدت و اکائی کی جگہ دوئی کو محور و مرکز ماننا پڑے گا جو فطرتاً ناممکن اور عقلاً محال ہے۔

تب ازبس ضروری ہے کہ رشد و ہدایت کے اس منصب "نبوت و رسالت" کا سلسلہ بھی قانونِ ارتقاء سے اسی طرح جکڑا ہوا ہونا چاہیے جس طرح مادیات کا اور اس لیے تسلیم کرنا ہوگا کہ رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ ارتقائی بنیادوں پر اس طرح ترقی پذیر ہو کہ کائناتِ انسانی اپنے بقاء و وجود تک کسی وقت بھی اِس راہ میں نشو و ارتقاء سے محروم نہ رہے۔

اِس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد اب رشد و ہدایت کے اس نظام کو جو منصبِ نبوت و رسالت کے نام سے معنوَن ہے یُوں سمجھنا چاہیے کہ قانونِ قدرت نے ایک جانب انسان کی مادی نشو و ارتقاء کا یہ سامان مہیا کیا کہ اس کی عقل و دانش اور اس کے شعور دماغی کو آہستہ آہستہ ترقی پذیر کرنا شروع کیا اور دوسری جانب اسی معیار پر انسان کو روحانی و اخلاقی تربیت کا ساز و سامان بھی انبیاء و رسل کے ذریعہ آہستہ آہستہ ترقی پذیر شکل میں عطا فرمایا اور آخر ایک وقت وہ بھی آیا کہ انسان عقل و شعور کی ابتدائی اور متوسط منازل سے گذر کر بلوغ و کمال کی اس حد پر پہنچ گئے جس کو ان کے لیے حدِ کمال کہا جا سکتا ہے اور جس معراجِ کمال پر پہنچ کر انسان "انسانِ کامل" کہلانے کا بجا طور پر مستحق ہو جاتا ہے، تاہم حدِ بلوغ کی اس معراجِ ارتقاء پر پہنچ جانے پر بھی اس کی جلاء اور صیقل کے لیے رہتی دنیا تک نت نئے سامان ہوتے رہیں گے اور خالقِ کائنات کی ربوبیتِ کاملہ ان کے کمال کو نقص سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنی تربیتِ حق کا ہاتھ اُن سے نہ اُٹھائے گی۔

ٹھیک اسی طرح نبوت ورسالت کی شمعِ رُشد و ہدایت کا یہی حال رہا ہے کہ وہ ہزاراں ہزار سال تک اپنے ابتدائی اور متوسط منازلِ ارتقاء سے گذرتی رہی اور آخرکار وہ وقت بھی آپہنچا کہ اس کی ترقی اور نشو و ارتقاء نے "کمال و تمام" کی شکل اختیار کرلی اور اُس حدِ کمال پر پہنچ گئی جہاں اس کے ذریعہ کائناتِ ہست و بود کے سامنے ایسا قانونِ مکمل اور دستورِ کامل آگیا جو ہر طرح عقل و شعورِ انسانی کے حدِ بلوغ کے مناسب حال ہے اور جس کی راہنمائی اور روشنی "عروج و کمال" کی ضامن و کفیل ہے۔ ساتھ ہی اس میں یہ لچک بھی موجود ہے، کہ گو یہ قانونِ رشد و ہدایت اپنے بُنیادی اصول کے لحاظ سے اٹل اور غیر متبدل ہے مگر عقل و شعور کے کمال و بلوغ کے تحفظ کے لیے جس طرح اللہ تعالیٰ کی ربوبیتِ کاملہ نے راہیں مسدود نہیں کیں بلکہ رہتی دنیا تک اس کی تربیت کے سامان مہیا کیے ہیں اسی طرح اس منصبِ نبوت و رسالت کی تکمیل اور نقطۂ ارتقاء کے حدِ کمال پر پہنچ جانے کے بعد اس کی عطا کردہ رشد و ہدایت کے تحفظ کی راہیں بھی بند نہیں کیں اور تا قیامِ قیامت اس کے جلا و صیقل کے لیے "علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل" کا سلسلہ قائم و دائم رکھا۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نے خاتم النبیین کی تفسیر کو ایک روشن مثال کے ذریعہ سمجھایا اور "ختمِ نبوت" کی حقیقی روح کو مادی شکل میں پیش کر کے حرفِ آخر قرار دیا۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قال ان مثلی ومثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنی بیتاً فاحسنہ واجملہ الاموضع	حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری اور مجھ سے پہلے نبیوں اور رسولوں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے گھر بنایا اور اس کو بہت عمدہ آراستہ و پیراستہ کیا

لبنة من زاوية فجعل الناس	مگر اُس کے ایک گوشہ میں ایک اینٹ کی جگہ
يطوفون به ويعجبون له	تعمیر میں چھوڑ دی تو اب لوگ اس کو دیکھنے جوق در جوق
ويقولون هلا وضعت هذه	آتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں مگر ساتھ ہی کہتے
اللبنة وانا خاتم النبيين	جاتے ہیں کہ یہ ایک اینٹ بھی کیوں نہ بھر دی گئی۔
(رواه البخاري في كتاب الانبياء ومسلم)	(تاکہ تعمیر کی تکمیل ہو جاتی)
وفي بعض الفاظه فكنت	چنانچہ میں نے اسی جگہ کو پُر کیا ہے اور میں وہی
انا سددت موضع اللبنة وختم	نبوّت کی آخری اینٹ ہوں جس سے قصر مکمّل ہو گیا
بي البنيان وختم بي الرسل[1]	اور میں ہی آخر الانبیاء ہوں۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ ربّ العٰلمین کی ربوبیتِ کاملہ نے کائناتِ ہست و بود میں قانونِ ارتقاء کو جس طرح نافذ فرمایا ہے اُس کا تقاضا یہ ہے کہ عقل و شعورِ انسانی کے حدِ بلوغ پر پہنچ جانے کے باوجود اس کی ترقی کا سلسلہ تا ابد جاری رہے اور اُس میں ایسی پابندی یا روک نہ ہونی چاہیے جس سے اُس کی صلاحیتوں کے نشو و ارتقاء کا سدِ باب ہو جائے اور دوسری جانب پیغامِ حق کا یہ سلسلۂ نبوّت و رسالت (بذریعہ وحیِ الٰہی) عالم کی رشد و ہدایت کے لیے عطا ہوا ہے وہ بھی حدِ کمال و تمام پر پہنچ جانے کے باوجود فطرت کے قانونِ ارتقاء کے مُطابق نہ کمال سے نقص کی جانب رجوع کرے کہ حقیقت ظلّ اور بروز کے پردہ میں مستور ہو کر رہ جائے اور نہ ربوبیتِ حق کے اس عطاء و نوال اور بخشش کا ہی سدِ باب ہو جائے جو "رشد و ہدایت" کے عنوان سے مُعنوَن اور عالمِ انسانی کی حقیقی راہنما ہے، اِس لیے طریقہ یہ رکھا گیا کہ جب انسان اپنے عقل و شعور میں حدِ بلوغ تک پہنچ گیا یا اُس کے سامان پُوری طرح مہیا ہو گئے تب نبوت و رسالت کو بھی بہ حدِ کمال و تمام پہنچا کر ختم کر دیا گیا اور اعلان کر دیا گیا۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ — آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا

[1] کنز العمال عن ابن عساکر۔

وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِیْ (القرآن پ۶ ع۶) اور تم پر اپنی نعمت (نبوت و رسالت) کو پورا کر دیا۔
مگر رشد و ہدایت کو رہتی دنیا تک اِس طرح باقی رکھا کہ آخری پیغمبر کے ذریعہ جو آخری پیغام کامل و مکمل بن کر آیا وہ اساس و بنیاد قرار پائے اور نت نئی مادی ترقیات کے ساتھ ساتھ اُس کا فیضانِ علم بھی درخشاں و تاباں رہے اور یہ خدمت علماء حق کے سپرد ہو، یہی وہ حقیقت ہے جس کو کلام معجز نظام نے اِس انداز میں بیان کیا ہے:۔

فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (القرآن پ۵ ع۶) — اگر تم کسی معاملہ میں اختلاف کرو تو اس اختلاف کو اللہ اور اس کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب رجوع کرو۔

ظاہر ہے کہ اگر نبوت و رسالت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پہنچ کر کامل نہ ہوتی اور اس کا سلسلہ کمالِ نبوت ہی کی شکل میں آگے بڑھتا رہتا تو یہ نہ کہا جاتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب یعنی اُن کے ارشاداتِ حق کی جانب رجوع کرو بلکہ خطاب یہ ہوتا کہ تم اللہ کی جانب اور جو نبی تم میں موجود ہو اس کی جانب رجوع کرو، اِس لیے نبوّت و رسالت کو ظل و بروز کی اصطلاحوں کی آڑ میں باقی رکھنے کی کوشش کرنا قانونِ فطرت اور دینِ حق کے صریح خلاف اور باطل ہے چنانچہ اس حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے قرآنِ حکیم نے کئی جگہ مختلف معجزانہ خطابت کو اختیار کیا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے:۔

وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ (سورۂ انعام پ۷ ع۷) — اور میری جانب اس قرآن کی وحی کی گئی تاکہ اس کے ذریعہ میں تم کو (بری باتوں سے) ڈراؤں اور ان تمام لوگوں کو بھی جن کو (رہتی دُنیا تک) یہ قرآن پہنچے۔

اور دوسری جگہ ہے:۔

وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ[1] — اور نہیں بھیجا ہم نے تم کو مگر تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر۔

اور ایک جگہ ہے:۔

هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ — اللہ وہ ہے جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو

[1] (سورۂ انبیاء پ۱۷ ع۷)

بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا (فتح پ ۲۶)	ہدایت اور دینِ حق دے کر تاکہ اس کو تمام ادیان پر غالب کرے اور اللہ اس کے لیے بطور گواہ کافی ہے

اور ایک جگہ ارشاد ہے :-

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ (سورۂ نساء پ ۵)	اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی اور ان کی اطاعت کرو جو تم میں سے اولی الامر ہیں۔

اس آیت میں صاف طور پر یہ کہدیا گیا ہے کہ اب انسانی رُشد و ہدایت کے لیے صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ اللہ کی اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی جائے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اب کسی نبی و رسول کی اطاعت کا سوال نہیں ہے بلکہ اللہ اور اُسکے رسول کی اطاعت کا آخری طریقہ یہ ہے کہ تم میں سے جو صاحبِ امر ہوں (علماء مجتہدین و خلفاء حق) اُن کی پیروی کرو۔

اِن آیاتِ بینات کے علاوہ قرآنِ حکیم نے جن آیات میں خدا کی کتابوں یا رسولوں پر ایمان لانے کی ہدایت کی ہے وہاں یہ کہہ کر مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ [1] اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ [2] کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن سے پہلے نبیوں اور رسولوں اور قرآن اور اس سے قبل کی کتابوں پر ایمان لاؤ، اِس حقیقت کو نمایاں کیا اور ابھارا ہے کہ جہاں تک پیغمبر اور کتاب اللہ پر ایمان لانے کا تعلق ذاتِ اقدس، قرآنِ حکیم اور اس سے قبل کے نبیوں، رسولوں اور کتابوں کا ہے اور یہ صرف اس لیے کہ یہ سلسلہ آگے بشکلِ نبوت و رسالت اور وحیِ الٰہی نہیں چلے گا بلکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ہی بہ حدِ کمال پہنچ کر قیامت تک بلا فصل باقی اور جاری رہے گی، اور قرآنِ حکیم کامل و مکمل دستورِ ہدایت بن کر ہمیشہ اس کے لیے زندہ شہادت دے گا۔

[1] (بقرہ پ ۱ ع ۱)، [2] (نساء پ ۵ ع ۲۰)

حق تعالیٰ کی جانب سے "خاتم النبیین" کا جو منصب جلیل ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کو عطا ہوا ہے عقل ونقل دونوں اعتبار سے ایک اور صرف ایک ہی معنی رکھتا ہے اور وہ یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخر انبیاء ورسل ہیں اور نبوت ورسالت کا سلسلہ آپ پر پہنچ کر ختم ہو گیا۔

تاج العروس میں ہے (و الخاتم (من کل شئ عاقبتہ و اٰخرتہ کخاتمتہ والخاتم (اٰخر القوم کالخاتم) ومنہ قولہ تعالیٰ وخاتم النبیین ای اٰخرھم الخ (فصل الخاء من باب المیم)

تاج العروس کے علاوہ تمام معتبر اور مشہور عربی لغات ناطق ہیں کہ خاتم "بفتح تاء ہو یا بکسرہ تاء" آخر شئ" اس کے حقیقی معنی ہیں اور جب کسی شخصیت کے لیے بولا جائے تو "آخر القوم" مراد ہوتے ہیں، اس لیے آخر الانبیاء والرسل ہونا ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ خصوصیت ہے جس میں دوسرا کوئی شریک وسہیم نہیں۔

یہ درست ہے کہ خاتم بمعنی "مہر" بھی حقیقی معنی ہیں اور یہی نہیں اِن دونوں کے ماسوا اِس لفظ کے چند اور معانی بھی حقیقی ہیں لیکن اطلاقات ہی اس کو ظاہر کر سکتے ہیں کہ اِن ہر دو حقیقی معنی میں سے کون سے معنی برمحل ہیں مثلاً جب آپ ہاتھ میں انگشتری پہنے ہوئے ہوں اور اُس پر آپ کا نام کندہ ہو، اس وقت اگر کہا جائے کہ "خاتمک فی اُنملک" تو اس وقت خاتم بمعنی "مہر" حقیقی معنی ہوں گے لیکن اس لفظ خاتم کو اگر کسی انسان پر اطلاق کریں تو اس وقت خاتم بمعنی "آخر" حقیقی معنی ہوں گے اور خاتم القوم یا خاتم الانبیاء تب ہی صحیح ہو گا کہ آنے والا شخص قوم کا آخری فرد یا نبیوں کا آخری نبی ہو اور اس حقیقی اطلاق کی موجودگی میں مجازی معنی تب ہی قابلِ اعتنا ہوں گے کہ یا حقیقی معنی اس مقام پر ناممکن الاستعمال ہوں اور یا مجازی معنی، حقیقی معنی سے مغائر ومتضاد نہ ہوں بلکہ اس کے ساتھ پوری مطابقت رکھتے ہوں۔

تب یہ بات واضح اور صاف ہے کہ اگر کوئی شخص بلاغتِ قرآن اور اعجازِ نظمِ قرآنی

کے خلاف بلکہ عربیت کے عام اصول کے خلاف آیت کریمہ خاتم النبیین میں خاتم کے حقیقی معنی ترک کر کے بلحاظ اطلاق مجازی معنی "مہر" کے لیتا ہے تب بھی مجازی معنی اور مفہوم وہی صحیح اور لائق توجہ ہو سکتے ہیں جو حقیقی معنی "آخر" سے متباین اور متخالف نہ ہوں اور نبیوں کی مہر کا یہ مطلب ہوگا کہ جس طرح کسی تحریر یا کسی شے کے ختم پر مہر اس لیے لگائی جاتی ہے کہ اس پر تحریر یا شے کا اختتام ہو گیا اور اب کسی بھی اضافے کی گنجائش باقی نہیں رہی، اسی طرح ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء و مرسلین کے سلسلہ کے لیے "مہر" ہیں کہ آپ کے بعد اب فہرست انبیاء و رسل میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں رہی اور اس سلسلہ پر مہر لگ گئی اور جس طرح کاغذ یا لفافہ پر مہر ثبوت ہے اس امر کا کہ اب اس کے بعد کسی مضمون یا لفظ و جملہ کی توقع عبث ہے، اسی طرح نبیوں کی مہر اس کے لیے کھلی دلیل ہے کہ اب کسی اضافہ کی توقع محال ہے۔ پس "مہر" بہ اطلاق مجاز کے اس مفہوم کو چھوڑ کر اگر کسی خاص غرض کی بناء پر یہ معنی مراد ہوں کہ ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نبیوں کے لیے مہر ہیں کہ جس طرح کوئی کاغذ یا تحریر جب ہی مستند ہوتی ہے کہ اس پر ذمہ دار شخصیت کی مہر ثبت ہو اس طرح کوئی نبی "نبی یا رسول" نہیں بن سکتا جب تک آپ اُس کے لیے مہر تصدیق نہ بن جائیں" تو یہ مُراد دو وجہ سے باطل ہے: اوّل اس لیے کہ یہ مفہوم حقیقی معنی "آخر" کے متضاد و متباین ہے دوم اس لیے کہ ہزاروں یا لاکھوں انبیاء علیہم السلام جو ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ بعثت سے قبل اس کائناتِ ارضی پر مبعوث ہو چکے اپنی اپنی اُمت کے زمانہ میں اُن کی نبوت غیر مستند اور ناقابلِ قبول رہی اس لیے کہ اُن کی نبوت کی تصدیق کنندہ "مہر" اُن کی بعثت سے ہزاروں یا سیکڑوں برس کے بعد آئی جبکہ وہ اپنے اپنے فرض منصبی سے سبکدوش ہو چکے تو اب بے سود و بے فائدہ، اور اگر یہ مراد ہے کہ آپ کے بعد جو نبی آئیں گے اُن کے لیے آپ "مہر" ہیں تو یہ ترجیح بلا مرجح کیوں؟ کہ ہزاروں لاکھوں انبیاء و رسل کے لیے تو مہر نہ بنے اور بعد میں آنے والوں کے لیے "مہر" قرار پائے۔ اور اگر یہ

مطلب ہے کہ اگلوں اور پچھلوں سب ہی انبیاء و رسل کے لیے مہرِ تصدیق ہو تب بھی اگلوں کے لیے مہر ہونا بے کار رہا کہ اُن کے وقتِ نبوت گزر جانے کے بعد مہرِ تصدیق پہنچی۔

علاوہ ازیں یہ احتمالات خود ساختہ اور ظنی ہیں اور کسی ایک احتمال کے یقینی ہونے کی بھی قرآن میں صراحت موجود نہیں ہے تو پھر حقیقی اطلاق کو ترک اور حقیقی سے مطابق مجازی مفہوم سے روگردانی کے بعد ایسے احتمالات جو حقیقی مفہوم کا حق نہ ادا کرتے ہوں باطل نہیں تو اور کیا ہیں ؟

پھر یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن کا حکیمانہ طریقِ استدلال یہ ہے کہ وہ ایک مقام پر جو بات کہنا چاہتا ہے اُس کو متعدد جگہ مختلف اسالیبِ بیان کے ساتھ اس طرح ادا کر دیتا ہے کہ ایک آیت دوسری آیت کی خود ہی تفسیر بن جاتی اور حقیقتِ حال روشن ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ اِس حقیقت کو مفسرین نے اِس طرح ادا کیا ہے کہ "القرآن یفسر بعضہ بعضاً" یعنی قرآن کا بعض حصہ دوسرے بعض حصہ کی خود تفسیر کر دیتا ہے۔ چنانچہ یہی صورتِ حال یہاں بھی موجود ہے، وہ یہ کہ قرآنِ حکیم اسلام کی خوبی بیان کرتے ہوئے اعلان کرتا ہے :-

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ	آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا
اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ	اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے
لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (پ ۶ ع)	اسلام کو دین کی حیثیت میں پسند کر لیا

آیتِ کریمہ کو ایک مرتبہ خوب غور سے پھر پڑھیے اور دیکھیے کہ اس جگہ نہ "خاتَم" ہے اور نہ "خاتِم" کہ اس کو معرضِ بحث میں لا کر خود ساختہ احتمالات پیدا کر لیے جائیں، بلکہ یہاں صاف صاف کہا گیا ہے کہ جو دینِ اسلام وجودِ انسانی کے ساتھ ساتھ رشد و ہدایت کا مرکز بنا ہوا ہے اس کو آج "کامل" اور اِس نعمتِ دین کو تمام کر دیا گیا، اور ظاہر ہے کہ "کامل" کا مقابل "ناقص" اور "تمام" کا متوازی "ناتمام - ادھورا" ہوتا ہے۔ یعنی ایک چیز آہستہ آہستہ

ترقی پذیر تھی اور رفتہ رفتہ اِس حد پہنچ گئی جس کے بعد اب ترقی کا خاتمہ ہے، اس لیے کہ وہ کامل و مکمل ہو کر سامنے آگئی جس کے بعد ناقص یا ناتمام کے دُہرانے کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔

سو اگر یہ صحیح ہے کہ اسلام، دورِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر پہنچ کر ہی کامل و تمام ہوا ہے تو بلاشبہ آیتِ کریمہ "وَلٰكِن رَّسُولَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ" کے یہی معنی صحیح ہو سکتے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسی دین کے پیغامبر ہیں جو کائناتِ انسان کی ابتداء سے ہی رُشد و ہدایتِ انسانی کا فرض انجام دے رہا ہے اور خدا کا پسندیدہ ہے "ولٰکن رسول اللہ" اور انسانیت کی مادی ترقی کے ساتھ ساتھ وہ بھی رُوحانی مدارجِ ارتقاء طے کرتے ہوئے آج "کامل" اور "تمام" ہو گیا، اور اب کسی جدید پیغام کی حاجت نہیں رہی اور جب جدید پیغام کی ضرورت نہیں ہے تو اب نئے پیغامبر کی بھی ضرورت خود بخود باقی نہیں رہی اور رہتی دنیا تک یہی کامل پیغام اور پیغامبر انسانی دُنیا کے لیے کافی اور بس ہے "وخاتم النبیین" لہٰذا حقیقی اطلاق لیجئے یا مجازی "خاتم" کے معنی اور مفہوم میں "آخر" ہونے کا تصور غیر منفک اور لازم ہے اور اس کے خلاف جو کچھ بھی ہے وہ باطل ہے۔

آیتِ کریمہ کا شانِ نزول اگرچہ ایک خاص واقعہ سے تعلق رکھتا ہے لیکن اپنے مفہوم و معنی کے لحاظ سے ہمہ گیر اور غیر موقت ہے اور عربیت اور نقل و روایات دونوں لحاظ سے ایک ٹھوس حقیقت کا اظہار کرتی ہے۔

اِس آیت کے تین حصے ہیں ایک میں کہا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں اس لیے کہ آپ کی اولادِ ذکور حیاتِ مستعار کو پورا کر چکی اور آپ صلبی بیٹا نہیں رکھتے اور اسلام میں لے پالک "متبنیٰ" بے معنی رسم ہے اور اس سے دوسرے کا بیٹا گود لینے والے کا بیٹا نہیں بن جاتا اور اس کے احکام حاصل نہیں کر لیتا تو ایسی شکل میں زید (رضی اللہ عنہ) کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا کہنا ہر طرح غلط ہے۔ "مَاكَانَ

مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ" مگر اس سے یہ احساس پیدا نہیں ہونا چاہئے کہ جب آپؐ مردوں میں سے کسی کے صلبی باپ نہیں ہیں تو اُمت کے ساتھ کس طرح آپؐ کو شفقتِ پدری ہوسکتی ہے حالانکہ اُمم سابقہ و سالفہ میں انبیاء و رسل اپنی اپنی اُمتوں کے بیشتر صلبی باپ بھی رہے ہیں اور رُوحانی باپ بھی۔ یہ احساس اس لیے نہیں ہونا چاہئے کہ اگرچہ آپؐ اُمتِ مرحومہ کے صلبی باپ نہیں ہیں تو نہ ہوں مگر رُوحانی باپ تو ہیں؛ جیسا کہ ہمیشہ انبیاء و رسل اپنی اپنی اُمتوں کے رُوحانی باپ ہوتے ہیں بلکہ روحانی باپ کا رشتہ و رابطہ تو صلبی باپ سے بھی ہزارہا درجہ بڑھ چڑھ کر ہے کیونکہ وہ مادی و روحانی دونوں تربیتوں کا کفیل و مُربّی ہر اس لیے دوسرے نبیوں اور رسولوں کی طرح آپ بھی خدا کے رسُول ہیں "وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ" یہ آیت کا دُوسرا حصّہ ہے۔

پھر بات اِسی حد پر پہنچ کر ختم نہیں ہوجاتی بلکہ اُمتِ مرحومہ کے لیے اِس سے بھی بلند و بالا یہ بشارت ہے کہ آپؐ سے قبل جس قدر بھی رُوحانی باپ (انبیاء و رُسل) گزُرے ہیں علیٰ قدرِ مراتب اُن میں اُمت کے لیے شفقت و رحمت کا جذبہ محدود رہا ہے؛ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اُن کے گذر جانے کے بعد دوسرا روحانی باپ (نبی یا رسُول) مبعوث ہو کر اُمت پر میری ہی طرح یا مجھ سے زیادہ شفقت و تربیت کا حق ادا کرنیوالا ہے لیکن ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم کی یہ شانِ رفیع ہے کہ آپؐ صرف اللہ کے رسول ہی نہیں ہیں بلکہ آخر الانبیاء والرسل ہیں جن کے بعد کسی نبی اور رسول کی بعثت کی ضرورت نہیں رہی اس لیے کہ دین کامل ہوگیا اور خدا کی نعمت پوری ہوگئی، ایسی صورت میں تم اندازہ کرسکتے ہو کہ اس کی شفقت و رحمت کا کیا ٹھکانا ہوگا، جو مربّی یہ سمجھتا ہو کہ اب اگلوں کی طرح اس کے بعد دوسرا کوئی مربّی آنے والا نہیں ہے کہ اُمت پر اپنی رحمت نچھاور کرے، اب تو رہتی دُنیا تک اُس کی آغوشِ تربیت وا رہے گی اور اسی کی نبوت و رسالت کا غیر منقطع سلسلہ جاری رہے گا۔ "وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ"۔

خلاصہ یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ مبارک اِس خصوصی امتیاز کی حامل ہے کہ اُس کی بعثت کے بعد کسی نبی یا رسول کی بعثت کی حاجت باقی نہیں رہی اور اس طرح یہ حقیقت بھی روشن ہوگئی کہ ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اِس امر کے باعث نہیں ہیں کہ انھوں نے نبوت ورسالت کا سلسلہ ختم کر دیا بلکہ جب خدا تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اب یہ سلسلۂ نبوت ورسالت اِس ارتقائی منزل پر پہنچ گیا ہے کہ آخری پیغام بن کر کامل وتمام ہو جائے تو ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نے اس کے لیے چن لیا اور بلا شرکت غیرے اُن کو یہ منصب عظمیٰ عطا فرمایا" وَذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ پھر کسی نادان کا یہ کہنا کہ اگر آپ آخر الانبیاء والرسل ہیں تو یہ آپ کی منقبت نہیں بلکہ نقص ہے کہ آپ اس رحمت کے لیے سدِ باب ثابت ہوئے جو نبوت ورسالت کے عنوان سے جاری تھی۔

اِس نادان کا یہ خیال اِسی طرح فاسد ہے جس طرح اس شخص کا خیال جس نے ایک محفل میں شرکت کی اور دیکھا کہ جو معزز مہمان بھی آتا ہے اُس کا پُرجوش استقبال ہوتا ہے اور اس سے محفل کی رونق میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، مگر جب اُس نے یہ دیکھا کہ ایک شخص ایسا بھی آپہنچا جس کو سب نے حاصلِ محفل سمجھ کر نہ صرف پُرجوش استقبال ہی کیا بلکہ تمام محفل کا سرتاج کہا اور اس کے بعد محفل اپنا کام کر کے ختم ہوگئی تو یہ نادان بہت کُڑھا اور پچھتانے لگا کہ کاش یہ حاصلِ محفل نہ بنتا اور محفل اسی طرح سجی سجائی رہتی اور مہمانوں کی آمد کا یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا۔

ٹھیک اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر الانبیاء والرسل ہونے پر یہ نادان اپنے فسادِ خیال کا اظہار کر رہا اور باطل تاویلات کے درپے ہو رہا ہے۔ "یُضِلُّ بِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ وَیَہۡدِیۡ بِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ"۔

قرآنِ عزیز نے اکثر مقامات پر "نبی" اور "رسول" کے ایک ہی معنی لیے ہیں جس کو اُردو میں پیغمبر سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن خاص خاص مقامات پر وہ نبی اور رسول میں فرق بھی

کرتا ہے۔ اِس فرق کو علمار اسلام نے یوں ظاہر کیا ہے کہ نبی عام ہے اور رسول خاص۔ یعنی خدائے تعالیٰ جس شخصیت کو ہم کلامی کا شرف عطا فرماتے ہیں وہ "نبی" کہلاتا ہے کیونکہ لُغت میں نبی "خبر دینے والے" کو کہتے ہیں۔ گویا جو شخص خدا سے براہِ راست لے کر بندگانِ خدا کو اس کے احکام کی خبر دے وہ نبی ہے، قطع نظر اِس امر کے کہ اُس کو جدید کتاب یا جدید شریعت عطا کی گئی ہو یا نہ کی گئی ہو لیکن جب خدا نے ہم کلامی کے منصب کے ساتھ ساتھ اس شخصیت کو "کتابِ جدید" یا "شریعتِ جدیدہ" بھی عطا کی ہو تو اس کو "رسول" کہتے ہیں۔ چنانچہ اس مقام پر قرآنِ حکیم نے اِسی فرق و امتیاز کو معجزانہ اسلوب کے ساتھ ظاہر کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ جہاں تک گذشتہ انبیار و رسل کی فہرست کا تعلق ہے اس فہرست میں آپ کا منصب صرف "نبی" ہی نہیں بلکہ "رسول" ہے، اور خود قرآن اس کے لیے شہادتِ جاوید ہے" اور جبکہ وہ پیغامِ الٰہی کے سلسلہ میں آخری پیغامبر ہیں تو اس جگہ یہ یقین کر لینا چاہیے کہ وہ صرف مصطلحہ رسولوں کے ہی آخر نہیں ہیں بلکہ سرتاسر سلسلۂ نبوت کے لیے "آخر" ہیں تاکہ ظاہر ہو جائے کہ جب وہ خاتم الانبیار ہیں تو خاتم الرسل بدرجۂ اولیٰ واتم ہیں، کیونکہ جب عام ہی کا وجود مفقود ہے تو خاص کا وجود کس طرح کتمِ عدم سے ظاہر ہو سکتا ہے "وخاتم النبیین" اور اسی نمایاں حقیقت کو خود ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طویل صحیح حدیث میں بُرہانِ قاطع کے طور پر ظاہر کیا ہے" لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ "میرے بعد اب کسی نبی کی بعثت نہیں ہے" "اِنَّ الرِّسَالَۃَ وَالنُّبُوَّۃَ قَدِ انْقَطَعَتْ فَلَا رَسُوْلَ بَعْدِیْ وَلَا نَبِی۔ بلاشبہ رسالت اور نبوت دونوں ختم ہو گئے۔ پس میرے بعد نہ رسول ہے اور نہ نبی": خُتِمَ بِیَ الْاَنْبِیَاءُ عَلَیْھِمُ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَام۔ مجھ پر انبیار علیہم الصلوٰۃ والسلام کے سلسلہ کا خاتمہ ہو گیا": اَنَا الْعَاقِبُ الَّذِی لَیْسَ بَعْدَہٗ نَبِیٌّ۔ میرا نام عاقب[1] ہے جس کے بعد کسی نبی کی بعثت نہیں ہے": وَخُتِمَ بِیَ النَّبِیُّوْنَ اور مجھ پر نبیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا"[2]

---

[1] عاقب: انجام کو پہنچانے والا۔ [2] مسند احمد، ترمذی، مسلم، بخاری وغیرہا۔

غزواتُ

غزوۂ بدر

غزوہ | اربابِ سیر و حدیث نے یہ اصطلاح مقرر کرلی ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کے سلسلہ میں جس لشکر کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوں اس کو سَرِیَّہ اور جس میں بنفسِ نفیس خود شرکت فرمائیں اُس کو "غزوہ" کہتے ہیں۔

بدر | قرآنِ عزیز نے جن اہم غزوات کا تذکرہ کیا ہے اُن میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت "غزوۂ بدر" کو حاصل ہے۔ بدر دراصل ایک کنُویں کا نام ہے جس کی نسبت سے یہ وادی بھی بدر ہی کہلاتی ہے، یہ وادی مکہ اور مدینہ کے درمیان مدینہ سے قریب سُلطانی[1] راستہ پر واقع ہے، اِسی جگہ وہ اہم غزوہ پیش آیا جس نے دنیا کی تاریخِ ادیان و مِلل ہی کا نہیں بلکہ ہر شعبۂ حیات کا رُخ پلٹ کر ظُلم سے عدل کی جانب پھیر دیا۔

واقعہ | یہ واقعہ چونکہ ادیان و ملل کی تاریخِ انقلاب میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے، اس لیے راویانِ حدیث و سیرت نے اس کے ہر ایک جزء کی تفصیل کو واضح طور پر بیان کیا ہے، تاکہ اس تاریخی واقعہ کا کوئی گوشہ بھی تشنۂ تکمیل نہ رہے، لیکن ہم اِس مقام پر مختصر مگر جامع الفاظ میں اِس کا ذکر مناسب سمجھتے ہیں۔

ہجرتِ مدینہ مشرکین کے لیے کچھ اِس درجہ برہمی اور اشتعال کا باعث ہوئی اور وہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مسلمانوں کو اپنی ناقابلِ برداشت ایذا رسانی سے محفوظ

---

[1] حکومتِ عثمانی کے دورِ شباب میں مکہ سے مدینہ جانے کے لیے جو راہ مقرر ہوئی وہ "سلطانی راہ" کہلاتی ہے۔

دیکھ کر کچھ اس درجہ برافروختہ ہوئے کہ اب انھوں نے طے کر لیا کہ جس قیمت پر بھی ہو سکے مسلمانوں کو نیست و نابود کر دینا چاہیے، چنانچہ اس کے لیے انھوں نے ہجرت سے متصل ہی معرکہائے جنگ کی ابتدا کر دی اور غزوۂ بواط اور عشیرہ جیسے چھوٹے چھوٹے غزوات اسی سلسلہ میں پیش آئے مگر مشرکین مکہ کی آتش حسد کے لیے یہ کافی نہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ ہو جائے۔

اس ارادہ کی تکمیل کے لیے انھوں نے ضروری سمجھا کہ سامانِ حرب و ضرب بافراط میسر آئے اور اس کے لیے بہترین طریقہ یہ سوچا کہ ابوسفیان کی سرکردگی میں ایک قافلۂ تجارت شام کی منڈیوں میں جائے اور نفع کثیر حاصل کر کے اس سے سامانِ جنگ مہیا کیا جائے، اور اس جذبہ نے جوش و خروش کی یہ کیفیت پیدا کر دی کہ جب قافلۂ تجارت کی طیاری شروع ہوئی تو مکہ کے ہر متنفس نے اپنے سرمایہ کا کچھ حصہ اس تجارت کے لیے پیش کیا، حتیٰ کہ ایک بڑھیا (عجوز) نے بھی اپنی محنت کی معمولی پونجی اس خدمت کے لیے پیش کر دی، اور تقریباً ستر قریشیوں پر مشتمل یہ قافلہ ابوسفیان کی قیادت میں شام کو روانہ ہو گیا۔

مشہور محدث و مفسر ابن جریر طبری اپنی کتاب "تاریخ الامم والملوک" میں قریش کی اس کیفیت کا اس طرح تذکرہ فرماتے ہیں:-

وقد كانت الحرب بينهم	اور قافلہ کی روانگی سے قبل مسلمانوں اور قریشِ مکہ
قبل ذلك فقتلت قتلى وقتل	کے درمیان جنگ چھڑ گئی تھی اور ان لڑائیوں میں لوگ
ابن الحضرمي في ناس بنخلة و	مارے جا چکے تھے اور (مشہور مشرک) ابن حضرمی
اسرت أسارى من قريش كانت	مارا جا چکا تھا اور قریش کے لوگ قیدی بھی بنائے
تلك الواقعة هاجت الحرب بين	جا چکے تھے اور یہ واقعہ قریش کے اور مسلمانوں کے
رسول الله صلى الله عليه وسلم	درمیان جنگ کے مشتعل ہو جانے کا باعث بن گیا،
وبين قريش وذلك قبل	اور یہ سب کچھ ابوسفیان اور اس کے رفقاء کے شام

مخرج ابی سفیان واصحابہ الی الشام[1]	کی جانب قافلہ تجارت کی شکل میں نکلنے سے قبل پیش آچکا تھا۔

اور جلیل القدر محدث و مفسر ابن کثیر (رحمہ اللہ) اپنی تاریخ البدایۃ والنہایہ میں تحریر فرماتے ہیں :۔

باب سریۃ عبد اللہ بن جحش التی کان سببا لغزوۃ بدر العظمیٰ وَذٰلِكَ يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ[2]	باب سریہ عبد اللہ بن جحش (سریہ نخلہ) جو سبب بنا بدر کبریٰ کے غزوہ کا اور جس کے متعلق قرآن نے یہ کہا "اور یہ دن ہے حق و باطل کے نکھر جانے کا وہ دن جبکہ (حق و باطل کی جنگ کے لیے) دو جماعتیں آپس میں ملیں، اور اللہ ہر شے پر قادر ہے۔"

قریش کا تجارتی قافلہ جب نفع کثیر حاصل کر کے شام سے واپس ہو کر مکہ جا رہا تھا، بدر سے قریب ہو کر گذرا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا۔ آپ نے فوراً صحابہؓ کو جمع کر کے مشورہ فرمایا، تب بعض حضرات نے تو بخوشی اُس کے مقابلہ کے لیے آمادگی ظاہر کی اور بعض نے یہ سمجھ کر کہ کسی اہم جنگ کا معاملہ نہیں ہے اس کے تعاقب پر آمادگی کا ثبوت نہیں دیا، چنانچہ ابن کثیرؒ نے بروایت محمد بن اسحٰقؒ اس واقعہ کا اس طرح ذکر کیا ہے :۔

وقال "هذه عير قريش فيها اموالهم فاخرجوا اليها لعل الله ينفلكموها" فانتدب الناس فخف بعضهم وثقل بعض و	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ قریش کا قافلہ جا رہا ہے جس میں ان کا مالِ تجارت ہے، اس کا تعاقب کرو، کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس کو تمہارے لیے مالِ غنیمت بنا دے۔ پس لوگوں کو اس کے لیے پکارا گیا تو بعض نے اس کو پسند کیا اور بعض نے نکلنے میں

[1] جلد ۲ ص ۲۶۷۔ [2] ابن حضرمی اسی غزوہ میں مارا گیا۔ [3] جلد ۳ ص ۲۴۸۔

ذٰلك انهم لم يظنوا ان رسول الله يلقى حربًا۔ (تاریخ الامم والملوک جلد ۲ ص ۲۵۱)

گرانی محسوس کی اور یہ عدولِ حکمی کے پیشِ نظر نہیں بلکہ اس لیے تھی کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی جنگ کے ارادہ سے نہیں جا رہے ہیں۔

مسلمانوں کا یہ لشکر جو قافلہ کے تعاقب میں نکلا، سامانِ حرب سے بے پرواہ ہو کر مدینہ سے نکلا، مشہور روایت کے مطابق اُن کی تعداد صرف تین سو تیرہ تھی جبکہ بحمد اللہ مدینہ کے اندر ہی مسلمانوں کی آبادی ہزارہا بالغ نفوس پر مشتمل تھی اور چند تلواریں، دو تین گھوڑے ساٹھ زرہ اور صرف ساٹھ اونٹ ان کا متاعِ جنگ تھا، درانحالیکہ مسلمانوں کے پاس بلکہ خود نکلنے والے مجاہدین کے پاس مدینہ میں بیش از بیش سامانِ جنگ اور اونٹ گھوڑے موجود تھے، غرض یہ لشکر جنگی لشکر نہیں تھا، بلکہ فدا کارانِ توحید کا ایک مختصر سا قافلہ تھا، جو قریش کے حرب و ضرب کے سرمایہ پر قابض ہو کر دشمن کو بے مایہ بنانے نکلا تھا۔

ابوسفیان کو مسلمانوں کے تعاقب کا حال معلوم ہوا تو گھبرا یا اور فوراً ضمضم نامی ایک شخص کو اجیر بنا کر مکہ روانہ کیا کہ وہ قریش کو اس معاملہ کی خبر دے اور مدد طلب کرے۔

قریش نے جب حقیقتِ حال کو سنا تو ان میں بہت زیادہ جوش پیدا ہو گیا اور تمام سردارانِ قریش آمادۂ جنگ ہو کر اپنے اپنے لشکر کو لے کر نکل کھڑے ہوئے اور اس کر و فر سے نکلے کہ تعداد میں ایک ہزار تھے، نیزے اور تلواریں بے شمار تھیں، سات سو زرہ، ستر گھوڑے اور بے تعداد اونٹ تھے، وہ اونچی بنے، نیزے اور تلواریں سجے ڈھالیں اور بکتر لگائے، نشۂ غرور میں جھومتے ہوئے بدر کی جانب بڑھے۔

ادھر مسلمان آگے بڑھتے ہوئے جب وادیٔ صفراء کے قریب پہنچے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بسبس بن عمرو اور عدی بن الزغباء کو جاسوس بنا کر بھیجا کہ وہ قافلہ کا حال معلوم کر کے آئیں۔ ابن اسحٰق کہتے ہیں کہ یہ دونوں بدر پہنچے تو وہاں کنویں کے قریب

۱؎ ابولہب کے علاوہ سب ہی تھے، ابولہب بیمار تھا اس لیے اس نے اپنا قائم مقام دیدیا تھا۔ ۲؎ مسلم و ابو داؤد۔

قبیلۂ جُہینہ کا ایک شخص مجدی بن عمرو موجود تھا، اور نزدیک ہی دو لڑکیاں آپس میں بات چیت کر رہی تھیں۔

ایک نے دوسری سے کہا کہ کل یا پرسوں یہاں قریشی قافلہ آنے والا ہے، میں اس میں کام کروں گی اور تیرا قرض اتار دوں گی اور پھر مجدی نے اس لڑکی کی تصدیق کی، بسبس نے یہ سنا تو وہ اور عدی اونٹوں کو پانی پلا، فوراً روانہ ہو گئے۔

دوسری جانب ابوسفیان ڈرتا اور چھپتا چھپاتا قافلہ سے آگے بڑھ کر تجسس حال کے لیے بدر پہنچا، مجدی وہاں موجود تھا، ابوسفیان نے دریافت کیا، تو نے کسی اجنبی کو تو یہاں نہیں دیکھا۔؟

مجدی نے کہا اور تو کوئی نئی بات نظر نہیں آئی البتہ تھوڑی دیر ہوئی کہ غیر متعارف دو آدمی ضرور یہاں آئے تھے اور اونٹوں کو پانی پلا کر واپس ہو گئے۔

ابوسفیان کنویں کے پاس گیا تو اونٹوں کی لید پڑی دیکھی، اس نے لید کو کریدا تو کھجور کی گٹھلیاں نکلیں، ابوسفیان نے یہ دیکھ کر کہا بلاشبہ یہ اونٹ یثرب کے تھے اور تیزی کے ساتھ قافلہ تک پہنچا اور حالات سے باخبر کر کے قافلہ کا رخ ساحل کی جانب پھیر دیا اور بدر کو بائیں ہاتھ چھوڑتا ہوا مکہ کو چل دیا۔[۲]

اس مدت میں مسلمان وادیٔ صفراء سے گذر کر وادیٔ ذفران تک پہنچ چکے تھے یہاں اُترے تو ایک جانب بسبس اور عدی سے یہ معلوم ہوا کہ عنقریب ابوسفیان کا قافلہ بدر پہنچنے والا ہے، دوسری جانب یہ پتہ لگا کہ مکہ سے قریش ایک ہزار جمعیت لے کر کرّوفر کے ساتھ مسلمانوں سے لڑنے کی غرض سے بدر کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

ابوسفیان نے جب ساحلی جانب اختیار کر لی اور اس کو یہ یقین ہو گیا کہ اگر مسلمان

---

[۱] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۶۵ و سیرت ابن ہشام جلد ۱ روض الانف جلد ۲۔ [۲] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۲۶۵ و سیرت ابن ہشام جلد ۱ روض الانف جلد ۲۔

میرے تعاقب کے لیے بدر کی جانب آئیں گے تو میں اُن کی زد سے محفوظ رہوں گا۔
اس لیے اُس نے مکّہ کی جانب دوسرا قاصد روانہ کیا کہ اب جنگ کی ضرورت نہیں ہے میں مُسلمانوں کی زد سے بچ کر جلدی مکّہ پہنچ جانے والا ہوں، قریش بدر کے قریب آچکے تھے کہ قاصد نے ابوسفیان کا پیغام سُنایا مگر ابوجہل نے واپسی کے لیے سختی کے ساتھ انکار کردیا اور کہا کہ اب بدر ضرور پہنچنا ہے اور مسلمانوں کا قلع قمع کرکے اس کانٹے کو ہمیشہ کے لیے نکال دینا ہے۔[1]

بہرحال مسلمانوں کو جب وادی ذفران میں یہ دونوں خبریں ملیں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے دوبارہ مشورہ ضروری سمجھا کیوں کہ اب معاملہ کٹھن تھا۔ مسلمان بے سروسامان اور پھر تھوڑی تعداد میں تھے اور دشمن ہر طرح وقت کے ہتھیاروں سے مسلح، کثیر سامانِ جنگ کے مالک تھے اور تعداد میں تین گُنے سے بھی زیادہ اور بقول اربابِ سیرتِ انصار اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیّتِ سفر کو صد ہزار باعثِ نازش ومباہات سمجھتے اور ہمرکاب رہتے تھے لیکن عقبۂ ثانیہ کے وقت وہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ یہ معاہدہ کرچکے تھے کہ جب تک قریش یا غیر قریش اپنی جانب سے مدینہ پر حملہ آور نہ ہوں، انصار مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کے لیے مجبور نہیں ہوں گے۔[2]
مشورہ کے لیے یہ اہم وجوہ تھیں جن کے پیشِ نظر نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابہ سے مشورہ فرمایا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ دشمن سر پر ہے اور قافلہ قریب! اب بتاؤ کیا چاہتے ہو، جنگ کرکے حق وباطل کا فیصلہ یا بغیر کانٹا لگے قافلے پر قبضہ؟
مُسلمانوں نے جب یہ سُنا تو بعض نے طبعی طور پر جنگ کی مخالفت کی اور اِس بارے میں گرانی محسوس کی، انھوں نے کہا: یارسول اللہ ہم جنگ کے ارادے سے نہیں نکلے تھے، اس لیے بے سروسامان ہیں، ہم تو اب بھی یہی چاہتے ہیں کہ قافلہ پر قبضہ کرکے

---

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۲ ص ۳۶۶۔ [2] سیرت وتاریخ کی کتابوں میں عموماً یہ قول مذکور ہے

واپس چلے جائیں' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کمزور رائے کو ناپسند فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا، قافلہ کو چھوڑو، اب اُس قوم کے متعلق رائے دو' جو تمہارے مقابلہ کے لیے مکہ سے نکل آئی، بعض لوگوں نے جب دوبارہ عذر کیا، تو آپ نے پھر پہلی بات لوٹادی تب جلیل القدر صحابہ ابوبکر، عمر، علی (رضی اللہ عنہم) سمجھ گئے کہ مرضیِ مبارک حق و باطل کی جنگ سے وابستہ ہے، اس لیے انھوں نے جذبۂ وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا کہ ہم ہر طرح جنگ کے لیے تیار ہیں اور اسلام کی خاطر آپ کے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہانے کو حاضر ہیں اور حضرتِ مقداد ؓ نے تو اِس شد و مد کے ساتھ فداکارانہ جذبات کا اظہار کیا کہ صحابہؓ کو ان کی تقریر پر رشک ہونے لگا۔ مگر آپ اب بھی نگاہِ مبارک سے کسی بات کے طالب نظر آ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر انصار میں سے حضرتِ سعد بن معاذ (رضی اللہ عنہ) کھڑے ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا ہم انصار کی جانب اشارہ ہے کہ ہم کچھ عرض کریں اور پھر انصار کی جانب سے پوری وفاداری اور فداکاری کا یقین دلاتے ہوئے نہایت مؤثر تقریر فرمائی۔

مہاجرین و انصار کی یہ تقاریر سُن کر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک مسرت سے تمتما اٹھا اور آپ نے ارشاد فرمایا:۔

اب اللہ کے نام پر آگے بڑھو اور بشارت حاصل کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ دو گروہ (قافلہ اور مشرکینِ مکہ کا لشکر) میں سے ایک کو تمہارے قبضہ میں دیدوں گا اور قافلہ نہیں بلکہ مشرکین کا لشکر تمہارے قبضہ میں دیدیا جائے گا اور خدا کا وعدہ بلاشبہ سچا ہے اور قسم بخدا میں جنگ سے قبل ابھی سے قوم کے سرداروں کی قتل گاہ کو دیکھ رہا ہوں[۲]۔ اور صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے بدر پہنچ کر زمین پر ہاتھ رکھ کر بتایا کہ اِس جگہ فلاں قریشی مارا جائے گا اور یہاں فلاں قتل ہوگا۔"

---

[۱] بخاری و مسلم، نسائی و عام کتب سیر و تاریخ۔ [۲] زرقانی جلد ۱ ص ۴۸۰۔

سلف سے خلف تک تمام مفسرین محدثین اور اصحاب سیر و تاریخ اس پر متفق ہیں کہ یہی وہ مشورہ ہے جس کے متعلق سورۂ انفال کی یہ آیات نازل ہوئی ہیں:-

كَمَآ أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنۢ بَيْتِكَ	(انفال اللہ اور رسول کے لیے ہیں) اس لیے کہ تیرے پروردگار
بِٱلْحَقِّ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنَ ٱلْمُؤْمِنِينَ	نے تجھ کو حق کے لیے تیرے گھر سے نکالا اور حالت یہ ہو گئی کہ
لَكَـٰرِهُونَ ۝ يُجَـٰدِلُونَكَ فِى ٱلْحَقِّ بَعْدَ	مسلمانوں کا ایک فریق اس نکلنے پر گرانی کا اظہار کر رہا تھا اور
مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى	وہ تجھ سے حق کے بارے میں حق کے ظاہر ہو جانے کے بعد
ٱلْمَوْتِ وَهُمْ يَنظُرُونَ ۝ وَإِذْ يَعِدُكُمُ	جھگڑا کر رہے تھے گویا وہ آنکھوں دیکھے موت کے مُنہ میں ہنکائے
ٱللَّهُ إِحْدَى ٱلطَّآئِفَتَيْنِ أَنَّهَا لَكُمْ	جا رہے ہیں اور (یہ واقعہ اس وقت پیش آیا) جبکہ اللہ تم کو وعدہ
وَتَوَدُّونَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ ٱلشَّوْكَةِ	دے رہا تھا کہ دونوں فریق (قافلہ اور مشرکین مکہ کا لشکر) میں سے
تَكُونُ لَكُمْ وَيُرِيدُ ٱللَّهُ أَن	ایک فریق کو تمہارے قبضہ میں دیدے گا اور تم یہ شبہ کرتے تھے
يُحِقَّ ٱلْحَقَّ بِكَلِمَـٰتِهِۦ وَيَقْطَعَ	کہ تم کو وہ گروہ ملے جس کے مقابلہ میں کانٹا بھی نہ لگے، اور اللہ
دَابِرَ ٱلْكَـٰفِرِينَ ۝ لِيُحِقَّ ٱلْحَقَّ	کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اپنے وعدہ کے کلمات سے حق کو ثابت
وَيُبْطِلَ ٱلْبَـٰطِلَ وَلَوْ كَرِهَ	کر دکھلائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے اور اس طرح حق کو
ٱلْمُجْرِمُونَ ۝	حق کر دے اور باطل کو باطل اگرچہ مجرموں کو یہ بات پسند نہ آئے۔

اب مسلمان آگے بڑھے اور بدر کے قریب پہنچ کر مدینہ کی جانب والے رُخ "عدوۃ الدنیا" پر خیمہ زن ہو گئے اور مشرکینِ مکہ آگے بڑھے تو بدر پہنچ کر مدینہ سے دور مکہ کی جانب والے رُخ "عدوۃ القصویٰ" پر اُترے اور محاذِ جنگ کا نقشہ اِس طرح بن کر مسلمان اور مشرکین بالمقابل تھے اور ابوسفیان کا قافلہ اس وقت ساحل کی جانب نیچے نیچے مشرکین کے لشکر کی پشت پر سے گذر رہا تھا کہ جب وہ چاہیں تو مشرکینِ مکہ کی نصرت و مدد کے لیے بے روک ٹوک آ سکتے اور کمک کا کام دے سکتے ہیں اور پھر یہ عجیب صورتِ حال تھی کہ مسلمانوں کا محاذِ جنگ اِس درجہ ریتیلا تھا کہ انسانوں اور چوپاؤں

دونوں کے قدم ریت میں دھنسے جا رہے تھے اور چلنا دشوار ہو رہا تھا مگر مُشرکین کا محاذِ جنگ ہموار اور پختہ فرش کی طرح تھا۔ غرض دشمن تعداد میں تین گنے سے زیادہ، سامانِ جنگ میں پُوری طرح مکمل، ذرائع رسل و رسائل میں ہر طرح مطمئن، جائے وقوع نہایت عمدہ اور ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ قافلہ کی کمک متوقع تھی، اور خود اپنی حالت یہ کہ تعداد میں بہت کم، اسلحہ جنگ برائے نام، سامانِ حرب نہ ہونے کے برابر، سواریوں کا شمار برائے بیت، جائے وقوع حد درجہ خراب اور ان تمام ناسازگار حالات کے ساتھ کمک قطعاً غیر متوقع، اور حد یہ کہ دشمن پانی پر قابض اور مسلمان اِس سے محروم۔

ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اگر مسلمانوں کو ان کی ذاتی رائے پر چھوڑ دیا جاتا تو اُن کی عقل و خرد بہ اسبابِ ظاہر اس کے سوا اور کیا فیصلہ کر سکتی تھی کہ وہ اِس وقت کو ٹال دیں اور دشمن سے کسی ایسے دوسرے وقت کے لیے جنگ کا قول و قرار کریں کہ وہ دشمن کی طرح ہر حیثیت سے جنگ کے لیے تیار ہوں، چنانچہ اسی بنا پر مسلمانوں نے وادیٔ ذفران میں شوریٰ کے وقت ابتداءً یہی کہا بھی مگر وحی الٰہی کے ذریعہ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ خدا کا یہ وعدہ کہ تم کو "عیر اور نفیر" دونوں میں سے ایک پر مسلط کر دیا جائے گا، صرف اس شکل میں پورا ہونے والا ہے کہ مسلمان مشرکین کے لشکر (نفیر) کا مقابلہ کریں اور حق و باطل کے اِس معرکہ میں مسلمان کامیاب ہوں اور مشرکین ناکام و خاسر، اِس لیے مسلمانوں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی پا کر ہمہ قسم کی بے سرو سامانی کے باوجود خود کو حق و باطل کی معرکہ آرائی کے لیے والہانہ و فداکارانہ جذبۂ پاک کے ساتھ پیش کر دیا۔

ایسی صورتِ حال کو قرآنِ عزیز نے اِس معجزانہ اسلوبِ بیان کے ساتھ ظاہر کیا ہے:

اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا	اگر تم اللہ پر اور اس (غیبی مدد) پر یقین رکھتے ہو جو ہم نے
عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ	فیصلہ کر دینے والے دن اپنے بندہ پر نازل کی تھی جبکہ لشکر
يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ؕ	ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے تو چاہیے کہ اِس تقسیم پر

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ	(یعنی مالِ غنیمت کی مقررہ تقسیم پر) کاربند ہو اور اللہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔
قَدِيْرٌ اِذْ اَنْتُمْ	یہ وہ (بدر کا دن) تھا کہ تم اِدھر قریب کے ناکہ پر تھے، اُدھر دشمن دُور کے
بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ	ناکہ پر اور قافلہ تم سے نچلے حصہ میں تھا (یعنی سمندر کے کنارے کنارے
بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى	گزر رہا تھا) اور اگر تم آپس میں لڑائی کی بات ٹھہراتے تو ضرور جنگ کے وقت کے
وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ	بارہ میں تم اختلاف کرتے کیونکہ تم چاہتے ہو کہ کسی حالت میں جنگ نہ ہو اور
وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ	دشمن چاہتا ہے کہ ضرور جنگ ہو (یعنی تمھیں دشمنوں کی کثرت اور اپنی
فِي الْمِيْعٰدِ وَلٰكِنْ	بے سروسامانی کا اندیشہ تھا اور قافلہ پر تسلط آسان نظر آرہا تھا اور دشمن
لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ	اپنی کثرت اور ساز و سامان کے بل پر گھمنڈ کیے ہوئے تھا) لیکن اللہ نے
مَفْعُوْلًا لِّيَهْلِكَ مَنْ	دونوں لشکروں کو بھڑا دیا تاکہ جو بات ہونے والی تھی اُسے کر دکھائے،
هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى	نیز اس لیے کہ جسے ہلاک ہونا ہے اتمامِ حجت کے بعد ہلاک ہو اور جو زندہ
مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ وَاِنَّ	رہنے والا ہے اتمامِ حجت کے بعد زندہ رہے اور بلاشبہ اللہ سب کی
اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (انفال)	سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔
وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ	اور اللہ تمہاری مدد کر چکا ہے بدر کی لڑائی میں اور تم کمزور
اَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ	حالت میں تھے، پس اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم شکر گزار ہو۔
اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ	(یہ جب ہوا) کہ تو مسلمانوں سے کہہ رہا تھا کیا تم کو کافی نہیں
اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ	کہ تمہارا پروردگار تمہاری مدد کو آسمان سے اُترنے والے
مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ بَلٰٓى اِنْ	تین ہزار فرشتے بھیجے، ہاں بلاشبہ اگر تم صبر کرو اور تقویٰ کی
تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ	راہ اختیار کرو اور پھر ایسا ہو کہ دشمن اسی دم تم پر چڑھ آئے
مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ	تو تمہارا پروردگار (بھی) پانچ ہزار نشان رکھنے والوں سے
رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ	تمہاری مدد کرے گا۔ اللہ نے صرف یہ اس لیے کیا کہ تمہارے
الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ۝	لیے خوش خبری ہو اور اس کی وجہ سے تمہارے دل

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ (آل عمران)

مطمئن ہو جائیں اور مدد و نصرت جو کچھ بھی ہے اللہ کی ہی طرف سے ہے اس کی طاقت سب پر غالب ہے اور وہ اپنے تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے اور نیز اس لیے تاکہ منکرینِ حق کی جمعیت و طاقت کا ایک حصّہ بیکار کر دے۔ انھیں اس درجہ ذلیل و خوار کر دے کہ وہ نامراد ہو کر اُلٹے پاؤں پھر جائیں۔

دعائے نصرت غرض اس حالت میں دونوں فریق جنگ کے لیے صف آرا ہوئے تو اول آپؐ نے مسلمانوں کی صفوف کو درست فرمایا اور پھر اس عریش (خس پوش جھونپڑی) کے نیچے جا کر جو آپؐ کے لیے میدانِ جنگ میں بنا دی گئی تھی، درگاہِ الٰہی میں الحاح و تضرع کے ساتھ دعا شروع کر دی اور عرض کیا:-

اللّٰهُمَّ اَنْجِزْ لِيْ مَا وَعَدْتَنِيْ اللّٰهُمَّ ان تهلك هٰذه العصابة من اهل الاسلام لا تُعبد في الارض۔

خدایا! تو نے مجھ سے جو وعدہ (نصرت) فرمایا اس کو پورا کر۔ خدایا! اگر یہ مٹھی بھر مسلمان ہلاک ہو گئے تو پھر خطۂ زمین پر کوئی تیرا عبادت گذار باقی نہیں رہے گا۔

صدیقِ اکبر (رضی اللہ عنہ) نے دیکھا تو قریب آئے اور عرض کیا: خدا کے رسولؐ! بس کیجیے اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔

غیبی نصرت و امداد اور آخر یہی ہوا بھی کہ ہر قسم کے ناسازگار حالات اور اس درجہ کمزوری کے باوجود کسی مسلمان کا اس معرکہ سے صحیح و سالم بچ کر نکل جانا خود ایک معجزہ ہوتا مسلمانوں کو غیبی نصرت و امداد نے بامراد اور کامیاب کیا، فتح اور نصرت نے قدم چومے، اور تاریخ عالم کا ایک بے نظیر اور حیرت زا انقلاب پیش کر دیا اور مشرکین قریش کے تمام سردار اور مشہور نبرد آزما ہی قتل نہیں ہوئے بلکہ شرک و کفر کی اجتماعی طاقت ہی کا خاتمہ ہو گیا۔

یہ غیبی نصرت کیا تھی؟ قرآنِ حکیم اس کا جواب متعدد آیات میں یہ دیتا ہے:-

(۱) مسلمانوں کی نگاہ میں دشمنوں کی تعداد اصل تعداد سے کم نظر آئی تاکہ مسلمان مرعوب نہ ہوں اور مشرکین کی نگاہوں میں مسلمان مٹھی بھر معلوم ہوئے تاکہ وہ جنگ سے جی نہ چرائیں اور معرکۂ حق و باطل ٹل نہ جائے۔ اِذْ یُرِیْکَهُمُ اللّٰهُ فِیْ مَنَامِكَ قَلِیْلًا، (الیٰ) وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (انفال) اور ایک وقت میں دوگنے معلوم ہوئے تاکہ مسلمانوں سے مرعوب ہو کر رہ جائیں۔ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِیْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ یَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَیْهِمْ رَاْیَ الْعَیْنِ وَاللّٰهُ یُؤَیِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ ۝ (آل عمران)

(۲) مسلمانوں کی دعاء پر اوّل اُن کی مدد ایک ہزار فرشتوں سے کی گئی۔ اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِیْنَ ۝ اور پھر یہ تعداد بڑھا کر تین ہزار کر دی گئی " اَلَنْ یَّكْفِیَكُمْ اَنْ یُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِیْنَ " اور اگر دشمن تم پر یک لخت حملہ کر دے تو ہم تین ہزار کی بجائے پانچ ہزار فرشتوں سے مدد کریں گے یُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِیْنَ ۝

(۳) مسلمانوں پر عین معرکہ کے وقت اونگھ طاری کر دی جس کے چند منٹ بعد اُن کی بیداری نے اُن میں ایک نئی تازگی اور نئی روح پیدا کر دی۔ اِذْ یُغَشِّیْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً

(۴) آسمان سے پانی برسا کر مسلمانوں کے لیے ریتیلی زمین کو پختہ فرش کی طرح بنا دیا اور نشیب کی وجہ سے حوض نما گڑھے میں پانی مہیا کر دیا اور دشمنوں کی زمین کو کیچڑ کی طرح دلدل بنا ڈالا " وَیُنَزِّلُ عَلَیْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّیُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَیُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّیْطٰنِ وَلِیَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَیُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ۝

نتیجۂ جنگ | بہر حال معرکۂ جنگ بپا ہوا اور دونوں جانب سے نبرد آزما ایک دوسرے کے مقابل ہو کر " هَلْ مِنْ مُّبَارِزٍ " پکارنے اور دادِ شجاعت دینے لگے اور پھر یکایک ہجومی جنگ شروع ہو گئی، مسلمان اوّل تو جنگ مغلوبہ لڑے مگر فراغتِ دعاء کے بعد جب

میدانِ جنگ میں آکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "شَاھَتِ الْوُجُوْہُ" چہرے روسیاہ ہوں" پڑھتے ہوئے مٹھی بھر خاک اور کنکریاں دشمنوں کی جانب پھینکیں تو خدا نے برحق کی معجزانہ قدرت نے ہُوا کے ذریعہ اُس کے ذرات تمام مشرکین کی آنکھوں تک پہنچا دیے اور وہ اس ناگہانی پریشانی سے مضطرب ہو کر آنکھیں ملنے لگے اور جنگِ مغلوبہ "جنگِ غالبہ" کی شکل میں بدل گئی۔

وَمَا رَمَيْتَ	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور تو نے جب (کنکریاں) پھینکیں تو درحقیقت
إِذْ رَمَيْتَ	تو نے نہیں پھینکیں بلکہ اللہ نے پھینکیں (کیونکہ انسانی ہاتھ ایک مٹھی میں اتنے
وَلٰكِنَّ	بڑے لشکر کے ہر آدمی پر رمی نہیں کر سکتا تھا یہ جو کچھ ہوا نبی کے ہاتھ پر خدا کا
اللّٰهَ رَمٰى	معجزہ ہوا)

اور دیر نہیں لگی کہ مشرکین کے بڑے بڑے آدمی مارے گئے اور دشمنوں کے پیر اُکھڑ گئے، وہ بھاگتے تھے مگر بھاگنے کا موقع نہ پاتے تھے، چنانچہ اُن کے ستّر آدمی قتل ہوئے اور ستّر گرفتار اور باقی نے راہِ فرار اختیار کی۔

مُسلمان اگرچہ خدا کی نصرت اور اس کے فضل سے کامیاب ہوئے اور فتح و کامرانی کے مالک بنے تاہم بائیس مجاہدین نے بھی جامِ شہادت نوش کیا۔

جنگِ بدر نے تاریخِ عالم کا رُخ بدل دیا

بدر کا معرکہ مؤرخین اور اصحابِ سیر سے بھی اگرچہ اپنی تاریخی اہمیت کا اعتراف کراتا ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ معرکۂ بدر ایک ہنگامی معرکہ نہیں تھا بلکہ اس نے قریشِ مکّہ کی قوت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا اور مسلمانوں کے لیے اعلاء کلمۃ اللہ کی راہیں کھول دیں، لیکن وہ بھی اس حقیقتِ حال سے شاید بے خبر ہیں کہ معرکۂ بدر صرف مشرکینِ مکّہ اور مسلمانوں کی آویزش حق و باطل کا معرکہ نہیں تھا بلکہ جس زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا اس وقت دُنیا ایک موڑ پر کھڑی تھی اور تاریخِ عالم کا اشہب تیز گام اُس موڑ پر حیران سرگرداں کھڑا تھا کہ کس جانب رُخ کرے اِس لیے

بدر کا انقلاب عالمگیر انقلاب تھا۔

صفحۂ عالم پر اگر بدر کا معرکہ پیش نہ آتا اور مشرکین مکہ کی طاقت شکست و ریخت نہ ہوتی تو بلا شبہ نہ صرف حجاز، نہ صرف عرب و عجم بلکہ کائناتِ ہستی کا ہر ایک بحر و بر ظلم، سرکشی اور باطل سے دوچار رہتا۔ آزادیٔ ضمیر فنا ہو جاتی، جذباتِ حق مٹ کر رہ جاتے اور یہ سب ظلم و جبر کے بل پر اپنے لیے آپ جگہ پیدا کر لیتے، اب جبکہ بدر کا معرکہ پیش آگیا اور مشرکینِ مکہ کی قوت ٹوٹ گئی تو دنیا نے موڑ سے آگے بڑھ کر وہ راہ اختیار کر لی جو آزادیٔ ضمیر، عدل و نصفت، حق پرستی اور نکوکاری کی راہ تھی جہاں ضعیفوں کی نصرت فرض اور بیچاروں کے لیے چارۂ کار مہیا تھا، اس لیے خدا کا یہ عظیم الشان احسان کہ بدر میں حق کو فتح و کامرانی نصیب ہوئی، صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں تھا بلکہ تمام کائناتِ انسانی پر احسانِ عظیم تھا۔

مولانا ابو الکلام آزاد نے کیا خوب فرمایا :-

بعض اوقات قدرتی حوادث کا ایک معمولی سا واقعہ بھی فتح و شکست کا فیصلہ کر دیتا ہے، جنگ واٹرلو کے تمام مؤرخین متفق ہیں کہ اگر، ۱۷ اور ۱۸ رجون ۱۸۱۵ء کی درمیانی شب میں بارش نہ ہوئی ہوتی تو یورپ کا نقشہ بدل گیا ہوتا۔ کیوں کہ اس صورت میں نپولین کو زمین خشک ہونے کا بارہ بجے تک انتظار نہ کرنا پڑتا۔ سویرے ہی لڑائی شروع کر دیتا۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ بلوشر کے پہنچنے سے پہلے ولینگٹن کو شکست ہو جاتی، واٹرلو میں اگر بارش نہ ہوئی ہوتی تو یورپ کا سیاسی نقشہ بدل جاتا۔ لیکن اگر بدر میں نہ ہوئی ہوتی تو کیا ہوتا؟ تمام کرۂ ارضی کی ہدایت و سعادت کا نقشہ اُلٹ جاتا۔ اسی طرف پیغمبرِ اسلامؐ نے اپنی دعا میں اشارہ کیا تھا "اللھم ان تھلك ھٰذہ العصابۃ فلا تعبد فی الارض" خدایا! اگر خدامِ حق کی یہ چھوٹی سی جماعت آج ہلاک ہو گئی تو کرۂ ارضی میں تیرا سچا عبادت گذار کوئی نہیں رہے گا۔[1]

[1] ترجمان القرآن، جلد ۲ ص ۵۶ و ۵۷۔

قرآن عزیز کی روشنی میں غزوۂ بدر پر دوبارہ نظر

غزوۂ بدر سے متعلق بیان کردہ تفصیلات جمہور علماء اسلام کے نزدیک مُسلّم ہیں، خصوصاً اِس مسئلہ میں تو سلف و خلف میں سے کسی کی بھی دو رائے نہیں ہیں کہ مسلمان جب مدینہ سے نکلے تو صرف قافلہ پر حملہ مقصود تھا لیکن وادیٔ ذفران میں پہنچ کر قدرتی حادثہ نے ایک دوسرے مقابلہ سے دوچار کر دیا اور یہ مشرکینِ مکہ کی وہ یورش تھی جو مسلمانوں کا قلع قمع کرنے کے لیے ظہور میں آئی، اور اب مسلمانوں کو "عیر و نفیر"[1] دو کے ساتھ واسطہ پڑ گیا۔ اس لیے یہی وہ مقام ہے جہاں مسلمانوں کو بذریعہ وحی یہ بشارت سُنائی گئی کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو مسلمانوں کے سپرد کر دیا جائے گا، اور بعض مسلمانوں نے اگرچہ انسانی کمزوری کی بنا پر "نفیر" کے مقابلہ میں "عیر" کو ترجیح دینے کا خیال ظاہر کیا، مگر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی نے اطلاع کر دی تھی کہ اللہ تعالیٰ "نفیر" کے مقابلہ کو مقدر کر چکا ہے، اور اُس کا وعدہ اسی شکل میں پُورا ہو گا۔ اس لیے ذاتِ اقدسؐ کا رجحان اسی جانب ہوا، اور مشورہ کے بعد آخر وہی فیصلہ ہوا جو خدا اور خدا کے رسولؐ کی مرضی تھی ————

چنانچہ قرآنِ عزیز کی آیات "كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ" (الآیہ) اور "اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ" (الآیۃ) اسی حقیقت کا اعلان کر رہی ہیں۔

مگر جمہور کے ان مُسلّمات کے خلاف مولانا شبلی (مرحوم و مغفور) نے سیرۃ النبی جلد اوّل میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ مُسلمان شروع ہی میں مدینہ سے صرف "نفیر" کے لیے نکلے تھے، اور خدا کے وعدہ "عیر و نفیر" کا حال مسلمانوں کو مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا تھا اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "عیر و نفیر" کے متعلق جو کچھ مشورہ کیا اور صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے جو کتبِ سیر میں مذکور زبردست تقاریر فرمائیں وہ سب وادیِ ذفران میں نہیں،

---

[1] عیر۔ تجارتی قافلہ اور نفیر دشمنوں کا لشکر۔

بلکہ مدینہ ہی میں ہو چکا تھا۔

مولانائے مرحوم نے اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے طویل بحث فرمائی ہے اور احادیث و سیر میں مذکور واقعات کی ترتیب کا اس لیے انکار کر دیا ہے کہ وہ اس ترتیب کو قرآن کی تصریحات کے خلاف سمجھتے ہیں اور یہ کہ بعض صحیح احادیث و روایات بھی ان کے خیال کی ہی تائید کرتی ہیں۔

چونکہ یہ مسئلہ علمی نقد و فکر سے تعلق رکھتا ہے اس لیے از بس ضروری ہے کہ قرآن عزیز ہی کی روشنی میں مناظرانہ اسلوب سے بچ کر خالص تحقیقی رنگ میں اس پر "محاکمہ" کیا جائے تاکہ اصل حقیقت واضح ہو سکے۔

قرآن عزیز نے اس واقعہ کی تفصیلات دیتے ہوئے دو جگہ بصراحت اس حقیقت کا اعلان کیا ہے کہ "نفیر" کا معاملہ مدینہ سے "عیر" کی خاطر نکلنے کے بعد اچانک سامنے آیا اور اس لیے بعض مسلمانوں نے نفیر کے مقابلہ کو ابتداءً خطرہ کی نگاہ سے دیکھا اور گراں محسوس کیا

(۱) پہلا مقام سورۂ انفال کی وہ چند آیات ہیں جو "كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ" سے شروع ہو کر "وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ" تک مسلسل چلی گئی ہیں جو تقریباً سات یا آٹھ آیات ہیں۔

قرآن عزیز نے ان آیات میں اُس پورے واقعہ کو اختصار کے ساتھ بیان کر دیا ہے جو معرکۂ بدر میں از اوّل تا آخر پیش آیا یعنی مدینہ سے نکلنے پر مسلمانوں کے سامنے کیا کیا صورتیں پیش آئیں وہ سب ہی ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کر کے بیان کی گئی ہیں۔

پس جس طرح "كَمَا أَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ" کے ساتھ "وَإِنَّ فَرِيقًا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ لَكَارِهُونَ" کا تعلق ہے اسی طرح "وَإِذْ يَعِدُكُمُ اللَّهُ إِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ" اور "إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ" اور "إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ" "وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً" وغیرہ واقعات کا بھی تعلق ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مولانا شبلی مرحوم بھی جمہور کے ساتھ اس پر

متفق ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا درگاہِ الٰہی میں استغاثہ پیش کرنا، ملائکہ کی مدد کا آنا، مُسلمانوں پر اُونگھ طاری کرکے تازہ دم کر دینا، آسمان سے پانی کا برس کر مسلمانوں کے حق میں رحمت ثابت ہونا، یہ کل معاملات اُس آن ہی نہیں پیش آگئے تھے جس آن میں مُسلمان مدینہ سے نکلے تھے بلکہ یہ ایک طویل سلسلہ تھا جو ایک مدت کے اندر وقوع پذیر ہوتا رہا ہے۔

پس اگر بقول مولانائے مرحوم آیت " کَمَآ اَخۡرَجَكَ رَبُّكَ " میں اس آن کے ماسوا جو مدینہ سے خروج کے ساتھ مربوط ہے اور کچھ مُراد نہیں ہے تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ باقی وہ تمام واقعات جو اس آیت کے ساتھ مربوط کر کے بیان ہوئے ہیں "گو کلام مستانف ہی کی حیثیت میں کیوں نہ ہوں" وہ سب بھی ایک ہی آن سے متعلق ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ قطعاً باطل اور خلافِ واقعہ ہے۔ اِس لیے اس آیت کا صاف اور صریح مطلب یہ ہے کہ قرآنِ عزیز عام بول چال اور محاورہ کے مطابق یہ کہہ رہا ہے کہ مسلمانوں کو ذرا اُس واقعہ کی جانب بھی نظر کرنی چاہیے:-

" جب پروردگار نے تم کو ایک مرتبہ مدینہ سے باہر حق کی خاطر نکالا تھا اور تمہارے سامنے ایسی صورتِ حال پیش آگئی تھی کہ تم پر یہ گراں گذرنے لگا تھا کہ کیوں ہم مدینہ سے باہر نکلے کہ آخر کار ہمارے سامنے یہ صورتِ گراں بار آگئی اور یہ وہ وقت تھا جبکہ خدا نے تم سے " عیر و نفیر " میں سے ایک کا وعدہ کیا، وغیرہ وغیرہ "

یہی وجہ ہے کہ تمام مفسرین آیت " وَاِنَّ فَرِيۡقًا مِّنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ لَكٰرِهُوۡنَ " کے متعلق عربیت کے قاعدہ سے یہ فرما رہے ہیں:-

والجملة فی موضع الحال وھی حال مقدرة لان الكراھة وقعت بعد الخروج	اور یہ جملہ حال واقع ہو رہا ہے اور یہ حالِ مقدرہ ہے اس لیے کہ جس کراہت کا آیت میں ذکر ہو رہا ہے وہ مدینہ سے نکلنے کے بعد پیش آئی تو جیسا کہ ان شاء اللہ ابھی تجھ کو معلوم ہو جائے گا یا یوں کہیے کہ یہ اس پوری

کما تراہ ان شاء اللہ تعالیٰ ویعتبر ذلك ممتداً۔ [1]

حالت کا نقشہ بیان ہو رہا ہے جو مدینہ سے نکلنے کے وقت سے معرکہ بدر کے ختم تک پیش آئی، یعنی "اَخْرَجَكَ" میں اخراج سے زمانہ ممتد مراد ہے آنی مراد نہیں ہے۔

تو اب صورتِ حال یہ ہی کہ جو شخص "لکارھون" میں مذکورہ واقعۂ کراہت کو آنی قرار دیتا ہے اور اس پورے واقعہ کو مدینہ کے اندر ہونا ثابت کرتا ہے اس کے پاس تو صرف ایک ایسا تخمینی احتمال ہے جس کا ثبوت اُن قرائن سے قطعاً نہیں ملتا جو مابعد آیات میں موجود ہیں اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ آیت "اخرجك" میں اخراج آنی نہیں ہے بلکہ وہ ممتد مدت مراد ہے جس میں یہ معرکہ پیش آیا، تو بعد کی تمام آیات بلا شبہ اس کے دعوے کے لیے واضح قرینہ بنتی اور دعوے کی تصویب کرتی نظر آتی ہیں۔

(۲) دوسرا مقام سورۃ انفال ہی کی وہ آیات ہیں جو "مَا اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعَانِ" سے شروع ہو کر "وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ" پر ختم ہوتی ہیں۔ ان آیات میں قرآنِ حکیم نے اول مسلمانوں اور مشرکوں کے محاذِ جنگ کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ مسلمانوں کا محاذِ جنگ مدینہ سے قریب وادی میں تھا اور مشرکینِ مکہ ان کے بالمقابل جانبِ بعید کی وادی میں خیمہ زن تھے اور اس وقت ابوسفیان کا قافلہ مسلمانوں کی وادی سے نیچے نیچے سمندر کے کنارے اس طرح گذر رہا تھا کہ وہ مکی فوج کی پشت پر تھا کہ اگر وہ چاہے تو مسلمانوں کی زد سے محفوظ ہو کر بے خوف اپنی فوج کی مدد کر سکتا ہے:

"وَاِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْیَا وَھُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰی وَالرَّکْبُ اَسْفَلَ مِنْکُمْ"

اور اس کے بعد کہتا ہے کہ یہ صورتِ حال مسلمانوں کے لیے اس درجہ ناسازگار تھی کہ اگر تقدیرِ الٰہی یہ فیصلہ نہ کر لیتی کہ بدر کا معرکہ ضرور پیش آئے گا، اور اس کا انجام مسلمانوں کے حق میں ہوگا اور جنگ کے معاملہ کو مسلمانوں اور مشرکوں کے باہمی عہد و پیمان پر چھوڑ دیا جاتا تو مسلمان آپس میں بھی مختلف المیعاد ہو جاتے، بعض کہتے کہ اس میدان میں حق و باطل کا

[1] روح المعانی، جلد ۹ ص ۲۵۱ و ابن کثیر و روح البیان والبحر المحیط وغیرہ۔

فیصلہ ہوجائے تو اچھا ہے' اور بعض کہتے کہ ہم ان ناسازگار حالات میں ہرگز جنگ کی طاقت نہیں رکھتے' اس لیے دوسرے وقت کے لیے اس جنگ کو ٹال دینا چاہیے' اور نفیرؔ کی جگہ "عیرؔ" کو قبضہ میں کر لینا چاہیے جیسا کہ پیش آیا اور بعض کو جنگ کا معاملہ سخت گراں گذرا، اور ہو سکتا تھا کہ سب ہی مسلمان یہ چاہتے کہ اس وقت معرکۂ جنگ بپا نہ ہو، اور مشرکین اپنے سازو سامان کے زعم پر یہ اصرار کرتے کہ اسی وقت اور اسی جگہ معرکہ ہو جانا از بس ضروری ہے' اور یہ نقشہ سامنے آجاتا وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيعَادِ مگر ہوا یہ "وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا۔"

ان آیات میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ اگر مشرکینِ مکہ کی فوج کشی کا حال مسلمانوں کو مدینہ ہی میں معلوم ہوگیا تھا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے مدینہ ہی میں وہ مشورہ فرمایا تھا جس کا ذکر تمام کتبِ حدیث و سیرت میں موجود ہے اور اسی مقام پر خدا نے احد الطائفتین کا وعدہ فرما کر اپنے نبی کو وحی کے ذریعہ یہ بھی بتا دیا تھا کہ خدا کی مرضی معرکۂ حق و باطل کی ہے، قافلہ پر تسلط کی نہیں ہے' تو پھر عقل حیران ہے کہ ان تمام امور کے معلوم ہو جانے کے بعد مسلمان خود کو کس لیے بے سروسامان سمجھ رہے تھے اور کس وجہ سے بعض مجاہدینِ اسلام جنگ سے جی چُرا رہے تھے، جبکہ مدینہ میں مسلمانوں کے پاس ہزاروں اُونٹ موجود تھے، گھوڑے بھی کم نہیں تھے، سَو پچاس گھوڑوں کا مہیا ہونا معمولی بات تھی، تلواروں اور نیزوں کی بھی کچھ کمی نہیں تھی' اور ان سب باتوں پر مستزاد یہ کہ جب ان کو دشمنوں کی عددی طاقت کا بھی صحیح اندازہ تھا تو آخر وہ کیا سبب تھا کہ مسلمان جن میں انصار بھی ہیں اور مہاجرین بھی صرف تین سَو تیرہ (۳۱۳) ہی کی تعداد میں کیوں نکلے ؟ اور نکلے بھی ہیں بے سروسامانی کے ساتھ کہ نیزے اور تلواریں تک بھی ہر ایک کے پاس موجود نہیں' چہ جائیکہ باقی سامانِ حرب و ضرب مکمل ہوتا، اور کیا بدر کے اس واقعہ کے علاوہ کسی بھی ایسے غزوہ یا سریہ کا حوالہ دیا جا سکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے

مدینہ میں بیٹھ کر تیاری فرمائی ہو اور مسلمانوں میں دشمن کے مقابلہ کے لیے وہ ہراسانی اور گرانی پیدا ہوئی ہو جس کا ذکر قرآن ان جملوں میں کرتا نظر آتا ہے: "وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لَکٰرِهُوْنَ" "یُجَادِلُوْنَکَ فِی الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَیَّنَ کَاَنَّمَا یُسَاقُوْنَ اِلَی الْمَوْتِ" "وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِی الْمِیْعٰدِ"

کیا ہمارے سامنے غزوۂ تبوک (غزوۂ عسرت) کا نقشہ موجود نہیں ہے کہ دشمن کی تعداد لاکھوں تک پہنچی ہوئی ہے اور مشرکین مکہ جیسے غیر متمدن نہیں بلکہ متمدن عیسائی طاقت سے معاملہ ہے جو ہر قسم کے متمدن ساز و سامانِ جنگ سے مسلح ہے اور پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں نہیں مدینہ کے قرب و جوار میں نہیں، بلکہ خود دشمن کے گھر پر جا کر معرکۂ حق و باطل گرم کرنا چاہتے ہیں، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ایک مسلمان بھی ہراساں نہیں، گراں خاطر نہیں، بلکہ پروانہ وار نثار ہونے کو ایک دوسرے پر بازی لیجانے کے لیے مدینہ سے تبوک کی جانب قدم بڑھا رہے ہیں۔

بات بالکل صاف ہے کہ مسلمان درحقیقت اس بے سرو سامانی کے ساتھ لڑنے کے لیے نہیں بلکہ قافلہ پر قبضہ کرنے کے لیے نکلے تھے اور اس کے لیے یہ جمعیت اور یہ صورتِ حال کافی تھی لیکن بدر کے قریب پہنچ کر اچانک صورتِ حال تبدیل ہو گئی اور مسلمانوں کو دو باتوں کا ایک ساتھ علم ہوا: ابوجہل مکہ سے لشکر کشی کر کے آرہا ہے، اور ابوسفیان کا قافلہ بدر سے گذر کر مکہ جا رہا ہے، تب وہ سب کچھ پیش آیا جس کو تفصیل کے ساتھ سن آئے ہو، اور یہی وہ حالت تھی جس کا ذکر قرآن نے اس طرح کیا:۔

"وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لَکٰرِهُوْنَ" اور "لَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِی الْمِیْعٰدِ"

بہر حال ان ہر دو مقامات کا تبادر، کلامِ الٰہی کا سیاق و سباق، اور آیات کے اندر موجود قرائن و دلائل کے سامنے مصنفِ سیرت النبی کا "کَمَآ اَخْرَجَکَ رَبُّکَ مِنْ بَیْتِکَ" کے اجمال سے بے دلیل ایک دعویٰ کر دینا کسی طرح صحیح نہیں ہے اور آیت "وَاِنَّ فَرِیْقًا

مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكَارِهُوْنَ" میں "و" حالیہ کے لیے بقاعدۂ عربیت ہرگز یہ ضروری نہیں کہ حال اور ذوالحال کا زمانہ اس طرح ایک ہو کہ دونوں آن واحد سے وابستہ ہوں بلکہ زمانہ کا امتداد نہ صرف ممکن الوقوع بلکہ اکثر الوقوع ہوتا ہے، نیز "حالِ مقدرہ" کی مثالیں کلام عرب میں بیشتر موجود ہیں اور "حالِ مقدرہ" کا حاصل یہ ہے کہ جو واقعہ کسی ایک بات کی بنا پر آئندہ قریبی زمانہ میں پیش آنے والا ہے اس کو بربیلِ تقدیر واو حالیہ کے ساتھ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ گویا وہ اسی آن میں پیش آیا ہے کیونکہ اس کا پیش آنا یقینی ہے اور اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ "مدینہ سے خروج اس حالت میں ہوا کہ جب صورتِ حال نازک بن کر سامنے آئی تو مسلمانوں کے ایک گروہ پر گراں گزرنے لگا کہ اے کاش! مدینہ سے کیوں نکلے جو اس صورت کے ساتھ دوچار ہونا پڑا۔

(۳) یہ بھی واضح نہیں ہے کہ کاروانِ تجارت مسلمانوں کے ہاتھ سے اس طرح بچ کر نکل گیا تھا کہ مسلمان اس کا تعاقب نہ کر سکیں اور اس کو قابو میں نہ لا سکیں، چنانچہ آیت "وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ" اس پر صاف دلالت کر رہی ہے، البتہ مسلمانوں کو اپنے جاسوسوں کے ذریعہ جو کچھ قافلہ کے متعلق معلوم ہوا تھا اس کے پیشِ نظر یہ خیال اب بھی تھا کہ ابوسفیان کا قافلہ بدر ہی کے راستہ سے گذرے گا، اور اس لیے وہ وادیٔ ذفران میں مشورہ کے وقت کاروانِ تجا[رت] کے طالب تھے، اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ کیا کہ دونوں میں سے کسی ایک گروہ پر تم کو ضرور مسلط کر دیں گے، درحقیقت حال کے پیشِ نظر ہی یہ بھی اپنے رسول کو بتلا دیا کہ "عیر" سے نہیں بلکہ "نفیر" سے تم کو واسطہ پڑے گا اور تم کامیاب ہو گے۔

اس صورتِ حال کو اگرچہ بعض اصحابِ سیرت نے واضح نہیں کیا، مگر محققین اربابِ سیر نے اس حقیقت کو مستند روایات سے ثابت کیا ہے:۔

چنانچہ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر اور تاریخ میں اور حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری اور شیخ بدرالدین عینیؒ نے عمدۃ القاری میں بسند اس واقعہ کو حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ

سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں :۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	ہم مدینہ میں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
ونحن بالمدینۃ انی اخبرت عن	مجھے ابھی معلوم ہوا کہ ابی سفیان کا کاروانِ تجارت شام
عیر ابی سفیان انھا مقبلۃ فھل	سے آرہا ہے۔ کیا تم تیار ہو کہ اس سے قبل اس کی راہ
لکم ان تخرجوا قبل ھذا العیر	گھیر لو، کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس بہانہ ہم کو مالِ غنیمت
لعل اللہ یغنمناھا فقلنا نعم	عطا کردے۔ ہم سب نے عرض کیا "ہاں" پس آپؐ بھی
فخرج وخرجنا فلما سرنا یوما	نکلے اور ہم بھی نکلے، ابھی ایک یا دو دن کی مسافت پر ہی
او یومین قال لنا ما ترون فی	پہنچے تھے کہ آپؐ نے فرمایا: مجھے معلوم ہوا ہے کہ اہلِ مکہ
قتال القوم فانھم قد اخبروا	فوج کشی کے ارادہ سے آرہے ہیں، اب کیا ارادہ ہے؟
بخروجکم فقلنا لا واللہ ما لنا	تب ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! قسم بخدا اس حالت
طاقۃ لقتال العدو ولکنا	میں ہم میں دشمن کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے، البتہ
اردنا العیر۔ (الحدیث)[1]	قافلہ پر حملہ کا ارادہ ضرور ہے۔

یہ اور اسی قسم کی روایات بکثرت موجود ہیں جن میں صراحت ہے کہ مسلمان وادئ ذفران میں کاروانِ تجارت پر حملہ آور ہونے کے متوقع تھے اور وجہ یہی تھی کہ ان کے جاسوسوں نے بدر میں اس کے آنے کی خبر دی تھی۔

(۴) آیت " تَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ (الآیہ) میں جمہور کے نزدیک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی جانب ہیں جس جانب خدا ہے اور جب بعض مسلمانوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رُخ کو پہچان لیا تو پھر وہ بھی خدا اور خدا کے رسولؐ کی مرضی کے ساتھ ہوگئے، اس لیے اس حقیقت کو ان جذباتی الفاظ سے بے حقیقت نہیں بنلیا جاسکتا :۔

ایک طرف وہ لوگ ہیں جو قافلہ تجارت پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، دوسری طرف خدا ہے

[1] تفسیر ابن کثیر برحاشیہ [illegible] ۔ جلد ۴ ص ۲۶۱ ۔

(جو چاہتا ہے) کہ حق کو قائم کردے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے، اب سوال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان دو میں سے کس کے ساتھ ہیں؟ عام روایتوں کے مطابق اس سوال کا کیا جواب ہوگا، میں اس تصور سے کانپ اٹھتا ہوں[1]

۵ واقعہ کی نوعیت دراصل وہ نہیں ہے جس کو بزعم خود مصنف سیرت النبی نے گڑھ کر بیان کردیا اور پھر اس پر سوالات قائم کردیے، بلکہ نوعیتِ واقعہ وہ ہے جس کو ہم بصراحت و بدلائل ابھی بیان کر آئے ہیں، اور جس کو تسلیم کرنے کے بعد شبہ اور اعتراض کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

۶ "لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ" مسلمانوں میں جو لوگ صحیح و تندرست ہوتے ہوئے بھی گھروں میں بیٹھے رہے تو وہ ان کے برابر ہرگز نہیں ہوسکتے جو اپنی جان و مال کے ذریعہ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں"

بیشک صحیح بخاری میں اس آیت کے متعلق حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے "کہ یعنی وہ لوگ جو بدر میں نہیں شریک ہوئے اور وہ جو شریک ہوئے دونوں برابر نہیں ہوسکتے، اور یہ صحیح ہے کہ صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ پہلے آیت میں "غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ" کا جملہ نہیں نازل ہوا تھا تو آیت سن کر حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ خدمت اقدسؐ میں حاضر ہوئے اور اپنے نابینا ہونے کا عذر کیا، اس پر وہیں یہ جملہ نازل ہوا "غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ"۔ لیکن اس کے باوجود مصنفِ سیرت النبی کا اِس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں ہے:

"یہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں معلوم ہوگیا تھا کہ قافلہ پر حملہ کرنا نہیں بلکہ لڑنا اور جان دینا ہے۔"

یہ نتیجہ اخذ کرنا اس لیے درست نہیں ہے کہ اس آیت کے شانِ نزول کے متعلق تین صحابیوں سے روایات منقول ہیں ان میں سے دو صحابہ زید بن ثابتؓ اور براء بن عازب

رضی اللہ عنہا تو غزوۂ بدر سے جُدا اس کا نزول بیان کرتے ہیں۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہا) بدر کے ساتھ اس کو وابستہ فرماتے ہیں لہٰذا اس اختلاف کو دیکھ کر مشہور اور محقق محدثین اور شارحین بخاری، ابن تین اور بدرالدین عینی (رحمہا اللہ) یہ فرماتے ہیں کہ صحابہ (رضی اللہ عنہم) کا یہ عام قاعدہ ہے کہ اگرچہ کسی آیت کا تاریخی اور حقیقی شانِ نزول ایک خاص واقعہ سے متعلق ہو، لیکن اس آیت کے مفہوم و مصداق میں جس قدر واقعات و جزئیات داخل ہو سکتی ہیں، ان سب کے متعلق یہ کہدیا کرتے ہیں کہ اس آیت کا شانِ نزول یہ واقعہ ہے[1]

لہٰذا جبکہ تمام علماء تفسیر اس پر متفق ہیں کہ اس آیت کا تاریخی شانِ نزول بدر کا واقعہ نہیں ہے تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہا کا یہ ارشاد اسی عموم کے اعتبار سے ہے، جبکہ بدر کے معرکہ میں بھی مسلمان دو حصوں میں منقسم تھے، ایک شریکِ جنگ اور دوسرے مدینہ میں مقیم تو بلاشبہ فضیلتِ درجات میں دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ حضرتِ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بطریقِ تفسیر یہ فرمایا ہے: "لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ عَنْ بَدْرٍ والخارجون الی بدر" بطور واقعہ اس کو نقل نہیں کیا اور اسی لیے حضرتِ عبداللہ بن مکتوم کے واقعہ کا بھی ذکر نہیں فرمایا اور ترمذی میں اس قسم کی تفصیل اگر منقول ہے تو خود ترمذیؒ نے یہ کہہ کر اس تفصیل کو کمزور کر دیا ہے۔ هذا حديث حسن غريب من هذا الوجه من حديث ابن عباس: "یہ حدیث اس تفصیل طریقہ پر ابن عباسؓ سے بسند حسن غریب ثابت ہوئی" یعنی اس ایک راوی کے علاوہ دوسرا کوئی طریقِ سند موجود نہیں ہے جس میں حضرتِ عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) کی روایت میں حضرتِ عبداللہ بن ام مکتومؓ کا واقعہ منقول ہو، اور اسی لیے امام بخاریؒ نے اس تفصیل کو قابلِ ترک سمجھ کر فقط تفسیر کو ہی لیا ہے۔

پس اس آیت کو بھی اپنے دعوے کے لیے سند بنانا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

(۷) کفارِ قریش جو مکہ سے لڑنے کے لیے بدر میں آئے ان کی نسبت قرآن مجید

[1] فتح الباری، جلد ۸ ص ۲۱۱ مصری وعینی جلد ۸ ص ۵۶۴۔

میں ہے: "وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ" "اُن لوگوں کی طرح نہ بنو جو اپنے گھروں سے مغرورانہ نمائش اور خدا کی راہ سے روکے ہوئے نکلے" "اگر قریش صرف قافلۂ تجارت کے بچانے کے لیے نکلتے تو خدا کیوں کہتا کہ وہ اظہارِ شان اور دکھاوے کے لیے خدا کی راہ سے لوگوں کو روکتے ہوئے نکلے الخ"

یہ بھی مصنفِ سیرت النبی کا ایک انوکھا استدلال ہے، اس لیے کہ جن روایات میں یہ ہے کہ کفارِ قریش قافلۂ تجارت کے بچانے کے لیے نکلے، ان ہی میں یہ بھی بصراحت موجود ہے کہ جب ابوسفیان نے قاصد کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ ہم مسلمانوں کی زد سے بچ گئے ہیں۔ تم اب تم واپس چلے جاؤ، تو ابوجہل نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ اب تو ہم مسلمانوں کا قلع قمع کر کے ہی بیٹھیں گے، اور یہی وہ جذبہ تھا جس نے کفارِ قریش کو بدر کی جانب اس نخوت کے ساتھ پیش قدمی کے لیے اُبھارا جس کا ذکر قرآنِ حکیم اس آیت میں کر رہا ہے

اس کے بعد مولانا مرحوم نے احادیث سے اپنے مقصد کی تائید چاہی ہے اور اس سلسلہ میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ تمام ذخیرۂ حدیث میں کعب بن مالک کی روایت کے علاوہ کہیں یہ مذکور نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدر میں قریش کے قافلۂ تجارت پر حملہ آوری کے لیے نکلے، نیز کعب بن مالکؓ کی روایت مولانا کے نزدیک متعدد وجوہ سے قابلِ بحث ہے

حضرتِ کعب (رضی اللہ عنہ) کی روایت بخاری میں اس طرح منقول ہے:

عن عبد اللہ بن کعب قال کعب	کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں رسول اللہ
لم اتخلف عن رسول اللہ صلی اللہ	صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر کسی غزوہ میں پیچھے نہیں رہا۔
علیہ وسلم فی غزوۃ غزاھا الا غزوۃ	بجز غزوۂ تبوک کے، اور ہاں غزوۂ بدر میں بھی شریک
تبوک غیر ان کنت تخلفت فی	نہیں تھا، اور جو اس میں شریک نہیں ہوا اُس پر
غزوۃ بدر ولم یعاتب احد تخلف	کچھ عتاب نہیں، کیوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

عنہا انما خرج النبی صلے اللہ علیہ وسلم قریش کے قافلہ کے لیے نکلے تھے کہ خدا نے
یرید عیر قریش حتی جمع اللہ بینہم دونوں فریق کو اچانک مقابل کر دیا۔
وبین عدوھم علی غیر میعاد۔ (جلد ثانی کتاب الغزوات)

حضرت کعبؓ کی اس روایت کی تائید ذخیرۂ حدیث میں دیگر روایات سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ گذشتہ صفحات میں ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث جس کو ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم سے تمام محدثین و ارباب سیر نے نقل کیا ہے گذر چکی ہے اس میں صراحت کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اوّل مدینہ سے ابوسفیان کے قافلہ کے لیے نکلے اور جب ایک یا دو دن کی مسافت پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ کفارِ مکہ کا لشکر مقابلہ کے لیے آرہا ہے، تب آپؐ نے پھر مشورہ کیا اور اسی مشورہ میں بعض مسلمانوں نے جنگ کے حق میں گرانی کا اظہار کیا اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ذخیرۂ حدیث میں کعب کی روایت کے علاوہ کوئی روایت اس کو ظاہر نہیں کرتی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے ابوسفیان کے قافلہ کے لیے نکلے تھے۔

رہا کعب کی حدیث کا معرضِ بحث ہونا تو یہ دعویٰ خود محلِ نظر ہے جو حسب ترتیب لائق توجہ ہے:۔

(۱) فرماتے ہیں کہ حضرت کعب چونکہ غزوۂ بدر میں شریک نہیں تھے، اس لیے ان کی روایت اس موقع پر مشاہدہ و واقعیت کی روایت نہیں۔

میدانِ استدلال میں یہ عجیب دلیل ہے اس لیے کہ جب مصنف سیرت النبی کا یہ دعویٰ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے شروع ہی میں کفار قریش سے جنگ کے ارادہ سے نکلے تھے اور مدینہ میں ہی مشہور تاریخی مشورہ فرمایا تھا تو کعب بن مالکؓ خواہ غزوۂ بدر میں شریک نہ ہوئے ہوں، لیکن مدینہ میں بہر حال موجود تھے، اس لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انصار و مہاجرین سے مشورہ فرمائیں اور موجودہ

صحابہؓ شرکت نہ کریں، لہٰذا حضرت کعبؓ کی روایت کو مشاہدہ وواقعیت کی روایت تسلیم نہ کرنا قطعاً بے سند ہے، البتہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ جنگ کے متعلق مشورہ مدینہ سے باہر کسی وادی میں ہوا تھا، تب یہ بیشک کہا جا سکتا ہے کہ کعبؓ اگر اس مشورہ کے متعلق کچھ فرمائیں تو وہ مشاہدہ وواقعیت کی روایت نہیں ہوگی کیونکہ وہ غزوۂ بدر میں شریک نہیں تھے۔

(۲) اس واقعہ کی روایت سے ان کا مقصود یہ ہے کہ غزوۂ بدر کی اہمیت کم ہو جائے تاکہ عدم شرکت سے ان کا وزن کم نہ ہو۔الخ

مولانا کا ایک صحابی کے متعلق یہ سوءِ ظن بھی قطعاً بے سند اور بے دلیل ہے اسلیے کہ حضرت کعبؓ بدر کی اہمیت کو کم کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس کی اہمیت اور عظمت کا احساس ہی اُن کو اس پر مجبور کر رہا ہے کہ وہ اپنی عدم شرکت کے لیے یہ معذرت پیش کریں کہ ان کو یہ سعادت اس لیے نصیب نہ ہو سکی کہ جب مسلمان مدینہ سے نکلے تھے تو چونکہ کاروانِ تجارت کے لیے نکلے تھے اس لیے سب کی شرکت ضروری نہیں تھی تاہم جو نکلے اُن کو وہ بے نظیر شرف ہاتھ آگیا جس سے ہم جیسے محروم رہ گئے۔

کعب بن مالکؓ کی اس روایت میں ایک اور باریک نکتہ مستور ہے جو مولانا کے دعوے کو یکسر پا در ہوا بنا دیتا ہے، وہ یہ کہ حضرتِ کعبؓ اس جانب بھی توجہ دلا رہے ہیں کہ اگر بدر کا معرکہ غزوۂ تبوک کی طرح مدینہ کے اندر ہی طے شدہ ہوتا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے اس ہی غرض کے لیے نکلتے تو یہ ناممکن تھا کہ اس قدر اہم اور عظیم الشان غزوہ کے لیے "نفیرِ عام" نہ ہوتا اور جو لوگ جی چرا کر یہاں بیٹھ رہتے واپسی پر اُن سے باز پُرس نہ کی جاتی، جبکہ غزوۂ تبوک میں انہی کعبؓ اور ان کے دو رفقاء سے عدمِ شرکت پر اس قدر سخت باز پُرس ہوئی تھی کہ ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن کے مقاطعہ کا حکم صادر فرما دیا تھا اور جب تک ان کی توبہ کے قبول پر وحی الٰہی کا نزول نہیں ہوا تقریباً پچاس دن مقاطعہ کا سِلسلہ جاری رہا، اِس لیے یہ یقین کرنا چاہیے کہ

غزوۂ تبوک میں مجھ پر ناراضی کا اظہار اور مقاطعہ کا اعلان، اور بدر میں ان امور کا فقدان بلاشبہ اس لیے تھا کہ معرکۂ بدر ارادی نہیں تھا بلکہ حسب اتفاق بالکل اچانک پیش آگیا اور درحقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان مدینہ سے "عیر" کے ہی لیے نکلے تھے۔ غرض حضرت کعبؓ غزوۂ بدر کی حیثیت کو کم کرنا نہیں چاہتے، بلکہ اپنے عذر عدمِ شرکت کی مقبولیت کو ظاہر کرنا اور واقعہ کی نوعیت کو واشگاف کرنا چاہتے ہیں۔

پھر یہ عجیب بات ہے کہ مصنف سیرت النبی تو یہ معلوم کر سکیں کہ قرآن ناطق ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے ہی کفار قریش کے مقابلہ میں نکلے اور ان کے بقول احادیث بھی یہی صراحت کر رہی ہیں، لیکن کعبؓ بن مالک پر ساری عمر یہ حقیقت آشکارا نہ ہو سکی، ہاں یہ حقیقت جدا ہے کہ مولانا کے نزدیک کعبؓ بن مالک اپنی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لیے جان بوجھ کر کذب بیانی تک پر آمادہ ہو گئے، مگر میں تو اس کے تصور سے بھی کانپ اٹھتا ہوں۔

(۳) مولانا کے نزدیک بخاری میں مذکور کعبؓ بن مالک کی روایت حضرت انسؓ کی اس روایت کے بھی خلاف ہے جو مسلم اور مصنف ابن ابی شیبہ میں منقول ہے۔

عن انس ان رسول اللہ صلعم	حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ
شاور حین بلغہ اقبال ابی سفیان	علیہ وسلم کو جب ابو سفیان کے آنے کی خبر معلوم ہوئی
قال فتکلم ابو بکر فاعرض عنہ	تو آپ نے مشورہ طلب کیا۔ حضرت ابوبکرؓ بولے تو
فتکلم عمر فاعرض عنہ فقام	آپ نے توجہ نہ فرمائی۔ پھر حضرت عمرؓ بولے، آپ نے
سعد بن عبادۃ فقال ایانا ترید	ان کی طرف بھی توجہ نہ کی، پھر سعد بن عبادہؓ کھڑے
یا رسول اللہ والذی نفسی بیدہ	ہوئے اور کہا یا رسول اللہ! کیا آپ کا روئے خطاب
لو امرتنا ان نخیضھا البحر	ہم انصار کی طرف ہے، خدا کی قسم اگر دریا میں سواری
لاخضناھا۔ الخ	ڈالنے کا آپ حکم دیں تو ہم ڈال دیں گے۔ الخ۔

یعنی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ابو سفیان کے آنے کا حال معلوم ہوا تو اسی وقت آپؐ نے مہاجرین و انصار سے مشورہ کیا، اور انصار سے اعانت کی خواہش کی، اور ابو سفیان کی آمد کا حال مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا ہے، اس بنا پر یہ محقق طور پر ثابت ہو گیا کہ اس غزوہ کی شرکت کے لیے آپؐ نے انصار سے مدینہ ہی میں خواہش کی تھی۔

مگر مولانا کا یہ استدلال بھی صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ اس روایت میں راوی نے ایک بہت بڑی غلطی کر دی ہے وہ یہ کہ اس نے انصار مقررین میں سعد بن عبادہؓ کا نام لیا ہے، حالانکہ تمام محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت سعد بن عبادہؓ غزوۂ بدر میں شریک نہیں تھے اور تمام ذخیرۂ حدیث میں اس تقریر کو حضرت مقدادؓ کی جانب منسوب کیا گیا ہے اور یہی صحیح و درست ہے، البتہ سعد بن عبادہؓ نے اسی قسم کی تقریر حدیبیہ کے موقع پر کی تھی جس کا ذکر روایات میں بکثرت موجود ہے تو ثابت ہوا کہ اس روایت میں راوی نے واقعہ کو خلط ملط کر دیا ہے، پس حدیثِ انسؓ کے ابتدائی جملوں میں بھی یا تو ابہام و اجمال ہے اور یا راوی کے وہم کی وجہ سے مدینہ کے ابتدائی مشورہ اور وادیٔ ذفران کے مشہور تاریخی مشورہ کے درمیان خلط ہو گیا ہے، چنانچہ مشہور محدث اور بخاری کے شارح حافظ ابن حجرؒ بھی روایتِ انسؓ کا ذکر کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں:۔

ووقع فی مسلم ان سعد بن	اور مسلم میں ہے کہ سعد بن عبادہؓ نے وہ تقریر کی جو مقدادؓ کی
عبادۃ ھو الذی قال ذلک وکذا	جانب منسوب ہے اور ابن ابی شیبہؒ نے بھی "مصنف" میں
اخرجہ ابن ابی شیبۃ من مرسل	اسی طرح عکرمہ کے مرسل کے ذریعہ نقل کیا ہے اور اس پر
عکرمۃ وفیہ نظر لان سعد بن	اعتراض واقع ہوتا ہے اس لیے کہ سعد بن عبادہؓ غزوۂ بدر
عبادۃ لم یشھد بدرا وان کان یعد	میں شریک نہیں ہوئے۔ ہاں حدیثِ مسلم کے اس مضمون کو
فیھم لکونہ ممن ضرب لہ بسھمہ (؟) بان النبی صلی اللہ علیہ وسلم استشارھم	دوسری صحیح حدیث کے ساتھ اس طرح جمع کیا جا سکتا ہے
فی غزوۃ بدر مرتین الاولیٰ	کہ در اصل بدر کے معاملہ میں دو مشورے ہوئے ہیں: ایک

وهو بالمدینة اول ما	مدینہ کے اندر ہوا جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ابو سفیان
بلغہ خبر العیر مع ابی سُفیان	کے قافلہ کا حال معلوم ہوا مسلم کی روایت میں شاید اس کا
وذٰلك مبیّن فی روایة	ذکر ہے اور دوسرا مشورہ راستہ میں وادیٔ ذفران میں ہوا
مسلم ووقع عند الطبرانی	جیسا کہ فتح الباری میں بصراحت مذکور ہے اور طبرانی میں
ان سعد بن عبادة قال	ہے کہ دراصل سعد بن عبادہؓ کی یہ تقریر حدیبیہ کے موقع پر
ذٰلك بالحدیبیة وھٰذا	ہوئی تھی (اور راوی نے اس جگہ خلط ملط کر دیا ہے)
اولیٰ بالصواب۔	اور یہی صحیح اور درست ہے)

غرض حضرتِ انسؓ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے بھی مولانا کا استدلال صحیح نہیں ہے۔

رہا یہ معاملہ کہ انصار جب قافلہ کے لیے مدینہ سے نکل چکے تھے، تو پھر اس اہمیت کے ساتھ وادیٔ ذفران میں ان کی رائے معلوم کرنے کی ضرورت ہی کیا باقی رہ گئی تھی تو یہ شبہ بھی نادرست ہے، کیونکہ سابق میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے نکلتے وقت بھی ابو سفیان کے قافلہ پر قابض ہونے کے لیے مہاجرین وانصار سے مشورہ کیا تھا، وہ غالباً اس لیے کیا ہوگا کہ انصار بھی شریک ہونا چاہتے ہیں اور جب اچانک جنگ کا یہ معاملہ بہت ہی شدید پیش آگیا اور صورتِ حال انتہائی نازک ہو گئی تو انصار سے دریافت کرنا ازبس ضروری تھا کہ اس حالت میں بھی وہ مدینہ سے باہر معرکہ آرائی کے لیے تیار ہیں یا نہیں۔

بہرحال بخاری، نسائی، ترمذی اور دیگر کتبِ حدیث میں مذکور غزوۂ بدر سے متعلق روایات کے خلاف مسلم کی روایت انسؓ کے آخری ٹکڑوں میں جو کچھ بھی مذکور ہے وہ سب اسی مشورہ سے متعلق ہے جو وادیٔ ذفران میں مدینہ سے باہر ہوا تھا، اور تمام صحیح روایات کے خلاف یہ راوی کا وہم ہے کہ اس نے پہلے ٹکڑے کے ساتھ دوسرے ٹکڑوں کو اِس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ گویا یہ سب کچھ ابو سُفیان کے قافلہ کے وقت ہی پیش آیا تھا

اور اس پر بھی مستزاد یہ کہ اس روایت میں کفار قریش سے جنگ کا اشارہ تک بھی نہیں ہے کہ مولانا کے لیے دلیل ہو سکے، بلکہ ابو سفیان کے قافلہ ہی کا مذکور ہے، اس لیے مولانا کو پھر اس روایت کے ٹکڑوں کو بھی اپنے موافق بنانے میں تکلفات کرنے پڑتے ہیں۔

اِسی طرح مولانا نے مرحوم کا حضرتِ علی (رضی اللہ عنہ) کی اس روایت سے استناد بھی صحیح نہیں جس میں بدر کے واقعہ کا ان الفاظ میں ذکر ہے :۔

عن علی قال لما قدمنا المدینة اصبنا	حضرتِ علیؓ فرماتے ہیں کہ جب ہم مدینہ آئے تو وہاں
من ثمارها فاجتوینا واصابنا بها وعك	پھل کھانے کو ملے جو ہمارے ناموافق مزاج تھے
وکان النبی صلی الله علیه وسلم یتخبر عن بدر	اس لیے ہم بیمار ہو گئے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
فلما بلغنا ان المشرکین قد اقبلوا سار	بدر کو پوچھا کرتے تھے، جب ہم کو خبر ملی مشرکین آ رہے ہیں
رسول الله صلی الله علیه وسلم الی بدر وبدر	تو رسول اللہؐ بدر کو چلے۔ بدر ایک کنویں کا نام ہے
بئر فسبقنا علی المشرکین الیها۔ (احمد)	جہاں ہم مشرکین سے پہلے پہنچ گئے۔

یہ روایت طویل ہے مگر اس میں ابتدائی واقعات کو نظر انداز کر کے صرف معرکے کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے چنانچہ اس میں نہ مدینہ کے اندر مشورہ کا ذکر ہے، نہ بعض مسلمانوں کی کراہت اور گرانی کا تذکرہ ہے اور نہ مہاجر و انصار کی ولولہ انگیز تقاریر مذکور ہیں، حتّٰی کہ مسلمانوں کی تعداد اور بے سر و سامانی تک کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے، اور اس پر طرّہ یہ کہ مدینہ کی آمد کے وقت مہاجرین کی ناموافق آب و ہوا کے بعد ہی متصل بدر کے واقعہ کا ذکر شروع کر دیا گیا ہے، حالانکہ اس درمیان میں کتنے سرایا اور دوسرے اہم واقعات پیش آ چکے تھے جو کتبِ احادیث میں بسندِ صحیح منقول ہیں۔

پس اگر حضرتِ علیؓ کی یہ روایت اس بات کے لیے سند ہو سکتی ہے کہ اس میں قافلہ کے لیے نکلنے کا کوئی ذکر نہیں ہے، بلکہ مشرکینِ مکہ سے جنگ کا ہی ذکر ہے تو بلا شبہ یہ روایت اُس شخص کے لیے ہی سند ہو سکتی ہے جو بدر کے معرکے سے متعلق ان تمام

ابتدائی واقعات کا انکار کردے جس کا اس روایت میں ذکر موجود نہیں ہے حالانکہ قرآن اور دوسری روایات میں بصراحت وہ واقعات مذکور ہیں۔

روایت و درایت کا مُسلّمہ اصول ہے کہ جب ایک ہی واقعہ سے متعلق مفصل و مجمل دونوں قسم کی روایات بسندِ صحیح موجود ہوں تو ہمیشہ مجمل کی تفصیل و تشریح مفصل ہی کے ذریعہ کی جائے گی، اور اگرچہ بہت سے مقامات پر مولانا بھی اس کو تسلیم فرماتے ہیں مگر یہاں نہ معلوم کیوں نظر انداز کرنا چاہتے ہیں۔

تفصیل و اجمال کی اس حقیقت کے پیشِ نظر ابن جریرؒ نے اپنی تاریخ میں، امام احمدؒ نے مسند میں، ابن ابی شیبہؒ نے مصنف میں، اور بیہقیؒ نے دلائل میں بدر کی مفصل و مجمل روایات کے ضمن میں اس روایت کو بھی نقل کر دیا ہے اور جن روایات میں قافلہ کا تذکرہ ہے اور جن میں نہیں ہے ان سب کو بیان کر کے ایک دوسرے کے متضاد نہیں سمجھا ہے۔

مصنفِ سیرۃ النبی قرآن اور احادیث سے استشہاد کے بعد واقعہ کے بعض پہلوؤں سے عقلی استشہاد کرنا چاہتے ہیں جو قابلِ توجہ ہیں۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر سے قبل جس قدر سرایا بھی بھیجے ہیں ان میں سے کسی ایک میں بھی انصار کو نہیں بھیجا، پس اگر مدینہ میں ہی مشورہ نہ ہوا ہوتا تو کاروانِ تجارت کے مقابلہ میں بھی انصار نہ نکلتے حالانکہ وہ مہاجرین سے زیادہ تعداد میں نکلے، یعنی کل فوج (۳۰۵) تھی جن میں (۷۰) مہاجرین تھے، باقی سب انصار۔

لیکن یہ استشہاد بھی اس لیے درست نہیں ہے کہ کاروانِ تجارت کا یہ معاملہ چوں کہ زیادہ اہم نہیں تھا اور دشمن میں مقابلہ کی طاقت نہیں تھی، اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ چاہا کہ اس سلسلہ میں جو مالِ غنیمت ہاتھ آئے، اس میں انصار کا بھی حصہ ہو، مگر عقبیٰ میں انصار کے معاہدہ کے پیشِ نظر ضرورت تھی اس بات کی کہ ان سے مشورہ لیا جائے کہ وہ نکلنا چاہتے ہیں یا نہیں، چنانچہ کاروانِ تجارت کے سلسلہ میں مدینہ کے اندر ہی مشورہ کیا گیا تھا

جس میں انصار نے بخوشی رفاقت کو منظور کیا تھا، چنانچہ ابن کثیرؒ نے اپنی تاریخ میں ابن اسحٰقؒ سے بسند یہ روایت کی ہے :۔

لما سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بابی سفیان مقبلاً من الشام ندب المسلمین الیھم و قال ھذہ عیر قریش فیھا اموالھم فاخرجوا الیھا لعل اللہ ینفلکموھا فانتدب الناس فخلف بعضھم و ثقل بعض و ذٰلک انھم لم یظنوا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یلقی حربًا۔ [1]	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ابوسفیان کی شام سے آمد کا حال سُنا تو مسلمانوں کو کاروانِ ابوسفیان کیلیے پکارا اور فرمایا: "یہ قریش کا کاروان ہے اس میں اُن کا مالِ تجارت ہے پس اس کے لیے نکلو، کیا تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ مالِ غنیمت تمہارے ہاتھ لگا دے۔ پس لوگ تیار ہو گئے، بعض نے تو اس مقابلہ کو پسند کیا اور بعض کو نکلنا شاق گذرا کیونکہ ان کو خیال ہی نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سفر میں جنگ سے دوچار ہوں گے۔

اس روایت کا جملہ "لعل اللہ ینفلکموھا" اور "لم یظنوا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یلقی حربًا" صاف پتہ دے رہے ہیں کہ انصار اس مرتبہ اس لیے مدینہ سے نکلے کہ جنگ کا اندیشہ نہیں تھا اور کثیر مالِ غنیمت کی توقع تھی اور اسی بناء پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مرتبہ ان کو ہمراہ لینے کا ارادہ فرمایا۔

(۲) ابوسفیان کا کاروانِ تجارت جب شام سے روانہ ہو کر حدودِ مدینہ و شام سے نکل گیا اور مکہ کی راہ پر پڑ گیا، تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جاسوسوں نے اطلاع دی، اس سے قبل اطلاع نہ ہو سکی، لہٰذا مولانائے مرحوم کا یہ عقلی استدلال واقعہ کی اصل حقیقت کو نہیں بدل سکتا کہ مکہ سے شام کو جو قافلۂ تجارت جاتا تھا وہ مدینہ کے پاس سے ہو کر گذرتا تھا اس لیے شام سے آنے والے قافلہ کے لیے آپؐ کو شام کی جانب بڑھنا چاہیے تھا نہ کہ مکہ کی جانب جہاں قریش کے اثرات زیادہ تھے۔

[1] جلد ۳ ص ۲۵۶۔

جب ارادۂ الٰہی یہ ہو چکا تھا کہ بدر میں معرکۂ حق و باطل اس طرح بپا ہو کہ بظاہر اسباب مسلمانوں کے سامنے اچانک بے سروسامانی کی حالت میں دشمن سازوسامان کے ساتھ آدھمکے اور پھر خدا کی معجزانہ نصرت ویاری ظہور میں آئے تو پھر اس پر تعجب کیسا کہ مسلمانوں کو اس وقت تک قافلہ کا علم نہ ہو سکا جب تک کہ وہ مکہ کی راہ پر نہ پہنچ گیا۔

اس کے بعد مولانا نے جمہور کے مسلک کو پیشِ نظر رکھ کر پانچ دفعات میں اپنی جانب سے واقعۂ بدر کے اسباب کی ایسی ترتیب دی ہے کہ جس پر مولانا کو آخر میں یہ کہنے کا موقع مل سکا۔

"کیا واقعات کا یہ نقشہ قریش کے جوشِ عداوت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ نبوت کے موافق ہے"[1]

مولانائے مرحوم بہترین ادیب ہیں اور وہ خوب جانتے ہیں کہ کسی اچھے سے اچھے واقعہ کو بھی اگر مخالفانہ رنگ دینے کی کوشش کی جائے تو اس کو الفاظ کی تعبیرات میں بھیانک سے بھیانک رنگ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ مسئلۂ طلاق، نکاحِ بیوگان، تعددِ ازدواج جیسے مسائل کے متعلق عیسائی پادریوں اور ہندو آریہ سماجیوں نے جن توہین آمیز اور مضحکہ خیز تعبیرات میں رنگ کر اپنے معتقدین کے سامنے پیش کیا ہے، وہ نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں، مگر آج کی دنیائے تہذیب و تمدن میں جب انہی عیسائیوں اور ہندوؤں نے سیکڑوں اور ہزاروں سال کے تجربہ کے بعد یہ یقین کر لیا کہ سوسائٹی کا "معاشرتی نظام" رحمۃ للعٰلمین کے لائے ہوئے قانون کو اختیار کیے بغیر صحیح نہیں ہو سکتا، تو آج وہ پارلیمنٹ کونسل اور اسمبلیوں کے ذریعہ ان ہی قوانینِ طلاق، نکاحِ بیوگان وغیرہ کو اپنی معاشرت میں شامل اور ان امور کے جواز کے لیے بہتر سے بہتر عقلی دلائل وادبی تعبیرات اختیار کر رہے ہیں۔

پس غزوۂ بدر کیوں پیش آیا؟ اس کے لیے جمہور نے باتفاق تاریخ و سیرت یہی کہا ہے کہ مسلمانوں کا مدینہ میں محفوظ رہ کر تبلیغِ اسلام کرنا مشرکین کو کسی طرح برداشت نہ ہو سکا

[1] سیرت النبی ج ۱ ص ۳۱۹۔

اور انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی جھڑپیں شروع کر دی تھیں کہ اسی اثنار میں "سریۂ عبداللہ بن جحش پیش آگیا، جس میں اُن کا مشہور سردار عمرو بن حضرمی قتل ہوگیا اور عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان جیسے بہادر سردار قید ہوگئے، اس بنا پر کفارِ مکہ کو اشتعال آجانا ایک فطری بات تھی، چنانچہ مشہور محدث ابن کثیرؒ نے اپنی تاریخ میں اس سریہ کا عنوان ہی یہ قائم کردیا ہے: "باب سریہ عبد اللہ بن جحش التی کانت سبباً لغزوۃ بدر العظمیٰ وذٰلک یوم الفرقان یوم التقی الجمعان واللہ علی کل شئ قدیر۔" ابھی یہ اشتعال بڑھ ہی رہا تھا کہ ابو سفیان کے کاروانِ تجارت کا قصہ مزید پیش آگیا جو دراصل کاروانِ تجارت نہیں تھا بلکہ مسلمانوں کے استیصال کا وہ "سرمایہ" تھا جس کے گھمنڈ پر قریش یقین کیے بیٹھے تھے کہ جوں ہی وہ مکہ میں بحفاظت تمام پہنچ جائے گا سمجھو لینا چاہیے کہ مسلمانوں کے خاتمہ کا سامان ہاتھ آگیا۔

تو اب خود ہی انصاف کیجیے کہ اس میں کون سی بات ایسی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ نبوت کے خلاف اور قریش کے جوشِ عداوت کے منافی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ مولانا شبلی مرحوم نے آرنلڈ[1] کی رہنمائی کے لیے یا اس کی تقلید میں اس واقعہ کے تمام نقشہ کو جمہور کے خلاف اس لیے پلٹنے کی سعی فرمائی ہے کہ وہ وقت کے عیسائی مستشرقین کے اس اعتراض سے مرعوب ہوگئے ہیں کہ "قافلہ کا لوٹنا انتہائی معیوب بات ہے، لہٰذا جو شخص نبوت کا مدعی ہو وہ کیسے ایسا فعل کرسکتا ہے" حالانکہ یہ بات مرعوب ہونے کی نہیں تھی بلکہ ضرورت تھی اس امر کی کہ ان تاریخی اسباب و وسائل کو روشنی میں لایا جائے جن کے پیشِ نظر مشرکینِ مکہ کے کاروانِ تجارت کو روکنا اور اُن پر قابض ہونا لوٹ کھسوٹ نہیں بلکہ جنگی نقطۂ نظر اور مسلمانوں کی جماعتی بقار و حفاظت کے اعتبار سے ازبس ضروری تھا۔

---

[1] آرنلڈ نے بھی غزوۂ بدر کے متعلق ان ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

صورتِ حال یہ تھی کہ مکہ کے قیام میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر تیرہ سال مسلسل مشرکینِ مکہ نے جو مظالم کیے ان پر صبر و ضبط کے بعد جب مدینہ کو ہجرت کر گئے تب بھی ان مشرکین نے مسلمانوں کو چین سے نہ بیٹھنے دیا اور جنگ و جدل اور سازشی مکر و فریب میں لگے رہے، چنانچہ ابوداؤد میں ہے:

ان کفار قریش کتبوا الی ابن ابی	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف
ومن کان یعبد معہ الاوثان	لے آئے تھے کہ بدر کے واقعہ سے بہت پہلے
من الاوس والخزرج ورسول اللہ	کفار قریش نے عبداللہ بن ابی اور اس کے
صلی اللہ علیہ وسلم یومئذ	بت پرست ساتھیوں کو جو اوس اور خزرج میں
بالمدینۃ قبل وقعۃ بدر انکم	باقی رہ گئے تھے، یہ لکھا کہ تم نے ہمارے صاحب کو
آویتم صاحبنا وانا نقسم باللہ	پناہ دی ہے اور ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ
لتقاتلنہ او لتخرجنہ او لنسیرن	یا تو تم اُن سے لڑو یا ان کو نکال دو، ورنہ تو
الیکم باجمعینا حتی نقتل	ہم سب تم پر چڑھ آئیں گے اور تمہارے
مقاتلتکم ونستبیح نساءکم	جوانوں کو قتل کریں گے اور تمہاری عورتوں کو
(الحدیث باب فی خبر النضیر)	باندیاں بنالیں گے۔

پھر معاملہ دھمکیوں تک ہی نہیں رہا بلکہ کاروانِ تجارت کی آمد و رفت کے پردہ میں منافقین اور یہودِ مدینہ سے مسلمانوں کے استیصال کے لیے مختلف تدابیر پر خط و کتابت کا سلسلہ برابر جاری رہا اور صرف یہی نہیں بلکہ اب کاروانِ تجارت کا مقصد محض تجارتی کاروبار تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ نفع کے حصول کو مسلمانوں کے مقابلہ کی تیاریوں پر صرف کرنا نصب العین بنالیا گیا۔

ایسی حالت میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے تھا؟ دشمن کو اپنے خلاف اور اپنے استیصال کے لیے سازش کرنے، مقابلہ کی تیاریوں میں مشغول رہنے، کاروانِ تجارت کے ذریعہ

مدینہ میں مقیم دشمنوں کے ساتھ مشرکینِ مکہ کو معاندانہ خط وکتابت جاری رکھنے اور خود کاروانِ تجارت کے ذریعہ اپنے استیصال کے لیے سرمایہ فراہم کرنے دینے کیلیے آزاد چھوڑ دینا اور اس طرح ہمیشہ کے لیے اپنا خاتمہ کرا لینا یا ان تمام ذرائع کا سدِ باب کر کے فتنہ کا سر کچل دینے کی کوشش کرنا؟

لہٰذا مسلمانوں نے وہی کیا جو عقل، تدبیر، سیاست، اخلاقِ مدن کے نزدیک نہ صرف جائز بلکہ واجب اور ضروری تھا، یہی وہ امور تھے جن کی جانب اربابِ سیر و تاریخ نے بھی توجہ دلائی ہے، چنانچہ سب سے پہلے سریہ سریہ حمزہؓ کے متعلق (جو کہ مشرکین کے کاروانِ تجارت کے روکنے کے لیے نکلا تھا، زرقانی شرح مواہب میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"فخرجوا یعترضون عیرًا لقریش جاءت من الشام ترید مکۃ ای یعترضون لھا لیمنعوھا من مقصدھا او باستیلائھم الخ (جلد ۱ ص ۴۵۲)	"پس وہ نکلے کہ قریش کے کاروانِ تجارت کے درپے تھے "جو شام سے مکہ جا رہا تھا یعنی وہ یہ چاہتے تھے کہ جس مقصد کے لیے یہ کاروانِ تجارت آ جا رہے ہیں اُن پر غلبہ کر کے اُس مقصد کو پورا نہ ہونے دیں۔

اور ابو سفیان کے جس کاروانِ تجارت کے واقعہ سے بدر کے معرکہ کا تعلق ہے اس کے متعلق تو تمام اربابِ سیر و تاریخ متفق ہیں کہ قریش کے اندر مسلمانوں کے استیصال کا جوش و خروش اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ جب ابو سفیان کا کاروانِ تجارت مکہ سے چلا ہے تو کوئی قریشی اور قریشیہ باقی نہیں رہی تھی جس کے پاس ایک مثقال بھی موجود تھا کہ اُس نے اپنا راس المال کاروان کے حوالہ نہ کر دیا ہو۔ زرقانی میں ہے:۔

کان فیھا خمسون الف دینار وکان لم یبق قرشی ولا قرشیۃ	کاروانِ تجارت کے ساتھ پچاس ہزار دینار سُرخ تھے اور کوئی قرشی و قرشیہ کے کہ جس کے

لہٗ مثقال الابعث بہ فی العیر۔	پاس ایک مثقال بھی موجود تھا ایسے نہیں تھے کہ
(جلد ۱ ص ۴۷۶)	جس نے قافلہ میں اپنا راس المال نہ لگایا ہو۔

ابوسفیان کا یہ کاروان صرف کاروانِ تجارت ہی نہ تھا بلکہ سامانِ حرب وضرب کے لیے بنیادِ کار تھا، اس کا اندازہ ابوجہل کے اس قول سے بھی ہوتا ہے جو قافلہ کے گھر جانے پر اس نے قریشیوں کو مشتعل کرتے ہوئے کہا:۔

النجاء النجاء علی کل	نجات حاصل کرو، انتہائی مصیبت وذلت سے نجات
صعب وذلول غیرکم	حاصل کرو، کاروانِ تجارت کارواں نہیں ہے، تمہارے
اموالکم ان اصابہا	مال و دولت کا ذخیرہ ہے، اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس پر
محمّد لن تفلحوا بعدھا ابداً۔	قابض ہو گئے تو پھر تم ہمیشہ کیلیے ناکام و نامراد ہو کر رہ جاؤ گے۔

کیا ابوجہل کا یہ خطرہ محض کاروانِ تجارت کے لُٹ جانے پر ہو سکتا تھا؟ ہرگز نہیں، بلکہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ یہ تجارت کا کارواں نہیں ہے بلکہ سامانِ جنگ کی وہ ریڑھ کی ہڈی ہے جس کی حفاظت کی خاطر آج کی مہیب جنگوں میں فیصلہ کُن لڑائیاں لڑی جاتی ہیں۔

تو اب انصاف فرمائیے کہ اس قسم کے کاروانِ تجارت پر حملہ کر کے دشمن کی تجارت کا سدِباب کرنا کونسا گناہ تھا، جس کے لیے ہم دوسروں کی ہرزہ سرائی سے مرعوب ہو کر حقایق کا انکار کرنے لگیں۔

مولانا کو یہ بات بھی کھٹکتی ہے کہ زر ومال کے حاجتمند انصار سے زیادہ مہاجرین تھے تو پھر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس رفاقت میں مہاجرین کے مقابلہ میں انصار کیوں زیادہ تعداد میں تھے، سو اِن احتمالاتِ عقلی کا باب تو اس درجہ وسیع ہے کہ جس قدر جی چاہے وسیع سے وسیع تر کرتے چلے جائیے ورنہ بات صاف ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رجحانِ طبع نے صورت ہی ایسی پیدا کر دی کہ انصار کی تعداد مہاجرین سے زیادہ ہو گئی ورنہ شاید حالت برعکس ہوتی، البتہ مولانا کی توجیہ کے خلاف یہ سوال ضرور

پیدا ہوتا ہے کہ اگر مدینہ ہی میں جنگ کے لیے مشورہ ہوا تھا تو پھر مہاجرین جو انصار کے بغیر بھی اب تک مختلف غزوات و سرایا میں سر بکف میدانِ جنگ میں جاتے رہے تھے، آج اِس عظیم الشان غزوہ میں انصار کے مقابلہ میں کیوں پیچھے رہے۔

اس موقع پر بار بار حضرت سعد بن عبادہ کی تقریر کا حوالہ دینا بھی اسی لیے غیر موزوں ہے جبکہ ہم محدثین سے یہ نقل کر چکے کہ مسلم کی حدیث میں حضرت سعد بن عبادہؓ کا نام راوی کا وہم ہے اور در اصل ان کی یہ تقریر حدیبیہ کے موقع پر ہوئی تھی نہ کہ معرکۂ بدر کے موقع پر۔

مولانائے مرحوم نے سیرۃ النبی میں طبری کے حوالہ سے اُس روایت کو نقل کرتے ہوئے "جس کو ہم گذشتہ صفحات میں نقل کر آئے ہیں اور جو یہ ثابت کرتی ہے کہ مدینہ میں ابوسفیان کے قافلہ سے متعلق جو مشورہ ہوا تھا اس میں بعض مسلمان اسی لیے نکلتے ہوئے کسمساتے رہے کہ جنگ کا معاملہ نہیں ہے صرف قافلہ کا معاملہ ہے" یہ تنقید فرمائی ہے :-

"لیکن یہ واقعات صریح آیاتِ قرآن کے خلاف ہیں، قرآن مجید میں بتصریح موجود ہے کہ جو لوگ مدینہ سے نکلتے ہوئے کسمساتے تھے وہ عدم ضرورت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ ان کو یہ نظر آتا تھا کہ موت کے مُنہ میں جا رہے ہیں"[1]

مگر تنقید فرماتے ہوئے مولانا کو یہ بات فراموش ہو گئی کہ انھوں نے جمہور کے خلاف کوئی دلیل نہیں پیش فرمائی بلکہ جو دعویٰ تھا وہی دلیل بنا کر پیش کر دیا گیا اس لیے جمہور کا دعویٰ مع دلیل تو یہ ہے کہ قرآنِ عزیز کی زیر بحث آیات مدینہ کے مشورہ سے متعلق ہی نہیں ہیں بلکہ وادیٔ ذفران کے مشورہ سے متعلق ہیں جیسا کہ گذشتہ صفحات میں مدلل خود قرآن سے ہی ثابت کیا جا چکا ہے، اور اس روایت میں جس مشورہ کا ذکر ہے وہ قرآن میں مذکور نہیں ہے، البتہ احادیث و روایاتِ سیر میں بسندِ صحیح منقول ہے لہٰذا

[1] جلد ۱ ص ۳۲۳۔

دونوں مواقع پر یکسانیت کی وجوہ جُدا جُدا تھیں اور قرآن نے اس پورے واقعہ کے ان ہی خاص اجزاء کو بیان کرنا مناسب سمجھا جو مسلمانوں کی بے سروسامانی اور دشمن کی قوت اور پھر مسلمانوں پر خدا کی نصرت کے نزول سے تعلق رکھتے ہیں۔

طبقات ابن سعد میں ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے ایک میل پر پہنچے تو لشکر کا جائزہ لیا، ابن عمرؓ اُس زمانہ میں کمسن تھے، لہٰذا اُن کو واپس کر دیا[1] اس سے بھی مولانا یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے قافلہ کے مقابلہ کے لیے نہیں بلکہ کفارِ مکہ سے جنگ کے لیے ہی نکلے تھے ورنہ تو ایسے نوخیز لڑکے قافلہ کو لوٹنے میں زیادہ مفید ثابت ہو سکتے تھے مگر یہ بھی مولانا کا محض قیاس ہی قیاس ہے اس لیے کہ قافلہ کے مقابلہ میں اگرچہ کسی بڑی جنگ کی توقع نہیں تھی، مگر بہرحال معمولی جنگ کا خطرہ تو موجود ہی تھا، کیا ابوسفیان اور اس کے تیس چالیس بہادر قریشی، ایک ہزار اونٹ پر لدا ہوا سامان آسانی سے حوالہ کر دیتے، یہ کیسے ہو سکتا تھا؟

پس اگر معمولی جنگ کا خطرہ بھی تھا تو نوعمر لڑکوں کو واپس کر دینا اس کے لیے کس طرح دلیل بن جا سکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شروع ہی میں قافلہ کے مقابلہ کو نہیں بلکہ کفارِ مکہ سے فیصلہ کن جنگ کے لیے نکلے تھے۔

اسی طرح استیعاب میں سعد بن خیثمہ کا جو واقعہ مذکور ہے اس سے بھی مولانا کا مقصد حل نہیں ہو سکتا اس لیے کہ اگر باپ کی فرمائش پر بیٹے نے یہ گوارا نہ کیا کہ اپنی بجائے باپ کو اس موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلنے دے تو اس سے یہ کیسے لازم آ گیا کہ اگر مسلمان مدینہ سے قافلہ پر حملہ کے لیے نکلے تو اس یقین کے ساتھ نکلے تھے کہ ان میں سے کسی ایک شخص کو بھی چشم زخم نہیں پہنچے گا اور سب ہی

---

[1] اسد الغابہ میں بھی یہ واقعہ مذکور ہے۔ جلد ۳ ص ۲۲۷۔

صحیح سالم واپس آجائیں گے۔ یہ تو بدقسمتی سے عیسائی مستشرقین سے مرعوب ہو کر ہم نے بزعم خود یہ تصور کرلیا کہ قافلہ پر حملہ کے معنی گویا ڈاکوؤں کا قافلہ لوٹنے کے مرادف ہے مسلمان تو جب بھی دشمنوں کے مقابلہ کو نکلے خواہ وہ براہِ راست جنگ کے ارادے سے نکلے ہوں یا دشمن کو دوسرے معاملات میں زک دینے، ہمیشہ جہاد اور شہادت ہی کے نقطۂ نظر سے نکلتے تھے اور مالِ غنیمت تو ان کے لیے خدا کا مزید فضل واحسان تھا، جو کبھی بغیر جنگ ہی ہاتھ آگیا، اور کبھی خون میں نہانے کے بعد حاصل ہوا۔

اب ہم مصنف سیرۃ النبی کے غزوۂ بدر کے متعلق ان تمام دعاوی وشبہات پر تحقیقی نظر ڈالنے کے بعد جو جمہور کے خلاف اُن کی جانب سے پیش کیے گئے ہیں، صرف ایک سوال پر اس بحث کو ختم کردینا مناسب سمجھتے ہیں کہ اگر معرکۂ بدر میں ابتداء ہی سے یہ بذریعہ وحی بتادیا گیا تھا کہ خدا کی مرضی معرکۂ حق وباطل کی ہے اور قافلہ پر حملہ کرنے یا بقول مولانا کے "قافلہ لوٹنے" کا تصور وتخیل گناہِ عظیم اور شانِ اسلام کے خلاف ہے، تو آخر جلیل القدر صحابہؓ نے ایسا تصور قائم ہی کیوں کیا اور اگر کیا بھی تھا تو قرآن نے "احدی الطائفتین" کا وعدہ کرکے اِس گناہِ عظیم کے تصور کی حوصلہ افزائی کیوں کی اور کیوں صاف صاف یہ نہیں کہہ دیا کہ خدائے تعالیٰ ایک لمحہ کے لیے بھی تم کو قافلہ پر قابو پانے کی اجازت نہیں دیتا، کیونکہ اس کا تصور بھی گناہِ عظیم ہے، البتہ اس کا وعدہ کرتا ہے کہ تم کو دشمنوں پر قابو دے گا اور تم کامیاب ہوگے تو کیا پھر قرآن عزیز کا "احدی الطائفتین" کا اس طرح ذکر کرنا اس امر کی صاف شہادت نہیں ہے کہ معرکۂ بدر سے قبل ضرور چند اکابرینِ اسلام کی یہ مٹھی بھر جماعت قافلہ کے لیے نکلی تھی مگر اچانک جب کفارِ مکہ سے سابقہ پڑگیا اور مسلمانوں نے بے سروسامانی کو دیکھ کر قافلہ پر قبضہ چاہا تو اللہ تعالیٰ نے اوّل یہ وعدہ دیا کہ

اِن دونوں "عیر و نفیر" میں سے ایک تم کو ضرور دیں گے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ اطلاع کر دی کہ خدا کی مرضی یہ ہے کہ وہ اب قافلہ کی بجائے معرکۂ حق و باطل میں مسلمانوں کو کامیابی عطا کر کے ہمیشہ کے لیے تاریخ ظلم کا رُخ عدل کی جانب پھیر دینے والا ہے۔

الحاصل قرآن و حدیث اور تاریخی حقائق کی روشنی میں معرکۂ حق و باطل "غزوۂ بدر" کے متعلق جمہور علماءِ اسلام کا مسلک ہی صحیح ہے اور بلاشبہ واقعات کی صحیح و مستند تفصیلات کسی طرح بھی شانِ نبوت کے خلاف نہیں اور نہ علم الاخلاق و علم الاجتماع اور حق و صدق پر مبنی سیاساتِ مدن کے منافی ہیں "ھٰذا ھو الحق والحق احق ان یتبع"



غزوۂ اُحُد

اُحُد | اُحد مدینہ کے ایک پہاڑ کا نام ہے، یہ مدینہ منورہ سے جانبِ جنوب تقریباً دو میل (ایک فرسخ) پر واقع ہے۔

غزوۂ اُحد | یہی وہ مقام ہے جہاں شوال ۳ھ مطابق جنوری ۶۲۵ء عیسوی میں مُسلمانوں اور مشرکوں کے مقابلہ میں معرکۂ حق و باطل گرم ہوا، اِس لیے اس کا نام غزوۂ احد ہے۔

غزوۂ احد بھی بہت اہم غزوہ ہے اور اپنی تفصیلات و جزئیات کے اعتبار سے اپنے دامن میں عبرت و موعظت کا بے شمار ذخیرہ رکھتا ہے، اِس غزوہ کے تفصیلی حالات کتبِ حدیث و سیرت اور تفاسیر قرآنِ حکیم میں مکمل طور پر مذکور ہیں[1]۔

اِن حالات کا خلاصہ یہ ہے کہ بدر میں جو زخم قریش کو لگ چکا تھا اس نے ناسُور کی شکل اختیار کر لی تھی، کیونکہ بدر کے واقعۂ ہائلہ سے قریش کا ہر گھر ماتم گسار اور عرب کے مشرک قبائل نوحہ خواں تھے، ابو سفیان نے تو قسم کھائی تھی کہ جب تک بدر کا انتقام نہ لے لوں گا نہ غسل کروں گا نہ تبدیلِ لباس، عکرمہ بن ابو جہل اور دوسرے نوجوانوں کی تقریریں اور عورتوں کی نوحہ خوانی قریشیوں اور قبائلِ عرب کو غیرت اور اشتعال دلا کر جنگ کے لیے آمادہ کر رہی تھیں اور اس طرح ابو سفیان کی سرکردگی میں تین ہزار نبرد آزما سورماؤں کا لشکرِ جرار مکہ سے مُسلمانوں کو مٹانے کے لیے نکلا اور اُحد کے سامنے آکر خیمہ زن ہو گیا

---

[1] ہم نے زیادہ حصہ فتح الباری جلد نمبر، سے لیا ہے اور باقی سیرت حلبیہ اور زرقانی اور تاریخ کبیر سے۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جب ابوسفیان کی تیاریوں کا حال معلوم ہوا تو صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے مشورہ فرمایا، عمر رسیدہ اور تجربہ کار صحابہ نے یہ رائے دی کہ ہم کو باہر نکل کر جنگ کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ مفید طریقہ یہ ہے کہ ہم مدینہ کے اندر ہی دشمن کا انتظار کریں اور جب وہ مدینہ پر حملہ آور ہو تو اس کا پُر زور مقابلہ کریں، ہمارے اس طرزِ عمل سے اوّل تو دشمن کو جرأت ہی نہ ہوگی کہ مدینہ پر حملہ آور ہو، اور اگر اس نے اقدام کیا تو بلاشبہ شکستِ فاش اٹھا کر راہِ فرار اختیار کرے گا، مگر اُن صحابہ کو جو بدر میں شریک نہیں ہوئے تھے اور بدر کی فضیلت کو اُس وقت حاصل کرنا چاہتے تھے، یہ رائے پسند نہیں آئی اور نوجوانوں نے بھی ان کا ساتھ دیا اور اکثریت کی رائے یہ قرار پائی کہ ہم کو دشمنوں کا مقابلہ میدان میں نکل کر ہی کرنا چاہیے، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب اکثریت کا رجحان دیکھا تو اُس پر صاد فرما کر حجرۂ مبارک میں تشریف لے گئے تو تجربہ کار اور اکابر صحابہ نے اپنے اصاغر کو اُن کی رائے پر ملامت کی کہ انھوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے رجحان کے خلاف کیوں اپنی آزادانہ رائے سے آپ کو پریشان کیا، چنانچہ جب آپ باہر تشریف لائے تو ان نوجوانوں اور شمعِ اسلام کے پروانوں نے اپنی رائے پر اظہارِ ندامت کیا اور عرض کیا کہ آپ مدینہ ہی کے اندر دشمن کا مقابلہ کریں یہی مناسب ہے۔

یہ سن کر حضورِ اقدس نے ارشاد فرمایا "نبی کی شان کے یہ خلاف ہے کہ جب خدا کی راہ میں ہتھیار سج کر تیار ہو جائے تو پھر معرکۂ حق و باطل کے بغیر ہی اُن کو اُتار دے، اب خدا کا نام لے کر میدان میں نکلو"۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ سے نکلے تو ایک ہزار کا لشکر جلو میں تھا، اس لشکر میں تین سو منافقین عبداللہ بن اُبی کی سرکردگی میں ہمرکاب تھے، یہ مدینہ ہی میں مشرکینِ مکہ کے ساتھ سازش کر چکے تھے کہ مخلص مسلمانوں کو بزدل بنانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کریں گے کہ اوّل مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ نکلیں گے اور راہ سے ہی اُن سے

کٹ کر مدینہ واپس آجائیں گے، چنانچہ رأس المنافقین یہ بہانہ کرکے لشکرِ اسلام سے کٹ کر جدا ہوگیا اور مدینہ واپس آگیا کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم جیسے تجربہ کاروں کی بات نہ مان کر الھڑ نوجوانوں کی رائے کو ترجیح دی تو ہم کو کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈالیں۔

مگر منافقین کا مقصد پورا نہ ہوا اور ان فداکارانِ اسلام پر ان کی مراجعت کا مطلق کوئی اثر نہ پڑا اور ایسے جانباز اور نثارانِ اسلام پر اثر ہی کیا پڑتا جن کے بچوں کی جانبازی اور اسلام پر فداکاری کا جذبہ اور ولولہ یہ ہو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ سے باہر جب لشکرِ اسلام کا جائزہ لیا اور صغیر السن لڑکوں کو واپسی کا حکم دیا تو رافع بن خدیج جو ابھی نوعمر ہی تھے یہ دیکھ کر پنجوں کے بل کھڑے ہوگئے کہ دراز قد بن کر جنگ کے سپاہی رہ سکیں، چنانچہ اُن کی تدبیر کارگر ہوگئی۔ اسی طرح جب سمرہ بن جندب صغیر سن شمار کر لیے گئے تو رونے لگے اور عرض کیا یا رسول اللہؐ اگر رافع شریکِ جنگ ہو سکتا ہے تو میں کیوں خارج کیا جارہا ہوں جبکہ میں رافع کو کشتی میں پچھاڑ دیا کرتا ہوں، آخر دونوں کی کشتی کرائی گئی اور سمرہ نے رافع کو پچھاڑ دیا اور وہ مجاہدین میں شامل کر لیے گئے، البتہ مسلمانوں کے دو قبیلے بنو سلمہ، بنو حارثہ میں کچھ بددلی سی پیدا ہو چلی تھی مگر فداکار مسلمانوں کے جوش و ولولہ کو دیکھ کر ان کی ہمت بھی بلند ہوگئی۔

غرض اس ولولہ اور جذبہ کے ساتھ مجاہدین کا لشکر اُحد پہنچا اور دونوں صفیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہوگئیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکرِ اسلام کو اس طرح صف آرا کیا کہ اُحد کو پسِ پشت لے لیا اور پچاس تیر اندازوں کو حضرتِ عبداللہ بن جبیرؓ کی کمان میں پہاڑ کی ایک گھاٹی پر مقرر فرما دیا کہ فتح و شکست کسی حال میں بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کریں تاکہ پشت کی جانب سے دشمن حملہ آور نہ ہو سکے۔

اب جنگ شروع ہوگئی اور دونوں صفیں بالمقابل نبرد آزما ہو کر جوہرِ شجاعت دکھانے لگیں، ابھی جنگ کو کچھ زیادہ دیر نہیں لگی تھی کہ مسلمانوں کا پلہ بھاری ہوگیا اور مشرکینِ مکہ کا لشکر درہم برہم ہو کر بھاگنے لگا، نبرد آزما مسلمانوں نے جب مالِ غنیمت جمع کرنے کا ارادہ کیا تو تیر اندازوں سے صبر نہ ہو سکا اور وہ گھاٹی چھوڑنے پر آمادہ ہوگئے کمان افسر حضرت عبداللہ بن جبیرؓ نے ہر چند روکا اور فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی نہ کرو، مگر انھوں نے یہ کہہ کر جگہ چھوڑ دی کہ آپؐ کا حکم جنگ تک محدود تھا اب جبکہ جنگ ختم ہوگئی تو خلاف ورزی کیسی؟

حصولِ غنیمت کے شوق نے ادھر مسلمان تیر اندازوں سے جگہ خالی کرادی اُدھر خالد بن ولید (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) اپنے جنگی دستہ کے ساتھ میدان خالی دیکھ کر گھاٹی کی جانب سے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے، اب مسلمان گھبرائے اور اس اچانک حملہ سے اُن کے پیر اُکھڑ گئے اور اس طرح فتح و نصرت یک بیک شکست سے بدل گئی۔ اگرچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد و پیش ابوبکر، عمر، علی، طلحہ، زبیر (رضی اللہ عنہم) جیسے فداکار موجود تھے، تاہم مسلمانوں کے فرار سے دشمنوں کو موقع مل گیا اور ایک شقی ازلی نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پتھر کھینچ کر مارا جس سے آپؐ کا ایک دندان مبارک شہید ہوگیا، آپؐ پتھر کے صدمہ سے قریب کی ایک گھاٹی میں گر گئے، ابھی آپؐ سنبھلے بھی نہ تھے کہ ایک مشرک نے پکار دیا "ان محمد أقد مات" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انتقال ہوگیا اس آواز نے مسلمانوں میں اور زیادہ انتشار اور سخت بے چینی پیدا کردی مگر مسلمان فوراً سنبھلے اور ثابت قدم صحابہ نے للکارا کہ اگر یہ خبر صحیح ہے تو اب ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے آؤ اور جنگ کا فیصلہ کر کے دم لو! اس صدائے حق نے مسلمانوں کے دل میں غیرت کا جذبہ پیدا کر دیا، وہ سب پلٹ پڑے اور حملہ آور ہونے کی غرض سے سمٹ کر یکجا ہوگئے، مگر نقشۂ جنگ بدل چکا تھا اور قریش اپنی کامیابی پر نازاں ہو کر میدان سے الگ ہو چکے تھے مسلمانوں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو جلوہ جہاں آرا پر

نظر پڑتے ہی اُن کے دل میں بھی سکون پیدا ہوگیا اور پروانہ وار آپؐ کے گرد جمع ہوگئے، غار میں گر جانے سے خود سر میں گھس گیا اور زرہ کی کڑیوں کی زد میں چہرۂ مبارک اور بازوؤں پر بھی ہلکے زخم آگئے تھے، حضرتِ علی (رضی اللہ عنہ) اور حضرت فاطمہ (رضی اللہ عنہا) نے خود کو سر سے نکالا اور زخموں کو دھویا اور بوریا جلا کر راکھ کو زخم کے اندر بھر دیا جس سے خون بند ہوگیا۔

حضرت حمزہؓ کی شہادت

اس غزوہ میں ستر مسلمان شہید اور بہت سے زخمی ہوئے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچا، دودھ شریک بھائی، بے تکلف دوست اور جاں نثار صحابی حضرتِ حمزہؓ کی شہادت اِس واقعہ کا زبردست سانحہ ہے، زبانِ وحی ترجمان نے اِن کو سیدالشہداء کا لقب عطا فرمایا۔

مشرکینِ مکہ نے اِس جنگ میں درندوں اور خونخوار حیوانوں کی طرح مُردہ نعشوں تک کے ناک کان کاٹ ڈالے اور پیٹ چاک کرکے دل و جگر کو نیزوں کی اَنی سے چھید چھید کر دل کا بخار نکالا، ابوسُفیان کی بیوی ہندہ نے تو سیدالشہداء کا جگر چاک کرکے دانتوں سے چبا ڈالا۔ حضرت حمزہؓ کو ایک حبشی غلام وحشی نے شہید کیا تھا جس کی خوشی میں ہندہ نے اُس کو اپنا سونے کا ہار عطا کیا۔

ابوسفیان اپنی کامیابی کی مسرت میں کہہ رہا تھا "اعلیٰ ھُبل اعلیٰ ھُبل۔ ہُبل کی جے ہو۔ ہُبل کی جے ہو"۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تم ان کے جواب میں یہ پکارو "اللہ اعلیٰ واجل، اللہ اعلیٰ واجل"۔ "اللہ ہی سب سے بلند و بالا اور بزرگ ہے"۔

ابوسفیان نے پھر طیش میں آکر کہا "لنا العُزّٰی ولا عُزّٰی لکم ہماری مددگار عُزّٰی دیوی ہے اور تمہارے پاس عُزّٰی کا ہمسر نہیں ہے"۔ حضورِ اقدسؐ نے ارشاد فرمایا، اے عمرؓ تم یہ جواب دو "اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم۔ ہمارا والی و مددگار اللہ تعالیٰ ہے اور تمہارا کوئی بھی مددگار نہیں۔

بہرحال ابوسفیان یہ کہہ کر کہ آئندہ سال پھر بدر میں معرکہ آرائی ہوگی، اپنا لشکر لے کر واپس چلا گیا۔

قرآن عزیز اور غزوۂ اُحد

مسلمانوں کا غزوۂ اُحد کے لیے طیار ہونا، منافقین کا لشکرِ اسلام سے جُدا ہو کر مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے کی سعی کرنا، مسلمانوں کا اوّل خدا کی مدد سے کامیاب ہونا اور پھر اپنی غلط کاری اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی کی پاداش میں شکست کھا جانا اور فتح کا شکست سے بدل جانا اور خدائے تعالیٰ کا مسلمانوں کی تسلی کرنا، ان تمام امور کو قرآنِ عزیز نے آلِ عمران میں قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے چنانچہ محمد بن اسحٰق سے منقول ہے:

انزل اللہ فی شان احد ستین آیۃ من آل عمران۔[1]	اللہ تعالیٰ نے غزوۂ احد کی شان میں آلِ عمران کی ساٹھ آیتیں نازل فرمائی ہیں۔
وروی ابن ابی حاتم من طریق المسور بن مخرمۃ قال قلت لعبد الرحمن بن عوف اخبرنی عن قصتکم یوم احد قال اقرأ العشرین ومائۃ من آل عمران تجدھا واذ غدوت من اھلک تبوئ المؤمنین مقاعد للقتال الی قول امنۃ نعاسا۔[2] (الآیات)	اور ابن ابی حاتم نے بطریق مسور بن مخرمہ روایت کیا ہے کہ وہ کہتے تھے میں نے عبدالرحمٰن بن عوف سے عرض کیا، آپ غزوۂ اُحد کا اپنا قصہ بیان فرمائیں۔ انھوں نے فرمایا تم آلِ عمران کی ایک سو بیس آیات پڑھو تو تم کو سارا واقعہ معلوم ہو جائیگا۔ یہ آیات یہاں سے شروع ہو کر اذ غدوت من اھلک تبوئ المؤمنین مقاعد للقتال امنۃ نعاسا الآیۃ پر ختم ہوتی ہیں۔
وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَھْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰہُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ اِذْ ھَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰہُ وَلِيُّھُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰہِ	اور (اے پیغمبر! قابلِ ذکر ہے وہ بات) جبکہ تم صبح سویرے اپنے گھر سے نکلے تھے (اور اُحد کے میدان میں) لڑائی کیلیے مورچوں پر مسلمانوں کو بٹھا رہے تھے اور اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ پھر جب ایسا ہوا تھا کہ تم میں سے دو جماعتوں نے ارادہ کیا تھا کہ ہمت ہار دیں (اور واپس لوٹ چلیں)

[1] فتح الباری جلد ۷ ص ۲۷۰۔ [2] ایضاً۔

فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝	حالانکہ اللہ مددگار تھا اور جو ایمان رکھنے والے ہیں اُن کو
(آلِ عمران پ ع)	چاہیے کہ ہر حال میں اللہ ہی پر بھروسہ رکھیں۔
وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا	اور دیکھو! نہ تو ہمت ہارو، نہ غمگین ہو، تم ہی
وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ	سب سے برتر و اعلیٰ ہو بشرطیکہ تم سچے مومن ہو! اگر
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝	تم نے (اُحُد) میں زخم کھایا ہے تو دوسروں کو بھی
اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ	ویسے ہی زخم (بدر میں) لگ چکے ہیں۔ دراصل یہ
فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ	(ہار جیت کے) اوقات ہیں جنھیں ہم انسانوں میں
مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ	اِدھر اُدھر پھراتے رہتے ہیں، علاوہ بریں یہ اسلیے
نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ	تھا تاکہ اس بات کی آزمائش ہو جائے، کون سچا
وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ	ایمان رکھنے والا ہے کون نہیں اور اس لیے کہ تم میں
اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ	سے ایک گروہ کو (ان وقائع اور ایام کے نتیجوں کا)
شُهَدَآءَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ	شاہد حال بنا دے اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ ظلم کرنے والوں
الظّٰلِمِيْنَ ۝ (سورۂ آلِ عمران پ ع)	کو دوست نہیں رکھتا۔



غزوۂ احزاب (غزوۂ خندق)

غزوۂ احزاب تمام غزوات میں خاص اہمیت رکھتا ہے اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے نرالا ہے، اس لیے کہ اس غزوہ میں مسلمانوں کو تمام کافر جماعتوں سے بیک وقت واسطہ پڑا اور قبائلِ عرب، یہود اور ان کے حلیف سب کے سب جمع ہو کر مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے نکلے تھے، اور مدینہ کے اندر بھی منافقین کا گروہ خفیہ اُن کی مدد کر رہا تھا "حِزب" کے معنی چونکہ "گروہ" کے ہیں اور "احزاب" اس کی جمع ہے، اس لیے یہ غزوۂ احزاب کہلایا، اور جبکہ حضرتِ سلمان (رضی اللہ عنہ) کے مشورہ سے مسلمانوں نے پہلی مرتبہ خندق کھود کر مدینہ کو دشمن سے محفوظ رکھنے کی تدبیر اختیار کی، اس لیے اس کو غزوۂ خندق بھی کہتے ہیں۔

یہ غزوہ شوال ۵ھ مطابق فروری ۶۲۷ء میں پیش آیا جبکہ ابوسفیان دس ہزار پر مشتمل لشکرِ جرار کے ساتھ مدینہ پر چڑھائی کے لیے مکہ سے نکلا۔ اِس واقعہ سے متعلق تاریخ و سیر کی کتابوں کے علاوہ صحیح بخاری میں بھی بہت کافی تفصیلات ملتی ہیں اور اس کے بہت سے اہم اجزاء پر روشنی پڑتی ہے۔

مختصر طور پر واقعات کی تفصیل یہ ہے کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمنوں کی نقل و حرکت کا علم ہوا، تو حسبِ دستور آپ نے صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے مشورہ فرمایا، حضرتِ سلمان فارسیؓ نے عرض کیا! ہم اہلِ فارس کا دستور یہ ہے کہ ایسے موقع پر خندق کھود کر دشمن سے خود کو محفوظ کر لیتے اور اس کو مجبور بنا دیتے ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مشورہ کو قبول فرما کر خندق کھودنے کا حکم دیا اور کُدال لے کر خود بھی بہ نفسِ نفیس شرکت فرمائی۔ کائناتِ انسانی کی

تاریخ میں آقا اور غلام، حاکم اور محکوم، افسر اور ماتحت، مخدوم اور خادم کے درمیان یہ پہلا منظر تھا جو آنکھوں نے دیکھا اور کانوں نے سُنا کہ دو جہان کا سردار ہاتھ میں کدال لیے تین دن کے فاقہ سے پیٹ پر پتھر باندھے مہاجرین و انصار کے ساتھ خندق کھودنے میں برابر کا شریک نظر آتا ہے بلکہ ایک سخت پتھر کے حائل ہو جانے پر جب سب صحابہ نے زور لگایا اور اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی اور خدمتِ اقدسؐ میں اس واقعہ کو پیش کیا تو آپؐ نے "بِسْمِ اللّٰہ" کہہ کر کدال کی ایک ضرب سے اس کو پارہ پارہ کر دیا[1]۔

آپ کے ساتھ صحابہ بھی تین شبانہ روز بھوک سے پیٹ پر پتھر باندھے دینِ حق کی حمایت اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کی خاطر مصروفِ کار تھے۔

ایک جانب اگر لبثنا ثلثۃ ایام لا نذوق ذواقاً کا مظاہرہ تھا تو دوسری جانب زبانِ وحی ترجمان پر یہ دعائیہ کلمہ جاری تھا "اَللّٰھُمَّ اِنَّ الْعَیْشَ عَیْشُ الْاٰخِرَۃِ فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُھَاجِرَۃ! خدایا عیش تو آخرت کا عیش ہے، پس تو انصار و مہاجرین کو مغفرت سے نواز" اور جب جاں نثارانِ توحید شمعِ نبوت سے یہ سُنتے تو پروانوں کی طرح والہانہ جوش کے ساتھ یہ کہہ کہہ کر قربان ہونے لگتے۔

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا عَلَی الْجِھَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا

"ہم وہ ہیں جنھوں نے زندگی بھر کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کر لی ہے۔"

اور جب شمعِ نبوت کے پروانوں سے آپؐ یہ والہانہ رجز سنتے ہیں تو مسرت و شادمانی کے ساتھ پھر ارشاد فرماتے ہیں:۔

اَللّٰھُمَّ لَا خَیْرَ اِلَّا خَیْرَ الْاٰخِرَہ فَبَارِكْ فِی الْاَنْصَارِ وَالْمُھَاجِرَہ

خدایا خیر و نیکی تو آخرت ہی کی ہے پس تو انصار و مہاجرین کے درمیان اپنی برکت کا نزول فرما[2]"

اور براء بن عازب فرماتے ہیں کہ غزوۂ خندق میں خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت یہ تھی کہ خندق سے مٹی اٹھا کر ادھر اُدھر منتقل کر رہے تھے اور جسدِ مبارک گرد آلود

[1] بخاری باب غزوۂ احزاب۔ [2] ایضاً۔

ہورہا تھا، اور یہ رجز پڑھتے جاتے تھے :

وَاللہِ لَوْلَا اللہُ مَا اھْتَدَیْنَا وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّیْنَا

قسم بخدا اگر خدا کی ہدایت رہنمائی نہ کرتی تو نہ ہم کو ہدایت نصیب ہوتی اور نہ صدقہ و نماز

فَاَنْزِلَنْ سَکِیْنَۃً عَلَیْنَا وَثَبِّتِ الْاَقْدَامَ اِنْ لَاقَیْنَا

پس اے خدا! تو ہم پر طمانیت نازل فرما اور میدانِ جنگ میں ہم کو ثابت قدم رکھ

اِنَّ الْاُولٰی قَدْ بَغَوْا عَلَیْنَا اِذَا اَرَادُوْا فِتْنَۃً اَبَیْنَا

اور جن لوگوں نے ہم پر سرکشی کرتے ہوئے چڑھائی کی ہے جب انھوں نے فتنہ کا ارادہ کیا تو ہم نے انکار کردیا (ان کو ناکام کردیا) اور تنہا جوش کے ساتھ " ابینا " کو بلند آواز سے کہتے جاتے تھے۔

خندق کی کھدائی کا کام چند روز جاری رہا اور اس طرح دشمن سے حفاظت کا پوری طرح سامان ہوگیا، لیکن جب محاصرہ کو بیس روز ہوگئے تو یہود بنی قریظہ کی عہد شکنی اور مسلسل محاصرہ سے کچھ اکتانے اور مضطرب ہونے لگے، اُس وقت خدا کی نصرت نے نزول کیا اور مسلمانوں کی کامرانی کے اسباب مہیا ہوگئے، ہوا یہ کہ کفار کے لشکر میں ایک شخص نعیم بن مسعود نخعی تھا، یہ گو ابھی تک مسلمان نہیں ہوا تھا لیکن اس کے قلب میں صداقتِ اسلام گھر کرچکی تھی، اس لیے اس نے اپنی ہوشیاری سے مشرکینِ مکہ اور یہودِ مدینہ کے درمیان بے اعتمادی پیدا کردی اور جنگ کے معاملہ میں دونوں فریق میں ایسا اختلاف پیدا ہوگیا کہ ایک نے دوسرے کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے سے انکار کردیا اور ابھی مشرکینِ مکہ واپس بھی نہ ہوئے تھے کہ قدرت کی جانب سے ہوائے تند کا ایسا طوفان اُٹھا کہ جس نے آن کی آن میں دشمن کے تمام لشکر کو زیر و زبر کر ڈالا خیمے اکھڑ کر گرنے لگے، چوپائے بھڑک کر بھاگنے لگے اور سارے لشکر میں ابتری پھیل گئی اور دشمن نے محاصرہ چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کی اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو

ان کے فتنہ سے نجات دی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی موقع پر ارشاد فرمایا: "نصرت بالصبا واھلکت العاد بالدبور" اللہ تعالیٰ کی جانب سے مجھ کو پُروا ہوا کے ذریعہ فتح عطا کی گئی اور عاد پچھوا ہوا سے ہلاک کیے گئے تھے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب دشمن کی خبریں معلوم کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی تو تین مرتبہ آپ نے دریافت کیا کہ اس خدمت کو کون انجام دے گا؟ اور تینوں مرتبہ حضرت زبیر بن عوام نے پیش قدمی کر کے عرض کیا: اس خدمت کے لیے میں حاضر ہوں۔ تب آپ نے ارشاد فرمایا: "ان لکل نبی حواریا وان حواری الزبیر" ہر ایک نبی کے حواری ہوتے ہیں اور میرے حواری زُبیر ہیں۔

اور اس موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعاء فرمائی "اللھم منزل الکتاب سریع الحساب، اھزم الاحزاب، اللھم اھزمھم وزلزلھم۔ اے کتاب (قرآن) کے نازل کرنے والے خدا! اے جلد حساب لینے والے، تو مشرکین کی جماعتوں کو شکست دیدے، الٰہی ان کو فرار کر اور اُن کو ڈگمگا دے۔"

لا الٰہ الا اللہ وحدہ اعز جندہ ونصر عبدہ، وغلب الاحزاب وحدہ فلا شئ بعدہ۔ کوئی خدا نہیں اللہ کی ذات کے ماسوا جو یکتا و بے ہمتا ہے اُس نے اپنے لشکر (مسلمانوں) کو عزت بخشی اور اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کی اور یکتا ذات احزاب (سب جماعتوں) پر غالب ہے، اور اس کے ماسوا سب فانی ہے۔

یہی وہ غزوہ ہے جس میں مشغولیتِ جہاد کی وجہ سے حضورِ اقدس اور صحابہؓ کی نمازِ عصر قضا ہو گئی اور آپ نے مغرب کے وقت دونوں نمازوں کو ادا کیا۔[1]

قرآن عزیز اور غزوۂ احزاب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: یہ آیت غزوۂ خندق ہی کے متعلق نازل ہوئی:۔

[1] بخاری باب الجہاد۔

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ	اور جب چڑھ آئے (مشرکین) تم پر اوپر کی جانب سے
اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ	اور نیچے کی جانب سے اور جب پھر گئیں (دہشت
الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ	کی وجہ سے) آنکھیں اور پہنچ گئے دل گلوں تک
الْحَنَاجِرَ (احزاب ۱ پ ع ۲)	(یعنی کلیجے منہ کو آگئے)

قرآن حکیم میں اسی غزوہ کی نسبت سے اس سورۃ کا نام ہی احزاب ہوگیا۔ اس سورت کے دوسرے اور تیسرے رکوع میں اسی واقعہ کا تذکرہ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ	اے ایمان والو! اللہ کی نعمت کو یاد کرو جو تم پر
اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ	اس وقت کی گئی جب تم پر (مشرکین کے) لشکر
فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا	چڑھے تھے پس ہم نے اُن پر ہوا کو اور ایسے لشکروں
لَّمْ تَرَوْهَا وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ	کو بھیج دیا جن کو تم نہیں دیکھ رہے تھے اور جو کام بھی تم
بَصِيْرًا ۰ (الی) وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى	کرتے ہو اللہ تعالیٰ اُن کاموں کا دیکھنے والا ہے۔
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ۰ (احزاب پ ع ۳)	وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا۔ تک۔



۱؎ بخاری باب غزوۂ احزاب۔

واقعۂ حدیبیہ

حدیبیہ مکۂ مکرمہ سے جدہ کی جانب ایک منزل پر واقع ہے، اور آج کل شمیسیہ کے نام سے مشہور ہے، حدیبیہ دراصل کنویں کا نام ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کے ساتھ "فتح مبین" اور بیعت رضوان کی مقدس تاریخ وابستہ ہے۔

سنہ ۶ ہجری مطابق فروری ۶۲۸ء ماہ ذی قعدہ روز دوشنبہ وہ وقت سعید تھا کہ سرور دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) چودہ سو صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے جلو میں ادائے عمرہ کے ارادہ سے مکۂ معظمہ روانہ ہوئے۔ اور جب ذوالحلیفہ پہنچے تو قربانی کے جانوروں کے قلادہ ڈالا اور احرام باندھا اور بنی خزاعہ کے ایک شخص کو جاسوس بناکر بھیجا کہ وہ قریش کے حالات کا اندازہ لگا کر خبر دے۔

حضورِ اقدسؐ جب غدیر اشطاط پہنچے تو جاسوس نے آکر خبر دی کہ قریش کو آپؐ کی آمد کی اطلاع ہو چکی ہے اور وہ قبائل کو جمع کرکے مقابلہ کی تیاریوں میں مصروف ہیں اُن کا ارادہ ہے کہ آپ کو مکۂ مکرمہ میں داخل نہ ہونے دیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ سے مشورہ فرمایا تو صدیق اکبرؓ نے عرض کیا:

"خدا کے رسولؐ! ہم تو بیت اللہ کے قصد سے نکلے ہیں، جنگ یا قتل و قتال ہمارا مقصد نہیں ہے، لہٰذا ہم بیت اللہ کی زیارت کو اپنا مقصد سمجھتے ہوئے ضرور آگے بڑھتے رہیں گے اور جو جماعت خواہ مخواہ سدِ راہ ہو گی اُس سے مجبوراً لڑنا پڑے گا۔"

مشورہ کے بعد ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "امضوا علی اسم اللہ"

اب خدا کا نام لے کر بڑھے چلو[1]

زائرین بیت اللہ خدا کے عشق میں چوُر اور بیت اللہ کی زیارت میں مسرور مکہ کی جانب قدم بڑھائے چل رہے تھے کہ خدا کے رسولؐ نے فرمایا! خالد بن ولید فوج کا دستہ لیے عتیم میں گھات لگائے تمہارا منتظر ہے، اس لیے مناسب یہ ہے کہ اس جانب سے کاوا کاٹ کر داہنی جانب چلیں اور اچانک بے خبری میں اس کے مقابل پہنچ جائیں، جب مسلمان اچانک خالد بن ولید کے دستہ فوج کے سامنے آگئے تو اپنی گھات کو ناکام دیکھ کر خالد گھبرا گئے، دستہ فوج کو لے تیزی کے ساتھ مشرکین مکہ کے پاس جا پہنچے اور اُن کو مسلمانوں کی آمد سے مطلع کیا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اس ٹیلہ پر پہنچے کہ اس کے بعد وادی میں اُتر کر مکہ پہنچ جانا تھا تو اچانک آپؐ کی اونٹنی قصواء بیٹھ گئی، صحابہؓ نے یہ دیکھ کر اُس کو چوکے دیئے بھڑکایا اور کوشش کی کہ کسی طرح وہ اُٹھ کھڑی ہو مگر وہ نہ اٹھی۔ لوگ جب بار بار "حل حل[2]" کہہ کر تھک گئے تو کہنے لگے "خلأت القصواء" قصواء نافرمان ہوگئی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنا تو فرمایا "ماخلأت القصواء وماذاك لها بخلق ولكن حبسها حابس الفيل قصواء ہرگز نافرمان نہیں ہوئی اور نہ یہ اس کی عادت ہے بلکہ اُس کو اُس خدا نے روک دیا تھا جس نے ہاتھی والوں کو روک دیا تھا، یعنی قریش مکہ کی بیہودگی اور جنگی ذہنیت کی وجہ سے چونکہ جنگ کی صورتِ حال پیدا ہوگئی ہے اس لیے خدا کی مرضی یہ ہے کہ ہم اس وقت تک آگے نہ بڑھیں جب تک کہ کعبہ کی حرمت کا عہد نہ کرلیں۔

چنانچہ اس ارشاد کے بعد ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: والذی نفسی بيده لا يسئلوني خطة يعظمون فيها حرمات الله الا اعطيتهم اياها۔ اُس خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے وہ مجھ سے جو بھی ایسی بات چاہیں گے کہ اس میں

[1] بخاری باب غزوۃ الحدیبیہ۔ [2] اونٹنی کو اٹھانے کے لیے بولتے ہیں۔

حُرماتُ اللہ کی عظمت اُن کے پیشِ نظر ہو تو میں ضرور اس کو پورا کردوں گا۔"

حضورِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) جب یہ اعلان فرما چکے تو اب جو قصواء کو کھڑا ہونے کے لیے ڈپٹا وہ فوراً کھڑی ہوگئی اور چل پڑی اور حدیبیہ کے میدان میں جا پہنچی۔[1]

جب زائرینِ بیت اللہ کا مقدس قافلہ حدیبیہ میں فروکش ہوگیا تو صلاح یہ قرار پائی کہ حضرتِ عثمان (رضی اللہ عنہ) کو مکہ بھیجا جائے تاکہ وہ مشرکینِ مکہ پر یہ واضح کریں کہ ہمارا ارادہ بجز زیارتِ بیت اللہ کے اور کچھ نہیں، لہٰذا تم کو روکنا مناسب نہیں ہے۔

حضرتِ عثمان (رضی اللہ عنہ) جب مکہ میں داخل ہوئے اور ابوسفیان وغیرہ سے مل کر گفتگو کی تو انھوں نے ایک نہ سُنی اور کہنے لگے کہ تم اگر چاہتے ہو کہ تنہا طوافِ بیت اللہ کرلو، تو کرلو، ورنہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے دوسرے رفقاء کو ہرگز مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔

حضرتِ عثمانؓ نے فرمایا "یہ تو میں ہرگز نہیں کرسکتا کہ خدا کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بغیر طواف اور عمرہ کو ادا کرلوں" قریش نے جب حضرتِ عثمانؓ کا یہ اصرار دیکھا تو اُن کو واپس جانے سے روک لیا۔

بیعتِ رضوان یہ خبر مسلمانوں تک اس طرح پہنچی کہ عثمانؓ قتل کردیے گئے، مسلمانوں کیلیے یہ خبر ایک بہت بڑا سانحہ تھا جس سے ہر شخص مضطرب اور بے قابو ہوا جارہا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی وقت ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر مسلمانوں سے اس بات پر بیعت لی کہ مرجائیں گے، مگر ہم میں سے کوئی ایک بھی راہِ فرار اختیار نہیں کرے گا۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) جب سب مسلمانوں سے بیعت لے چکے تو اُن میں حیرت زا والہانہ جوش وخروش پیدا ہوگیا، جس کی خبر شدہ شدہ مکہ بھی پہنچ گئی، مشرکینِ مکہ بہت گھبرائے اور خوف زدہ ہوکر مسلمانوں تک یہ خبر پہنچائی کہ قتلِ عثمانؓ کی خبر غلط ہے اور حضرت عثمانؓ صحیح وسلامت حدیبیہ واپس تشریف لے آئے۔

[1] البدایہ والنہایہ جلد ۴ ص ۱۶۷ - ۱۶۸۔

چونکہ جہاد کی یہ بیعت بہت ہی نازک اور اہم موقع پرلی گئی اور مسلمانوں نے پورے ولولہ اور جذبۂ ایثار کے ساتھ اس بیعت کو کیا، اِس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی اس فداکاری کی قدرومنزلت فرمائی اور سورۂ فتح میں اپنی رضا اور خوشنودی کا پروانہ مرحمت فرما کر اُن کے اِس کارنامہ کو زندۂ جاوید بنا دیا اور اسی حقیقت کے پیش نظر اسلامی تاریخ میں اس کا نام "بیعتِ رضوان" قرار پایا:۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ	بلاشبہ اللہ راضی ہوا ایمان والوں سے جبکہ وہ تیرے
يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ	ہاتھ پر اس درخت کے نیچے بیعت کرنے لگے اور
مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ	جان لیا اللہ نے جو اُن کے جی میں تھا، پس اُتارا
عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا	ان پر اطمینان و سکون اور انعام میں دیا اُن کو
(الفتح پ ع)	ایک فتح قریب[1]۔

مسلمانوں کے فداکارانہ جوش اور والہانہ جذبہ نے مشرکین مکہ پر ایسا اثر کیا کہ اب وہ خود صلح پر آمادہ ہو گئے اور پیش قدمی کر کے سہیل بن عمرو کو سفیر بنا کر بھیجا کہ وہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے شرائطِ صلح طے کرے تاکہ یہ قضیہ ختم ہو جائے، مگر یہ شرط بہرصورت رہے گی کہ مسلمان اِس سال نہیں بلکہ آئندہ سال عمرہ کر پائیں گے[2]۔

معاہدۂ صلح سہیل بن عمرو جب مسلمانوں کے کیمپ میں پہنچا تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح کے نقطۂ خیال کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور طویل گفت و شنید کے بعد حسبِ ذیل دفعات پر دونوں جانب سے معاہدہ کی تصدیق و توثیق عمل میں آگئی:

(۱) اِس سال مسلمان مکہ میں داخل ہوئے بغیر ہی واپس چلے جائیں۔

---

[1] حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: "واثابھم فتحا قریبا" میں فتح قریب سے مراد "فتح خیبر" ہے جو حدیبیہ کے بعد پیش آیا اور مسلمانوں کو جس میں بہت مالِ غنیمت ہاتھ آیا، اور یہی صحیح قول ہے۔ جلد ۷، ص ۳۵۵

[2] البدایہ والنہایہ۔ جلد ۴ ص ۱۶۷ - ۱۶۸۔

(۲) آئندہ سال مسلمان مکہ میں بغرضِ عمرہ اِس طرح داخل ہوں گے کہ معمولی حفاظتی ہتھیاروں کے علاوہ کوئی جنگی ہتھیار نہیں ہوگا اور تلواریں نیام کے اندر ہی رہیں گی۔ اور صرف تین دن قیام کریں گے، اور جب تک وہ رہیں گے ہم مکہ چھوڑ کر پہاڑیوں پر چلے جائیں گے۔

(۳) معاہدہ کی مدت کے اندر دونوں جانب امن وعافیت کے ساتھ آمدورفت کا سلسلہ جاری رہے گا۔

(۴) اگر کوئی شخص مکہ سے اپنے ولی کی اجازت کے بغیر مسلمان ہوکر بھی مدینہ چلا جائے گا تو اس کو مکہ واپس کرنا ہوگا، اور اگر مدینہ سے کوئی شخص مکہ بھاگ آئے گا تو ہم اس کو واپس نہیں کریں گے۔

(۵) تمام قبائل آزاد ہیں کہ ہر دو فریق میں سے جو جس کا حلیف بننا پسند کرے اس کا حلیف بن جائے۔

(۶) یہ معاہدہ دس سال تک قائم رہے گا اور کوئی فریق اس مدت کے اندر اس کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔[۱]

معاہدہ کی تحریر کے وقت نامِ مبارک کے ساتھ "رسول اللہ" لکھنے پر سہیل نے اعتراض کیا تھا۔

آپؐ نے فرمایا کہ "یہ تو یہ واقعہ اور حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن ہم کو چونکہ صلح مقصود ہے اس لیے تم اگر یہ پسند نہیں کرتے تو مجھ کو اصرار نہیں" اور یہ فرما کر آپؐ نے کاتبِ معاہدہ حضرتِ علی (رضی اللہ عنہ) کو حکم دیا کہ وہ اِس جملہ کو محو کردیں، حضرتِ علی (رضی اللہ عنہ) سے یہ کب ممکن تھا کہ وہ اس جملہ کو اپنے ہاتھ سے مٹائیں جس کی نسبت نے ساری کائنات میں انقلاب پیدا کرکے ظلمت کو نور سے، شرک کو ایمان سے، اور جہل کو علم سے بدل ڈالا۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب یہ محسوس کیا تو مقامِ تحریر کو

[۱] البدایہ والنہایہ جلد ۴ ص ۱۶۸، ۱۶۹۔

معلوم کر کے دستِ مبارک سے اُس جملہ کو محو کر دیا۔[1]

معاہدہ جب مکمل ہو گیا تو مسلمانوں نے یہ محسوس کیا کہ اس میں ہمارا پہلو کمزور رہا، اور صورتِ حال یہ ہو گئی کہ گویا ہم نے دب کر صلح کی ہے حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ضبط نہ ہو سکا اور اعلاء کلمۃ اللہ اور اسلام کی سربلندی کے جذبہ نے مجبور کیا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں عرض کریں "یا رسول اللہ! کیا یہ حدیبیہ کا واقعہ "فتح" ہے؟" حضورِ اقدس نے ارشاد فرمایا "ہاں! قسم بخدا بلاشبہ یہ "فتح" ہے۔"[2]

یہ واقعہ جو اپنی دفعاتِ معاہدہ کے لحاظ سے مسلمانوں کے حق میں بظاہر شکست اور ذلت کا باعث نظر آتا تھا "فتح مبین" کیسے تھا؟ تو اس کا جواب جلیل القدر محدثین کی زبانی سنیئے۔ امام حدیث و سیرت زہری (رحمہ اللہ) فرماتے ہیں:۔

> اسلام میں جو عظیم الشان فتوحات شمار کی گئی ہیں، ان میں سب سے پہلی "فتح عظیم" صلحِ حدیبیہ ہے، اس لیے کہ اس سے قبل برابر کفار و مشرکین سے جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری تھا، اور جب یہ "صلح" عمل میں آگئی تو اس کی وجہ سے ہر دو فریق کو امن و اطمینان کے ساتھ ایک دوسرے سے ملنے اور گفتگو کرنے کا موقع میسر آیا، اور تبادلۂ خیالات کی آزادی نصیب ہوئی، نتیجہ یہ نکلا کہ جو شخص بھی اسلام کو اچھی طرح صحیح سے جانچتا اور اس کی حقیقت پر غور کرتا، اس کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ باقی نہ رہتا تھا کہ وہ فوراً اسلام قبول کر لے، چنانچہ ان دو سال میں (جب تک معاہدہ پر عمل رہا اور مشرکین نے اپنی جانب سے اس کی خلاف ورزی نہیں کی) لوگ اس قدر مسلمان ہوئے کہ اس سے قبل کی پوری مدت میں اسی قدر یا اس سے بھی کم مسلمان ہوئے تھے۔[3]

اور حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ ارشاد فرماتے ہیں:۔

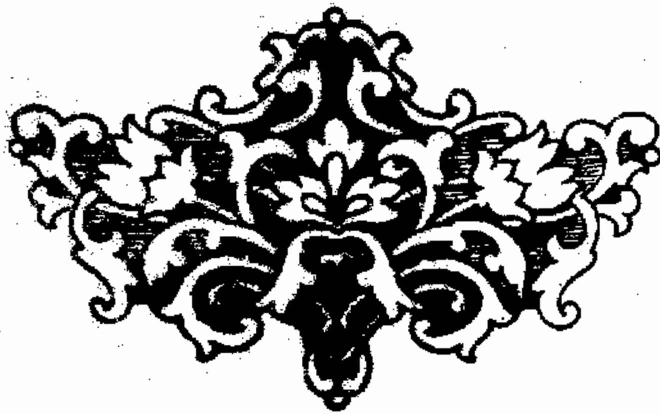
---

[1] تاریخ طبری جلد ۳ ص ۸۰۔ [2] فتح الباری جلد ۷ ص ۳۵۵ [3] ایضاً۔

"اِس مقام پر "فتح مبین" سے مراد واقعۂ حدیبیہ ہے، صلح حدیبیہ نے درحقیقت "فتحِ مُبین" "فتحِ مکہ" کے لیے راہ کھول دی، یہ اس لیے کہ جب جنگ کا خطرہ درمیان سے جاتا رہا اور امن واطمینان کی صورت پیدا ہوگئی تو مکہ اور مدینہ کے درمیان سلسلۂ آمد ورفت بے خوف خطر ہونے لگا اور حضرتِ خالد بن ولید (رضی اللہ عنہ) اور حضرتِ عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہ) جیسے شجیع اور مُدبّر حضرات کا قبولِ اسلام اِسی صلح کا کارنامہ ہے اور یہی اسبابِ ترقی آہستہ آہستہ "فتحِ مکہ" کا باعث بنے"[1]

اور ابنِ ہشامؒ، امام زہریؒ کی توجیہ کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" زہری کے قول کی تائید اس حقیقتِ حال سے بخوبی ہوجاتی ہے کہ واقعۂ حدیبیہ میں جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نکلے ہیں تو چودہ سو مسلمان جلو میں تھے اور دو سال بعد جب فتحِ مکہ کے لیے نکلے ہیں تو دس ہزار کی تعداد تھی"[2]



[1] فتح الباری ج ، ص ۳۵۵ - [2] ایضاً۔

الفتح الاعظم

رمضان المبارک سنہ ۸ ہجری مطابق جنوری سنہ ۶۳۰ء میں "فتح مکہ" کا عظیم الشان واقعہ پیش آیا۔ اِس واقعہ کی تاریخی حیثیت یہ ہے کہ حدیبیہ کے معاہدہ میں یہ طے پاگیا تھا کہ قبائل عرب اس کے لیے آزاد ہوں گے کہ نبیِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور قریش میں سے جس کے بھی حلیف بننا چاہیں بن جائیں، جب معاہدہ پر دونوں جانب سے دستخط ہو گئے تو فوراً عرب کے قبیلہ خُزاعہ نے اعلان کیا کہ ہم مسلمانوں کے حلیف ہونا پسند کرتے ہیں، اور قبیلہ بنو بکر نے کہا کہ ہم قریش کے حلیف بننا چاہتے ہیں اور دونوں قبائل اس طرح الگ الگ دو جماعتوں کے حلیف ہو گئے۔

تقریباً ڈیڑھ سال تو معاہدہ پر ہر دو جانب سے پوری طرح عمل ہوتا رہا لیکن ڈیڑھ سال کے بعد ایک نیا واقعہ پیش آیا وہ یہ کہ بنی خزاعہ اور بنی بکر کے درمیان عرصہ سے جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری رہ چکا تھا جو اس درمیانی مدت میں اگرچہ بند رہا مگر اچانک کسی بات پر پھر جنگ چھڑ گئی اور بنو بکر ایک شب کو مقام وتیرہ[1] میں بنو خزاعہ پر جا چڑھے، قریش کو جب یہ معلوم ہوا تو انھوں نے آپس میں مشورہ کیا اور کہنے لگے شب کا وقت ہے اور مسلمان یہاں سے بہت دور ہیں آج موقع ہے کہ بنی خزاعہ کو پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حلیف ہونے کا مزہ چکھایا جائے، چنانچہ انھوں نے بھی بنی بکر کا ساتھ دیتے ہوئے بنی خزاعہ کو تہ تیغ کرنا شروع کر دیا۔

---

[1] مکے کے قریب ایک مقام ہے۔

عمرو بن سالم نے جب یہ حال دیکھا تو ایک وفد لے کر دربارِ قدسی میں استغاثہ کیا، اور بنی خزاعہ کی دردناک حالت کو پیش کرتے ہوئے طالبِ امداد ہوا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: واللہ لا منعکم مما امنع نفسی منہ۔ (قسم بخدا میں جس چیز کو اپنی ذات سے روکوں گا تم کو بھی اس سے ضرور محفوظ رکھوں گا۔[1])

ادھر قریش کو جب یہ علم ہوا تو وہ ڈرے، اپنی حرکت بیجا پر نادم ہوئے اور انھوں نے ابوسفیان کو مامور کیا کہ وہ مدینہ جائے اور مسلمانوں کے اشتعال کو دور کرنے کی یہ تدبیر کرے کہ قریش چاہتے ہیں کہ سابق معاہدہ کی مدت میں مزید اضافہ اور از سرِ نو معاہدہ کی توثیق ہو جائے۔ ابوسفیان مدینہ پہنچ کر سب سے پہلے اپنی بیٹی ام حبیبہ (رضی اللہ عنہا) کے گھر میں داخل ہوا جو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رفیقۂ حیات تھیں۔ ابوسفیان نے جونہی ارادہ کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بچھے ہوئے بستر پر بیٹھ جائے، ام حبیبہؓ نے فوراً اس کو سمیٹ دیا، اور کہنے لگیں "باپ! یہ خدا کے نبیؐ کا بچھونا ہے۔ ابوسفیان نے کہا کہ "پھر کیا ہوا، میں تیرا باپ ہوں"

اُمِّ حبیبہؓ نے کہا: "یہ صحیح ہے مگر تو مشرک ہے اور یہ پیغمبرِ خدا کا پاک بستر۔

ابوسفیان اگرچہ اس وقت بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا، مگر اس حیرت زا واقعہ نے اس کی آنکھیں کھول دیں اور وہ سمجھا کہ حقیقتِ حال کیا ہے۔[2]؟

غرض وہ دربارِ اقدسؐ میں حاضر ہوا، اور عرض و معروض کرنے لگا، آپؐ نے دریافت فرمایا: یہ تجدید و توثیق کی کیا حاجت ہے، کیا کوئی نیا واقعہ پیش آگیا ہے؟ ابوسفیان نے عرض کیا "نہیں کوئی نئی بات نہیں ہے"۔ تب آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "تو مطمئن رہو کہ ہم اپنے عہد پر قائم ہیں"

ابوسفیان اس جواب کو سن کر مطمئن نہ ہوا، اس لیے کہ وہ حقیقتِ حال کو چھپا کر

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۴ ص ۲۷۸ - [2] ایضاً۔

جھوٹ بول چکا تھا اور چاہتا تھا کہ اس طرح نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دھوکا دے کر اپنا مقصد پورا کرلے لیکن اس صاف اور سچے جواب نے اوس ڈال دی اور اس کا مقصد پورا نہ ہوسکا۔ تب اس نے صدیق اکبر، فاروق اعظم، علی حیدر (رضی اللہ عنہم) کی خدمت میں حاضر ہوکر جُدا جُدا گفتگو کی اور چاہا کہ معاملہ قریش کے حسب مراد طے ہو جائے لیکن اس کی مراد بر نہ آسکی اور بے نیل و مرام مکہ واپس ہوگیا۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صدیق اکبر (رضی اللہ عنہ) کو صورتِ حال سے آگاہ فرمایا، حضرتِ صدیقؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہمارے اور قریش کے درمیان تو معاہدہ ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: "تھا مگر قریش نے خود نقضِ عہد کردیا ہے۔"

اب جہاد کی تیاری شروع ہوئی، مگر عام طور پر یہ کسی کو معلوم نہ ہوسکا کہ کس جانب ارادہ ہے، آپؐ نے اطرافِ مدینہ میں نفیرِ عام کرادیا کہ جو شخص بھی اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے وہ رمضان تک مدینہ پہنچ جائے، آپؐ پوری کوشش فرما رہے تھے کہ کسی طرح ہماری تیاری کا حال قریش کو نہ معلوم ہو جائے، کیونکہ آپؐ کی دلی خواہش یہ تھی کہ مکہ میں جنگ بپا نہ ہونے پائے اور قریش مرعوب ہوکر منقاد و مطیع ہو جائیں کہ اس اثناء میں ایک حادثہ پیش آگیا۔

حاطب بن بلتعہ کا واقعہ

حاطب بن بلتعہؓ ایک بدری صحابی تھے، ان کے اہل و عیال مکہ ہی میں تھے کہ یہ صورتِ حال پیش آگئی، انھوں نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس واقعہ کا حال بہرحال مشرکین کو معلوم ہو ہی جائے گا، سو اگر میں بھی قریشِ مکہ کو اس کی اطلاع کردوں تو ہمارا (مسلمانوں کا) کوئی نقصان بھی نہیں ہوگا اور میں اُن کی ہمدردی حاصل کرکے اپنے اہل و عیال کو ان کی مضرت سے بھی محفوظ رکھ سکوں گا، مشرکینِ مکہ کے نام ایک مکتوب لکھ دیا، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بذریعہ وحیِ الٰہی یہ معلوم ہوگیا اور آپؐ نے حضرتِ علیؓ، مقدادؓ، زبیرؓ کو مامور فرمایا کہ روضۂ خاخ جاؤ، وہاں ناقہ سوار عورت

ملے گی، وہ جاسوس ہے، اس کے پاس ایک خط ہے، وہ اس سے چھین لو، یہ حضرات روضۃ خاخ پہنچے تو عورت کو موجود پایا، انھوں نے خط کا مطالبہ کیا، عورت نے انکار کیا کہ میرے پاس کوئی خط نہیں ہے، مگر جب انھوں نے جامہ تلاشی کی دھمکی دی تو مجبور ہوکر اس نے سر کے بالوں میں سے ایک پرچہ نکال کر دیا۔

یہ پرچہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تو وہ حضرت حاطب کا خط تھا، نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کی جانب مخاطب ہوکر ارشاد فرمایا: حاطب! یہ کیا؟ حاطب نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! عجلت نہ فرمائیں، یہ خط میں نے اس لیے لکھا کہ میں جانتا ہوں کہ مدینہ میں مقیم سب مہاجرین کا مکہ کے قریشیوں کے ساتھ کسی نہ کسی قسم کا رشتہ اور تعلق ہے، ایک میں ہی ایسا ہوں جس کا ان کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہے، تو میں نے یہ صرف اس یقین پر کیا ہے کہ مسلمانوں کو تو اس بات سے کوئی نقصان نہیں ہوگا اور میں اس طرح قریش کی ہمدردی حاصل کرکے اپنے اہل و عیال کو محفوظ کرسکوں گا، یارسول اللہؐ! بخدا میں نے ہرگز، ہرگز یہ کام ارتداد اور کفر پر رضا کی نیت سے نہیں کیا، میں اب بھی اسلام کا شیدائی اور فدائی ہوں۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ سب سن کر ارشاد فرمایا "حاطب نے تمہارے سامنے سچ سچ بات کہدی۔" حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا:۔ یارسول اللہؐ! مجھ کو اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کی گردن اُڑا دوں" نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:" حاطب بدر کے مجاہد ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے شرکاء بدر کے لیے یہ ارشاد فرمایا ہے:" اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ" حاطب کے واقعہ پر ہی قرآن حکیم کی یہ آیت نازل ہوئی:" يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا عَدُوِّي وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ (الی) فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ[1] "

---

[1] بخاری۔ اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔

بہرحال رمضان کی ابتدائی تاریخیں تھیں کہ ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) دس ہزار جاں نثاروں کے ساتھ مکہ کی جانب روانہ ہوئے، آپ جب قدید اور عسفان کے درمیان کدید تک پہنچے تو دیکھا کہ مسلمانوں پر روزہ کی سختی حد سے متجاوز ہوتی جارہی ہے، تب آپ نے پانی طلب فرمایا اور مجمع کے سامنے نوش فرمایا[1] تاکہ صحابہؓ دیکھ لیں اور سمجھ لیں کہ مُسافرت اور پھر جہاد کے موقع پر افطار کی اجازت ہے، اور قرآن کی دی ہوئی رُخصت کا یہی مطلب ہے۔

اِسی سفر میں ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرتِ عبّاس (رضی اللہ عنہ) مسلمان ہوکر حاضرِ خدمت ہوئے، آپؐ نے حکم دیا کہ اہل وعیال کو مدینہ بھیج دو، اور تم ہمارے ساتھ رہو۔

اسلامی لشکر جب مکہ کے قریب پہنچا تو ابوسفیان چھپ کر لشکر کا صحیح اندازہ کررہے تھے کہ اچانک مُسلمانوں نے گرفتار کرکے خدمتِ اقدس میں پیش کیا، آپؐ نے ابوسفیان پر نگاہِ کرم ڈالتے ہوئے معاف کردیا، اور قید سے آزاد کردیا، ابوسفیان نے رحمۃ للعالمینؐ کا یہ خلق دیکھا تو فوراً مشرف باسلام ہوگئے، اِسی طرح عبداللہ بن ابی امیہ بھی اسلام کے والِہ و شیدا بن کر حاضرِ خدمت ہوئے، آپؐ نے ان حضرات کے قبولِ اسلام پر بہت مسرت کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا: "لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ یَغْفِرُاللّٰہُ لَکُمْ وَھُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ۔" نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرتِ عبّاسؓ سے فرمایا کہ ابوسفیان کو ابھی مکہ واپس نہ جانے دو اور سامنے کی پہاڑی پر لیجاؤ تاکہ وہ مسلمانوں کی طاقت وشوکت کا اندازہ کرسکے۔

ابوسفیان اور حضرتِ عبّاس رضی اللہ عنہما پہاڑی پر کھڑے ہوئے اسلامی لشکر کا نظارہ کررہے تھے، اور مہاجرین وانصار قبائل کے جُدا جُدا لشکر اپنے پرچم لہراتے ہوئے سامنے سے گذر رہے تھے، اور ابوسفیان ان کو دیکھ دیکھ کر متاثر ہورہے تھے کہ انصاری قبیلہ کا

[1] بخاری، باب الغزوات۔

ایک لشکر پاس سے گذرا، اس لشکر کا پرچم حضرتِ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھا، انھوں نے ابوسفیان کو دیکھا تو جوش میں آکر کہنے لگے: "الیوم یوم الملحمہ الیوم تستحل الکعبۃ"۔ (آج کا دن جنگ کا دن ہے، آج کعبہ میں بھی جنگ حلال ہے) ابوسفیان کی نسلی عصبیت بھڑک گئی اور کہنے لگا: "یاعباس حبذا یوم الذمار" (اے عباس جنگ کا دن مبارک ہو)

جب سب لشکر اسی طرح گذر گئے تو آخر میں ایک چھوٹی سی جماعت کے جلو میں سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سامنے سے گذرے، حضرتِ زبیر (رضی اللہ عنہ) کے ہاتھ میں پرچم تھا اور وہ آگے آگے چل رہے تھے، ابوسفیان کی نگاہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑی تو اُس نے خدمتِ اقدس میں سعد اور اپنے درمیان مکالمہ کا حال سنایا یہ سُن کر ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: سعد نے جھوٹ بولا۔ "ھذا یوم یعظم اللہ فیہ الکعبۃ و یوم تکسی فیہ الکعبۃ" (آج کا دن وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس میں کعبہ کی عظمت کو بالا کرے گا اور آج کعبہ پر غلاف چڑھایا جائے گا، اور یہ فرما کر حضرتِ سعدؓ کو برطرف کر کے پرچم اور لشکر کی سیادت حضرتِ سعدؓ کے بیٹے کو عطا کر دی۔

اب نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرتِ خالدؓ بن ولید کو حکم فرمایا کہ تم مکہ کے زیریں حصہ کی جانب سے داخل ہونا اور کسی کو قتل نہ کرنا، ہاں اگر کوئی خود اقدام کرے تو دفاع کی اجازت ہے، اور بنفسِ نفیس مکہ کے بلند حصہ سے داخل ہوئے، حضرتِ خالدؓ سے بعض قبائل کے افراد نے مزاحمت کی، اس لیے اُن کے ہاتھوں چند مقتول ہو گئے لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بغیر کسی مزاحمت کے مکہ میں داخل ہوئے[1]

جب مرّ الظہران میں حضرتِ عباس رضی اللہ عنہ نے ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) کو قبولِ اسلام کے لیے خدمتِ اقدس میں پیش کیا تھا تو یہ بھی عرض کیا تھا: یارسول اللہؐ!

[1] بخاری۔ جلد ۲۔

ابوسفیان میں فخر کا مادہ ہے اس لیے اگر اس کو کوئی امتیازی حیثیت نصیب ہو جائے تو بہتر ہو۔ آپ نے ارشاد فرمایا: "من دخل دار ابی سفیان فھو امن" جو شخص ابوسفیان کے مکان میں داخل ہو جائے گا اُس کو امن ہے۔"

غرض جب آپ باعزت واجلال مکہ میں داخل ہوئے تو اس وقت یہ اعلان کرادیا:

(۱) جو مکان بند کرا کے بیٹھ جائے اُس کو امن ہے۔

(۲) جو ابوسفیان کے مکان میں پناہ لے اُس کو امن ہے۔

(۳) جو مسجدِ حرام میں پناہ لے اس کو امن ہے۔

البتہ اس امنِ عام اور عفوِ عظیم سے چند ایسی ہستیوں کو مستثنیٰ فرمادیا جنھوں نے اسلام کے خلاف بہت زہر چکانی کی تھی اور مسلمانوں کی ایذا رسانی میں بہت زیادہ حصہ لیا تھا، مگر ان میں سے اکثر اس وقت چھپ گئے یا فرار ہو گئے اور آہستہ آہستہ عفوِ عام سے مستفیض ہو کر مشرف باسلام ہو گئے۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) مکہ میں اس شان سے داخل ہوئے کہ آپ کا علم سپید رنگ کا تھا اور آپ کا پرچم عقاب نامی سیاہ رنگ تھا، سر پر مغفر اوڑھے اور اس پر سیاہ عمامہ باندھے ہوئے تھے اور سورہ "اِنَّا فَتَحْنَا" پڑھتے ہوئے آیات کو بلند آواز سے دہراتے جاتے تھے، اور تواضع کا یہ عالم تھا کہ درگاہِ الٰہی میں خشوع وخضوع کے ساتھ ناقہ پر اس درجہ جھکے ہوئے تھے کہ چہرۂ مبارک ناقہ کی پیٹھ کو مس کر رہا تھا۔

بت شکنی | جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجدِ حرام میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے آپ نے حکم فرمایا کہ کعبہ سے تمام بُت نکال کر پھینک دیے جائیں اور دیواروں پر جو تصاویر منقوش ہیں وہ مٹادی جائیں، چنانچہ جب تین سو ساٹھ بُتوں کے سرنگوں ہونے کا وقت آیا تو دو مورتیاں حضرتِ ابراہیم وحضرتِ اسمٰعیل علیہما السلام کی اس حالت میں سامنے آئیں کہ اُن کے ہاتھوں میں بانسوں کے تیر تھے، آپ نے دیکھ کر فرمایا خدا ان مشرکوں کو مارے، یہ خوب

جانتے تھے کہ یہ دونوں مقدس ہستیاں اس ناپاک بات سے مقدس اور پاک تھیں۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کعبہ کا طواف کیا اور پھر بتوں کے سامنے کھڑے ہوکر لکڑی سے اُن کو چرکا دیتے جاتے اور یہ پڑھتے جاتے تھے: "جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ" (حق آپہنچا اور باطل اُڑ گیا۔ اور باطل نہ کسی شے کو پیدا کرے اور نہ پھیر کر لائے (یعنی باطل تو خود فنا ہونے کے لیے ہے)

رحمۃ للعالمین کی شان کعبہ جب بتوں کی نجاست و تلویث سے پاک کر دیا گیا تو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کعبہ میں داخل ہوئے اور اُس کے گوشوں میں گھومتے ہوئے بلند آواز سے تکبیرات کہتے رہے اور نماز نفل ادا کی، باہر تشریف لائے تو مصلّے ابراہیمی پر جاکر نماز ادا کی، جب آپ اور صحابہؓ وضو فرما رہے تھے تو مشرکین انگشت بدنداں وحیران تھے کہ یاں فتح وکامرانی نہ جشن ہے نہ کبر ونخوت کا اظہار، بلکہ درگاہ الٰہی میں اظہار عبودیت کے لیے ہر ایک مجاہد بیتاب نظر آتا ہے، بلاشبہ یہ "بادشاہت" نہیں ہے بلکہ دوسرا ہی کوئی عالم ہے۔[1]

آپ نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت علی (رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! آپ ہمارے لیے دو خدمتیں "حجابۃ اور سقایۃ" جمع فرما دیجیے اور کعبہ کی کنجی ہمارے حوالہ کر دیجیے۔[2] لیکن نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے متعدد بار عرض کرنے کا کوئی جواب نہیں دیا اور بار بار یہی فرمایا: "عثمان بن طلحہ کہاں ہیں؟" جب عثمانؓ حاضر ہوئے تو آپ نے کعبہ کی کلید اُن کے حوالہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "هاك مفتاحك يا عثمان اليوم يوم بر ووفاء" عثمان! لو یہ اپنی کنجی۔ آج کا دن بھلائی اور

---

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۴ ص ۳۰۰۔ [2] سقایہ یعنی حجاج کو پانی پلانے کی خدمت بنی ہاشم کے سپرد تھی، اب وہ کلید برداری کا شرف بھی جمع کرلینا چاہتے تھے۔

وفاءِ عہد کا دن ہے۔"[1]

اب لوگ منتظر تھے کہ دیکھیے جن مشرکین نے برسوں تک آپؐ کو اور مسلمانوں کو ہر قسم کی ایذا دی، مصائب میں مبتلا کیا، آج اُن کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے؟

آپؐ نے تمام قریشی قیدیوں کو حاضر ہونے کا حکم دیا اور جب سب خدمتِ اقدس میں پیش ہوئے تو آپؐ نے دریافت فرمایا: "اے قریشی گروہ! تمھارا کیا خیال ہے کہ میں تمھارے ساتھ کس طرح پیش آؤں؟ انھوں نے جواب دیا: "ہم آپ سے خیر کی امید رکھتے ہیں۔"

آپؐ نے یہ سُن کر زبانِ وحی ترجمان سے یہ ارشاد فرمایا: "اذھبوا فانتم الطلقاء" (جاؤ، تم سب آزاد ہو) یہ سُننا تھا کہ نہ صرف قریش بلکہ ہر ایک صاحبِ بصیرت کے سامنے یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ بادشاہ اور پیغمبر کی زندگی کا امتیازی نشان کیا ہے؟ پیغمبرانہ زندگی نہ ذاتی عداوت و کدورت کو کوئی وقعت دیتی ہے اور نہ اس کا غیظ و غضب ہوا و نفس کے تابع ہوتا ہے، ایک نبی کو اگر صبر آزما حد تک ایذا و تکلیف دی جائے اور پھر موذی شخص رحم کا طالب ہو تو وہ بلاشبہ "عفو و کرم" ہی پائے گا اور مکارمِ اخلاق کے ہر پہلو کا مظاہرہ دیکھے گا، چنانچہ اس درمیان میں جب ایک شخص لرزتا، کانپتا آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپؐ نے شیریں گفتاری کے ساتھ ارشاد فرمایا "ھوّن علیك فانی لست بملك انما انا ابن امراءة من قریش کانت تاکل القدید" گھبراؤ نہیں، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں میں تو خشک گوشت کھانے والی ایک

---

[1] یہ وہی عثمانؓ بن طلحہ ہیں جنھوں نے کلیدِ کعبہ طلب کرنے پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں دی تھی، لیکن رحمتِ عالمیاں کی درگاہ میں انتقام بے حقیقت شے تھی، اس لیے آپؐ نے ان ہی کے خاندان میں یہ سعادت باقی رہنے دی، یہی خاندان آج تک کعبہ کا مجاور اور شیبی کے لقب سے مشہور ہے۔ کیونکہ حضرت عثمانؓ بن طلحہ بنو شیبہ میں سے تھے۔

قریشی عورت ہی کا بیٹا ہوں۔

اسی عفو و کرم کا یہ نتیجہ نکلا کہ زعماء قریش جوق در جوق حاضر خدمت ہوتے اور دولتِ اسلام سے مشرف ہو کر سعادتِ کبریٰ سے محظوظ ہوتے تھے، چنانچہ حضرتِ معاویہؓ اور حضرتِ ابو بکر صدیقؓ کے والد ابو قحافہؓ جیسے حضرات اسی دن مسلمان ہوئے۔

خطبہ | نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس موقع پر ایک اہم خطبہ بھی دیا جو اسلام کے بہت سے احکام کی اساس و بنیاد ہے، اس خطبہ کے چند اہم اعلانات یہ ہیں:-

(۱) مسلم اور غیر مسلم ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔

(۲) معاملات اور قضایا میں مدعی کے ذمہ گواہوں کا پیش کرنا اور گواہوں کی عدم موجودگی میں مدعیٰ علیہ کے ذمہ حلف اٹھانا ہے۔

(۳) کسی عورت کو تین دن کا سفر بغیر ذی رحم محرم کے درست نہیں ہے۔

(۴) صبح اور عصر کے بعد کوئی نفل نماز نہیں ہے اور عید الفطر اور عید الاضحٰے کے دن روزہ جائز نہیں ہے۔

(۵) اے گروہِ قریش! بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تم سے نخوتِ جاہلیت اور باپ دادا کے نام و نسب پر فخر کا خاتمہ کر دیا ہے، آگاہ رہو کہ تمام انسان نسباً آدمؑ کی اولاد ہے اور آدم (علیہ السلام) کی تخلیق مٹی سے کی گئی ہے۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝ (حجرات ۱۳)

فتح مکہ اور قرآن عزیز | سورۂ فتح، حدید، نصر، ان تینوں سورتوں میں اللہ تعالیٰ نے فتحِ مکہ کے متعلق اشارات فرمائے ہیں۔ مثلاً سورۂ الفتح میں ہے:-

وَيَنصُرَكَ اللَّهُ نَصْرًا عَزِيزًا　　　اور خدا تجھ کو مدد دے گا زبردست مدد

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ فتحِ مکہ کی جانب اشارہ ہے۔

اور سورۂ حدید میں ہے :۔

لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ (حدید ع ۱)	تم میں برابر نہیں ہیں وہ کہ جس نے کہ خرچ کیا فتح مکہ سے پہلے اور جہاد کیا، ان لوگوں کا درجہ بڑا ہے اُن سے جو کہ خرچ کریں فتح مکہ کے بعد اور جہاد کریں اور سب سے وعدہ کیا ہے اللہ نے خوبی کا۔

اور سورۂ نصر میں ہے :۔

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ○	جب آجائے اللہ کی مدد اور فتح (مکہ) اور تم دیکھو لوگوں کو کہ وہ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہونے لگیں۔

یہاں باجماعِ امت "الفتح" سے مراد فتح مکہ ہے۔

حافظ ابن حجرؒ، امام شعبیؒ سے نقل فرماتے ہیں :۔

"إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا" میں "فتح مبین" صلح حدیبیہ کی جانب اشارہ ہے اور "فَجَعَلَ مِنْ دُونِ ذَٰلِكَ فَتْحًا قَرِيبًا" میں "فتح قریب" سے بھی صلح حدیبیہ کے ہی ثمرات ونتائج مراد ہیں اور سورۂ نصر کی آیت "إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ" میں "نصر و فتح" سے بالاتفاق فتح مکہ مراد ہے۔"[۱]

اور اِس نقل کے بعد تحریر فرماتے ہیں :۔

"ان آیات کے مفہوم و مراد میں صلح حدیبیہ اور فتح مکہ سے متعلق جو مختلف اقوال پائے جاتے ہیں اور موجبِ اشکال بنتے ہیں، شعبیؒ کی اس تقریر سے تمام اقوال میں مُطابقت بھی ہو جاتی ہے اور اشکال بھی دُور ہو جاتا ہے۔"[۲]

---

[۱] فتح الباری۔ جلد ۸ ص ۳۵۵۔ [۲] ایضاً ص ۳۵۵۔

سورۂ الفتح، النصر اور الحدید کی مسطورۂ بالا آیات کا مصداق فتح مکہ ہے یا صلح حدیبیہ؟
اِس بارہ میں مختلف اقوال و روایات اور امام شعبیؒ کی توجیہ اور اس پر حافظِ حدیث ابنِ حجرؒ کی تائید و تصدیق کے مطالعہ کے بعد بھی ہم یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ سورۂ فتح میں "فتحِ مبین" "نصرِ عزیز" اور "فتحِ قریب" کا ذکر اور پھر سورۂ حدید میں انفاق و جہاد فی سبیل اللہ کو "الفتح" کے قبل اور بعد کے ساتھ تقسیم درجات و فضائل کا تذکرہ اور پھر سورۂ نصر کی ایک آیت "نصر اللہ والفتح" میں نصر و فتح " کا اجتماعی ذکر صاف صاف اِس حقیقت کا اعلان ہے کہ ان مقامات میں ایسے واقعہ کا تذکرہ ہے جس کی ابتداء جہاد و قتال سے شروع ہو کر ایک ایسی فتح و نصرت پر نتیجہ خیز ہوئی ہو جس کے بعد سرزمینِ حجاز ہمیشہ کے لیے شرک و بُت پرستی کی تلویث سے پاک ہو جائے اور ظاہر ہے کہ یہ شرف بلاشبہ فتحِ مکہ کو ہی حاصل ہے، البتہ اس میں بھی شبہ نہیں کہ صلحِ حدیبیہ کے وقت سورۂ الفتح کا نزول اور "اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا" کا اسلوبِ بیان یہ بھی واضح کرتا ہے کہ صلحِ حدیبیہ چونکہ اپنے اسباب و عواقب اور نتائج و ثمرات کے لحاظ سے فتحِ مکہ کا پیش خیمہ اور اس کے لیے تمہید ثابت ہوئی، اِس لیے وہ بھی "فتحِ مبین" کہلانے کی مستحق ہے، یعنی جو واقعہ "فتحِ قریب" "نصرِ عزیز" اور "الفتح" "نصر" کا باعث ہو وہ یقیناً "فتحِ مبین" کہلانے کا حق رکھتا ہے۔



غزوۂ حُنین

"فتح عظیم" کے بعد مشرکین عرب کی شوکت وصولت کا قریب قریب خاتمہ ہوگیا، اور اب عرب قبائل جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے، یہ دیکھ کر دو قبائل کی حمیت جاہلیت بھڑک اٹھی اور وہ اسلام کی ترقی کو برداشت نہ کر سکے، ہوازن اور ثقیف دونوں قبائل کے سرداروں کا اجتماع ہوا اور انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی قوم (قریش) کو مغلوب کرکے مطمئن ہوئے ہیں، لہٰذا اب ہماری باری ہے، پس کیوں نہ ہم ہی پیش قدمی کرکے مسلمانوں پر حملہ آور ہوجائیں اور اُن کا قلع قمع کرکے رکھ دیں، دونوں نے یہ منصوبہ باندھا اور مالک بن عوف نضری کو اپنا بادشاہ تسلیم کرکے آتشِ حسد کو مسلمانوں کے خون سے بجھانے کی کوشش کی، مالک نے بہت سے قبائل کو اپنے ساتھ ملا کر جنگ کی تیاری شروع کردی۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جب یہ حال معلوم ہوا تو صحابہ (رضی اللہ عنہم) کو جمع فرمایا اور بعد مشاورت مدافعت کے لیے آمادہ ہوکر حُنین کو روانہ ہوگئے۔ اس وقت لشکرِ اسلامی میں بارہ ہزار جاں نثار موجود تھے، ان میں سے دس ہزار مہاجرین وانصار اور مدنی جاں نثار تھے اور دو ہزار وہ تھے جو فتح مکہ کے وقت مشرف باسلام ہوئے اور اتنی وہ مشرکین (طلقاء) تھے جو اسلام قبول نہ کرنے کے باوجود رحمۃ للعالمین کے مظاہرے دیکھ کر خود اپنی خواہش سے مسلمانوں کے رفیقِ جنگ بن گئے تھے۔

۱۰ ارشوال ۸ھ ہجری مطابق فروری ۶۳۰ء کو ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جلو میں

لہ فتح الباری - جلد ۸

مجاہدینِ اسلام کا لشکر حنین جا پہنچا، آپ نے دشمن کے مقابلہ میں جب اسلامی فوج صف آرا ہونے کا حکم دیا تو مہاجرین کا پرچم حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مرحمت فرمایا اور انصار میں سے بنی خزرج کا پرچم خباب بن منذر کو بخشا اور اوس کا اسید بن حضیر کو عنایت فرمایا اور اسی طرح مختلف قبائل کے سرداروں کو ان کی فوج کا پرچم عطا فرمایا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی بنفسِ نفیس ہتھیار سجے، دو زرہ ملبوس کیے خود سر پہ رکھے اپنے مشہور خچر پر سوار اسلامی فوج کی کمان کر رہے تھے۔

ابھی جنگ نے قتل و قتال کی صورت نہیں دیکھی تھی کہ مسلمانوں کے دلوں میں اپنے لشکر کی اکثریت اور فوج کی فراوانی اس درجہ اثر کر گئی کہ بعض مسلمانوں کی زبان سے انشاء اللہ کہے بغیر ہی اپنی قوت کے گھمنڈ پر یہ نکل گیا کہ آج ہماری قوت کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

مسلمان خدائے واحد کا پرستار مسلمان اور خدائے قدوس پر بھروسہ کی بجائے اپنی عددی اکثریت پر گھمنڈ کرے، یہ اس کی بھول ہے، اس لیے خدا کو مسلمانوں کا یہ فخر پسند نہیں آیا اور اس لیے ان پر یہ تازیانۂ عبرت لگا کہ جب جنگ کا افتتاح ہوا اور مسلمانوں کے لشکر نے پیش قدمی کی تو اچانک دشمن کی ان ٹولیوں نے گوریلا جنگ لڑنے کے لیے پہاڑ کی مختلف گھاٹیوں میں گھات لگاتے بیٹھی تھی چہار جانب سے اسلامی لشکر پر بارش کی طرح تیر باری شروع کر دی۔

اسلامی لشکر اس بے محابا تیر باری کا متوقع نہ تھا اس لیے ان کی صفوں میں تزلزل پیدا ہو گیا اور تھوڑی سی دیر میں مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے اور نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مشہور مہاجرین و انصار صحابہ رضی اللہ عنہم کے علاوہ تمام بندی قبائل اور مدنی لشکر کی اکثریت نے راہِ فرار اختیار کی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس حالت میں بھی یہ رجز پڑھتے اور شجاعانہ مظاہرہ فرماتے

جاتے تھے: "اَنَا النَّبِیُّ لَا کَذِب، اَنَا ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِب"

غرض اسی وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارہ پر حضرت عباسؓ نے بلند آواز سے مفرور مسلمانوں کو للکارا "یا معشر الانصار" "یا اصحاب بیعۃ الرضوان"۔

حضرت عباسؓ کی صدائے حق گونجی ہی تھی کہ ایک ایک مسلمان اپنی حالت پر متاسف ہو کر پلٹ پڑا، اور منٹوں میں تمام جاں نثار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو کر داد شجاعت دینے لگے اور نتیجہ یہ نکلا کہ شکست مبدل بہ فتح و نصرت ہو گئی اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم نے ہزیمت کو "نصر عزیز" سے بدل دیا۔

مشرکین کی جماعت میں ایک مشہور ذی رائے دُرَید بن صمۃ نامی تھا، اُس نے مالک کے اس طرز عمل کی سخت مخالفت کی تھی کہ میدان میں عورتوں، بچوں اور مال و دولت کے خزانوں کو ساتھ لے جائے، مگر مالک نے اس کی رائے پر عمل نہ کیا اور سب کو ساتھ لے کر آیا تھا چنانچہ یہ سب مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا اور مشرکین کی رہی سہی طاقت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

بہت سے مشرکین اور ان کے قبائل پر اگرچہ اسلام کی صداقت روشن ہو چکی تھی مگر پھر بھی وہ اپنے خیال میں مادی شوکت کو ہی مدارِ صداقت تسلیم کرتے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں پر خدائے تعالیٰ کے اس فضل و کرم کو جب انھوں نے اپنی آنکھوں سے اس طرح دیکھ لیا تو اب وہ بھی برضا و رغبت حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

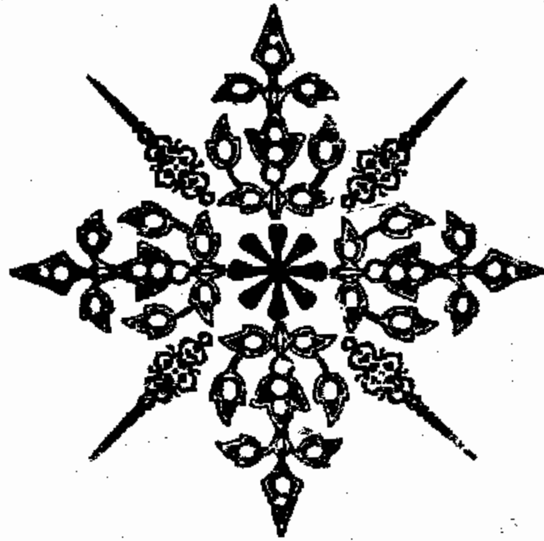
غزوۂ حنین اور قرآن حکیم | غزوۂ حنین میں مسلمانوں کے اپنی کثرت پر معجب و مغرور اور اس کے انجام میں ابتداءً شکست اور پھر خدا کے فضل سے فتح و نصرت کا حال قرآن حکیم نے سورۂ توبہ میں اپنے معجزانہ اسلوب بیان کے ساتھ اس طرح کیا ہے:۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ	بلاشبہ اللہ بہت میدانوں میں تمہاری مدد کر چکا ہے
كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ	اور حنین کے دن (بھی) جب تم اپنی کثرت پر

كَثْرَتُكُمْ فَلَنْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا
وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا
رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ثُمَّ
اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ
وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا
لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝
ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ
عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

(پ۱۰ - سورۂ توبہ - ع۴)

اترا گئے تھے تو دیکھو وہ کثرت تمہارے کچھ کام نہ آئی اور
زمین اپنی پوری وسعت پر بھی تم پر تنگ ہو گئی اور آخر کار
ایسا ہوا کہ تم میدان کو پیٹھ دکھا کر بھاگنے لگے پھر اللہ نے
اپنے رسول پر اور مومنوں پر اپنی جانب سے دل کو
سکون و قرار نازل فرمایا اور ایسی فوجیں اُتار دیں جو تمہیں
نظر نہیں آئی تھیں اور ان لوگوں کو عذاب دیا جنھوں نے
کفر کی راہ اختیار کی تھی اور جو کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں
ان کی جزا یہی ہے، اس کے بعد اللہ جس پر چاہے گا
اپنی رحمت سے لوٹ آئے گا اور اللہ بڑا ہی بخشنے والا
رحمت والا ہے۔



غزوۂ تبوک اور قبولِ توبہ کا عجیب واقعہ

علی الثلثۃ الذین خلفوا

تبوک شام کا ایک مشہور شہر ہے، ۹ سنہ ہجری میں سردارِ دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ اطلاع ملی کہ قیصرِ روم ہرقل ایک عظیم الشان لشکر مسلمانوں پر چڑھائی کے لئے تیار کر رہا ہے اور کئی لاکھ نبرد آزما دالنیٹر اب تک بھرتی ہو چکے ہیں۔

مسلمانوں کے لئے یہ وقت بہت ہی کٹھن تھا، سرزمین حجاز میں قحط پڑا ہوا تھا زمین پیداوار سے خالی، نہریں اور تالاب خشک اور گرمی نہایت شدت کی پڑ رہی تھی اور تمام آدمی عسرت کے ساتھ بسر کر رہے تھے۔

اس کے باوجود موسم بہار تھا، باغوں میں کھجوریں پک رہی تھیں، کھجور کے پتوں سے سائبان تیار کئے جاتے تھے اور عرب کے دستور کے مطابق لوگ باغوں میں خیمہ زن موسم کی بہار لوٹنا چاہتے تھے کہ اچانک یہ خبر آئی۔

سخت آزمائش کا وقت تھا۔ سیکڑوں میل کی راہ، بادِ سموم اور تپتے ہوئے ریت سے واسطہ، مگر فداکارانِ اسلام عیشِ دنیا اور مصائبِ موسم سے بے پروا اور بے خوف ہو کر پروانہ وار اسلام پر نثار ہونے کے لئے مدینہ میں جمع ہو رہے تھے۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ دستور تھا کہ جب کسی غزوہ کا ارادہ فرماتے تو عام طریقے پر یہ ظاہر نہ ہونے دیتے کہ کہاں کا قصد ہے تاکہ دشمن صحیح حالات نہ پا سکے لیکن غزوۂ تبوک میں چونکہ سخت موسم تھا، حجاز میں قحط سالی، ناسازگاری حالات اور دشمن کی زبردست

قوت کا مقابلہ کرنا تھا، اس لئے اس کڑی آزمائش میں ذات اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تمام قبائلِ عرب میں اصل حقیقت کا اعلان کرا دیا تاکہ جو شخص بھی اس وادئ پُرخار میں قدم رکھے سوچ سمجھ کر رکھے۔

مالی استعانت | مسطورہ بالا نازک حالات کے پیشِ نظر یہ پہلا غزوہ ہے جس میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجاہدین کی مالی استعانت کے لئے ترغیب دی اور جلیل القدر جاں نثارانِ اسلام کو اپنی مالی فداکاری کا ثبوت دینے کے لئے موقع بہم پہنچایا، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دس ہزار دینار سُرخ، تین سو اونٹ اور پچاس گھوڑے پیش کئے اور ذاتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کے اس جذبۂ اخلاص پر یہ دعا فرمائی "اللھم ارض عن عثمان فانی راض عنہ" خدایا تو عثمان سے راضی ہو اس لئے کہ میں اس سے راضی ہوں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا نصف مال پیش کر دیا۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف نے سو اوقیہ، اور حضرت عاصم بن عدی نے ساٹھ وسق کھجوریں پیش کیں اور حضرت عباس و حضرت طلحہ (رضی اللہ عنہما) نے زرِ کثیر پیش کیا اور عورتوں نے بھی اپنے حوصلہ سے زیادہ زیورات پیش کئے۔ حتیٰ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تو اپنا کل مال ہی اسلام پر قربان کر دیا۔ صدیق اکبر جب اپنا مال لیکر حاضر خدمت ہوئے تو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دریافت کیا: ابوبکر تم اپنے اہل و عیال کے لئے بھی کچھ چھوڑ کر آئے ہو؟ ابوبکر (رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا "ہاں یا رسول اللہ! میں اپنے گھر میں اللہ اور اسکے رسولؐ کا نام چھوڑ آیا ہوں"۔

غرض عظیم الشان تیاریوں کے بعد جب مسلمانوں کا لشکر جرار اعلائے کلمۃ اللہ کے فداکارانہ ولولہ اور جوش کے ساتھ تبوک کی طرف بڑھا تو ہرقل کو بھی جاسوسوں نے خبر کر دی۔ ہرقل یا تو کروفر کے ساتھ جنگ کی تیاریوں میں مشغول تھا اور یا یہ خبر سنتے ہی ہوش و

حواس کھو بیٹھا اور رومی مسلمانوں کے عدیم النظیر جذبۂ ایثار وفداکاری) سے متاثر و خائف ہوکر تبوک میں مسلمانوں کے پہنچنے سے قبل ہی منتشر ہوگئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم راہ کے چند عیسائی امراء کو امن کا پروانہ دیتے اور معاہدات کرتے ہوئے کامرانی کے ساتھ واپس آگئے۔

عذرخواہی جب آپ مدینہ جلوہ افروز ہوئے تو منافقین نے اس عظیم الشان آزمائش میں عدم شرکت کے لئے جھوٹے اعذار تراش کر خدمت اقدس میں عذر خواہی کی اور ذات اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے جماعتی نظام کی مصالح کے پیش نظر ان سے درگذر فرمایا۔

مگر عذر خواہ جماعتوں میں تین اشخاص مخلصین اسلام میں سے بھی تھے اور وہ کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع جیسی ہستیاں تھیں انھوں نے منافقین کی طرح حاضر ہوکر کذب بیانی سے کام نہیں لیا اور صاف صاف عرض کردیا کہ اے خسرو دین ودنیا میں چاہتا تو منافقین کی طرح کوئی جھوٹا عذر پیش کرکے آپ کے مواخذہ سے بچ جاتا لیکن اگر کسی دنیادار سے ایسا معاملہ پیش آتا تو کربھی لیتا مگر خدا کے نبیؐ کے ساتھ ایسا نہیں کرسکتا۔ سچ بات یہ ہے کہ میں محض اپنی کاہلی کی وجہ سے محروم الجہاد رہا، ہر دن یہ خیال کرتا رہا کہ آج اپنے باغوں کے لطف سے اور سیر ہولوں کل ضرور روانہ ہوجاؤں گا اور لشکر اسلام کو ایک دو منزل ہی پر جاپکڑوں گا، آخر کار اس کاہلی کا نتیجہ محرومی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اب جو حکم ہو اس کے لئے سر تسلیم خم ہے، یہی ہلال اور مرارہ نے کہا اور اس طرح تینوں مجرموں کی طرح حکم رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سننے کے لئے گوش برآواز ہوگئے۔

معاشرتی مقاطعہ یہ تینوں حضرات اسلام کے فدائی، اخلاص کے پیکر، اور عاشقانِ رسول ﷺ تھے، اس لئے ان کا معاملہ منافقین کا سا نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ نظام جماعت

کی خلاف ورزی کر گذریں اور جہاد جیسے عظیم ترین رکنِ ملت کو محض کاہلی اور سستی پر قربان کر دیں اور پھر ان کو معمولی معذرت پر معاف کر دیا جائے اس لئے ضرورت تھی کہ اس معاملہ میں ایسا فیصلہ دیا جائے کہ آئندہ کسی مخلص مسلمان کو ایسی غلط کاری اور نظام کی خلاف ورزی کی جرأت نہ ہو سکے، چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اما ھذا فقد صدق فقم حتی یقضی اللہ فیک"۔ "تم نے سچ سچ بات کہدی۔ اب جاؤ اور خدا کے فیصلہ کا انتظار کرو"۔

"تینوں" اس حکم کے بعد گھر واپس آ گئے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہؓ کو حکم فرما دیا کہ ان تینوں سے کلام و سلام سب ترک کر دیا جائے، چنانچہ تمام مسلمانوں نے ان کا معاشرتی مقاطعہ کر دیا۔

ضبط و نظم کی عدیم النظیر مثال

کعب خود فرماتے ہیں کہ اس واقعہ نے ہم تینوں پر جو کچھ اثر کیا اس کا اندازہ دوسرا کوئی نہیں کر سکتا۔ میرے دونوں رفیقوں پر تو اس درجہ اثر پڑا کہ انھوں نے باہر نکلنا ہی ترک کر دیا۔ مگر میں سخت جان تھا برابر نمازوں کے اوقات میں مسجد نبوی میں حاضر ہوتا رہا۔

جب میں مسجد میں حاضر ہوتا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرتا اور دیکھتا رہتا کہ لب مبارک کو حرکت ہوئی یا نہیں مگر بدقسمتی اور محرومی کے سوا کچھ نہ پاتا، البتہ یہ محسوس کرتا تھا کہ جب میں نماز میں مشغول ہوتا تو آپ میری جانب دیکھتے رہتے اور جب میں فارغ ہو کر آپؐ کی جانب متوجہ ہوتا تو میری جانب سے رُخِ مبارک پھیر لیتے۔

لیکن اس تمام واقعہ میں مسلمانوں کی اسلام دوستی اور امر رسول پر امتثال و والہانہ استقامت کا یہ حال تھا کہ جب میں لوگوں کی اس سختی سے اکتا گیا تو ایک روز اپنے سب سے محبوب عزیز اور چچازاد بھائی ابو قتادہ کے پاس گیا۔ اس ابو قتادہ کے پاس جو اس سے قبل مجھ پر جان چھڑکتا تھا اور میرا عاشق و جاں نثار تھا۔ میں نے اس کو سلام کیا، مگر

قسم بخدا کہ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں اس حالت کو دیکھ کر تڑپ گیا اور ابوقتادہ سے کہا: ابوقتادہ! میں خدا کی قسم دیکر تجھ سے دریافت کرتا ہوں کیا تجھے معلوم نہیں کہ میں خدا اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہوں اور میں عاشق خدا و رسول ہوں؟ ابوقتادہ پھر بھی خاموش رہا اور کوئی جواب نہیں دیا، میں نے دو مرتبہ پھر اس بات کو دُہرایا مگر اس نے سکوت ہی اختیار کیا اور کوئی جواب نہ دیا، آخر جب تیسری مرتبہ کہا تو صرف یہ کہہ کر چپ ہوگیا "اللہ ورسولہ اعلم" خدا اور رسول ہی خوب جانتا ہے"۔

یہ سُن کر مجھ سے ضبط نہ ہوسکا اور میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں کہ اللہ اکبر! یہ انقلاب اور صرف یہیں تک معاملہ ختم نہیں ہوا بلکہ چالیس دن گذرنے پر رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حکم فرمایا کہ ان تینوں کی رفیقۂ حیات کو بھی چاہیئے کہ شوہروں سے مقاطعہ کر کے الگ ہوجائیں چنانچہ ان اللہ کی بندیوں نے ہمارے ساتھ قلبی تعلق کے باوجود حکم رسول کو مقدم سمجھا اور اپنے میکے چلی گئیں۔ البتہ ہلال بن امیہ کی رفیقۂ زندگی نے دربارِ رسالت میں جاکر عرض کیا: یا رسول اللہ! ہلال بہت بوڑھے ہیں۔ ان کی خدمت گذار صرف میں ہوں، دوسرا کوئی نہیں، اگر وہ میری خدمت سے محروم ہوگئے تو ان کی ہلاکت کا اندیشہ ہے، اب کیا حکم ہے؟ تب آپؐ نے فرمایا "خدمت کرتی رہو، باقی تعلقات کو سردست منقطع کردو" یہ سُنکر اس نے سرِ تسلیم خم کردیا اور اس کے باوجود کہ شوہر اور بیوی یا عزیزوں اور رشتہ داروں کے درمیان دوسرا کوئی موجود نہیں ہوتا تھا تب بھی کیا مجال کہ ایک لمحہ کے لئے بھی کسی نے امرِ رسول سے انحراف کرنے کی جرأت کی ہو۔ اللہ اللہ! یہ ہے سچی شانِ انقیاد اور اطاعتِ خدا و رسول۔

عشقِ رسول اور صداقتِ اسلام کا حیرت انگیز معیار

کعب بن مالکؓ کا چالیس دن سے مسلسل معاشرتی مقاطعہ ہے غیروں کا تو ذکر ہی کیا۔ قریبی عزیز و رشتہ دار حتی کہ رفیقۂ زندگی بھی اسلام اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حکم پر پروانہ وار نثار

ہوتے ہوئے کعب" کا مقاطعہ کئے ہوئے ہیں، گویا اس طرح کعبؓ پر خدا کی زمین تنگ ہوگئی ہے وہ اس مایوسی اور حیرانی کی حالت میں مدینہ کے بازار سے گذر رہے ہیں کہ اچانک شام کا ایک نبطی پکارتا ہوا نظر آیا "من یدل علی کعب بن مالکؓ" مجھ کو کوئی کعب بن مالک تک پہنچا دے۔"

لوگوں نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ کعب وہ جا رہے ہیں، نبطی آگے بڑھا اور کعب کی راہ روک کر ان کی خدمت میں ایک خط پیش کیا، کعب نے پڑھا تو شاہ غسان کا خط تھا۔ اس میں لکھا تھا:

امابعد! فانہ قد بلغنی ان	امابعد! مجھکو معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ساتھی محمد
صاحبك قد جفاك ولم	(صلی اللہ علیہ وسلم) نے تم پر بڑا ظلم کر رکھا ہے خدا نے تم
يجعلك الله بدار هوان ولا	جیسی ہستی کو ذلت اور ضیاع کیلئے نہیں بنایا پس
مضيعة فالحق بنا نواسك لـه	تم ہمارے پاس چلے آؤ ہم تمہاری خاطر خواہ عزت کریں گے۔

حضرت کعب (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں خط پڑھتے ہی مجھکو سخت رنج و ملال ہوا اور میں نے دل میں کہا کہ یہ آزمائش و ابتلا پہلی آزمائش سے بھی زیادہ کٹھن ہے، میں اور شاہ غسان کو میرے متعلق یہ گمان کہ اس امتحان سے گھبرا کر اس کے پاس بھاگ جاؤں اور خدا اور خدا کے رسول سے منہ موڑ لوں، آہ یہ بہت ہی تکلیف دہ صورت حال ہے۔ بہرحال شاہ غسان کی اس ذلیل حرکت پر مجھے ایسا غصہ آیا کہ میں ایک تنور کے سامنے پہنچا اور اسکے خط کو اس میں جھونک کر نبطی سے کہا! یہ ہے تیرے بادشاہ کے خط کا جواب اور میں خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر بے چینی کے ساتھ عرض رسا ہوا: "شاہِ ہر دو سرا! آخر یہ اعراض کیوں اس درجہ کو پہنچ گیا کہ اب مشرکین تک مجھے بہلانے کی جرأت کرنے لگے ہیں۔

غرض اسی طرح پچاس راتیں گذر گئیں اور ہماری محرومی کی گرہ نہ کھلی اور ارشاد خداوندی کے بموجب خدا کی زمین وسیع ہونے کے باوجود ہم پر تنگ ہو گئی اور اپنی جان وبال

له فتح الباری ج ۸ ص ۹۰، مسند احمد ج ۶ ص ۳۹۰

نظر آنے لگی کہ یک بیک صبح کی نماز کے بعد سلع کی چوٹی پر سے ایک پکارنے والے نے پکارا "اے کعب بشارت ہو" میں تو انقلابِ حال کا منتظر ہی تھا، فوراً سمجھ گیا کہ درگاہِ الٰہی میں توبہ قبول ہو گئی، اب کیا تھا مسرت وخوشی سے پھولا نہ سمایا اور وہیں سجدہ میں گر گیا۔

اب جوق درجوق لوگ آرہے ہیں اور قبولِ توبہ کا مژدہ سُنا رہے ہیں اور کل تک جو اجنبی نظر آتے تھے اس وقت جاں نثار اور محب بن کر اظہار مسرت کر رہے ہیں اور رفیقۂ حیات کی جانب سے بھی مبارکباد پیش کی جا رہی ہے، سب سے پہلے جس شخص نے مجھکو قبول توبہ کی مفصل بشارت سنائی وہ ایک سوار تھا، میں نے اظہارِ خوشی میں جو کپڑے پہنے ہوئے تھا اتار کر اس کو دیدیئے۔ خدا کی شان کہ میرے پاس اور کپڑے بھی نہیں تھے اسلئے مستعار مانگ کر پہنے اور بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا، راہ میں بھی لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا اور مجھ پر مبارکبادیوں اور بشارتوں کے پھول برسائے جا رہے تھے۔ دربارِ رسالت پہنچا تو آنحضرت آگے بڑھے اور مجھ سے مصافحہ کیا اور مبارکباد پیش کی، اسی مسرت کے ساتھ میں جلوۂ جہاں آرا کا طالب ہوا تو دیکھا کہ چہرۂ مبارک مسرت وشادمانی سے برق کی طرح چمک رہا ہے، مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا: "ابشر بخير يوم مر عليك منذ ولدتك امك" اس مبارک دن میں بشارت حاصل کر تیری ولادت سے آج تک جس سے بہتر کوئی دن نہیں آیا" میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ قبول توبہ آپ کی جانب سے ہے یا خدا کی جانب سے؟ حضورؐ نے فرمایا میری جانب سے نہیں خدا کی جانب سے ہے"۔

آپؐ نے یہ جواب مرحمت فرمایا اور رخِ انور قمر کی طرح روشن نظر آنے لگا۔ میں نے مسرت کے لہجہ میں عرض کیا: اے خدا کے رسول! "میری قبولِ توبہ کا ایک جزیہ بھی ہو جائے کہ میں اپنا کل مال خدا کی راہ میں تصدق کر دوں"۔ آپ نے ارشاد فرمایا "بہتر یہ ہے کہ کچھ حصہ اپنے لئے رکھ لو"۔ میں نے عرض کیا بہتر ہے۔ خیبر کا جو حصہ میرے پاس ہے اس کو روکے لیتا ہوں"۔ میں نے یہ بھی عرض کیا، یا رسول اللہؐ! یہ سچائی کا صدقہ ہے کہ آج

اس نعمتِ بیکراں سے مالا مال ہوں اس لئے عہد کرتا ہوں کہ عمر بھر صدق مقال کے ماسوا میرا شعار کچھ نہ ہوگا۔

حضرت کعبؓ فرماتے ہیں میرے اس معاملہ میں رنج و غم کے برد و رفقاء کا بھی مسرت و بہجت سے یہی حال ہوا اور ہماری قبول توبہ پر جو آیاتِ فضل نازل ہوئی تھیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے ان کی تلاوت فرمائی :-

قبولِ توبہ اور سورۂ توبہ

لَقَدْ تَابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ	بے شک اللہ اپنی رحمت سے نبی پر متوجہ ہوگیا اور
وَالْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ	مہاجرین اور انصار پر بھی جنھوں نے بڑی تنگی اور
الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ	بے سروسامانی کی حالت میں اس کے پیچھے قدم
مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ	اٹھایا اور اس وقت اٹھایا کہ قریب تھا ان میں سے ایک
فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ	گروہ کے دل ڈگمگا جائیں، پھر وہ اپنی رحمت
اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۙ وَّعَلَى	سے ان سب پر متوجہ ہوگیا بلا شبہ وہ شفقت
الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓي	رکھنے والا، رحمت کرنے والا ہے، اور ان تین
اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا	شخصوں پر بھی (اپنی رحمت کے ساتھ رجوع ہوا)
رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ	جو معلق حالت میں چھوڑ دیئے گئے تھے حتیٰ کہ
وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ	نوبت یہ آگئی کہ زمین اپنی ساری وسعت کے
اِلَيْهِ ۭ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ۭ اِنَّ	باوجود ان پر تنگ ہوگئی تھی اور وہ خود بھی اپنی جان
اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ؀	سے تنگ آگئے تھے اور انھوں نے جان لیا تھا کہ اللہ کی
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ	پکڑ سے بھاگ کر انھیں کوئی پناہ نہیں مل سکتی مگر خود اسی
وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ؀	کے دامن میں پس اللہ ان پر اپنی رحمت کے ساتھ لوٹ آیا تاکہ
	وہ رجوع کریں۔ بلا شبہ اللہ ہی بڑا توبہ قبول کرنے والا
(توبہ)	ہے بڑا ہی رحمت والا۔

قرآن عزیز اور غزوۂ تبوک

قرآن عزیز نے صرف اسی واقعہ کا ذکر نہیں کیا بلکہ غزوۂ تبوک کی اہمیت کے پیش نظر اس کی بہت سی تفصیلات بیان کیں اور اس سلسلہ میں پند و موعظت کے ذریعہ مسلمانوں کی رشد و ہدایت کا سامان مہیا کیا ہے چنانچہ اس سورہ میں چھٹے رکوع سے لیکر آخر سورہ تک اسی غزوہ اور غزوہ سے متعلق حالات و مواعظ کا تذکرہ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ (الی) فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۝



اہم غزوات اور نتائج وبصائر

بدر الکبریٰ (۱) عقائد اسلامی وافکار ملی کے بنیادی مسائل میں سے ایک مسئلہ یہی ہے کہ فتح وشکست کا مدار عددی اکثریت واقلیت پر نہیں ہے بلکہ صرف عنایتِ خداوندی اور اس کے فضل وکرم پر ہے۔ "كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ"

(۲) جو جماعت احساسِ فرض کے ساتھ عدل ونصفت کے لئے میدان میں نکلتی ہے کبھی ناکام نہیں ہوتی اور انجام اسی کے ہاتھ رہتا اور خدا کی نصرت کا پیغام اسی کو نصیب ہوتا ہے۔ "وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ"

(۳) اگر قلب میں اخلاص اور صداقت حق کا جذبہ موجود، اور خدا اور رسول پاکؐ کے حکم وارشاد کے سامنے گردن خم ہے تو یہ اسباب دنیوی بشری تقاضے کے پیش نظر اپنی جانب کا خوف وہراس قابل ملامت نہیں ہے اور خدائے برتر ضرور اس کو ثبات واستقامت عطا فرماتا ہے۔

(۴) "صبر واستقامت" ایسے میٹھے پھل ہیں جن کی شیرینی دنیا ودین دونوں ہی میں لذت وسکون اور رفعت وسعادت سے ہمکنار کرتی ہے چنانچہ غزوۂ بدر الکبریٰ اس حقیقت کے لئے زندۂ جاوید شہادت ہے۔

(۵) باطل کے برسرِ پیکار حاملِ حق وصداقت جماعت بہ اسباب دنیوی جس قدر زیادہ بے یار ومددگار ہوتی ہے خدا کی نصرت وحمایت اسی قدر زیادہ معجزانہ کرشمے دکھا کر حمایت حق کا ساتھ دیتی اور باطل کو ناکام بنا کر حق کو شاد کام کرتی ہے چنانچہ بدر میں ابرِ رحمت کا نزول، ملائکۃ اللہ کا ورود، نظر مسلم میں دشمن کی کثیر تعداد کا مشاہدہ

قلیل اور مشرکین کی نگاہ میں مسلمانوں کی تعدادِ قلیل کا مشاہدہ کثیر یہ سب معجزانہ امور سبھی قانونِ الٰہی کی کرشمہ سازیاں تھیں۔

احد (۱) "جہاد" مخلص و منافق کی معرفت کے لئے بے نظیر کسوٹی ہے چنانچہ غزوہ احد اور غزوہ تبوک میں یہ حقیقت نمایاں نظر آتی ہے چنانچہ احد کے موقع پر راس المنافقین عبد اللہ بن اُبی اپنی جماعت کے ساتھ لشکر اسلامی سے یہ کہہ کر جدا ہوگیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے چونکہ ہمارا مشورہ نہیں مانا اس لئے ہم کیوں میدانِ جہاد میں جاکر ہلاکت میں پڑیں اور غزوہ تبوک میں یہ کہہ کر لوگوں کو فداکاری و جاں نثاری سے روکتا رہا "لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ گرمی کی شدت میں جنگ کی آگ کے اندر نہ کودو" اور اس حقیقت کو فراموش کر دیا: "نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا" جہنم کی آگ کی شدت دنیا کی گرمی کی شدت سے کہیں زیادہ سخت ہے۔

(۲) امیر "خلیفہ" اور اس کے نائبین کا فرض ہے کہ اہم امور میں مسلمانوں سے مشورہ کرے، اور باتفاق رائے یا بکثرت رائے جو فیصلہ ہو اسی کو اپنا عزم بنائے۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نزول وحی ہوتا تھا اس لئے آپؐ اگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ نہ بھی فرماتے تو کوئی قباحت نہ تھی تاہم "اسوہ حسنہ" کو شعار بنانے کے لئے آپؐ اہم امور میں برابر مسلمانوں سے مشورہ فرماتے رہے۔ چنانچہ غزوۂ احد میں بھی مشورہ فرمایا اور اس مشورہ کی یہ خصوصیت ہے کہ خود ذات اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) اور عمر و تجربہ کار صحابہ کہ جن کی قوت و اصابتِ رائے پر آپؐ کو اعتماد تھا کی رائے یہ تھی کہ غزوۂ احد کے موقعہ پر مسلمانوں کو مدینہ سے نکل کر جنگ نہیں کرنی چاہئے مگر اکثریت کے لحاظ سے اُن صحابہؓ کی تعداد بہت زیادہ تھی جن کا اصرار تھا کہ ہم کو مدینہ سے باہر میدان میں نکل کر جنگ کرنی چاہیے، تو آپؐ نے اکثریت کے فیصلہ کو برقرار رکھتے ہوئے باہر نکل کر جنگ کرنے کو ہی ترجیح دی اور اس عملی اسوہ حسنہ کو اپنے سطور ذیل ارشاد مبارک سے محکم و مضبوط بنا دیا۔

حضرت علی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک صحابی نے یہ استفسار کیا: ما العزم یا رسول اللہ! اے خدا کے رسول! (قرآن میں مذکور "فاذا عزمت" میں "عزم" سے کیا مراد ہے، آپ نے ارشاد فرمایا: مشاورۃ اھل الرأی ثم اتباعھم۔ "اہل الرائے سے مشورہ کرنے کے بعد (امام و خلیفہ کا) ان کی دی ہوئی رائے پر عمل پیرا ہونے کا نام "عزم" ہے ۔[1]

(۳) تمام معاملات میں عموماً اور جہاد و میدان جنگ میں خصوصاً "ضبط و نظم" اہم امور میں سے ہے، اگر کسی جماعت میں اس کا فقدان ہے تو وہ جماعت حامل حق و صداقت ہی کیوں نہ ہو، کامیابی و کامرانی کا سہرا اس کے سر نہیں ہو سکتا اور جس درجہ اس بنیادی حقیقت کا رمیں کمی ہوگی اسی قدر اس جماعت میں اضمحلال اور ضعف غالب ہوگا۔

غور کیجیے کہ غزوۂ اُحد میں مشرکین کے مقابلہ میں تیر بار مسلم جماعت کے نظم و ضبط کی خلاف ورزی نے کس طرح مسلمانوں کی فتح و نصرت کو اچانک شکست کے ساتھ بدل دیا، پیغمبر خدا ہادیٔ اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) شریک جنگ ہیں، مسلمان مشرکین پر غالب اور مشرکین ہزیمت سے دوچار ہو رہے ہیں کہ مالِ غنیمت کے شوق میں اپنے سردار کے منع کرنے کے باوجود جب تیر بار جماعت نے گھاٹی چھوڑ دی تو یک بیک فتح شکست سے بدل گئی اور صرف یہی نہیں بلکہ سردار دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی چشم زخم پہنچا اور دندانِ مبارک تک شہید ہو گیا۔ "فاعتبروا یا اولی الابصار"

(۴) یہ ضروری نہیں ہے کہ جب کبھی حق و باطل میں معرکہ آرائی ہو تو حق ضرور جیت جائے اور ابتدائے کار میں بھی اس کو کبھی شکست نہ ہو، اگر ایسا ضروری ہو تو حق و باطل کی آزمائش و امتحان کی کوئی سبیل باقی نہ رہے اور قبول حق و باطل اختیاری نہ رہے اضطراری بن جائے۔ یہی حقیقت ہے جس کو ابوسفیان کے اس جواب پر "الحرب سجال" جنگ ان ڈولوں کی

[1] تفسیر ابن کثیر، رواہ ابن مردویہ بسند صحیح تحت آیۃ: فاذا عزمت فتوکل علی اللہ۔

کی طرح ہے جو ایک رسی میں اس طرح بندھے ہوں کہ کبھی ایک نیچے پانی میں چلا جاتا ہے اور دوسرا ابھر آتا ہے اور کبھی پہلا ابھر آتا ہے۔

روم کے شہنشاہ ہرقل (ہرکلس) نے کہا تھا کہ تیرا یہ قول سچ ہے کہ کبھی تم کو فتح ہو جاتی ہے اور کبھی اس مدعی رسالت (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو، اور کبھی تم شکست کا منہ دیکھتے ہو اور کبھی وہ، تو اے سفیان! نبی و رسول کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ جنگ کے موقعہ پر کبھی بھی اس کو شکست نہ ہو، ہاں البتہ یہ ازبس ضروری ہے کہ اس معرکہ آرائی کا آخری انجام حق کی فتح اور باطل کی شکست پر جا کر ختم ہو جائے گا۔"

(۵) میدانِ جہاد میں منافق اور ضعیف اعتقاد کا جدا رہنا ہی مفید اور کامیابی کے لئے ازبس ضروری ہے، اسی لئے جن غزوات میں منافقین نے مسلمانوں میں ضعف پیدا کرنے کے لئے شرکت جنگ سے پہلو تہی کی یا میدان میں نکل کر واپس ہو گئے تو انکی یہ ناپاک حرکت مسلمانوں کو ذرہ برابر بھی نقصان نہ پہنچا سکی، بلکہ اس کے برعکس مخلص فداکاروں اور جاں نثاروں کی چھوٹی سی چھوٹی تعداد نے بھی وہ انقلاب پیدا کر دیا کہ باطل کا قلع قمع ہو کر رہ گیا۔

غزوۂ احزاب (۱) کائنات انسانی پر خدا کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے ذاتِ اقدس محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ "اخوت و مساوات" کا وہ عظیم الشان علمی و عملی نقشہ پیش کیا کہ جس کی مثال عالم انسانی کی تاریخ پیش کرنے سے عاجز ہے۔

غزوۂ خندق میں سرور دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے جاں نثار رفقاء کے ساتھ بھوک سے پیٹ پر پتھر باندھ کر خندق کھودنے اور ٹوکری میں بھر کر اس کی مٹی منتقل کرنے میں جس طرح برابر کا حصہ لیا وہ اگر ایک طرف یہ ظاہر کرتا ہے کہ دنیوی بادشاہ شہنشاہ اور ہادیٔ اعظم نبی و رسول کے درمیان کس قدر عظیم فرق ہے، اسی طرح یہ بھی روشن کر دیتا ہے کہ اسلام کے مقدس جھنڈے کے نیچے خدمتِ حق کے لئے خلیفہ و امام اور ہادیٔ برحق تک

بھی کس طرح ایک سپاہی کے دوش بدوش ادنیٰ سے ادنیٰ کام میں برابر کا شریک سہیم بن جاتا ہے۔

(۲) کفار کی تمام جماعتوں کے متفقہ حملہ کے وقت حضرت سلمان فارسی کا مشورہ دینا کہ ایسے نازک وقت میں اہلِ فارس کا یہی دستور ہے اور نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ان کے دیئے ہوئے مشورہ کو قبول فرمانا دلیل ہے اس امر کی کہ ہر زمانہ میں وقت کے ترقی یافتہ وسائلِ دنیوی کو امرِ حق کی حمایت کے لئے اختیار کرنا اور اپنانا اسلام سے انحراف نہیں بلکہ بہترین اسلامی خدمت ہے۔ بشرطیکہ وہ اسباب و وسائل اسلامی اصول و احکام سے متصادم نہ ہوں۔

(۳) جہاد اسلام کا اس درجہ عظیم الشان رکن اور اس کی بقاء و حفاظت کے لئے ایسا اہم فریضہ ہے کہ اس ادائے فرض و مشغولیت میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور صحابہ (رضی اللہ عنہم) کا نماز جیسا اہم فریضہ قضا ہوگیا اور آپ نے اور صحابہ نے عصر کی نماز مغرب کے وقت ادا فرمائی۔

اور نماز کیسا اہم سے اہم تر فریضہ ہے اس حقیقت سے واضح ہوتا ہے کہ جہاد جیسے عظیم الشان فداکارانہ اور جاں نثارانہ عمل کے وقت بھی جبکہ انسان میدانِ جہاد میں جان ہتھیلی پر لئے مشغولِ جنگ ہوتا ہے، عبادتِ الٰہی سے غافل نہیں رکھا گیا اور ایسے وقت میں نصِ قرآنی نے "صلوٰۃ خوف" کی طرح ڈال کر نماز کی اہمیت و جلالتِ قدر پر مہرِ تصدیق ثبت کردی۔

(۴) جنگ میں ایسے طریقے اختیار کرنا صحیح ہیں جن میں کذب اور خلفِ وعد جیسے قبیح امور کا دخل نہ ہوتے ہوئے دشمن کو بغیر جنگ ہی کے نقصان و ہزیمت کا منہ دیکھنا پڑ جائے، یا وہ یہ صحیح اندازہ نہ کرسکے کہ اسلامی لشکر کا رُخ کس جانب ہے اور اس طرح حقیقتِ حال مستور ہوکر دھوکے میں پڑ جائے، چنانچہ غزواتِ اسلامی میں یہ دونوں پہلو عملی لباس میں صاف

نظر آتے ہیں اور یہی مفہوم ہے ارشادِ نبوی "الحرب خدعۃ" کا

صلح حدیبیہ (۱) اجتماعی مصالح اسلامیہ اگر متقاضی ہوں تو خلیفہ اور امیر المومنین کو اختیار ہے کہ وہ کفار مشرکین سے ایسی صلح کرے جو اگرچہ بظاہر حال شکست خوردہ نظر آتی ہو، مگر وقتِ نظر اور فکرِ عمیق کا یہ فتویٰ ہو کہ ثمرہ اور نتیجہ کے لحاظ سے یہ مسلمانوں کے حق میں فتحِ مبین اور ظفر و نصر کا سبب ثابت ہوگی، جیسا کہ حدیبیہ کے صلح نامہ کی دفعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

(۲) بسا اوقات ہماری ظاہر بین نظر میں ایک معاملہ کو موجبِ توہین سمجھتی اور اس کو کراہت سے دیکھتی ہیں لیکن وہ خدا کے نزدیک اسلام اور مسلمانوں کے حق میں بہتر اور موجب عزت بننے والی ہوتی ہے اسی طرح بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جس شئے کو ہماری نظریں خیر اور موجبِ فلاح سمجھتی ہیں وہ ثمرہ اور نتیجہ کے اعتبار سے باعثِ شر اور موجب ذلت و رسوائی ہو جاتی ہے اس لئے مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو ہر معاملہ میں اسوۂ حسنہ بنائے اور اپنی عقل و خرد پر اعتماد کر کے اُن کی خلاف ورزی پر آمادہ نہ ہو جائے

عَسٰی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَعَسٰی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّکُمْ۔

(۳) معاہداتِ اقوام و امم میں اسلام کی امتیازی شان یہ ہے کہ "نقض عہد کو غدر" سمجھے اور یقین کرے کہ عہد کی خلاف ورزی کرنے والا نہ دنیا میں صاحب عزت ہو سکتا ہے اور نہ عالم آخرت میں اس کو فلاح نصیب ہو سکتی ہے بلکہ روز قیامت اس کے ہاتھ میں غداری کا جھنڈا ہوگا تاکہ کائناتِ انسانی کے سامنے اس کے غدر کا مظاہرہ ہو سکے۔

"اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ کَانَ مَسْئُوْلًا"

(۴) جو لوگ قلتِ تعداد اور فقدانِ اسباب ظاہری کے باوجود خدا کے رسول کے ہاتھ پر فداکاری اور جاں نثاری کے لئے حدیبیہ میں بیعت کر رہے تھے خدا نے اُن کے اس ایثار و عقیدتِ حق کی جزاء عظیم یہ عطا فرمائی کہ قرآن حکیم میں بصراحت اُن کو اپنی خوشنودی کی سند بخشی اور اسی مبارک سند کی بنا پر وہ بیعت "بیعتِ رضوان" کے نام سے بھی

دنیا تک موسوم ہوئی، پس یہ واقعہ برہانِ قاطع ہے اس امر کے لئے کہ " اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ "۔

(۵) اگر آزادی ضمیر نصیب ہو اور تعصب راہ میں حائل نہ ہو تو اسلام ایسا دین فطرت ہے کہ خود بخود کائناتِ انسانی کو اپنے اندر جذب کرتا چلا جاتا ہے، چنانچہ "صلح حدیبیہ" نے اس لئے "فتح مبین" کا لقب پایا کہ جب مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان ایک معاہدہ کے ذریعہ جنگ کا التوا ہو گیا تو مشرکین کو امن و اطمینان کے ساتھ مسلمانوں میں میل جول کا موقع ملا اور نتیجہ یہ نکلا کہ دعوتِ اسلام کے وقت سے حدیبیہ کے وقت تک فداکارانِ اسلام کی جو تعداد تھی تقریبًا اٹھارہ یا بائیس مہینوں کے اندر اندر اس سے زیادہ شمعِ اسلام کے پروانے نظر آنے لگے، ایسا کیوں ہوا؟ صرف اس لئے کہ مشرکین نے دیکھا کہ قومِ مسلم اپنے اخلاق و اعمال اور کردار و گفتار بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں صادق و عادل، حق پسند و حق آگاہ ہے اور اس کی جماعتی و انفرادی حیات کا پایہ وقت کی تمام اقوام و ملل سے بلند تر ہے۔

فتح مکہ (۱) مسلمان جب کسی غیر مسلم طاقت سے معاہدہ کر لیں تو جس مدت کے لئے معاہدہ ہوا ہے ان کا اسلامی فرض ہے کہ اس مدت کو اپنی جانب سے پورا کریں اور نقضِ عہد نہ کریں البتہ اگر معاہد طاقت کی جانب سے خلاف ورزی ہو تو پھر مسلمان بری الذمہ ہیں بلکہ بعض حالات میں نقضِ عہد کرنے والی طاقت کا استیصال ازبس ضروری ہے جیسا کہ فتح مکہ کے اسباب سے ظاہر ہوتا ہے۔

(۲) فتح مکہ کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ عنوۃً (بہ زور طاقت) فتح ہونے کے باوجود خوں ریزی سے محفوظ رہا۔ اور نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حرم کعبہ کے احترام و عظمت کے پیش نظر خالد بن ولید (رضی اللہ عنہ) کو ہدایت دیتے ہوئے ابتداء ہی میں ارشاد فرما دیا تھا کہ داخلۂ حرم کے وقت ہرگز کسی پر تلوار نہ اٹھائی جائے، الا یہ کہ مشرکین میں سے کوئی از

از خود اقدام کرے اور اس لئے حضرت سعد بن عبادہ (رضی اللہ عنہ) کے ذریعہ رجز کے خلاف "الیوم یوم المرحمۃ" فرما کر اس حقیقت حال کو خوب روشن کر دیا۔

(۳) دنیوی شہنشاہ اور نبی الرحمۃ کے درمیان اگر فرق و امتیاز معلوم کرنا ہو تو فتح مکہ اس کے لئے روشن برہان ہے، تاریخ سے دریافت کرو کہ جب بھی بادشاہ شاہنشاہ کسی ملک کو فتح کرتا تو اس کے ساتھ کیا سلوک روا رکھتا تھا۔ یہی کہ مفتوح قوم پر مظالم کرے، قتل و غارت کر کے ان کو غلام بنائے یا تلوار کے گھاٹ اتارے، لیکن جب نبی الرحمۃ کو اقتدار اعلیٰ نصیب ہوا اور فتح مکہ کی صورت میں مشرکین و کفار پر یہ ید قدرت حاصل ہوا تو اس مقدس ہستی نے کیا کیا؟ صرف یہ کہ ان کو جمع کیا اور اعلان کر دیا "لا تثریب علیکم الیوم اذھبوا انتم الطلقاء۔ آج تم پر گذشتہ بداعمالیوں اور سفاکیوں پر کوئی ملامت نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔"

ایک شخص عمر بھر نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود جب فتح مکہ کے وقت کانپتا، خوف کھاتا اور لرزتا ہوا حاضر خدمت ہوتا ہے تو اس وقت بھی نبی الرحمۃ کی زبانِ اقدس اس حقیقت کا اعلان کرتی ہے جس سے آپؐ کی شانِ پیغمبری نمایاں نظر آتی ہے، آپؐ فرماتے ہیں:۔

خوف نہ کرو! میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں بلکہ تمہاری طرح خشک گوشت کھانے والی ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں۔

(۴) کافر و مشرک گروہ اگر اسلامی طاقت کا حلیف بننا چاہے تو بہ تقاضائے مسلم مفاد اس کو حلیف بنایا جا سکتا ہے بلکہ بعض حالات میں حلیف بنانا ازبس ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ حلیف کے مال اور اس کی جان و آبرو سب کو اپنے مال جان اور آبرو کی طرح سمجھے اور اسی قسم کا معاملہ کرے جو مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

قصص القرآن جلد ۴

حنین (۱) ایک لمحہ کے لئے بھی کسی مسلمان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ فتح وشکست کا مدار "کثرتِ تعداد" پر سمجھے بلکہ اس کا یقین راسخ ہر حالت میں خدا کی نصرت کے ساتھ وابستہ رہنا چاہیئے چنانچہ بدر میں اعتماد علی اللہ نے ذلت وقلت کو عزت وکثرت کے ساتھ بدل دیا اور حنین میں اپنی کثرتِ تعداد پر اعتماد نے کثرت وشوکت کو مبدل بہ ہزیمت بنادیا" "وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ"

(۲) اگر اسلام اور مسلمانوں کے مصالح کا تقاضا ہو تو ایک غیر مسلم طاقت کے مقابلہ میں دوسری غیر مسلم طاقت یا غیر مسلم جماعت کا تعاون واشتراک حاصل کرنا بلاشبہ درست اور مشروع ہے، اسی لیے حنین میں نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے "طلقاء" کو شریک جنگ رکھا اور جنگ میں استعانت من المشرکین کے مسئلہ میں بلحاظ دلائل اگرچہ قبول وعدم قبول دونوں قسم کے اقوال موجود ہیں، لیکن قرآن وحدیث کی روشنی میں جمہور کا مسلک جواز وقبول ہی کا ہے۔ چنانچہ محدثین وفقہاء امت نے کتاب الجہاد میں اس کی تصریح کر دی ہے[1]

تبوک (۱) مفادِ اسلامی کے پیش نظر جب خلیفۃ المومنین نفیر عام (جہاد عام) کا اعلان کردے تو ادائے فرض کے مقابلہ میں ہر قسم کی مشکلات ہیچ ہوجانی چاہئیں اور اسباب ووسائل کی پریشانیاں ہرگز راہ میں حائل نہ رہنی چاہئیں، غزوۂ تبوک ہم کو اسی جانب رہنمائی کرتا ہے۔

(۲) جہاد اور نفیر عام کے موقع پر مالی اعانت بھی جہاد ہی کا اہم شعبہ ہے اور

گر زر طلبی سخن درین است ❊ گر جاں طلبی مضائقہ نیست

کے خلاف عزم وعمل اور خلوص وصداقت کی روشن دلیل ہے، اس لئے جلیل القدر صحابہؓ نے غزوۂ تبوک میں مالی اعانت کی اپیل پر ایک دوسرے سے مسابقت کی اور ابوبکر صدیقؓ نے اپنا کل مال راہِ خدا میں دیکر صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کا نام گھر میں باقی چھوڑا۔

---

[1] فتح الباری، کتاب الام امام شافعی، مبسوط، البدائع والصنائع۔

(۳) جماعتی زندگی میں جن لوگوں کے متعلق شروع سے ہی یہ معلوم ہو کہ جماعت میں ان کی شرکت از رہِ خلوص نہیں بلکہ از راہ نفاق ہے وہ اگر جہاد جیسے اداکارانہ عمل سے پہلو تہی کرنے کے لئے کوئی بہانہ کر کے میدان جہاد سے جی چرائیں تو ان سے درگذر کی جاسکتی ہے کہ ان کی عدم شرکت مفید ہی ہے نہ کہ مضرت رساں لیکن مخلص و ایثار پیشہ فرد جماعت اگر ایسے نازک موقع پر کوتاہی کر جائے جیسا کہ غزوۂ تبوک کا اہم معاملہ تھا تو یہ کوتاہی ناقابل معافی جرم ہے تاوقتیکہ ماضی پر ندامت اور مستقبل میں ایسی شنیع حرکت سے پرہیز کے عزم کے ساتھ درگاہِ الٰہی میں عجز و نیاز سے تائب نہ ہو جائے"۔

(۴) اسلامی احکام کی کھلی خلاف ورزی پر مسلمانوں کا کسی فرد مسلم یا جماعت مسلمہ کے خلاف سوشل اور معاشرتی مقاطعہ درست ہے بلکہ بعض اہم اور نازک حالات کے پیش نظر کبھی واجب اور ضروری ہو جاتا ہے تاکہ ایک جانب مسلمانوں میں ضبط و نظم کا صحیح جذبہ پیدا ہو جائے، اور دوسری جانب مخلص و منافق کے درمیان بیّن تفاوت نظر آنے لگے۔



تَبَنّی

رسوم جاہلیت میں سے ایک رسم تبنّی (گود لے کر بیٹا بنانا) بھی ہے، یہ رسم مشرکین عرب وعجم میں یکساں رائج تھی، اس رسم قبیح کے ثمرات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بچہ اپنے حقیقی ماں باپ کے انتساب سے کٹ کر ایک اجنبی کے لئے صلبی بیٹے کی طرح ہوجاتا اور اس کے خاندان کے تمام محارم اس کے محارم بنجاتے ہیں۔ نیز اس اجنبی کے حقیقی ورثار کو محروم وراثت بناکر خود اس کی تمام جائداد کا مالک بن جاتا ہے یا اپنی موت پر اپنے حقیقی ورثار کو محروم رکھ کر اجنبی کو اپنا وارث بناتا ہے اس لئے بلاشبہ یہ رسم "نسبی انتساب اور معاشرتی نظام دونوں لحاظ سے مذموم و قبیح اور خلاف فطرت ہے۔

اسلام چونکہ انسان کے ہر شعبۂ حیات کو مکروہ جراثیم سے پاک کرنے اور ان میں انقلاب واصلاح کی روح پھونک کر نظام کائنات کو بہتر و خوب تر بنانے آیا ہے اس نے اس رسم بد کے انسداد پر بھی توجہ کی اور ایک خاص واقعہ کو سامنے رکھ کر ارادہ کیا کہ معاشرت میں گندھی ہوئی اس رسم پر ایسی ضرب کاری لگائے کہ مسلمانوں میں سے ہمیشہ کے لئے اس کا خاتمہ ہوجائے اور غیر مسلم بھی اس کی معقولیت پر سر تسلیم خم کرنے کے لئے مجبور ہوجائیں۔

انسداد تبنّی کے لئے خدائے برتر نے جس واقعہ کو منتخب فرمایا اس کی روداد حضرت زید بن حارثہ (رضی اللہ عنہ) کی زندگی سے وابستہ ہے۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ | حضرت زید رضی اللہ عنہ کا تعارف اُسد الغابہ میں ابن اثیر جزری نے اس طرح کرایا ہے: زید بن حارثہ بن شراحیل رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے آزاد کردہ

غلام (مولیٰ) ہیں اور بہت ہی محبوب صحابی ہیں۔ یہ عرب کے معزز قبیلہ بنی کلب کے ایک فرد تھے، مگر بچپن ہی میں ایک حادثہ کی وجہ سے غلام بنا لئے گئے، صورت یہ پیش آئی کہ ان کی والدہ ان کو ساتھ لئے اپنے خاندان بنی معن میں جارہی تھیں، راہ میں قبیلہ بنی قین نے ان کو لوٹ لیا اور زید کو بھی لے گئے اور عکاظ کے بازار میں لاکر فروخت کردیا۔ حضرت خدیجہؓ کے برادرزاد حکیم بن حزام نے ان کو اپنی پھوپھی کے لئے خرید لیا۔ یہ ابھی آٹھ سال ہی کے تھے کہ حضرت خدیجہؓ کو نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی رفیقۂ حیات ہونے کا شرف حاصل ہوگیا اور انھوں نے زید کو حضور اقدس کی خدمت میں ہبہ کردیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو آزاد کرکے اپنا بیٹا بنالیا۔

حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں، ہم اس دن سے زید کو ابن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہنے لگے اور اس وقت تک کہتے رہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ "مسلمانو! تم لے پالکوں کو ان کے باپ دادا کی نسبت ہی سے پکارا کرو۔"

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے زید اور اپنے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما کے درمیان بھائی چارہ کرادیا اور وہ دونوں حقیقی بھائیوں کی طرح رہنے لگے۔ ادھر زید کی گم شدگی نے ان کے والد حارثہ کو غم سے نڈھال کردیا تھا۔ حسنِ اتفاق کہ بنی کلب کے چند آدمی حج کی نیت سے مکہ آئے تو زید کو دیکھا اور پہچان لیا۔ زید نے بھی ان کو پہچانا اور اپنے قبیلہ کو اپنی موجودگی کا پیغام دیا۔ حارثہ اور ان کا بھائی کعب دونوں نے جب یہ سنا تو فوراً بھاگے ہوئے مکہ آئے اور دربار قدسی میں حاضر ہوکر عرض کیا۔ اب زید کو ہمارے حوالہ کردیجئے اور زر فدیہ لے لیجئے۔

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اس سے بہتر یہ بات ہے کہ زید آجائے اور اس کے سامنے دونوں صورتیں پیش کردی جائیں۔ وہ تمہارے ساتھ جانا قبول کرتا ہے یا میرے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ اور جو اس کی مرضی ہو اس پر ہم بھی راضی ہوجائیں۔

حارثہ بخوشی اس پر رضامند ہو گئے کیونکہ وہ یقین رکھتے تھے کہ بیٹا بہرحال باپ کو ہی ترجیح دے گا، چنانچہ زید بلائے گئے ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا انکو پہچانتے ہو؟ زید نے کہا کیوں نہیں، یہ میرے والد ہیں اور یہ چچا ہیں!

آپؐ نے فرمایا: یہ لینے آئے ہیں، اب تم مختار ہو، ان کے ساتھ چلے جاؤ یا میرے پاس رہو، زید نے عرض کیا! میں آپ پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا، میرے باپ چچا جو کچھ بھی ہیں، آپؐ ہی ہیں، حارثہ نے یہ سُنا تو رنج و تکلیف کے ساتھ کہا: "زید کس قدر افسوس ہے تجھ پر کہ غلامی کو آزادی پر اور باپ دادا اور خاندان پر اجنبی کو ترجیح دے رہا ہے" زید نے کہا "اس ہستی کے ساتھ رہ کر میری آنکھوں نے جو کچھ مشاہدہ کیا ہے اس کے بعد میں دنیا و مافیہا کو اس کے سامنے ہیچ سمجھتا ہوں"۔

تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حارثہ اور حاضرین کو بتلایا کہ میں نے زید کو آزاد کر دیا ہے، اب وہ میرا غلام نہیں بلکہ بیٹا ہے، حارثہ نے یہ سُنا تو بہت خوشی کا اظہار کیا اور باپ اور چچا دونوں مطمئن واپس گئے[1] اور گاہے گاہے آکر دیکھ جاتے اور آنکھیں ٹھنڈی کر جایا کرتے تھے۔

ترمذی کی ایک مختصر روایت میں حارثہ کی جگہ ان کے دوسرے بیٹے جبلہ کی آمد اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسطورۂ بالا گفتگو کا ذکر ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید کی مزید قدر افزائی کے لیے انکا نکاح اپنی دودھ پلائی (حاضنہ) اُم ایمن کے ساتھ کر دیا جن کے بطن سے حضرت اسامہ پیدا ہوئے اور اس کے بعد ارادہ کیا کہ ان کی شادی اپنی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش کے ساتھ کر دیں یہ ہاشمی خاندان کی بیٹی اور آپ کی پھوپھی اُمیمہ بنت عبد المطلب کی لختِ جگر تھیں۔ اس لئے زینب اور زینب کے بھائی اس عقد پر راضی نہیں تھے تب وحی الٰہی نے نازل ہو کر یہ حکم دیا

---

[1] جلد ۲ ص ۳۲۴، ۳۲۵

کہ جس بات کا حکم اللہ اور اس کا رسول دے پھر اس کی خلاف ورزی کسی کے لئے جائز نہیں ہے۔

مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا	جب اللہ اور اس کا رسول کوئی فیصلہ کر دے تو پھر
قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ	کسی مرد مومن اور عورت مومنہ کو ان کے معاملہ میں کوئی
لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ	اختیار باقی نہیں رہتا اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول
يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ	کی نافرمانی کرے بلاشبہ وہ کھلی گمراہی میں
ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝ (احزاب)	پڑ گیا۔

وحی الٰہی کے نزول پر حضرت زینب (رضی اللہ عنہا) اور ان کے بھائیوں نے آپ کے فیصلہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور اس طرح آپ نے خاندان سے ہی عملی طور پر فخر بالانساب کی جڑ کاٹ دی تاکہ آپ کا عمل اسوۂ حسنہ بنے۔

حضرت زید کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ قرآن میں ان کا نام بصراحت مذکور ہے یہ شرف کسی صحابی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نصیب نہیں ہوا۔

انسداد تبنّی حضرت زید اور حضرت زینب اگرچہ حبالۂ عقد میں منسلک ہو گئے تھے لیکن حضرت زینب کا یہ فطری رجحان مٹ نہ سکا کہ وہ قریشی ہاشمی ہیں اور ان کا شوہر آزاد شدہ غلام، اسی طرح حضرت زید کو یہ فخر حاصل تھا کہ وہ بہرحال عرب کے معزز قبیلہ کے فرد اور نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے منہ بولے بیٹے ہیں اور زینب رضی اللہ عنہا پر ان کو قوام ہونے کا شرف حاصل ہے۔ چنانچہ ان دو متضاد ذہنیتوں نے ان کے آپس میں محبت کا رشتہ قائم نہ ہونے دیا اور آخر کار زید اس پر آمادہ ہو گئے کہ حضرت زینب کو طلاق دیدیں، حضرت زید نے متعدد بار اس ارادہ کا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے تذکرہ کیا، مگر آپ نے یہ سمجھ کر کہ شاید دیرپا مدت ازدیاد محبت کا باعث ہو جائے زید کو طلاق دینے سے روکا

حضرت زید اور حضرت زینب کی ناچاقی نے اب صورت حال بدل دی اور وحی الٰہی نے یہ فیصلہ کر دیا کہ وقت آ گیا ہے کہ اب تبنّی کی رسم بد کا خاتمہ کر دیا جائے اور جس طرح

آپؐ نے فخر بالانساب کے پہلو کو اپنے خاندان ہی میں سب سے پہلے شکست دی اسی طرح اس کی ابتدار بھی خود ذاتِ اقدسؐ کے ہی عمل سے ہو اور یہ اس طرح کہ زیدؓ جب طلاق دیدیں تو پھر زینبؓ کا عقد آپؐ سے ہو جائے، کیونکہ اس سے ایک طرف زینبؓ اور ان کے خاندان کو جو صدمہ پہنچے اس کا اندمال ہو سکے اور دوسری جانب تبنی کی رسمِ بد کا انسداد ہو جائے۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جب وحی الٰہی نے یہ نقشہ بتلایا تو بربنائے بشریت آپؐ کے قلب میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ زیدؓ اگر زینبؓ کو طلاق نہ دے تو اچھا ہے تاکہ زینبؓ کے خاندان کو بھی توہین محسوس نہ ہو اور میں بھی منافقین اور مشرکین کے اس طعن و تشنیع سے محفوظ رہوں کہ وہ یہ کہیں گے "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے بیٹے کی بیوی کو اپنی بیوی بنالیا، حالانکہ وہ دوسروں کے لئے بیٹے کی بیوی کو حرام بتاتے ہیں"۔ چنانچہ آپ برابر زیدؓ کو طلاق سے باز رکھتے رہے، مگر جب کسی طرح باہم موافقت نہ ہو سکی تب زیدؓ نے طلاق دے ہی دی اور عدت گزرنے پر خدا کا حکم ہوا کہ اب زینبؓ کو آپؐ اپنی بیوی بنائیں تاکہ آئندہ منہ بولے بیٹے کی رسم کا خاتمہ ہو اور مسلمانوں کی معاشرت میں یہ تنگی نہ پیدا ہو سکے کہ منہ بولے بیٹے کی بیوی کے نکاح کو صلبی بیٹے کی بیوی کی طرح حرام سمجھا جائے اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی وحی نے یہ بھی واضح کر دیا کہ خدا جو فیصلہ کر چکا ہے وہ تو ظاہر ہو کر ہی رہے گا اور تمہارے بشری خوف سے وہ ٹلنے والا نہیں ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ حکمِ الٰہی کے مقابلہ میں سماج انسانی کا خوف ہیچ در ہیچ ہے۔

قرآنِ عزیز نے انسدادِ تبنی کے معاملہ کو دو شقوں میں تقسیم کر دیا ہے: ایک ذہنی وعلمی انقلاب اور دوسرا عملی چنانچہ ذہنی اصلاح و انقلاب کے لئے حسب ذیل آیات نازل فرمائیں:-

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ (اور اللہ نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا (حقیقی)

ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ وَاللّٰهُ	بیٹا نہیں بنا دیا، یہ قول تمہارے اپنے منہ کی بات ہے
يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ	اور اللہ سچ بات کہتا ہے اور وہی سیدھی راہ دکھاتا ہے
اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ	تم ان منہ بولے بیٹوں کو ان کے (حقیقی) باپوں کی
عِنْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا	نسبت سے پکارا کرو، یہی اللہ کے نزدیک انصاف
اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ	کا طریقہ ہے اور اگر تم کو ان کے باپ دادوں کا نام
(احزاب)	معلوم نہ ہوں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔

چنانچہ صحابہؓ تصریح کرتے ہیں کہ ہم نے اسی وقت سے حضرت زید کو ابن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہنا چھوڑ دیا اور زید بن حارثہ کہنے لگے۔

اور انسداد تبنّی کے عملی پہلو کو روشن کرنے کے لئے ان آیات کا نزول ہوا:۔

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ	اور وہ وقت قابل ذکر ہے، جب تم اس شخص سے کہتے تھے
وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ	جس پر اللہ نے اور تم نے انعام کیا کہ اپنی بیوی کو روکے
زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِيْ فِيْ	رکھو (اور طلاق نہ دے) اور اللہ سے ڈر اور صورت حال
نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى	یہی کہ تم اپنے جی میں اس بات کو چھپائے ہوئے تھے جس کو
النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ	اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور تم لوگوں کے طعن (وتشنیع) سے
فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا	ڈرتے تھے اور اللہ زیادہ مستحق ہے کہ اس سے خوف کیا
زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى	جائے سو جب زید اپنی حاجت پوری کر چکا (اور اس نے
الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ	طلاق دے دی) تو ہم نے اس (زینبؓ) کا نکاح تجھ سے
اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ	کر دیا تاکہ (آئندہ) مسلمانوں پر یہ تنگی نہ رہے کہ وہ اپنے
وَطَرًا ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا	منہ بولے بیٹے کی بیویوں سے نکاح نہ کر سکیں جب انکے
(احزاب)	منہ بولے بیٹے اپنی حاجت پوری کر لیں (یعنی طلاق دیدیں)
	اور اللہ کا یہ حکم اٹل ہے۔

قرآن عزیز کی ان آیات کا مفہوم اپنے متعلقہ مسئلہ کے ساتھ اس قدر صاف اور واضح ہے کہ اس میں کسی دوسرے مفہوم کی گنجائش تک نہیں اور نہ کسی قسم کی کوئی پیچیدگی ہی ہے کہ جو معاملہ کے رُخ کو کسی دوسری جانب پھیرنے کا موجب ہو مگر حیرت اور حیرت سے زیادہ رنج و ملال ہے اُن راویانِ روایت پر جنھوں نے روایت و درایت کی کسوٹی پر کسے بغیر ہی یہود بنی اسرائیل کی اسلام دشمنی اور رسول دشمنی میں گڑھی ہوئی خرافی داستان کو ان آیات کی تفسیر کے ضمن میں درج کر دیا اور یہ قطعاً محسوس نہ کیا کہ جب کہ ان بے سر و پا روایات کا نہ قرآن کی آیات سے جوڑ لگتا ہے اور نہ ذخیرۂ حدیث میں کوئی ایک صحیح روایت بھی اس کی جانب اشارہ کرتی ہے تو پھر ہمارے لئے کس طرح یہ جائز ہو سکتا ہے کہ ہم ایسی روایات کو بیان یا نقل کر کے ایک جانب دشمنانِ اسلام کے لئے غلط اور پُر از بہتان نکتہ چینی کا سامان مہیا کریں اور دوسری طرف بے علم مسلمانوں کے دینی و ذہنی انتشار کا باعث بنیں۔

خرافی داستان | اگر یہ خرافی داستان کتب تفسیر میں نقل نہ ہوتی اور اس کے مفاسد کا اثر موافق و مخالف دونوں جانب پڑا ہوتا تو ایک لمحہ کے لئے بھی قلم اس کے لئے آمادہ نہ ہوتا کہ اس ہرزہ سرائی کو روایت کہہ کر پیش کرے، مگر اصل حقیقت کو واشگاف کرنے کے بعد محض اس لئے اس داستان کو سپردِ قلم کیا جا رہا ہے کہ جب کبھی اس پر نگاہ پڑے تو فوراً ذہن میں آجائے کہ یہ ایک خرافی داستان سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی اور اس لئے دشمنانِ اسلام کو اس کی سند لینا محض تعصب اور اسلام دشمنی پر مبنی ہے نہ کہ تحقیقِ حال کی طلب و جستجو کے پیشِ نظر۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت زینب رضی کے یہاں تشریف لے گئے، اتفاق سے حضرت زید موجود نہیں تھے، حضرت زینب رضی پر اچانک نظر پڑی تو وہ بہت حسین نظر آئیں آپ فوراً ہی یہ پڑھتے ہوئے "سبحان مقلب القلوب پاک ہے وہ ذات جو دلوں کو پھیر دینے پر قابو رکھتی ہے" واپس ہو گئے۔ جب زید آئے تو زینب رضی نے ان سے پورا

واقعہ کہہ سنایا۔ زید یہ سن کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں زینب کو طلاق دینا چاہتا ہوں حضورؐ نے پوچھا ایسا کیوں کرتے ہو؟ تو کہنے لگے اور کوئی وجہ نہیں ہے وہ خود کو بہت بلند مرتبہ سمجھتی اور مجھکو زبان سے ایذا پہنچاتی ہے۔ یہ سنکر نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قلب میں (العیاذ باللہ) اگرچہ یہ آیا کہ زید طلاق دیدے۔ مگر زبان سے منع کیا کہ خدا سے ڈر اور ایسا نہ کر، تب اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر عتاب فرمایا اور کہا کہ تیرے دل میں جو بات تھی اس کو تو نے چھپایا۔ مگر اللہ تعالیٰ اس کو ظاہر کر کے رہے گا (اعاذنا اللہ من ہذا الخرفات)

اس روایت کو ابن ابی حاتم اور طبری نے قتادہ اور ابن عباسؓ کی نسبت کے ساتھ روایت کیا ہے مگر قاضی عیاض نے شفا میں، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ابن کثیر، ابن حبان، سید محمود آلوسی نے اپنی تفاسیر میں اور خفاجی نے نسیم الریاض میں اسکو روایت و درایت دونوں اعتبار سے ساقط الاعتبار اور ناقابل قبول ثابت کیا ہے اور ان دونوں بزرگوں کی جانب اس روایت کے انتساب کو باطل اور غلط قرار دیا ہے۔

فتح الباری میں ہے:۔

ووردت آثار اخریٰ اخرجها ابن ابی حاتم والطبری ونقلها کثیر من المفسرین لا ینبغی التشاغل بها والذی اوردته منها هو المعتمد [1]	اس سلسلہ میں اور بھی آثار بیان کئے جاتے ہیں جن کو ابن ابی حاتم اور طبری نے روایت کیا ہے اور بہت سے مفسرین نے اس کو نقل کر دیا ہے یہ آثار ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ ان کی جانب کوئی توجہ بھی دی جائے اور قابل اعتماد آثار وہی ہیں جن کو ہم نے اس جگہ بیان کر دیا ہے۔

[1] جلد ۸ کتاب التفسیر صفحہ ۴۰۳۔

اور سید محمود آلوسی اس داستان کو نقل کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :-

وللقصاص فی ھذہ القصۃ کلام لا ینبغی ان یجعل فی حیز القبول [1]	اور داستان سراؤں کے پاس اس واقعہ کے متعلق بھی گڑھی ہوئی باتیں ہیں جو ہرگز اس قابل نہیں کہ ان کو قبولیت کا درجہ دیا جائے ۔

اور ابن کثیر نے تو اس داستان کو اپنی تفسیر میں نقل کرنا بھی پسند نہیں کیا اور اس کا حوالہ دیتے ہوئے اپنا یہ محققانہ فیصلہ صادر فرمادیا :-

ذکر ابن ابی حاتم وابن جریر ھھنا آثارا عن بعض السلف رضی اللہ عنھم احببنا ان نضرب عنھا صفحا لعدم صحتھا فلا نوردھا ۔ [2]	ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے اس موقع پر بعض سلف رضی اللہ عنہم کی جانب منسوب چند آثار کو ذکر کیا ہے ہم نے یہ پسند کیا کہ ان کی جانب مطلق التفات نہ کریں اس لئے کہ وہ قطعاً صحیح نہیں ہیں اور اس لئے ہم انکا اس جگہ ذکر نہیں کریں گے ۔

اور پھر یہ تمام اہل تحقیق ان آثار کو نقل کرتے ہیں جو اس سلسلہ میں بسند صحیح ثابت ہیں اور جو آیات کی وہی تفسیر کرتے ہیں جس کو سطور بالا میں ہم بیان کر چکے ہیں ۔

حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ زید کے طلاق دینے سے قبل اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتلا دیا تھا کہ انسداد تبنی کے سلسلہ میں خدا کا یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ حضرت زینبؓ کو زید طلاق دے گا اور تم کو اس سے نکاح کرنا ہوگا ۔ یہ بات تھی جس کو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) بربنائے بشریت دشمنوں کے طعن سے بچنے کی خاطر کہ "کہیں گے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا" اپنے دل میں چھپائے رکھا اور آپ کوشش کرتے رہے کہ کسی طرح زید زینبؓ کو طلاق نہ دے

[1] جلد ۳ ص ۲۹۸ - ۲۹۳ [2] جلد ۲ ص ۱۳۲ ۔

اسی کو قرآن نے "تخفی فی نفسک" کہا ہے اور زید کا طلاق دینا اور پھر زینب کا حرم نبوی میں داخل ہونا اس حقیقت کا اعلان ہے جس کو "ما اللہ مبدیه وتخشی الناس واللہ احق ان تخشٰہ" میں کہا گیا ہے [1]

اور عمر بن فائد نے بھی امام زہری ؒ سے یہی تفسیر نقل کی ہے اور اسی پر تمام محدثین ومفسرین کا اعتماد ہے اور یہی صحیح ہے۔

لیکن یہ صورت حال کیوں اختیار کی گئی اور معاملہ کو اس خاص رنگ میں کیوں رکھا گیا جو قرآن عزیز کی اُن آیات سے ظاہر ہوتا ہے، حافظ ابن حجر ؒ اس کے متعلق یہ حقیقت واضح فرماتے ہیں۔

حاصل کلام

والحاصل ان الذی کان یخفیه	حاصل کلام یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف اس
النبی هو اخبار اللہ ایاہ انها	بات کو پوشیدہ رکھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انسداد
ستصیر زوجته الذی کان	تبنّی کے سلسلہ میں یہ ضروری ہے کہ زینب تمہارے
تحمله علی اخفاء ذلک خشیة	نکاح میں آئے گی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف
قول الناس تزوج امراۃ	اس بات کو پوشیدہ رکھا کہ آپ لوگوں کے اس طعن سے
ابنه واراد اللہ ابطال ما کان	بچنا چاہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بیٹے کی
اهل الجاهلیة علیه من احکام	بیوی سے شادی کرلی اور اللہ تعالیٰ یہ ارادہ کرچکا تھا
التبنّی بامر ابلغ فی ابطال منه	کہ لے پالک کے جو احکام زمانۂ جاہلیت میں نافذ تھے ان کو
وهو تزوج امراۃ الذی	باطل کردے اور اس کے لئے اس طریقے سے بہتر کوئی دوسرا
یدعی ابنا۔ ووقع ذلک من	طریقہ نہیں تھا کہ عملاً کسی منہ بولے بیٹے کی بیوی سے شادی

[1] نسیم الریاض جلد ۴ ص ۲۹۹۔

امام المسلمین لیکون ادعیٰ لقبولھم وانما وقع الخبط فی تاویل متعلق الخشیۃ۔ واللہ اعلم بلہ

کرائی جائے اور اس کے لئے ذات اقدس کو اس لئے چنا گیا کہ آپ امام المسلمین ہیں پس آپ کا عمل مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ اتباع اور قبولیت کا داعی ہوگا اور مسلمان اچھی طرح اس مسئلہ کی حقیقت کو سمجھ جائیں گے (لہٰذا صورت حال یہ اختیار کی گئی کہ پہلے زینب رضی کی آپ کے منہ بولے بیٹے زید سے شادی ہو اور پھر وہ طلاق دے اور بحکم خداوندی پھر وہ آپ کے نکاح میں آئیں، یہ ہے وہ اصل بات کہ جو اس لئے خبط میں پڑ گئی کہ تاویل کرنے والوں نے یہ قیاس آرائیاں کر ڈالیں کہ آیت میں خشیۃ کا متعلق کیا ہے۔

غرض اسرائیلی داستانوں میں سے یہ بھی ایک خرافی داستان تھی جس کا پردہ فاش ہونا ازبس ضروری تھا، ورنہ تو یہ روایت خرد و عقل کے نزدیک یوں بھی ناقابل اعتماد اور لغو ہے کہ زینب جبکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپی زاد بہن تھیں اور بچپن سے جوانی تک مسلسل آپ کے سامنے رہیں اور شادی کے بعد بھی آپ سے پردہ نہیں کرتی تھیں تو اس واقعہ کے دن کون خاص بات تھی کہ زینب آپ کی نگاہ میں اجنبی بن کر نظر آنے لگیں اور آپ نے اخلاق کریمانہ کے خلاف دل و زبان کی مطابقت بھی چھوڑ دی۔

اگر قرآن کی آیت کا یہ مطلب لے لیا جائے تو کیا پھر ایک لمحہ کے لئے بھی قرآن کو یہ حق ہے کہ ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک نبی، رسول اولوالعزم پیغمبر کی حیثیت میں پیش کر سکے۔ "سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ"

بقیہ ترجمہ (باوجود اس امر کے کہ پیغمبر و رسول اس حقیقت سے آشنا ہوتے اور اس پر

۔۔۔ جلد ۶ ص ۴۲۵ ۔

یقین رکھتے ہیں کہ خدا کا فیصلہ اٹل اور ناقابل رد ہوتا ہے تاہم اگر کوئی امر ایسا ہو جس میں ان کی ذات وقت کے خود ساختہ اخلاقی پہلو کی بنا پر مورد طعن وتشنیع بنتی ہو تو بہ تقاضائے بشریت وہ اس کی زد سے محفوظ رہنے کی کوشش کرتے ہیں اور متوقع رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس مقصد خیر کے لئے اس صورت حال کو رونما کرنا چاہتا ہے، کاش کہ وہ کسی ایسی صورت میں نمودار ہو کہ ان کی ذات اس طعن وتشنیع سے بچ جائے، لیکن جبکہ خدا کی مصلحت اسی خاص صورت حالات میں مضمر ہوتی ہے تو وقت آنے پر نبی ورسول اپنی خواہشات ذاتی کو پس پشت ڈال کر خدا کے فیصلہ پر سر تسلیم خم کر دیتا ہے، قرآن عزیز نے زیر بحث واقعہ میں اسی حقیقت کو معجزانہ انداز بیان میں ادا کیا ہے۔

(۲) قرآن عزیز کی تفسیر خصوصاً واقعات پر مبنی آیات کی تفسیر میں اجمال اس تفصیل سے بدرجہا بہتر ہے جو محض عقلی احتمالات کے پیش نظر آیات کے حقیقی مفہوم کو بھی بدل ڈالے اور لفظی تعبیرات کے اجمال سے غلط اور باطل عمارت تیار کر لے بلاشبہ ایسی تفصیل تفسیر نہیں بلکہ تحریف ہے اور اسی لئے ہر مفسر کا فرض ہے کہ اس سے اپنا دامن بچائے۔

قرآنی حقائق سے آگاہ محققین مفسرین اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ تفسیر قرآن میں لفظی تعبیرات سے حقیقت کی جستجو کئے بغیر عقلی احتمالات بیان کر کے متضاد اقوال پیدا کر دینا تفسیر قرآن کی محمود خدمت نہیں ہے بلکہ قلوب میں تردد و اضطراب پیدا کر دینے کا موجب ہے۔"

تفسیر قرآن کی بہترین خدمت یہ ہے کہ اول قرآن عزیز کی تفسیر خود قرآن سے ہی کی جائے "القرآن یفسر بعضہ بعضاً" اور ساتھ ہی صحیح و مستند احادیث رسول سے اس کے اجمال کی شرح کی جائے، اور پھر اگر مزید تشریحات صحیح آثار صحابہ رضی سے حاصل ہو سکیں تو ان سے بھی استفادہ کیا جائے اور ان تمام تحقیقات کے بعد ایک مضبوط و مدلل اور محقق قول فیصل نقل کیا جائے اور احتمالات کی کشاکش سے اضطراب اقوال

کا شکار نہ بنے۔ اور اگر لطائف و حکم اور نکات پر قلم اٹھائے تو ان میں بھی یہ پیش نظر رہے
کہ آیت کی حقیقی روح سے جُدا نہ ہو جائے بلکہ اس کے اندر محدود رہے نیز دور از کار لفظی
اور تخمینی احتمالات کی راہنمائی میں بعید تاویلات سے اپنا دامن محفوظ رکھے اور غیر مستند روایا
(واحادیث وآثار) اور اسرائیلیات سے ہرگز ہرگز احتمال کے طور پر بھی استشہاد و استناد
نہ کرے بلکہ اس کا فرض ہے کہ حسب موقعہ ان کی تردید اور ان کا ابطال کرتا جائے تاکہ اربابِ
مطالعہ کو قرآنی ہدایات سے حصولِ سعادت اور اخذ بصیرت و موعظت کے لئے
آسانی ہو۔



بنو نضیر

یہ واقعہ س۴ہ ہجری میں پیش آیا۔ جو قبائل یہود یمن سے بھاگ کر حجاز (مدینہ) میں آ بسے تھے، ان میں سے یہ بھی مشہور قبیلہ ہے۔ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) جب مدینہ تشریف فرما ہوئے تو آپ نے مدینہ اور اطرافِ مدینہ کے یہود سے عہد و پیمان کر کے "صلح و عہد" کی طرح ڈالی یہ انصار میں سے بنی خزرج کے حلیف بھی تھے۔

یہود نے اگرچہ ظاہراً اس صلح و عہد پر رضامندی کا اظہار کر دیا تھا لیکن ان کے روایتی حسد و بغض اور تاریخی منافقت نے اس عہد پر ان کو تا دیر قائم نہیں رہنے دیا اور انھوں نے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مسلمانوں کے خلاف اندرونی اور بیرونی سازشوں کا جال بچھانا شروع کر دیا، اسی اثنا میں بنو نضیر کے ذمہ دار افراد نے ایک روز یہ سازش کی کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں جا کر عرض کریں کہ ہم کو ایک معاملہ میں آپ سے مشورہ کرنا ہے اور جب آپ تشریف لے آئیں تو دیوار کے قریب ان کو بٹھایا جائے، اور جب وہ گفتگو میں مصروف ہو جائیں تو اوپر سے ایک بھاری پتھر آپ پر گرا کر آپ کا خاتمہ کر دیا جائے۔

چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدعو ہو کر تشریف لائے، ابھی آپ دیوار کے قریب بیٹھے ہی تھے کہ وحی الٰہی نے حقیقت حال سے مطلع کیا اور آپ فوراً خاموشی کے ساتھ واپس تشریف لے گئے اور وہاں جا کر محمد بن مسلمہ (رضی اللہ عنہ) کو بھیجا کہ وہ بنو نضیر تک

یہ پیغام پہنچا دیں کہ چونکہ تم نے غداری کی اور نقض عہد کیا ہے اس لئے تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ حجاز مقدس کی سرزمین سے جلد جلاوطن ہو جاؤ، منافقین نے یہ سُنا تو جمع ہو کر بنو نضیر کے پاس پہنچے اور کہنے لگے، تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فرمان ہرگز تسلیم نہ کرو اور یہاں سے ہرگز جلاوطن نہ ہو، ہم ہر طرح تمہارے شریک کار ہیں۔

بنو نضیر نے یہ پشت پناہی دیکھی تو حکم ماننے سے انکار کر دیا اور حالات کا انتظار کرنے لگے تب نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے جہاد کی تیاری کی اور حضرت عبداللہ بن ام مکتوم کو مدینہ کا امیر بنا کر بنو نضیر کی گڑھی (چھوٹا قلعہ) پر حملہ آوری کے نکلے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں اسلامی پرچم اور صحابہ جلو میں تھے۔

بنو نضیر نے یہ دیکھا تو قلعہ بند ہو گئے اور یقین کر لیا کہ اب مسلمان ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، چنانچہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم)، چھ شبانہ روز اُن کا محاصرہ کئے رہے اور پھر حکم دیا کہ ان کے ان درختوں کو کاٹ ڈالو جو اُن کے لئے پھل مہیا کرتے ہیں اور ان کا وجود ان کی رسد رسانی کے لئے تقویت کا باعث ہے۔ ان حالات کو دیکھ کر بنی نضیر کے دلوں میں رعب اور خوف طاری ہو گیا اور ان کو منافقین کی جانب سے مایوسی اور رسوائی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔ آخر مجبور ہو کر انھوں نے درخواست کی کہ ہم کو جلاوطن ہونے کا موقع دیا جائے۔ لہذا ان کو اجازت دی گئی کہ سامان حرب کے علاوہ جس قدر سامان بھی وہ اونٹوں پر لاد کر لے جانا چاہتے ہیں لے جائیں۔

اجازت نامہ حاصل ہونے کے بعد یہ منظر بھی قابل دید تھا کہ کل کے باغی، سرکش اور فتنہ جو غدار آج اپنے ہاتھوں سے اپنے مکانات کو برباد کر کے اس وطن کو خیرباد کہہ رہے تھے جس جگہ محفوظ و مامون رہنے کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بنفس نفیس ایک عہد نامہ کے ذریعہ اُن کو دعوت دی تھی۔

بنو نضیر نے اپنے مکانات کو اس لئے برباد کر دیا کہ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے

تھے کہ ان کے بعد مسلمان ان کے گھروں میں آباد ہوں۔

بہرحال بنو نضیر جلا وطن ہو کر جب چلے تو ان میں سے بعض اکابر قوم مثلاً حُیَیّ بن اخطب اور ابی الحقیق تو خیبر میں مقیم ہو گئے اور اکثر شام کے نواح میں جا بسے اور دو سردار یامین بن عمرو اور ابو سعد مشرف باسلام ہو کر مدینہ ہی میں رہ گئے۔

قرآن عزیز اور بنو نضیر۔

اسی واقعہ کے سلسلہ میں قرآنِ عزیز کی سورۂ حشر نازل ہوئی ہے اور اس میں بنو نضیر کی غداری، منافقین کی فتنہ پردازی مسلمانوں پر خدا کا احسان و کرم اور جنگ کے موقعہ پر سبز درختوں کے کاٹنے کا حکم، اور ایسی صورت میں جبکہ جنگ نہ پیش آئی ہو مال غنیمت کا مصرف اور فے کا حکم، ان تمام امور کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

بصیرت (۱) منافق کا نفاق ایک خود فریبی ہوتی ہے جو انجام کے لحاظ سے نہ خود اپنے لئے مفید ثابت ہوتا ہے اور نہ منافقین پر اعتماد کرنے والا ہی اس سے کوئی فائدہ اٹھا سکتا ہے بلکہ بسا اوقات وہ اپنی اور اپنے حلیفوں کی ذلت و رسوائی اور ہلاکت و بربادی کا سامان مہیا کر دیتا اور ابدی خسران کا سبب بن جاتا ہے چنانچہ منافقینِ مدینہ یہود بنی نضیر، بنی قریظہ اور بنی قینقاع کے حالات و واقعاتِ تاریخی اس کے لئے زندۂ جاوید شہادت ہیں۔

(۲) جس قوم میں شر و فساد اور مکر و فریب "اخلاق" کا درجہ لے لیتے ہیں ان کے قویٰ جسمانی و روحانی سے صلاح و خیر کی تمام استعداد فنا ہو جاتی ہے اور وہ نہ دنیا میں کسی عزت و شوکت کی مالک رہتی ہے اور نہ آخرت میں اس کے لئے کوئی حصۂ خیر باقی رہتا ہے، چنانچہ سامی (سیمیٹک) اقوام میں سے اگر کسی قوم میں اس کو نمایاں دیکھنا ہو تو "یہود کو دیکھ لینا کافی ہے۔

(۳) عام طریقے پر جنگ میں سبز درختوں اور ہری کھیتیوں کو کاٹنا اور برباد کرنا اصلاحاتِ جنگ کے منافی اور ممنوع ہے لیکن جب یہ اشیاء، زمانۂ جنگ میں دشمن کی مزید تقویت کا باعث ہو کر فساد و شر کے بقا میں معاون ہوں تو ایسی حالت عام حکم سے مستثنیٰ ہیں جیسا کہ "بنو نضیر" کے واقعہ میں نصِ قرآنی ناطق ہے۔



واقعۂ افک

شعبان ۵ھ ہجری مطابق دسمبر ۶۲۶ء میں بنی مصطلق کے سردار حارث بن ضرار کی فتنہ سامانیوں کی وجہ سے غزوۂ بنی المصطلق پیش آیا، منافقین کا یہ دستور بن گیا تھا کہ جس غزوہ کے اسباب ظاہری سے غالب گمان فتح کا ہوتا، اس میں مالِ غنیمت کے لالچ سے ضرور ساتھ ہو جاتے۔ چنانچہ اس غزوہ میں بھی منافقین کا گروہ مع اپنے سردار عبداللہ بن اُبی کے موجود تھا، واپسی پر ایک معمولی حادثہ پیش آگیا اور عبداللہ بن اُبی اور اس کے منافق گروہ نے اس پر افتراء اور بہتان کی ایک عمارت تیار کر لی مگر قرآنِ عزیز نے جلد ہی اس افتراء کی حقیقت آشکارا کر دی اور مفتریوں کو ذلیل و رسوا ہو جانا پڑا۔

بخاری میں اس واقعہ کی جو تفصیلات مذکور ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ جب نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کامیابی کے ساتھ غزوۂ بنی المصطلق سے واپس ہوئے تو مدینہ کے قریب ایک منزل پر پڑاؤ تھا کہ آخر شب میں کوچ کا اعلان ہوا۔

حضرت عائشہؓ اعلان سن کر رفع حاجت کے لیے عجلت کے ساتھ قیام گاہ سے دور چلی گئیں، فارغ ہونے کے بعد واپس ہوئیں تو گلے میں جو ہار پہنے ہوئے تھیں وہ سینہ پر نہ پایا، وہ یہ سمجھ کر کہ ٹوٹ کر وہیں گر گیا ہوگا جہاں رفع حاجت کے لیے گئی تھیں، اس کو تلاش کرنے کے لیے واپس گئیں اسی اثناء میں جو جماعت ان کے ہودج کو اونٹ پر سوار کراتی تھی اس نے ہودج اٹھا کر اونٹ پر کس دیا اور چونکہ اس زمانے میں کم خوری کی

وجہ سے عورتیں عموماً فربہ اندام نہیں ہوتی تھیں اور اس لئے وہ بھی بہت لاغر تھیں، لہذا ہودج پر مامور جماعت نے ان کی عدم موجودگی کا مطلق احساس نہیں کیا اور اونٹ پر ہودج رکھ کر روانہ ہوگئے۔ حضرت عائشہ رضؓ جب ہار کو تلاش کرتی ہوئی واپس ہوئیں تو قافلہ جا چکا تھا اور اب ہار بھی ہودج کے قریب ہی مل گیا، وہ سخت پریشان ہوئیں پھر سوچا کہ جونہی مسلمانوں کو یہ محسوس ہوگا کہ میں ہودج میں نہیں ہوں تو فوراً نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اسی جگہ سواری بھیج دیں گے اس لئے مناسب یہ ہے کہ قافلہ کا پیادہ پا پیچھا کرنے کی بجائے اسی جگہ انتظار کیا جائے۔ رات آخر تھی، سپیدۂ سحر نمودار ہونے والا تھا کہ ان کی آنکھ لگ گئی۔

ادھر صفوان بن معطل بھی اس خدمت پر مامور تھے کہ وہ قافلہ سے بہت پیچھے رہ کر نگرانی کرتے ہوئے اور جو چیز بھی قافلہ کی رہ جائے اس کو لیتے ہوئے آئیں وہ پیچھے سے چلتے ہوئے جب اس مقام پر پہنچے تو انھوں نے محسوس کیا کہ یہاں کوئی انسان موجود ہے، قریب آئے تو ان کو پہچان لیا کیونکہ آیت حجاب سے پہلے وہ ان کو دیکھ چکے تھے۔

انھوں نے دیکھتے ہی فوراً بلند آواز سے "اناللہ وانا الیہ راجعون" پڑھا۔ حضرت عائشہ آواز سن کر بیدار ہوگئیں اور سمٹ کر بیٹھ گئیں۔ صفوان نے ایک لفظ کہے بغیر اونٹ کو بٹھا دیا اور وہ خاموشی کے ساتھ اونٹ پر ہودج میں سوار ہوگئیں اور صفوان مہار پکڑے ہوئے روانہ ہوئے اور دوپہر کے قریب لشکر میں جا پہنچے۔

جب یہ خبر عبداللہ بن اُبَی کو معلوم ہوئی تو اس نے اور اس کی جماعت نے موقعہ کو غنیمت جانا اور تیزی کے ساتھ افترا اور بہتان کو لشکر میں پھیلا دیا مگر مسلمانوں نے کسی طرح اس کو باور نہیں کیا۔ البتہ صرف تین مسلمان (دو مرد اور ایک عورت) حسان بن ثابت، مسطح بن اثاثہ اور حمنہ بنت جحش اپنی سادہ لوحی سے منافقین کے

جال میں پھنس گئے۔

خدا کا کرم و فضل دیکھیئے کہ زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی الٰہی قرآن عزیز کے ذریعہ منافقین کی خباثت کو آشکارا کر دیا اور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی پاکدامنی اور عفت مآبی پر مہر تصدیق ثبت کر کے بہتان لگانے والوں پر کوڑوں کی سزا (حد قذف) جاری کرنے کا حکم دیا اور اس طرح کذاب اور مفتری کیفر کردار کو پہنچے۔

اس واقعہ پر بعض مستشرقین اور یوروپین مؤرخین نے بہت جولانیٔ طبع کا ثبوت دیا ہے اور خوب آب و رنگ لگا کر اس کو بیان کیا ہے جس کو پڑھ کر اسلام اور داعیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ان کے قلبی عناد کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

بہرحال قرآن عزیز نے اس واقعہ پر مسلمانوں کو صاف طور سے یہ بتلا دیا کہ یہ کذب و افترا پر مبنی داستان سن کر تم نے خود ہی یہ کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ محض جھوٹ اور بہتان ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ جَاءُوا بِالْإِفْكِ	جن لوگوں نے بہتان کا یہ طوفان اٹھایا ہے وہ تم ہی میں
عُصْبَةٌ مِّنكُمْ لَا تَحْسَبُوهُ	سے ایک جماعت (منافقین کی جماعت) ہیں (اے
شَرًّا لَّكُم بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ	پیغمبر!) تم اس کو اپنے حق میں برا نہ سمجھو، بلکہ یہ تمہارے
لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُم مَّا اكْتَسَبَ	حق میں بہتر ہے (یعنی خدا کی مصلحت کے راز نے اس میں
مِنَ الْإِثْمِ وَالَّذِي تَوَلَّىٰ	تمہاری بہتری کا انجام پوشیدہ رکھا ہے) ان میں سے
كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ	ہر ایک آدمی کے لئے وہ سب کچھ ہے جو اس نے گناہ
عَظِيمٌ لَّوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ	کمایا ہے اور جس نے اس (گناہ) کا بڑا بوجھ اٹھایا
الْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِأَنفُسِهِمْ	ہے اس کے واسطے بہت بڑا عذاب ہے، جب تم نے
خَيْرًا وَقَالُوا هَٰذَا إِفْكٌ	اس بہتان کو سنا تھا کیوں نہ ایمان والے مرد اور ایمان
مُّبِينٌ ۝ لَّوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِ	والی عورتوں نے اپنے لوگوں پر نیک خیال قائم کیا اور کیوں
بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَإِذْ لَمْ	یہ نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان کا طوفان ہے، وہ (طوفان اٹھانے والے

يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَٰئِكَ
عِندَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ ۝ وَلَوْ
لَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ
فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ لَمَسَّكُمْ
فِي مَا أَفَضْتُمْ فِيهِ عَذَابٌ عَظِيمٌ
إِذْ تَلَقَّوْنَهُ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُولُونَ
بِأَفْوَاهِكُم مَّا لَيْسَ لَكُم بِهِ عِلْمٌ
وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا وَهُوَ عِندَ اللَّهِ
عَظِيمٌ ۝ وَلَوْلَا إِذْ سَمِعْتُمُوهُ
قُلْتُم مَّا يَكُونُ لَنَا أَن نَّتَكَلَّمَ
بِهَٰذَا سُبْحَانَكَ هَٰذَا بُهْتَانٌ
عَظِيمٌ ۝ يَعِظُكُمُ اللَّهُ أَن
تَعُودُوا لِمِثْلِهِ أَبَدًا إِن كُنتُم
مُّؤْمِنِينَ ۝ وَيُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ
الْآيَاتِ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ
إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ
الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا
لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا
وَالْآخِرَةِ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ
لَا تَعْلَمُونَ ۝ وَلَوْلَا فَضْلُ
اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ وَأَنَّ

اپنے بہتان پر) کیوں چار گواہ نہ لائے پس جب وہ
گواہ پیش نہ کر سکے تو یہی لوگ اللہ کے یہاں سرتاسر
جھوٹے ہیں اور اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت دنیا
اور آخرت دونوں میں تم پر نہ ہوتی تو پڑ جاتی اس جھوٹے چرچا
کرنے میں تم پر کوئی بڑی آفت جبکہ تم اس (بہتان) کو اپنی
زبانوں پر جاری کرنے لگے اور ایسی بات منہ سے نکالنے
لگے جس کی تم کو خبر تک نہیں اور تم اس کو ہلکی بات سمجھتے
تھے حالانکہ (بہتان اور افتراء) اللہ کے نزدیک بہت
بڑی بات ہے ، اور جب تم نے اس کو سنا تھا تو کیوں
نہ کہا ہمارے لئے زیبا نہیں کہ ایسی جھوٹی بات منہ
سے نکالیں " اللہ کے لئے پاکی ہے " یہ تو بہت بڑا
بہتان ہے۔ اللہ تم کو سمجھاتا ہے کہ ایسا کام پھر کبھی نہ
کر بیٹھنا ۔ اگر تم واقعی سچے ایمان والے ہو اور اللہ تعالےٰ
تمہارے لئے پتہ کی باتیں واضح کرتا ہے اور اللہ
خوب جاننے والا، حکمت والا ہے جو لوگ چاہتے ہیں
کہ بدکاری کا چرچا ہو ایمان والوں میں ان چاہنے
والوں کے لئے دردناک عذاب ہے دنیا میں بھی اور
آخرت میں بھی بلاشبہ اللہ (حقیقت حال کا) جاننے
والا ہے اور تم جاننے والے نہیں ہو ۔ اور اگر اللہ کا
فضل نہ ہوتا اُس کی رحمت نہ ہوتی تم پر اور یہ بات
نہ ہوتی کہ وہ نرمی کرنے والا ہے اور مہربان

اللہ رؤف رحیم ○ (نور - ع ۲)   تو کیا کچھ نہ ہو جاتا۔

سورۂ نور کی ان آیات نے عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طہارت و پاکدامنی کا ہی صرف اعلان نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کو یہ تنبیہ بھی کی کہ ان کو ایک لمحہ کا انتظار کئے بغیر اس قسم کے افترا پردازوں کے افترار پر صاف صاف یہ کہہ دینا چاہیئے تھا کہ یہ محض افترار اور بہتان ہے۔

یہ آیات اس بنار پر "آیاتِ براۃ" بھی کہلاتی ہیں کہ ان میں حضرت عائشہ رضی کی براۃ کا اعلان ہے اور منافقین اور معاندین کی ذلت و خذلان کا اظہار

موعظت | اس واقعہ نے قرآن عزیز میں جن مواعظ و بصائر کا سامان مہیا کیا ہے ان میں سے یہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہیں:۔

(۱) فاسق و فاجر یا بد باطن انسانوں کی دی ہوئی خبر خصوصاً جبکہ وہ با عصمت و عفت اور صاحبِ تقویٰ و خیر افراد کے خلاف ہو ہرگز قابلِ توجہ نہیں اور اس کے لئے صرف اسی قدر کہہ دینا کافی ہے کہ یہ محض افترائے ہے تا وقتیکہ خبر دینے والا اس پر روشن دلیل و حجت قائم نہ کر دے۔

(۲) بے گناہ پر الزام اور تہمت لگانا بہت بڑا گناہ ہے اور چونکہ اس گناہ کا مرتکب حق العباد میں سے ایک اہم حق کا تہتک کرتا ہے، اس لئے نہ صرف اخلاق کی نگاہ میں بلکہ اجتماعی قانون کی نظر میں بھی حد درجہ مجرم ہے، قرآنِ عزیز کی نصوص نے اس لئے حدِ قذف (بے گناہ پر تہمت لگانے کی سزا) کے لئے اسی کوڑے تجویز کئے ہیں تاکہ آئندہ کسی کو بھی یہ جرأت نہ ہو سکے کہ وہ ایک پاکباز انسان پر بہتان لگائے یا بغیر شہادت کے اس کی تشہیر کرے۔

(۳) یہ واقعہ گو آغاز کے اعتبار سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بہت سخت ایذار کا باعث ہوا اور اہل بیت کو اس نے بے حد پریشان خاطر بنایا، لیکن

انجام کے پیشِ نظر اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ سرتا سر خیر ثابت ہوا کیونکہ اس سے ایک جانب منافقوں کی منافقت کا راز فاش ہوگیا اور دوسری جانب صدیقہ عائشہ رضؓ اور اہل بیت رسول کی عظمتِ شان کا بے نظیر مظاہرہ عمل میں آگیا کہ قرآن کی دس آیات نے ان کی براءۃ کے لئے نازل ہوکر ان کی عصمت و عظمت دونوں پر عدیم النظیر مہر تصدیق ثبت کردی۔

(۴) بعض مرتبہ اشرار اور خبیث النفس انسانوں کی ہفوات اس درجہ آب و رنگ رکھتی ہیں کہ سادہ لوح مسلمان اور نکوکار انسان بھی مغالطے اور دھوکے میں آجاتے ہیں اس لئے مسلمان کا فرض ہے کہ سنی سنائی بات پر اس وقت تک ہرگز ہرگز یقین نہ کرے جب تک کہ اسلامی اصولِ شہادت کے مطابق شنیدہ خبر کی تصدیق نہ ہوجائے۔

قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اِیَّاکَ وَالظَّنَّ فَاِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سوءِ ظن سے بچو اس لئے کہ بعض بد گمانیاں گناہ کا مرتکب بنادیتی ہیں"

(۵) حقوق العباد میں خدائے برتر نے جو حدود و قصاص اور تعزیرات مقرر فرمادئے ہیں، جرائم کے ارتکاب پر ان میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں ہے اور قانونِ اسلامی کی نگاہ میں اس حیثیت سے تمام مجرم یکساں قابل گرفت ہیں۔ اس لئے واقعۂ افک میں منافق مفتریوں کے ساتھ تین مسلمان (مرد و عورت) حسان۔ حضرت مسطح، اور حضرت حمنہ بنت جحش کو بھی جھوٹی تہمت لگانے کے الزام میں کوڑے کھانے پڑے۔



نبا فاسق[1]

غزوۂ بنی المصطلق[2] میں جب مسلمان فتح یاب ہو گئے اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشورہ کی بنا پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سردار قبیلہ کی بیٹی حضرت جویریہ (رضی اللہ عنہا) سے نکاح کر لیا تو نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رشتۂ مصاہرت کی وجہ سے تمام صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے اسیرانِ جنگ کو رہا کر دیا اور مسلمانوں کے اس حسنِ سلوک و اخلاقِ کریمانہ اور اسلامی محاسن سے متاثر ہو کر تمام قبیلہ مشرف باسلام ہو گیا۔ تب نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ولید بن عقبہ کو اس لئے ان کے پاس بھیجا کہ وہ قبیلہ کے دولت مندوں سے "زکوٰۃ" وصول کر کے اُن ہی کے فقراء و مساکین پر تقسیم کر دیں۔

اہلِ قبیلہ کو جب ولید کی اس آمد کا علم ہوا تو وہ عاملِ اسلام کے استقبال کے لئے تیاریاں کرنے لگے اور ایک معزز ترین ہستی کے استقبال کی طرح ساز و سامان کے ساتھ میدان میں نکلے۔

زمانۂ جاہلیت میں اس قبیلہ کے اور ولید کے درمیان کچھ ناچاقی رہ چکی تھی اور پُرانی عداوت کا رشتہ چلا آتا تھا، اس لئے استقبال کے اس اہتمام کو ولید نے دوسری نظر سے دیکھا اور سمجھا اور اپنی غلط رائے پر مجبور کر کے اہلِ قبیلہ سے مقابلہ کئے بغیر ہی مدینہ واپس آ گئے اور دربارِ قدسی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ بنی المصطلق

[1] فاسق کی دی ہوئی خبر۔ [2] یہ غزوہ ۵ھ میں پیش آیا۔

تو مرتد ہو گئے اور انھوں نے زکوۃ دینے سے بھی انکار کر دیا اور وہ تو سرکشی پر آمادہ ہیں۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ سن کر بنی المصطلق کے طرز عمل سے رنجیدہ ہوئے اور مسلمان تو برافروختہ ہو گئے اور جہاد کی تیاریاں ہونے لگیں تاکہ مرتدین کا مقابلہ کیا جائے، حتیٰ کہ وہ اسلام پر واپس آجائیں یا کیفر کردار کو پہنچ جائیں

ادھر بنی المصطلق کو ولید کے اس عجیب طرز عمل نے حیرت میں ڈال دیا اور جب ان کو معلوم ہوا کہ ولید نے کسی بیجا جسارت کے ساتھ ان کے متعلق دربار نبوی میں غلط بیانی کی ہے تو وہ بے حد پریشان ہوئے کیونکہ ان کے تو وہم و خیال میں بھی یہ نہیں تھا کہ ان جیسے پختہ کار اور ثابت قدم مسلمانوں پر اس قسم کی تہمت بھی لگائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے دراً خدمتِ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ایک موقر وفد بھیجا جس نے حاضر ہو کر کل ماجرا کہہ سنایا۔

ایک جانب اپنے عامل (ولید) کا وہ بیان اور دوسری جانب حدیث العہد مسلم جماعت کا یہ بیان اس لئے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے خاموشی اختیار فرمائی اور وحی الٰہی کا انتظار کیا۔

آخر وحی الٰہی نے رہنمائی کی اور قرآن عزیز (سورۂ حجرات) کی ان آیات نے نازل ہو کر نہ صرف زیر بحث معاملہ کی حقیقت ہی واضح کر دی بلکہ اس سلسلہ میں ایک مستقل قانون یا معیارِ تحقیق عطا فرما دیا۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ	اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی (غلط کار)
جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا	خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو، ایسا نہ ہو کہ
اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ	نادانی کی وجہ سے کسی قوم پر (جہاد کے نام پر)
فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ	حملہ آور ہو جاؤ اور پھر کل کو (اصل حال معلوم ہونے
نٰدِمِیْنَ ○ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ	کے بعد) اپنے کئے پر پچھتانے لگو، اور جانو کہ

فِيكُمْ رَسُولَ اللّٰهِ لَوْ	تم میں اللہ کا رسول موجود ہے ۔ اگر وہ تمہاری بات
يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِنَ	اکثر معاملات میں مان لیا کرے تو تم (اپنی
الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ	غلط روی کی وجہ سے) مصیبت میں پڑ جاؤ لیکن
حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَ	اللہ نے (اپنے فضل سے) تمہارے لئے ایمان کو
زَيَّنَهٗ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ	محبوب بنا دیا ہے اور تمہارے دلوں میں اس کو
اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ	زینت بخشی ہے اور تمہارے دلوں میں کفر اور گناہ
وَالْعِصْيَانَ اُولٰٓئِكَ هُمُ	اور نافرمانی کے لئے نفرت پیدا کر دی ہے ۔ اور
الرّٰشِدُوْنَ فَضْلًا مِّنَ	(در حقیقت) یہی لوگ ہیں اللہ کے فضل و احسان
اللّٰهِ وَنِعْمَةً وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ	کی وجہ سے راہ یاب اور اللہ جاننے والا ہے
حَكِيْمٌ ٥ (حجرات ع۱)	حکمتوں والا ہے ۔

موعظت (۱) خبروں کے بیان کرنے میں عام طور پر سنجیدہ اور مہذب جماعت بھی اس کو معیوب نہیں سمجھتی کہ جو خبر بھی ان کے کانوں تک پہنچے وہ اس کو بے تکلف نقل کرتے رہیں اور حقیقت حال کی جستجو کی زحمت قطعاً گوارا نہ کریں، خواہ اس خبر سے کسی ناکردہ گناہ پر افترا کیا جا رہا ہو، یا کسی فرد و جماعت کو مضرت پہنچ رہی ہو، حالانکہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے پُر زور الفاظ میں یہ تنبیہ فرمائی ہے:

عن ابی هريرة رضی الله	ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی
عنه عن النبی صلی الله	اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ انسان کے لئے
عليه وسلم قال كفٰى	یہ گناہ کافی ہے کہ ہر شنیدہ بات کو نقل کرتا رہے ۔
بالمرء اثما ان يحدث	یعنی یہ بھی گناہ کی بات ہے کہ سنی سنائی جھوٹی بات
بكل ما سمع (ابوداؤد)	کی تشہیر کرے ۔

(۲) جب کوئی ایسی خبر سنی جائے جو بلحاظ مفاد یا مضرت خبر دینے والے

پر یا دوسروں پر اثر انداز ہوتی ہو تو اسلامی آداب اجتماعی کا تقاضہ ہے کہ پہلے اس کی تحقیق ہونی چاہئے اور جب وہ پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے تب اس سے متعلق نتائج و ثمرات کی جانب متوجہ ہونا چاہیئے۔

"خبر" سے متعلق یہ حکم اخلاقی حیثیت رکھتا ہے اور معاشرتی زندگی میں روزمرہ واجب العمل ہے لیکن محاکم شرعیہ میں جب کوئی معاملہ جائے اور خبر "شہادت" کی حیثیت اختیار کرلے تو اس کے قبول و عدم قبول میں اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے دوسرے مزید شرائط ہیں جو فقہ اسلامی کے "باب الشہادۃ" میں بہ تفصیل مذکور ہیں۔



مسجدِ ضرار

منافقین کو یہ تو جرأت ہوتی نہ تھی کہ علانیہ اسلام کی مخالفت کر کے اس کو نقصان پہنچائیں، البتہ ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح در پردہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کر کے ان کو ضعف و انحطاط کی راہ پر لگا دیں، چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے انھوں نے جہاں اور بہت سی فتنہ سامانیاں بپا کر رکھی تھیں ان میں سے ایک واقعہ رجب سنہ ۹ ہجری میں بھی رونما ہوا۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو معلوم ہوا کہ تبوک کے میدان میں جو کہ مدینہ سے چودہ منزل پر براہِ دمشق واقع تھا۔ ہرقل شاہ روم نے مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے لشکر جرار جمع کر لیا ہے اور اس کا مقدمۃ الجیش آگے بڑھ کر بلقاء تک آپہنچا ہے، آپؐ نے عرب میں قحط اور گرمی کی شدت کے باوجود جہاد کے لئے منادی کر دی اور مسلمان جوق در جوق شوق جہاد میں مدینہ میں جمع ہونے لگے۔

نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) ابھی تیاریوں ہی میں مصروف تھے کہ منافقین نے وقت سے فائدہ اٹھا کر سوچا کہ مسجد قباء کے مقابلہ میں۔ جو ہجرت کے بعد سب سے پہلی مسجد تھی اس حیلہ سے ایک مسجد تیار کریں کہ جو لوگ ضعف یا اور کسی عذر کی وجہ سے مسجد نبوی میں نہ جا سکیں تو یہاں نماز پڑھ لیا کریں کیونکہ اس طرح مسلمانوں کو ورغلانے کا بھی موقعہ ہاتھ آئے گا اور ایک قسم کی تفریق بھی پیدا ہو جائے گی۔

یہ سوچ کر وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم نے ضعیف وناتواں اور معذوروں کے لئے قریب ہی ایک مسجد بنائی ہے اب ہماری خواہش ہے کہ حضورؐ وہاں چل کر ایک مرتبہ اس میں نماز پڑھ دیں تو وہ عنداللہ مقبول ہو جائے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس وقت تو میں اہم غزوہ کے لئے جا رہا ہوں واپسی پر دیکھا جائے گا۔

مگر آپؐ جب بخیر وکامرانی مراجعت فرما ہوئے تو وحی الٰہی کے ذریعہ اس مسجد کی تعمیر کے حقیقی سبب سے آگاہ ہو چکے تھے، چنانچہ واپس تشریف لا کر سب سے پہلے صحابہؓ کو حکم دیا کہ وہ جائیں اور اس مسجد کو آگ لگا کر خاک سیاہ کر دیں۔

چونکہ حقیقۃً اس مسجد کی بنیاد "تقویٰ" اور "وجہ اللہ" کی جگہ "تفریق بین المسلمین" پر رکھی گئی تھی اس لئے بلاشبہ وہ اسی کی مستحق تھی اور اس کو "مسجد" کہنا حقیقت کے خلاف تھا۔ اس لئے قرآنِ عزیز نے اس بظاہر مسجد وبباطن بیت الشر کی تعمیر کے متعلق حقیقت حال کو روشن کرتے ہوئے بتلا دیا کہ یہ مسجد تقویٰ نہیں بلکہ مسجدِ ضِرار کہلانے کی مستحق ہے:۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا	اور منافقوں میں سے) وہ لوگ بھی ہیں جنھوں
ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا	نے اس غرض سے ایک مسجد بنا کھڑی کی کہ
بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا	نقصان پہنچائیں کفر کریں، مومنوں
لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ	میں تفرقہ ڈالیں اور ان لوگوں کے
مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ	لئے ایک کمین گاہ پیدا کریں جو اب سے
اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ	پہلے اللہ اور اس کے رسولؐ
يَشْهَدُ اِنَّھُمْ لَكٰذِبُوْنَ	سے لڑ چکے ہیں وہ ضرور قسمیں
لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ۭ	کھا کر کہیں گے کہ ہمارا مطلب

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۚ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۚ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۔

(توبہ ع ۱۳)

اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ بھلائی ہو لیکن اللہ کی گواہی یہ ہے کہ وہ اپنی قسموں میں قطعاً جھوٹے ہیں (اے پیغمبر!) تم کبھی اس مسجد میں کھڑے نہ ہونا، اس بات کی کہ تم اسمیں کھڑے ہو اور بندگان الٰہی تمہارے پیچھے نماز پڑھیں وہی مسجد حق دار ہے جس کی بنیاد اوّل دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے (یعنی مسجد قبا اور مسجد نبوی) اس میں ایسے لوگ آتے ہیں جو پسند کرتے ہیں کہ پاک صاف رہیں اور اللہ بھی پاک صاف رہنے والوں کو ہی پسند کرتا ہے۔

موعظت (۱) منافقت ایک ایسا مرض ہے جو انسان کی تمام خصائلِ حمیدہ اور اخلاقِ حسنہ کو تباہ و برباد کر کے اس کی انسانیت کو حیوانیت سے بدل دیتا ہے، اور اس کے افکار و اعمال میں مطابقت باہمی نہ رہنے سے اس کی زندگی کو اسفل السافلین میں گرا دیتا ہے۔

(۲) ایک ہی عمل عامل کی نیت کے فرق سے "پاک" بھی ہو سکتا ہے اور "ناپاک" بھی "طیّب" بن سکتا ہے اور خبیث بھی، تعمیر مسجد ایک عمل خیر ہے اور باعث اجر و ثواب اگر جبکہ لوجہ اللہ ہو اور عبادتِ الٰہی کا حقیقی مقصد پیش نظر رہے۔

انما یعمر مساجد اللہ من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر واقام الصلوٰۃ واٰتی الزکوٰۃ ولم یخش الا اللہ (۱۰؍ پ) "اللہ کی مسجدوں کو تو بس وہی آباد کرتا ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور نماز ادا کی اور زکوٰۃ دی اور خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرا"

اور یہی عملِ خیر "عمل شر" اور لائق نفرت بن جاتا ہے جبکہ اس کا مقصد

ل تعمیر مساجد اللہ میں مساجد کی آبادی اور اس کی تعمیر دونوں کا مفہوم شامل ہے۔

کارِ شیطان ہو یعنی تفریق بین المسلمین یا نماز کی آڑ میں اسلام کے خلاف کمین گاہ اور جلبوسی کا مرکز بنانا ہو، اسی لئے یہ عمل خیر کافروں کے ہاتھ سے انجام پانا غیر مقبول اور مردود ہے۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسَاجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ (توبہ ع)

"مشرکوں کا حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجد کو آباد کریں، حالانکہ وہ اپنی جانوں پر کفر کی گواہی دیتے ہیں"۔



وفات یا وصل بالرفیق الاعلیٰ

اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ

آخر وہ وقت بھی آپہنچا جس کے تصور کے لئے نہ صرف مسلمان بلکہ دنیائے انسانیت بھی تیار نہ تھی، یہ وقت کائناتِ انسانیت کے لئے مصیبت عظمیٰ اور واہیۂ کبریٰ ثابت ہوا۔ چار دانگِ عالم پر حیرت طاری تھی کہ وہ کس طرح غیر متوقع طور پر ہادیٔ اکبر، مصلحِ اعظم کے فیض صحبت سے محروم ہو گئے! آنکھوں نے جو کچھ دیکھا، قلب اس کے باور کرنے کو تیار نہ تھا اور قلب جو کچھ چاہتا تھا، آنکھیں اس نظارہ کو واپس نہ لا سکتی تھیں، دل پاش پاش تھے، جگر شق ہو رہے تھے، چشم گریاں اشک کے سیلاب بہا رہی تھی کیونکہ آج روحانیت کے آفتاب عالمتاب کے اور کائنات انسانی کے درمیان موت کا کثیف ابر حائل ہو چکا تھا۔

اگر دنیا کا کرۂ آفتاب درحقیقت کبھی غروب نہیں ہوتا اور رہتی دنیا تک غروب نہیں ہوگا، بلکہ دیکھنے والوں کے اور اس کے درمیان پردۂ شب حائل ہو جاتا ہے تو کس کی مجال اور کس کی جرأت ہے کہ وہ آفتابِ رسالت (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق غروب ہونے کا دعویٰ کر سکے کیونکہ یہاں تو پردۂ شب کو بھی حائل ہونے کی اجازت نہیں ہے

"الدین السمحۃ البیضاء لیلھا ونھارھا سواء"

"دین اسلام آسان در روشن دین ہے جس کے رات اور دن دونوں یکساں

طور پر روشن ہیں۔

یعنی یہاں شب تاریک کا گذر ہی نہیں ہے، البتہ موت "کل نفس ذائقۃ الموت" کا پیغام بن کر اس آفتاب رسالت کے اور ہمارے درمیان لکۂ ابر بن کر حائل ہوگئی۔ اس لئے اس مصیبت کبریٰ میں بھی مسلمانوں کے زخمی قلوب کے لئے مرہم اور کشتگان فراق رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے بہترین اکسیر و تریاق موجود تھا اور وہ یقین اور اذعان ہے جس کو قرآن عزیز نے یہ کہہ کر پہلے ہی "قلب مسلم" کو عطا کردیا:

"إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ، وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ"

"یعنی موت اس حقیقت کا نام ہے جو نبی مرسل بلکہ خاتم المرسلین کو بھی پیش آکر رہے گی اور بقائے حقیقی تو ذات احدیت کا ہی بلاشرکت غیرے طغرائے امتیاز ہے۔"

"اللہ اللہ! وہ کیسا عجیب سماں تھا کہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "اللھم الرفیق الاعلیٰ" فرماتے ہوئے جان جاں آفریں کے سپرد فرمادی تو تمام صحابہ رنج و غم اور صدمۂ جانکاہ سے اس درجہ متحیر اور مصیبت زدہ ہو رہے تھے کہ ان کے ہوش و حواس تک بجانہ تھے، اسی عالم میں حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے فرط غم سے تلوار سونت کر یہ نعرہ لگایا کہ جو محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوگیا کہے گا تو اسی تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں گا۔

اسی اضطراب انگیز عالم میں خدا کا ایک بندہ صدیق اکبر آتا ہوا نظر آتا ہے، سب سے پہلے وہ حجرۂ عائشہ (رضی اللہ عنہا) میں پہنچتا اور دل بریاں و چشم پرنم کیساتھ سرور دو عالم کی جبین نور کو بوسہ دیتا اور فراق رسول سے کرب دبے چینی کا اظہار کرتا ہے

اور اس فرض عشق سے فارغ ہو کر جب باہر آتا ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی اس حالت کا جائزہ لے کر جس میں جاہلیت و اسلام دونوں ادوار کی بے نظیر شخصیت عمر بن الخطاب بھی شامل ہے تو آگے بڑھ کر کہتا ہے: "اے خطاب کے بیٹے بیٹھ جا" حضرت عمر وہیں بیٹھ جاتے اور انتہائی حزن و غم سے حضرت ابوبکر کا منہ تکنے لگتے ہیں۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اب منبر نبوی پر کھڑے ہو کر صدائے حق بلند کرتے ہوئے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے مجمع کو یوں خطاب کرتے ہیں:

"لوگو! جو شخص محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی پرستش کرتا تھا اس کو معلوم ہو جانا چاہیئے "انّ محمدًا قد مات" کہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے ذائقہ موت چکھ لیا اور جو خدائے واحد کا پرستار ہے تو بلاشبہ "انّ اللہ حیّ لا یموت" اللہ تعالے زندۂ جاوید ہے اور موت سے پاک اور بری، اس کو موت نہیں ہے"۔

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی یہ صدائے حق جب فضا میں گونجی تو سب سے اوّل حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد تمام صحابہ پر سکون و اطمینان طاری ہو گیا اور وہ سمجھ گئے کہ بلاشبہ سردار دوعالم صلے اللہ علیہ وسلم اپنا فرض رسالت پورا کر کے "رفیق الاعلیٰ" سے جا ملے اور اب اسلام مکمل ہو چکا اس لئے اب ہمارا فرض ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور زندۂ جاوید معجزہ کلام اللہ "قرآن" کو پیشوا بنا کر خدمت اسلام کا فرض انجام دیں۔

حضرت عمر بن الخطاب کی کیفیت تو یہ ہوئی کہ فرمانے لگے قسم بخدا صدیق اکبر نے یہ صدائے حق بلند کرتے ہوئے جب یہ آیت تلاوت کی " مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (الآیۃ)، تو مجھے ایسا معلوم ہوا گویا ابھی یہ آیت

کا نزول ہو رہا ہے اور عشقِ رسول ؐ نے فراقِ رسول سے جو مبہوت کر دیا تھا قرآن اور تعلیم رسول ؐ کی روشنی میں جو کچھ رفیق محترم نے کہا وہ یک بیک مثلِ آفتاب میرے سامنے آگیا۔

تمام کتب احادیث و سیر کی روایات متفق ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ماہ ربیع الاول روز دوشنبہ کو ہوئی البتہ کس تاریخ کو ہوئی ؟ اس بارے میں متعدد اقوال پائے جاتے ہیں۔

واقدی اور ابن سعد صاحب طبقات الکبریٰ کی روایات ۱۲۔ ربیع الاول ظاہر کرتی ہیں اور یہی قول مشہور و معروف ہے اور بیہقی اور ابن کثیر میں منقول بعض روایات میں ہے کہ ۲۔ ربیع الاول اور بعض میں ۱۰ر، ۴ر اور یکم ربیع الاول بھی منقول ہے[1]۔

ابو القاسم سہیلی اپنی مشہور کتاب روض الانف میں دعوی کرتے ہیں کہ ۱۱ھ ربیع الاول کا مہینہ اور دوشنبہ کا دن بالاتفاق متعین ہونے کے بعد حسابی اعتبار سے وفات کی تاریخ کسی طرح ۱۲ (بارہ) ربیع الاول نہیں ہو سکتی ، البتہ ۲۔ یا ۱۳ یا ۱۴ یا ۱۵ ربیع الاول میں سے کوئی تاریخ ہو سکتی ہے اور یہ اس لئے کہ جمہور کا اس پر "اجماع" ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں حج (وقوف عرفہ) جمعہ کے دن کیا ہے، پس جبکہ ۹۔ ذی الحجہ کو جمعہ کا دن تھا تو خواہ بعد کے تمام مہینے صرف انتیس دن کے مان لیجئے یا صرف تیس دن کے، یا بعض انتیس کے اور بعض تیس کے کسی صورت میں بھی دوشنبہ کو ۱۲ ربیع الاول نہیں ہوتی اس لئے یہ روایت صحیح نہیں ہے۔

البتہ ابن جریر طبری نے ابن کلبی اور ابو مخنف کی روایت سے ۲ ربیع الاول نقل کی ہے، تو یہ اس صورت میں صحیح ہو سکتی ہے کہ محرم ، صفر، ربیع الاول تینوں مہینے

[1] تاریخ ابن کثیر جلد ۵ ص ۲۵۵۔